بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

خدا کا شکر ہے کہ اس نے چند در چند مزاحمتوں کے باوجود سیرۃ پاک کی تیسری جلد کی تکمیل و انجام کا سامان بہم پہنچایا اور ایک گنہ گار کو توفیق بخشی کہ ان اوراق کو ترتیب دے کر اپنے سیاہ اعمالنامہ کے دھونے کے لیے آبِ رحمت کے چند قطرے فراہم کر سکے۔ دوسری جلد ۱۳۳۸ھ، (۱۹۲۰ء) میں چھپ کر نکلی تھی۔ چار برس کے بعد یہ نو سو صفحوں کا مجموعہ مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ صواب کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے بُعد نہ ہوا ہو، وَالْعِصْمَۃُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ۔

ان اوراق کی تالیف میں ہم اپنے ان محسنوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ان کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ مشکلات اور غوامض میں مخدومنا مولانا حمید الدین صاحب کے مشوروں نے فائدہ پہنچایا ہے۔ رفیقِ کار مولانا عبد السلام صاحب ندوی نے معجزات کے جزئی واقعوں کے فراہم کرنے میں مدد کی ہے۔ ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبد الباری ندوی (معلم فلسفۂ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) سے بڑھ کر فلسفۂ جدیدہ کا کوئی ماہر نہیں۔ معجزات کی بحث

میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفۂ جدیدہ کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں اُن سے بھی تعرض کیا جائے۔ چناں چہ میری درخواست پر موصوف نے معجزات اور فلسفۂ جدیدہ" کا باب لکھ کر عنایت کیا ہے، جو اس کتاب کے ص ۱۰۸ سے شروع ہو کر ص ۱۹۷ پر تمام ہوا ہے۔

کہیں کہیں آپ کو احادیث کی بعض غیر مطبوعہ کتابوں مثلاً بیہقی، ابو یعلی، ابنِ راہویہ، ابنِ ابی شیبہ، بزار وغیرہ کے حوالے دوسری مطبوعہ کتبِ احادیث کے حوالوں کے ساتھ تائیداً ملیں گے۔ ہم نے ان کے حوالوں میں دوسرے مفسرین، شارحینِ حدیث اور مصنفینِ سیرت مثلاً ابنِ کثیر، ابنِ حجر، ابنِ قیم، سیوطی وغیرہ پر بھروسہ کیا ہے۔ معجزات کے جزئی واقعات میں ایک دو مقام پر قوی روایتوں کے ساتھ اگر ضعیف روایتوں کو جگہ دی گئی ہے تو ان سے مقصود صرف یہ ہے کہ قوی روایتوں سے جس نوع کے معجزات ثابت ہیں اس نوع کے معجزات کی دوسری تائیدیں بھی گو اس رتبہ کی نہیں، مگر موجود ہیں۔

اس راہ کی ایک منزل آج اور تمام ہوئی۔ لیکن قلم کے مسافر کو آرام نہیں کہ اب چوتھی منزل اس کے سامنے ہے۔ احباب دُعا کریں کہ یہ جلد چہارم ان کی خدمت میں جلد پیش ہو سکے۔

سید سلیمان ندوی

۱۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبع سوم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تیسری جلد جو آنحضرتؐ کے منصب نبوت، حقیقتِ نبوت اور فضائل و معجزات پر مشتمل ہے، تیسری دفعہ چھپ کر اب منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اس اثنا میں بعض مباحث پر جدید تحقیقیں سامنے آئیں۔ اس لئے پوری کتاب پر نظرِ ثانی کی گئی۔ روایتوں اور حوالوں کو اصل ماخذوں سے دوبارہ ملایا گیا۔ اگر اختلاف نظر آیا تو تصحیح کی گئی۔ کوئی پہلے سے زیادہ مستند حوالہ ملا تو اس کا اضافہ کیا گیا۔ کوئی عبارت اگر مشتبہ تھی تو اس شبہہ کو دُور کیا گیا۔ خصوصیت کے ساتھ معراج کے جسمانی و روحانی یا حالتِ بیداری یا خواب کے ہونے کے مسئلہ کو صاف کیا گیا۔

معجزات کی روایتوں کی اصل سے پھر تطبیق کی گئی اور کہیں کہیں حواشی کے اضافہ سے بعض نئے فوائد بڑھائے گئے، کہیں کہیں عبارت کے اغلاق کو بھی دور کیا گیا ہے۔

ایک ظلوم و جہول انسان کی طاقت میں تحقیق کی جو حد تھی، اس نے اپنی وسعت کے مطابق وہ پوری صرف کی ہے۔ اس پر بھی عصمت کا دعویٰ نہیں۔ اہلِ نظر سے التماس ہے کہ اگر اب بھی کوئی قابلِ اصلاح چیز نظر آئے تو مؤلف کو مطلع کر کے جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

حسنِ خاتمہ کا طالب

سید سلیمان ندوی

دار القضا۔ بھوپال

۱۶ر شوال ۱۳۶۶ھ

۳۱ر اگست ۱۹۴۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دلائل و معجزات

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ (المائدۃ، ۳۲)

اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا کیے۔

روحانی نوامیس کا وجود سیرت نبویؐ کا یہ حصہ آنحضرتؐ کے اُن حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق اُس عالم سے ہے جو ہمارے اس مادّی عالم اور اس کے مادّی قوانین کے حدود سے باہر ہے۔ جس طرح ہماری یہ مادّی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے، مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معیّن اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے۔ اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے۔ وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے۔ خزاں اور بہار ہے۔ فصل و موسم ہے۔ ؎

آسمانہاست در ولایتِ جاں　　کارفرمائے آسمانِ جہاں

نبوت کے فطری و روحانی آثار جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے اور آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے۔ باغ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے تو موسم بدلتا ہے،

اور بہارِ نبوت رونق افزاء ہوتی ہے۔[1]

اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانینِ فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح دنیا کی رُشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں۔ جن میں تغیر راہ نہیں پاتا۔ انبیاءؑ اور رسلؑ اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں۔ قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں۔ منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں۔ اس روحانی جہاد میں انبیاءؑ و رسلؑ سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

نبوت کے روحانی نوامیس جسمانی قوانین پر حکمران ہیں جس طرح ہمارا نفس اور ہماری روح یا ہمارے جسم کی پُراسرار مخفی قوت ہمارے کالبدِ خاکی پر حکمران ہے اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارہ پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روح

[1] خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود باوجود سے پہلے انبیاءؑ کا سلسلہ جاری رہا۔ حضورؐ کی آمد کے بعد جانشینان محمدی یعنی مجددینِ امت اس فرض کو انجام دیتے ہیں۔ یہ مجددینِ ملتِ رسولؐ کے متبع کامل ہوتے ہیں اور منصب نبوت سے عاری ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے انکار سے کفر نہیں لازم آتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف ملکوں میں یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں یا جماعتوں میں مختلف مجددینِ ملت ہوں۔ ان کی پہچان کا سب سے بڑا معیار عقاید و اعمال، اخلاق اور طرقِ دعوت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباعِ کامل ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ وقت کے اوہام و رسوم و اعمال کو جو باہر سے آکر دین میں شامل ہو گئے ہوں، دور کریں اور امورِ دین میں سے جو امور مٹ گئے ہیں، اُن کو دوبارہ جاری کریں۔

اعظم اذنِ الٰہی سے سارے عالمِ جسمانی پر حکمران ہو جاتی ہے اور روحانی دُنیا کے سنن و اصول عالمِ جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں اس لئے وہ چشم زدن میں فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک عروج کر جاتی ہے۔ سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے۔ چاند اس کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں۔ اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں اس کے نفسِ پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں اور مُردے جی اُٹھتے ہیں۔ وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکمِ الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے اور اس سے یہ جو کچھ عجائبِ قدرت ظاہر ہوتے ہیں وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فعل ہوتا ہے اور اسی کی مشیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں

نبوت کے روحانی نوامیس کے اسباب و علل سے ہم اسی طرح لاعلم ہیں جس طرح جسمانی قوانین کے۔

لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے، فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں۔ ستارے چمکتے کیوں ہیں۔ شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے۔ چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں۔ تخم درخت، غذا خون اور گوشت کیونکر بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیونکر ہوتا ہے اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال و اعمال بحکمِ الٰہی کیونکر صادر ہوتے ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پُراسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات و کیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات و سوانح غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے تھے جو ہم نہیں

دیکھ سکتے۔ وہ، وہ کچھ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے۔ وہ، وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جان سکتے اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سکندر اور نپولین کی فتوحات اور بدھ اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے ہندوستان کی روحانی داستان کا ایک ایک حرف، اسرائیلی نبیوں کے صحیفوں کا ایک ایک باب اور عیسائیوں کی انجیل کا ایک ایک صفحہ اس تاریخ کی مثالیں اور نظیریں ہیں۔

انبیاءؑ کا اصلی معجزہ خود ان کا سرتاپا وجود ہے گو پیغمبر کا اصلی معجزہ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی کھلی نشانی خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کے لئے اس کی چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لئے اس کے لب و لہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لئے اس کے پیام و دعوت میں اعجاز ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ احساسِ حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں لیکن انبیاءؑ کے متبعین میں سے سابقینِ اوّلین اور صدیقین و صالحین نے اپنے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا۔ حضرت ہارون و یوشع علیہما السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا۔ حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے آنحضرتؐ پر ایمان لائیں۔ مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں بلکہ یہ جان کر کہ آپؐ غریبوں کے دست و بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں[1]۔ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی اور دیگر اصحابِ کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپؐ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا۔ ان کے لئے آپؐ کا سرتاپا وجود، نفسِ دعوتِ حق اور پیامِ اخلاص ہی معجزہ تھا۔ انہوں نے

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

اُسی کو دیکھا اور اُسی سے ایمان کی دولت پائی۔ مگر نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب جو آتشِ خلیل، طوفانِ نیل، قحطِ مکہ اور انشقاقِ قمر کے معجزوں کے طالب تھے، پھر بھی ایمان کی دولتِ عظمیٰ سے محروم رہے۔ لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دُنیا میں موجود رہا ہے۔ جس کی بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ جھائیاں پڑی ہوتی ہیں۔ جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى[1] پکار اُٹھتے ہیں۔ فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھا تو موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ آنحضرتؐ کی فتحِ روم کی پیشین گوئی پوری ہوئی تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشمِ باطن کھل گئی اور حقیقت کا پیکر ان کے سامنے جلوہ نما ہو گیا۔[2] یہی طبقہ ہے جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدرِ استعداد حصہ پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ مؤیدات یعنی تائیدِ حق کے لئے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے۔ مومنین صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دی جاتی ہے اور رسوخِ ایمان اور ثباتِ قدم مرحمت ہوتا ہے۔ ان کی بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات کی جاتی ہے اور اس سے اُن کی دولتِ ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

ان واقعات کا اصطلاحی نام حضراتِ انبیائے کرامؑ سے جو یہ مافوق العادۃ کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں ان کے لئے عام طور پر معجزہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ قرآن مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی جگہ آیت (نشانی) اور برہان (دلیل) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو

---

[1] طٰہٰ، ۷۰ جامع ترمذی تفسیر سورۂ روم۔

اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم محدثین نے ان کی جگہ دلائل و علامات کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو الفاظِ قرآنی کے ہم معنی ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام استعمال کی بنا پر لفظ "معجزہ" کے ساتھ کچھ خاص لوازمِ ذہنی پیدا ہو گئے ہیں۔ جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً اس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے، جس کا صدور خاص اس کے اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے اور نیز یہ کہ اس لفظ کے سبب سے اس کا معجزہ ہونا گویا اس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں خیال غلط ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ خود لفظِ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جامع لفظ درکار ہے جس میں نبوت کے تمام خواص، کیفیات، مشاہدات اور اعمالِ خارقۂ عادت اور غیر خارقۂ عادت سب داخل ہیں۔ لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں۔ آئندہ جہاں از روئے قرآن معجزہ کی حقیقت پر بحث آئے گی وہاں اس کے متعلق مزید تفصیل کی جائے گی جس سے معلوم ہوگا کہ قرآن پاک کی اصطلاح کس قدر صحیح اور موزوں ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اس کتاب میں صرف قرآن کی اصطلاح آیت، برہان اور محدثین کی اصطلاح علامات و دلائل کو اختیار کریں تاکہ ہمارا مفہوم زیادہ صحیح طریقہ سے اور زیادہ وسیع طور سے ادا ہو سکے۔ لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے اس لئے اس کو یک قلم ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دلائل و براہین و آیات کا تعلق انبیاءؑ کی سیرتوں سے

قرآن مجید اور دیگر صحفِ آسمانی میں انبیائے سابقینؑ کے جو قصص اور واقعات مذکور ہیں ان میں ان کے روحانی حالات و کیفیات یعنی دلائل و براہین اور آیات کا ذکر نہایت مؤثر اور عبرت انگیز طریقہ سے کیا گیا ہے؛ سیرِ ملکوت، مکالمۂ الٰہی، رویتِ ملائکہ، رویائے صادقہ، استجابتِ دعا، طوفانِ نوح، آتشِ خلیل،

عصائے موسیٰؑ، نفسِ عیسیٰؑ اور اس قسم کے اور بھی بہت سی کیفیات و حالات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور ان کے ساتھ ان کے عواقب و نتائج بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاءؑ کی سیرت سے ہر زمانہ میں ان چیزوں کو خاص تعلق رہا ہے اور اس وجہ سے وہ ان کے واقعاتِ زندگی کا جزوِ لاینفک ہو گئے ہیں۔

انبیاءؑ کی زندگی اگرچہ گوناگوں واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن نتائج کے لحاظ سے ان تمام واقعات کا مرکز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاکدان کو اخلاقِ ذمیمہ کے خس و خاشاک سے پاک کر کے محاسنِ اخلاق کے گل و ریحان سے آراستہ کیا جائے تاکہ برکاتِ آسمانی کا دامن کانٹوں سے اُلجھنے نہ پائے۔ اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاءؑ کو مادّی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور مادّی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست و بازو سے زیادہ ان کے روحانی دست و بازو کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاءؑ کے واقعاتِ زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے اور ان کے ذکر سے گویا انبیاءؑ کے تمام حالاتِ زندگی کو سلسلۂ علل و اسباب سے مربوط کر دیا ہے۔

دلائل و آیات کا تعلق سیرۃ محمدیؐ سے آنحضرتؐ کی سیرت تمام انبیاءؑ کے واقعاتِ زندگی کا خلاصہ، اُن کی تعلیمات کا عطر اور ان کے حالات و مشاہدات کا برزخ ہے۔ آپؐ ایک عالمگیر اور ابدی مذہب لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ اس لئے آپؐ نے ایک ہی خطاب کے ساتھ ان تمام لوگوں کو مخاطب فرمایا جن کو طوفانِ نوح دفعتہً بہالے گیا تھا، جن کو دریائے قلزم کی نہریں نگل چکی تھیں، جن کو نفسِ عیسیٰؑ نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا اور ان سب سے بڑھ کر آپؐ کا مخاطب ایک گروہ اور بھی تھا جو ان چیزوں کو صرف عجائب

پرستی کی نگاہ سے نہیں بلکہ ژرف نگاہی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس بنا پر جس چشمۂ فیض نے اسباطِ موسیٰ کو سیراب کیا تھا وہ ان تشنہ کامانِ روحانیت سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے آنحضرتؐ کی ذات کو اُن تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا جو اعلیٰ قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لئے ضروری تھے۔ آپؐ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپؐ کی شریعت معجزہ تھی۔ آپؐ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے علاوہ آپؐ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا۔ اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپؐ کے لئے بستر لگایا کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کبھی مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ کے نور سے قلبِ مبارک کو منور کیا۔ اور کبھی مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے سرمہ سے آپؐ کی آنکھوں کو روشن کیا کبھی نزولِ رحمتِ الٰہی کے لئے آسمان کے دروازے کھولے کبھی وادیٔ حق کے پیاسوں کے لئے زمین کی تہ سے پانی کے چشمے اُبالے۔ کبھی سنگِ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے۔ کبھی انبیائے سابقینؑ کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے اور آیندہ دنیا کے واقعاتِ غیب بتا کر رہروانِ عالم کو منزلِ حقیقت کے نشان دکھائے۔

آنحضرتؐ کے واقعاتِ زندگی کا سب سے بڑا جزو غزوات و محاربات ہیں۔ ان ہنگامہ خیز واقعات کے تاریخی علل و اسباب اور ان کے نتائج کا ذکر کتاب کے ایک حصہ میں بالتصریح گذر چکا ہے۔ لیکن جہاد کے میدان میں آپؐ کو جو فتوحاتِ عظیمہ حاصل ہوئیں ان میں انسانوں کے لشکر اور سپاہیوں کے تیغ و خنجر سے زیادہ فرشتوں کے پَرے، دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی۔ آپؐ کی زندگی کا سب سے بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے اور روئے انور نے نگاہِ کیمیا اثر نے، تقریرِ دلپذیر نے اخلاقِ اعجاز نما نے آیات و دلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ غرض آپؐ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر مظہر میں یہ دلائل،

یہ آیات، یہ معجزات اسبابِ ظاہری کے پہلو بہ پہلو اسبابِ حقیقی بن کر رونما ہوتے رہے ہیں۔

دلائل و معجزات اور عقلیت | ان دلائل و معجزات کے الفاظ کو سننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہیں؟ کیا عقلِ خردہ گیر ان کے وقوع کو جائز بھی رکھتی ہے؟ دنیا میں عقل و نقل اور فلسفۂ و مذہب کا جب سے وجود ہے ان مباحث پر معرکہ آرائیاں ہوتی چلی آئی ہیں۔ لیکن فلسفۂ قدیمہ ہو یا جدیدہ فلسفۂ یونان ہو یا فلسفۂ اسلام مشرق کا فلسفہ ہو یا مغرب کا، ان سب کا حاصلِ بحث یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ فرقے ان کو ممکن بلکہ واقع سمجھتے ہیں تو دوسرے ان کو محالِ قطعی تصور کرتے ہیں۔ عقل و فہم کا یہ اختلاف دنیا میں ہمیشہ سے قائم تھا، قائم ہے، قائم رہے گا۔ لیکن جو لوگ ان چیزوں کے امکان اور وقوع کے قائل ہیں وہ خود اپنے کج بحث دل اور بدگمان قلب کی تسلی، طمانیت اور رفعِ شک کے لئے اپنے اپنے فہم و ادراک کے موافق مختلف نظریے قائم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنی راز جو طبیعت کی تشنہ لبی کو تسکین دے سکیں۔ ان تمام نظریات کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ان عقل و حواس سے مافوق حقائق کو اپنے دریافت کردہ معلوم و محسوس قواعد کے مطابق بنا سکیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا محسوس و غیر محسوس یا جسمانی و روحانی دنیا دونوں ایک ہی نظام پر چل رہی ہیں کہ ایک عالم کے قیاسِ تمثیلی و استقرائی سے ہم دوسرے عالم کے ثبوت پر شہادتوں کا انبار لگانا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جانا نہیں جا سکتا، اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں اور جو سمجھا نہیں جا سکتا اس کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ جب ہماری عقل اور فہم کی لنگ پائی محسوسات کے میدان میں صاف نظر آتی ہے تو ماورائے محسوسات میں اس کی تگاپو کہاں تک منزلِ مقصود کے قریب کر سکتی ہے ؎

آنانکہ وصفِ حسنِ تو تقریر می کنند　　خواب ندیدہ راہمہ تعبیر می کنند

بہر حال اب تک انسان نے اس خوابِ نادیدہ کی جو کچھ تعبیر کی ہے وہ ذیل کے اوراق میں پھیلائی گئی ہے اور سلسلۂ بحث میں سب سے پہلے فلسفۂ قدیمہ کے نظریات کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے بعد فلسفۂ جدیدہ ان چیزوں کی گرہ کشائی جہاں تک کرسکتا ہے اس کی تفصیل ہے اور آخر میں خود قرآن مجید نے ہمیں اس باب میں جو کچھ تلقین کی ہے اس کو بیان کیا جائے گا۔



دلائل و معجزات

اور

فلسفۂ قدیمہ و علم کلام

اسلام میں عقائد کی سطح جب تک صاف اور ہموار رہی دلائل اور معجزات کے متعلق عقلی مباحث نہ پیدا ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ لیکن دوسری صدی میں جب یونانی علوم کے تراجم مسلمانوں میں پھیلے تو وہ ہمارے علمِ کلام کے ضروری اجزاء بن گئے اور ان کو اس درجہ اہمیت ہو گئی کہ اب ان سے تعرض کئے بغیر گویا موضوع مزید بحث کے لئے تشنہ رہ جاتا ہے۔

اہلِ یونان کسی شریعتِ الٰہی سے مشرف نہ تھے۔ اس لئے وہ نبوت، خواصِ نبوت، وحی، الہام اور معجزہ وغیرہ سے واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص فلسفہ میں ان مباحث کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ رُشد نے تہافۃ التہافۃ میں اس کی خاص تصریح کی ہے اور علامہ ابنِ تیمیہ نے بھی اپنی تصنیفات میں اس کو جا بجا لکھا ہے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلا فلسفی یعقوب کُندی ہے۔ لیکن چند مختصر رسائل کے سوا اس کی عام تصنیفات ناپید ہیں۔ کُندی کے بعد فارابی کا زمانہ ہے اور اسی نے سب سے پہلے ان مسائل کے متعلق اپنے خاص نظریئے قائم کئے۔ چنانچہ اس نے اپنے رسالہ فصوص الحکم[1] میں نبوت اور خواصِ نبوت کے متعلق بالترتیب حسبِ ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں:۔

---

[1] فصوص الحکم یورپ اور مصر دونوں جگہ چھپ گئی ہے۔ اس وقت میرے پیشِ نظر لیڈن ای جی بریل کا نسخہ مطبوعہ ۱۹۰۶ء ہے۔

خواصِ نبوّت کے متعلق فارابی کے خیالات

فقرہ ۲۸۔ صاحبِ نبوّت کی روح میں ایک قوتِ قدسیہ ہوتی ہے۔ جس طرح تمہاری روح عالمِ اصغر میں (یعنی اپنے جسم میں) تصرّف کرتی ہے اور تمہارا جسم، تمہاری روح کا تابع و فرمان بردار رہتا ہے، اسی طرح وہ روحِ قدسی عالمِ اکبر میں یعنی تمام جسمانیات میں تصرّف کرتی ہے اور تمام عالمِ جسمانی اس کا تابع و فرماں بردار ہوتا ہے، اور اسی بنا پر اس سے خارقِ فطرت معجزات صادر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اس کا آئینۂ باطنی صاف اور زنگ و غبار سے پاک ہوتا ہے اس لئے لوحِ محفوظ یعنی اس کتاب میں جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی، اور ملائکہ کی ذاتوں میں جو کچھ ہے، اُس کا عکس اِس کے آئینہ پر پڑتا ہے اور وہ قدرتِ قدسیہ یا روحِ قدسیہ اس کو مخلوقات تک پہنچاتی ہے۔

فقرہ ۲۹۔ ملائکہ ان صورِ علمیہ کا نام ہے جو بذاتہا قائم ہیں۔ اس طرح نہیں جس طرح لوح میں نقوش یا ذہن میں معلومات ہوتی ہیں بلکہ خود معانی قائم بالذات ہیں۔ اور وہ امرِ الٰہی سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ عام رُوحِ بشری تو حواسِ ظاہری کے تعطّل یعنی خواب میں اس امرِ الٰہی سے لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ لیکن روحِ نبوی بیداری میں اس سے تخاطب کرتی ہے۔

فقرہ ۳۰۔ عام روحِ بشری کا حال یہ ہے کہ جب اس کے حواسِ ظاہری مشغول ہوتے ہیں تو حواسِ باطنی معطّل ہو جاتے ہیں اور جب حواسِ باطنی کام کرتے ہیں تو حواسِ ظاہری بے کار ہو جاتے ہیں۔ مگر ارواحِ قدسیہ کا یہ حال ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے حواسِ ظاہری کی مصروفیت ان کے حواسِ باطن کو اور ان کے حواسِ باطن کی مشغولیت ان کے حواسِ ظاہری کو معطّل نہیں ہونے دیتی اور دونوں ایک

دوسرے کے فرائض میں مُخل نہیں ہوتے، بلکہ ان کی تاثیر کا عمل اُن کے اجسام سے متعدّی ہو کر دوسرے اجسام تک پہنچتا ہے اور وہ انسانی تعلیم سے نہیں، بلکہ ارواح و ملائکہ کے ذریعہ سے علم کی تلقی کرتے ہیں۔

فقرہ ۱۴۔ عام روحوں کی درماندگی یہاں تک ہے کہ نہ صرف یہ کہ حواس ظاہری کی مصروفیت حواس باطنی کو اور حواس باطنی کی مصروفیت حواس ظاہری کو اپنے فرائض سے باز رکھتی ہے بلکہ خود ان کے ایک حس کی مشغولیت دوسری حس کو بے کار کر دیتی ہے۔ ہم جس وقت غور سے سُنتے ہیں دیکھتے نہیں۔ جب دیکھنے میں مستغرق ہوتے ہیں تو سُنتے نہیں۔ خوف کا احساس ہو تو اشتہا نہیں پیدا ہو سکتی۔ اشتہا ہو تو غصّہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ جب ہم فکر کرتے ہیں تو ذکر سے غفلت ہو جاتی ہے اور جب ذکر کرتے ہیں تو تفکّر سے خالی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ارواحِ قدسیّہ کی یہ حالت نہیں ہوتی ان کے تمام ظاہری و باطنی حواس ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور ان کا ایک حاسہ دوسرے حاسہ کا عائق و مانع نہیں ہوتا۔

فارابی کے یہی چند لفظ ہیں جو ابنِ سینا اور ابنِ مسکویہ تک پہنچتے پہنچتے ایک داستان بن گئے ہیں اور اب چھوٹی اور بڑی تمام اسلامی فلسفیانہ تصنیفات میں باب النبوّت کے نام سے یہ مسائل شامل ہیں۔ یہاں تک کہ امام غزالی و رازی کی تصنیفات سے ان ہی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ صوفیہ کے لسان القوم مولانا رومی کے سازِ "نے" سے بھی یہی آواز نکلتی ہے۔

فلسفہ و عقل کی راہ سے جو حکمائے اسلام منزلِ حقیقت کے جویاں ہیں، ان کے نزدیک نبی وہ ہے جس میں یہ تین باتیں جمع ہوں:-

۱۔ اوّل یہ کہ اس کو امورِ غیب پر اطلاع ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ملائکہ اس کو نظر آئیں اور وہ اس سے کلام کریں۔

۳۔ تیسرے یہ کہ اس سے خوارقِ عادت ظاہر ہوں۔

ان تینوں دعووں کے امکان پر ان کے دلائل بہ ترتیب یہ ہیں:۔

اطلاعِ غیب "یہ عالمِ کائنات ایک باترتیب اور مسلسل نظامِ فطرت پر قائم ہے جس کا ہر درجہ دوسرے درجہ سے بلند ہے۔ پہلے جمادات ہیں جن میں نہ حرکت ہے نہ نمو، احساس ہے نہ ارادہ نُطق ہے نہ ادراکِ کلّیات کی قوّت۔ اس کے بعد نباتات کا درجہ ہے جن میں حرکت اور نمو تو ہے، لیکن وہ دوسری صفات سے محروم ہیں۔ اس کے بعد حیوانات آتے ہیں جن میں حرکت اور نمو کے ساتھ احساس وارادہ بھی ہے۔ سب سے آخر انسان کا مرتبہ ہے جس میں اِن تمام خصوصیات کے ساتھ نُطق اور ادراکِ کلّیات کی قوّت بھی ہے۔ کائنات کے ان چاروں طبقوں میں بھی یکسانی نہیں ہے۔ بلکہ ان میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ایک ترقّی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کا پست تر نقطہ اپنے پچھلے سے اور بلند تر اپنے اگلے سے جا کر مِل جاتا ہے۔ لیکن کیا اس ترقّی کی انتہا یہیں پر جا کر ختم ہو جاتی ہے؟ نہیں۔ ابھی نطق وادراک اور احساس وتمیز کا مرتبہ کمال کو نہیں پہنچا ہے۔ انسانوں میں وحشی اور غیر متمدّن قبائل سے شروع کرو تو ان سے ترقّی یافتہ دہقانی اور گنوار ہیں۔ اُن سے اعلیٰ شہری اور متمدّن ہیں۔ اور ان سے زیادہ بلند تر علماء اور عقلائے روزگار ہیں جو فکر ونظر اور قیاس واستدلال سے مجہول کو معلوم کرتے ہیں لیکن انسانوں کی بلند تر صنف وہ ہے جس کی عقل وہوش کے سامنے نظریات بھی بدیہیات ہیں۔ جن کی رُوحِ قدسی اپنی تمام معلومات کو تجربہ ومشاہدہ سے نہیں بلکہ براہِ راست عالمِ ملکوت سے حاصل کرتی ہے۔ جن کے حواس کی طاقت عام انسانوں سے اس قدر

تیز ہوتی ہے کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے ہیں جو عام انسان نہیں دیکھ سکتے اور وہ، وہ کچھ سنتے ہیں جو عام انسان نہیں سُن سکتے۔ یہ قوّتِ کمالیہ اور یہ روحِ قدسیہ جس صنفِ انسانی میں ہوتی ہے وہی انبیاء ہیں۔

رویتِ ملائکہ انسان کے علم و احساس کا منبع روح ہے اور اس کے آلات و ذرائع اس کے باطنی اور ظاہری حواس ہیں۔ اگر اس سطحِ زمین پر کوئی ایسا انسان ہو جو ان تمام آلات سے معرّا ہو تو وہ کسی شئے کا احساس کر سکتا ہے اور نہ کسی چیز کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے علم و احساس کے ان آلات میں ترقی اور تیزی آتی جاتی ہے اس کے علم و احساس میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک خاص نقطہ پر آکر وہ رُک جاتے ہیں اور مادّیات و محسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن خواب کی حالت میں روح کو مادّیات اور محسوسات کی زنجیروں سے جب آزادی ملتی ہے تو غیر مادّی چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روحِ انسانی کے علائق جس قدر مادّیات سے پاک ہوں گے اُسی قدر اس کے علم و احساس کے قویٰ میں ترقی ہوگی۔ اور جس قدر اس عالم مادّی سے اس کو افتراق ہوگا اُسی قدر عالمِ ملکوت کے ساتھ اس کا اتّصال بڑھتا جائے گا۔ اس بنا پر اگر کسی روح میں اس قدر استعداد اور صلاحیت عطا ہوئی ہو کہ وہ عالمِ بیداری میں بھی ان مادّی تعلّقات کو منقطع کر سکتی ہو تو جو کچھ عام روحوں کو خواب میں نظر آتا ہے اس سے بہت بڑھ کر اس کو بیداری میں محسوس و مشاہد ہو سکتا ہے۔ وہ غیب کی آوازوں کو سُن سکتی ہے، فرشتوں کو دیکھ سکتی ہے، اُن سے باتیں کر سکتی ہے۔ اور ان کے ذریعہ سے علم و معرفت کا فیض حاصل کر سکتی ہے۔

خوارقِ عادت دنیا کے مادّی حوادث جس طرح مادّی اسباب و علل کے نتائج ہیں اسی طرح وہ نفسیاتی اسباب کے نتائج بھی ہوتے ہیں۔ نفس کے اندر مختلف قسم کے جذبات

اور حرکات پیدا ہوتی ہیں اور ان سے ہمارا مادی جسم متاثر ہوتا ہے۔ درخت یا دیوار پر چڑھنے والے کو اکثر یہ پیش آتا ہے کہ جہاں اس کے دل میں خوف پیدا ہوا اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ کانپ جاتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ وہمی خوف سے انسان بے ہوش ہو جاتا ہے، بیمار پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے۔ شرمندگی اور خجالت سے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ غیظ و غضب میں چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ یہ کمزور نفوس کا حال ہے۔ اس سے زیادہ قوی نفوس اپنے تاثرات سے دوسروں کو متاثر کر لیتے ہیں اور اپنی قہر و محبت کی نگاہ سے دوسروں کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصحابِ نفوسِ قدسیہ اور اربابِ قوتِ کمالیہ اس مادی دنیا میں بہت کچھ تصرف کر سکتے ہیں[1]

اکثر متکلمینِ اسلام نے پہلی اور دوسری شقوں کو ایک میں داخل کر دیا ہے۔ اور ہیں بھی وہ درحقیقت ایک ہی۔ امورِ غیب کی اطلاع، ملائکہ اور روحانیت کا مشاہدہ، رویت اور ان سے تخاطب، یہ تمام تر وحی و مشاہدۂ روحانیت کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں اور تیسری چیز کا نام ان کی زبان میں معجزہ ہے۔ ہم ان دونوں پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

وحی و مشاہدہ ہمارے حکمائے متکلمین اور صوفیہ نے وحی و الہام اور مشاہدۂ روحانیت کی تشریح میں متعدد نظریئے قائم کئے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) الہامِ فطری اور الہامِ نوعی۔ دنیا میں جتنی چیزیں پردۂ عدم سے منصۂ وجود پر آتی ہیں وہ اپنے اپنے وجود کے ساتھ مختلف قسم کے خواص اور فطری علم اپنی ساتھ لاتی ہیں۔ گلاب کا پھول سُرخ اور چنبیلی سفید کیوں ہوتی ہے؟ کھجور میٹھی اندرائن کڑوا کیوں ہوتا ہے؟ ایک ہی

---

[1] ابن سینا نے اشارات میں تفصیل سے اور نجات میں اختصار کے ساتھ ان نظریات کو بیان کیا ہے۔ امام رازی نے مباحث شرقیہ میں اور ابن مسکویہ نے فوز الاصغر میں ان کو لکھا ہے۔ دیگر فلسفیانہ تصانیف میں بھی کم و بیش یہی ہے۔

زمین اور ایک ہی آب و ہوا میں مختلف پودے اُگتے ہیں مگر ہر ایک کا رنگ، مزہ اور بُو مختلف کیوں ہوتی ہے، اُن کے خواص اور کیفیات میں کیوں اس درجہ اختلاف ہوتا ہے؟ پرندہ کا بچہ انڈے کے چھلکے سے باہر آنے کے ساتھ زمین سے دانہ چننے لگتا ہے۔ بطخ کا بچہ پانی میں تیرنے لگتا ہے۔ حیوانات کے بچے ماؤں کے تھن میں منہ لگا دیتے ہیں۔ چوہے کے بچہ نے گو کبھی بلی نہ دیکھی ہو اور بلی کے بچہ نے کبھی چوہا نہ دیکھا ہو مگر عمر میں پہلی دفعہ جب ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہر ایک سے اس کی فطری حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں۔ ہر حیوان اپنے نفع اور ضرر کو سمجھتا ہے۔ وہ مہلکات سے بھاگتا اور منافع کی طرف لپکتا ہے۔ یہ تعلیم اُن کو کس نے دی؟ شیر، لومڑی، کتا، بلی ہر ایک کے بچے نے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اُن کے نوعی خصوصیات ہیں۔ ان اعمال کا معلّم کون ہے؟ کوّے بلبلوں کے جھنڈ میں اور بلبلیں کوّوں کے غول میں نہیں بیٹھتیں۔ یہ ہم جنسی کا علم ان میں کہاں سے آیا؟ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں عظیم الشان اور حیرت انگیز جماعت بندی اور ذخیرہ اندوزی کی قابلیت کیونکر پیدا ہوئی؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ معلّم فطرت نے عطیۂ وجود کے ساتھ ساتھ یہ طبعی خصوصیات اور الہامات بھی ان میں ودیعت کر دیئے ہیں۔

یہ تو انواع کا حال ہے۔ ہر نوع کے تحت میں اصناف ہیں۔ جس طرح ہر نوع کی خصوصیتیں اور قابلیتیں الگ الگ ہیں اسی طرح ہر صنف کی خصوصیات اور استعدادات بھی الگ ہیں۔ ایک کبوتر کی کتنی قسمیں ہیں۔ ایک آم میں کس قدر اقسام ہیں۔ ایک نوع انسان میں کس قدر طبقات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک صنف، قسم اور طبقہ اپنی مشترک نوعی خصوصیات کے ساتھ کچھ مستقل الگ صنفی اوصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو دوسرے اصناف میں نہیں پائے جاتے۔ افریقہ کے ایک وحشی انسان سے لے کر یورپ کے متمدّن شہری تک، ایک ناخواندہ جاہل سے لے کر ایک فلسفی اور حکیم تک کس قدر مختلف انسانی طبقات ہیں۔ ہر طبقہ اپنے اندر متعدد

صنفی خصوصیات اور ادراکات رکھتا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ معلّم ازل انسانوں کی ایک اور صنف (انبیاءؑ) کو علوم و معارف اور حقائق و اسرار کے وہ الہامات عطا کردے جن سے دیگر اصنافِ انسانی محروم اور ناآشنا ہیں۔

دنیا میں جس قدر علوم و فنون، صنائع و حِرف، ایجاد و اختراعات پیدا ہو چکے ہیں اُن کا کوئی نہ کوئی بانی، موجد اور مخترع ہوگا۔ پارچہ بافی اور خیاطی سے لے کر ریاضیات اور مکینکس تک جس قدر صنائع و ایجادات اور علوم و معارف ہیں، وہ کسی نہ کسی ایک شخص کے ذہن کا نتیجہ ہیں۔ اسی بانی اور مخترع اوّل کے ذہن میں اس مسئلہ خاص یا ایجادِ خاص کا خطور کیونکر ہوگیا؟ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسرے سے سیکھے بغیر اس کے نفس میں اس مسئلۂ خاص اور اس ایجادِ خاص کے متعلق ایک خاص قسم کی سوجھ یا فہم پیدا ہوگیا اور اس کے ذہن میں کہیں سے ایسی حقیقت بے پردہ مشہود ہوگئی جو دوسروں کے لئے تمام تر مستور تھی۔ یہی الہام ہے۔ اب جس شخص کو فلسفیانہ الہامات ہوتے ہیں وہ فلسفی ہے، جس کو شاعرانہ ہوتے ہیں وہ شاعر ہے۔ جس کو آلات اور مشینوں کا الہام ہوتا ہے وہ آلات ساز اور انجینیر ہے اور جس نفسِ قدسی میں اسرارِ الٰہیہ، نوامیس ملکوتیہ، عقائدِ حقہ، اعمالِ صالحہ، قوانینِ عادلہ کا الہام ہو وہ پیغمبر ہے اور اُس کے اس الہام کو وحی کہتے ہیں۔

(۲) انقطاعِ حواس عن المادیات۔ انسان کے تمام محسوسات اور مدرکات بواسطہ یا بلا واسطہ اس کے حواسِ خمسہ یعنی سامعہ، باصرہ، شامّہ، ذائقہ اور لامسہ سے ماخوذ ہیں جن کے کام بہ ترتیب سننا، دیکھنا، سونگھنا، چکھنا اور ٹٹولنا ہیں۔ اسی طرح انسان میں پانچ قوائے دماغی بھی ہیں۔ جن کے نام حسِّ مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ اور متخیلہ ہیں۔ ان قوائے خمسہ کے متفرق کام ہیں۔ حسِّ مشترک تو آلاتِ حواس کا خزانہ یا ایسیٹربکس ہے۔ انسان کو اپنے پانچوں حواس کے ذریعہ سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ سیدھا حسِّ مشترک میں جاکر منطبع ہوجاتا ہے اور پھر وہاں سے منتقل ہوکر خیال میں جمع ہوجاتا ہے

اور وہاں محفوظ رہتا ہے۔ واہمہ وہ قوت ہے جو اپنے اس گذشتہ محفوظ خزانۂ مدرکات کا بار بار جائزہ لیتی رہتی ہے اور اس پر احکام جاری کرتی رہتی ہے مثلاً دور سے ہم نے ایک زرد سیال شے دیکھی پہلے سے ہمارے خیال میں شہد کی صورت محفوظ ہے۔ اس زرد سیال شے کو دیکھتے ہی ہم نے کہہ دیا کہ "یہ شہد ہے اور یہ میٹھا ہوتا ہے"۔ یہ واہمہ کا کام ہے۔ حافظہ میں قوتِ واہمہ کے مخزونات جمع رہتے ہیں۔ اور متخیلہ جس کا دوسرا نام مفکرہ بھی ہے، اُس قوتِ دماغی کو کہتے ہیں جو مدرکاتِ خیال کی ترکیب و تحلیل کرتی رہتی ہے اور ہمیشہ نئی نئی شکلیں اور عجیب عجیب صورتیں، سینما (صورِ متحرکہ) کے تماشے کی طرح ہمارے ذہن کے سامنے لاتی رہتی ہے۔ کبھی دوسر کا انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ کبھی بے سر کا چلتا پھرتا انسان مشاہدہ کراتی ہے کبھی پرستان کی سیر کراتی ہے اور کبھی عالمِ قدس میں جانے کے لئے پر تولتی ہے۔ ذہن کو ہزاروں لاکھوں میل کی مسافت دم کے دم میں طے کرا دیتی ہے۔ آنکھیں بند کرتے ہی ہماری دوسری آنکھوں کے سامنے جو ہنگامۂ فکر و خیال برپا ہو جاتا ہے۔ وہ اِسی کا کارنامہ ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہماری قوتِ متفکرہ صرف آرام و سکون کے لمحوں میں کیوں یہ تماشے دکھاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری حسِ مشترک ہمیشہ خارج سے آلاتِ حواس کے بھیجے ہوئے محسوسات کی تحصیل و وصول میں مصروف رہتی ہے۔ اس لئے جب تک بیماری، نیند یا غفلت یا کسی اور سبب سے آلاتِ حواس میں تعطل نہیں ہوتا ہمارے قوائے دماغی میں آرام و سکون نہیں پیدا ہو سکتا۔ خواب کی حالت میں جب یہ حواس تھوڑی دیر کے لئے اپنا کام موقوف کر دیتے ہیں اُس وقت ہمارے پُراسرار قوائے ذہنی عالمِ بالا کی سیر کرنے لگتے ہیں اور وہاں کے مشاہدات و مسموعات حسِ مشترک میں آکر ہماری قوتِ مفکرہ کو حرکت دیتے ہیں اور ہم عجیب عجیب چیزیں دیکھنے اور عجیب عجیب آوازیں سُننے لگتے ہیں۔ اب اگر کسی کی روح میں اتنی قوت ہو کہ حالتِ بیداری میں بھی اپنے ظاہری آلات کو معطل کر کے

عالم بالا سے اپنا سلسلۂ تعلق قائم کر سکے تو اس کو سب کچھ اسی عالم بیداری میں نظر آسکتا ہے۔

(۳) قوتِ نبوت۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حواسِ انسانی صرف پانچ کے اندر محدود نہیں ہیں چنانچہ شیخ الاشراق نے حکمۃ الاشراق میں اس پر دلائل قائم کئے ہیں۔ بعض جمادات میں نباتاتی اوصاف ملتے ہیں۔ بعض نباتات ایسی دریافت ہوئی ہیں جن میں قوتِ حس ہے جس سے دیگر نباتات عام طور سے محروم ہیں۔ حیوانات کی مختلف انواع میں بعض ایسے قویٰ کا پتہ چلتا ہے جو دیگر حیوانات میں نہیں۔ شہد کی مکھیوں میں ایک ایسی عجیب وغریب قوت ہے جس سے ان کو کسی طرح بند کر کے لے جایئے اور کہیں جا کر چھوڑ دیجئے، وہ اپنے چھتہ کا راستہ پالیتی ہیں۔ مکڑیوں کی اقلیدسی اشکال بھی کسی نہ کسی قوت کا نتیجہ ہیں، خواہ اس کا نام جبلت یا فطرت ہی کیوں نہ رکھو۔ اسی طرح ممکن ہے کہ انبیاءؑ میں احساس وادراک کی وہ خاص قوت ہو جس سے اور اصنافِ انسانی محروم ہیں۔ وہ اپنی اسی قوتِ قدسیہ کے ذریعہ سے اُن چیزوں کا احساس وادراک کر لیتے ہیں جن کو عام قوائے انسانی نہیں کر سکتے۔ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں اس خیال کو جا بجا ظاہر کیا ہے۔ ؎

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس — آن چو زرِ سرخ و ایں حسہا چو مس

ان پانچ جسمانی حواسوں کے علاوہ پانچ اور روحانی حواس بھی ہیں وہ تانبا ہیں اور یہ سونا ہیں۔

حسِ ابداں قوتِ ظلمت خورد — حسِ جاں از آفتابے می چرد

جسمانی حواس تاریکی سے قوت اخذ کرتے ہیں تو روحانی حواس آفتاب سے۔

ہر کہ از حسِ خدا دید آیتے — در برِ حق داشت بہتر طاعتے

جس نے اس خدائی احساس کی کوئی نشانی دیکھ لی ہے وہ خدا کے سامنے زیادہ مطیع ہے۔

گر بدیدے حسِ حیوان شاہ را — پس بدیدے گاؤ خر اللہ را

اگر حیوان اپنے احساس سے بادشاہ کا مرتبہ پہچان سکتے تو بیل اور گدھے بھی خدا کو دیکھ لیتے۔

گر نہ بودے حسِ دیگر مر ترا　　جز حسِ حیواں زبیروں ہوا

اگر احساسِ حیوانی کے علاوہ تم کو اور دوسرے قوائے احساس نہ ملے ہوتے۔

پس بنی آدم مکرّم کے بُدے　　کے بہ حسِ مشترک محرم شدے

تو بنی آدم کا درجہ اتنا بڑھایا کیوں جاتا، اور صرف حسِ مشترک کی بنا پر وہ محرمِ راز کیونکر ہو سکتا۔

فلسفی گوید ز معقولاتِ دُوں　　عقل از دہلیز می ماند بروں

فلسفی لغو معقولات کی باتیں کرتا ہے تو عقل دہلیز کے باہر رہ جاتی ہے

فلسفی منکر شود در فکر و ظن　　گو برو، سر را بر اں دیوار زن

فلسفی جو صرف اپنی فکر و گمان کے باعث ان حقائق کا انکار کرتا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنا سر دیوار پر دے مارے

نُطقِ آب و نُطقِ باد و نُطقِ گِل　　ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

پانی، ہوا، مٹی، ان سب کا نُطق، اہلِ دل کے حواس کو محسوس ہوتا ہے

فلسفی کو منکرِ حنّانہ است　　از حواسِ انبیاؑ بے گانہ است

فلسفی جو ستونِ نبویؐ کے گریہ کا منکر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ انبیاؑ کے حواس سے واقف نہیں ہے

(۴) حواس کی غیر محدودیت۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حواس پانچ ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی حاسّہ کسی انسان میں موجود نہیں ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان حواسوں کی وسعتِ احساس ان کی حدود کے اندر محدود ہے اور چند اشخاص کو جو چیز دکھائی یا جو آواز سُنائی دیتی ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ عام انسان اس کو دیکھ سُن نہیں سکتے۔ یا جو چیز ہم کو اس وقت دکھائی یا سُنائی نہیں دیتی وہ آیندہ بھی ہم کو دکھائی یا سُنائی نہیں دے گی۔ بالکل ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو دیکھ یا سُن نہ سکے دوسرا انسان اُس کو دیکھ اور سُن لے۔ کوتاہ نظر پاس کی چیز بھی نہیں دیکھ

سکتے۔ لیکن تیز نظر میلوں کی خبر لیتے ہیں۔ بعض انسانوں اور حیوانوں میں بعض قوائے احساس اور دل سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ چیونٹی میں قوتِ شامہ، چیل اور کبوتر میں قوتِ باصرہ، سانپ میں قوتِ لامسہ، کتّوں اور گھوڑوں میں قوتِ سامعہ معمولی سطح حواس سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہے۔ خود انسان کے حواس کے درجے کس قدر متفاوت اور مختلف ہیں۔ ایک انسان دُور سے آواز سُنتا ہے، دُور کی چیز اس کو نظر آتی ہے، دور کی نہایت نازک خوشبو محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن کمزور حواس کے انسان ان کا مطلق احساس نہیں کر سکتے۔ لیکن کسی طریقہ سے اگر ان کے حواس کی قوت اور تیزی میں اضافہ ہو سکے تو وہ بھی اسی طرح دیکھ سکتے، سُن سکتے اور سونگھ سکتے ہیں۔

مقدمۂ بالا سے معلوم ہوا کہ ایک کم نظر انسان یا گراں گوش آدمی جس قدر دیکھتا یا سنتا ہے اگر اس کی قوتِ بصارت و سماعت کو کسی تدبیر سے ترقی دی جائے تو وہ حیرت انگیز طریقہ سے ترقی کر سکتی ہے اور پھر جس قدر اس کے حواس میں ترقی ہوتی جائے گی اس کے احساسات میں اضافہ اور محسوسات میں وسعت آتی جائے گی۔ ہمارے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس ہے۔ ہم اس کو پینا چاہتے ہیں۔ اس میں گرد و غبار کا ایک ذرہ بھی ہم کو نظر نہیں آتا۔ لیکن ہم خوردبین لگا کر دیکھیں تو قطرہ قطرہ میں ہم کو کیڑوں کی بستی کی بستی نظر آئے گی۔ خالی آنکھ سے ہم کو صرف آفتاب، ماہتاب اور کچھ چھوٹے بڑے روشن ستارے دکھائی دیتے ہیں، یہاں تک کہ بطلیموس کو ثوابت کی حرکت تک محسوس نہیں ہوئی اور اُس وقت تک صرف تین سو ستارے دریافت ہو سکے اور اب جب ایک سے ایک طاقت ور دوربینیں نکل رہی ہیں تو ہر نئی دوربین کی ایجاد کے بعد پہلے سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ صرف ساتویں درجہ کے ستارے تیرہ ہزار آٹھویں درجہ کے چالیس ہزار اور نویں درجہ کے ایک لاکھ بیس ہزار ہم کو اس فضائے آسمانی پر تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہرشل کی دوربین سے کُل چھوٹے بڑے دو کروڑ ستاروں کی فوج ہم کو دکھائی

دینے لگی ہے۔

یہی حال سماعت کا ہے۔ پہلے ہماری آواز زیادہ سے زیادہ ایک میل جاسکتی ہوگی۔ ٹیلیفون کی پہلی ایجاد نے اس فاصلہ کو بڑھایا اور دو چار قدم کے بعد شہر کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر دوسرے گوشہ کے لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ چند سالوں میں یہاں تک ترقی ہوگئی کہ سوئیٹزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر ہم بولتے ہیں اور فرانس میں لوگ اس کو سنتے ہیں۔ لکھنؤ سے الہ آباد دم کے دم میں آپ کی آواز پہنچتی ہے اور اب ہندوستان سے ہزاروں میل دور لندن میں آپ کی آواز پہنچنے والی ہے۔

ان روزمرہ کی مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حواس کے فعل وانفعال اور تاثیر و تاثر کے دائرہ کی تحدید نہیں کی جاسکتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ صنفِ انسانی کے حواس اس قدر تیز، سریع اور قوی ہوں کہ ان کو وہ کچھ نظر آئے جو ہم کو نظر نہیں آتا اور وہ کچھ سنائی دے جو ہم کو سنائی نہیں دیتا۔ آنحضرتؐ نماز کی صف کے اندر فرماتے ہیں کہ مجھ کو اسی مقام سے دوزخ اور جنّت نظر آئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان کی وادی میں بیٹھ کر مصر سے حضرت یوسف علیہ السلام کے پیرہن کی خوشبو معلوم ہوتی ہے۔ مولانا رومیؒ اسی خیال کو ان اشعار میں ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس حالت میں ایک حس کی تیزی دوسرے حواس کو بھی تیز کر دیتی ہے:-

پنج حس بایک دگر پیوستہ اند　　زانکہ ایں ہر پنج ز اصلی رستہ اند

حواس خمسہ باہم ایک دوسرے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ پانچوں حواس ایک ہی اصل سے نکل کر آئے ہیں

قوتِ یک قوتِ باقی شود　　مابقیٰ را ہر یکے ساقی شود

ایک حاسہ کی قوت، بقیہ حواس کی قوت بن جاتی ہے

دیدنِ دیدہ فزاید عشق را　　عشق اندر دل فزاید صدق را

دیدارِ چشم عشق کو ترقی دیتا ہے اور عشقِ دل میں سچائی پیدا کرتا ہے۔

صدق بیداریٔ ہر حس می شود　　حسّہا را ذوق مونس می شود

سچائی ہر حاسّہ کی بیداری کا سبب ہو جاتی ہے اور احساس کو ذوق و وجدان سے مدد ملنے لگتی ہے۔

(۵) عالمِ مثال۔ علمائے اسلام میں جن کے سینے علم و حکمت کے ساتھ نورِ معرفت سے بھی منور ہیں، انہوں نے نظر و استدلال سے نہیں بلکہ ذوق و عرفان سے ایک اور راستہ اختیار کیا ہے۔ حکماء میں دو گروہ ہیں ایک وحدیہ اور دوسرا ثنویہ۔ وحدیہ وہ ہیں جو ایک ہی عالم کے قائل ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک مبدءِ عالم صرف ایک ہی ہے۔ ان کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک وہ جو مبدءِ عالم صرف مادّہ کو مانتی ہے اور مادّہ کے علاوہ کسی اور چیز کو تسلیم نہیں کرتی، یہاں تک کہ عقل و حیات اور قوائے ذہنیہ تک اُس کے نزدیک تمام تر مادّہ کی نیرنگیاں ہیں۔ ان کو مادّیین اور طبیعیین کہتے ہیں۔ اور دوسری جماعت مادّہ سے یکسر منکر ہے۔ وہ صرف نفس و روح کو تسلیم کرتی ہے۔ اور اس عالمِ محسوس کو وہم و تصوّر سے زیادہ رُتبہ نہیں دیتی۔ اس کے نزدیک عالَم اور عالَم میں جو کچھ ہے وہ نفس و روح کے مظاہر ہیں۔ ان کو روحانیین کہتے ہیں۔

ثنویہ۔ دو مبدءِ عالم تسلیم کرتے ہیں، یعنی مادّہ اور روح اور عالَم کو ان دونوں کی جلوہ گاہ تسلیم کرتے ہیں۔

ہم نے اوپر کی سطروں میں جن اربابِ معرفت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ تین عالَم تسلیم کرتے ہیں۔ ایک تو یہ عالمِ اجساد یا عالمِ شہادت جس کو تم مادّہ اور مادّیات کہتے ہو۔ دوسرا عالَم ارواح یا عالمِ غیب جو مادّی اور مادّیات سے منزّہ اور مافوق ہے اور تیسرا عالمِ مثال یا عالمِ برزخ۔ یہ وہ عالم ہے جہاں عالمِ اجساد اور عالمِ ارواح، عالمِ شہادت اور عالمِ غیب دونوں کے اوصاف

اور قوانین مجتمع ہو جاتے ہیں۔ عالمِ اجساد کی چیزیں وہاں جاکر پیکرِ مادّی سے پاک ہوکر سامنے آتی ہیں، اور غیر مادّی معانی اور حقائق اور عالمِ ارواح کی مخلوقات وہاں مجسّم اور متجسّد ہوکر نظر آتی ہیں۔ امام ربّانی مکتوبات میں لکھتے ہیں:-

اے برادر! عالمِ ممکنات را سہ قسم قرار دادہ اند۔ عالمِ ارواح و عالمِ مثال و عالمِ اجساد۔ عالمِ مثال را برزخ گفتہ اند درمیان عالمِ ارواح و عالمِ اجساد۔ و نیز گفتہ اند کہ عالمِ مثال در رنگِ مرآۃ است مر معانی و حقائق ایں ہر دو عالم را کہ معانی و حقائقِ اجساد و ارواح در عالمِ مثال بصورِ لطیفہ ظہور می نماید۔ چہ در آنجا مناسب ہر معنی و حقیقی صورت و ہیئت دیگر است۔ و آں عالم فی حدّ ذاتہٖ متضمنِ صورِ ہیئات و اشکال نیست۔ صور و اشکال در وے از عوالمِ دیگر منعکس گشتہ ظہور یافتہ است در رنگِ مرآۃ است کہ فی حدّ ذاتہا متضمنِ ہیچ صورت نیست۔ اگر در وے صورت کائن است از خارج آمدہ است۔

(مکتوبات۔

مکتوب سی دیکم)

عالمِ ممکنات کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ عالمِ ارواح، عالمِ مثال اور عالمِ اجسام۔ عالمِ مثال کو عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام کے بیچ میں کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عالمِ مثال عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام کے معانی و حقائق کے لئے آئینہ کے مانند ہے کہ اس عالمِ مثال میں اجسام و ارواح کے معانی و حقائق لطیف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس عالمِ مثال میں ہر معنی و حقیقت کی ایک خاص مناسب شکل ہے اس عالمِ مثال میں بذاتِ خود کوئی صورت و شکل و ہیئت نہیں ہے۔ یہ صور و اشکال دوسرے عالموں سے آکر اس میں عکس انداز ہوتی ہیں۔ جس طرح خود آئینہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ جو صورہ و اشکال اس میں نمودار ہوتی ہیں، وہ خارج سے آکر اس میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان بزرگوں کا عالمِ مثال وہی افلاطون کا عالمِ مُثُل ہے لیکن افلاطون فرقۂ وحدیہ سے تھا یعنی عالم کا مبدٔ صرف ایک تسلیم کرتا تھا۔ اس لئے اس کے نظریہ کا منشا صرف یہ ہے کہ اس عالمِ محسوس میں ہر شئے فرداً فرداً جزئی اور مشخص ہو کر آتی ہے۔ نفس کُلّی اور مطلق نوع کا وجود خارج میں نہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "انسان ہنستا ہے" "گھوڑا ہنہناتا ہے" "کُتّا بھونکتا ہے" تو یہ کسی خاص انسان، خاص گھوڑے یا خاص کُتّے کی نسبت حکم نہیں ہے بلکہ انسان، گھوڑے اور کُتّے کی نوع پر حکم لگایا گیا ہے۔ لیکن کُلّی انسان مطلق گھوڑے اور مطلق کُتّے کا وجود تو اس عالمِ محسوس میں نہیں۔ مگر کہیں نہ کہیں تو اس کا وجود ہونا چاہیے۔ پھر کہاں ہے؟ عام جواب یہ ہے کہ ذہن میں۔ مگر ذہن جو ہمارے محدود و مختصر دماغ کا دوسرا نام ہے، کوئی ایسا ظرف نہیں جس کے اندر یہ ساری دنیا سما سکے۔ اس لئے ایک اور عالم ہے جس میں کلیات اور انواع بستی ہیں۔ اس عالمِ محسوس میں جتنی چیزیں ہیں وہ کسی نہ کسی نوع کے تحت ہیں۔ یہ انواع عالمِ مثل میں ہیں اور ان کے عکس اور سائے جن کا نام افراد اور جزئیات ہے، وہ اس عالمِ محسوس میں ہیں۔ حقیقی وجود ان ہی انواع یا مثل کا ہے۔ وہ گویا قدرت کے سانچے ہیں اور ان ہی سے ڈھل ڈھل کر اس عالمِ محسوس میں افراد اور جزئیات نمودار ہوتے ہیں۔ مگر ان افراد اور جزئیات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی اپنی نوع کے آثار اور ظلال (سایہ) ہیں۔ پھر ان میں سے ہر نوع کی مستقل روحِ نوعی ہے۔ جو اس نوع کا خدا ہے اُسی کا نام اُن کی اصطلاح میں ربّ النوع ہے۔

یہ ہے مُثُلِ افلاطون کی حقیقت۔ عالمِ مثال کی حقیقت اس سے بالکل الگ ہے۔ اس عالم کے قائلین جیسا کہ ابھی امام ربانی کے مکتوب کے حوالہ سے گذر چکا، تین عالم کے قائل ہیں، عالمِ جسمانی، عالمِ روحانی اور عالمِ مثالی۔ عالمِ مثالی جسم و روح کے احکام کا جامع ہے اس میں روحانی

اشیاء متجسم اور جسمانی چیزیں کسی اور مناسب شکل میں مشکل ہو کر نظر آتی ہیں اور وہ معانی و حقائق جن میں جسم و جان نہیں، مثلاً حیات، موت، علم، عقل، جسمانی رنگ و روپ میں وہاں نمایاں ہوتی ہیں۔ ارواح، فرشتے، جبریلؑ، جو جسم سے پاک ہیں، اس عالم میں متجسم معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل خواب کی سی ہے کہ اس میں کبھی روحانیات متجسم ہو کر اور کبھی جسمانیات کسی اور شکل میں نمودار ہو کر جلوہ گر ہوتی ہیں، اور اہل معرفت ان کو دیکھ کر ان کی مناسب تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی خواب میں علم دریا کی صورت میں، غیظ و غضب آگ کی شکل میں، شجاعت شیر کی ہیئت میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح عالم مثال میں بھی معانی و حقائق اور روحانیات و مجردات کسی مناسب جسمانی شکل و صورت میں دکھائی دیتے ہیں اور ان کو دیکھ کر اہل بصیرت ان رموز و کنایات کی حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ خود عالم مثال میں کوئی آبادی نہیں۔ وہ صرف ایک آئینہ خانہ ہے جس میں عالم بالا یا عالم زیریں سے جو شکل بھی اس کے سامنے آتی ہے، اہل بصیرت کو نظر آجاتی ہے۔

علمائے اسلام میں سب سے پہلے یہ خیال امام غزالی کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن اس کو انہوں نے عالم کے لفظ سے نہیں بلکہ وجود کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ کسی شئے کے وجود کا ثبوت ہمارے پاس اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس کا احساس یا تعقل کرتے ہیں، ہماری معلومات و محسوسات ذہن میں موجود ہیں اور ان کا یہ وجود بھی اس طرح ناقابل انکار ہے جس طرح عام اشیاء کا یہ خارجی وجود۔ لیکن نہ ہم ان کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ چکھ سکتے ہیں، نہ سونگھ سکتے ہیں نہ ٹٹول سکتے ہیں۔ اس بنا پر امام صاحب کے نزدیک وجود کی تین قسمیں ہیں۔ وجود حسی، وجود عقلی اور وجود خیالی۔ اس آخری قسم کی انہوں نے حسب ذیل تفصیل کی ہے:۔

"اور وہ یہ ہے کہ زبان حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے اور یہ خاص انبیاءؑ اور پیغمبروںؑ کی شان ہے۔ اس کی مثال خواب کی ہے۔ جس طرح خواب میں زبان حال

پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں سنتے ہیں۔ مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی مُردہ اس کو کچھ دے رہا ہے۔ یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کی انگلی آفتاب، سورج یا چاند گہن بن گئی یا اس کا ناخن شیر ہو گیا ہے یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں۔ انبیاءؑ کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں اُن سے خطاب کرتی ہیں۔ ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں، وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسّی ہے۔ خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جاگ جاتا ہے اور خواب و بیداری کی دونوں حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے۔

جن لوگوں کو ولایتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے۔ اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو نظر آتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو سنائی دیتا ہے۔"

احیاء العلوم باب عذاب القبر میں بھی امام صاحب نے اس کی تشریح کی ہے۔ امام خطابی (مشہور امام الحدیث) نے معالم السنن میں اس کو رؤیا کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معالم کا اصل نسخہ موجود نہیں۔ حافظ ابن حجر نے شرحِ بخاری میں ان کی رائے نقل کی ہے۔ شریک بن عبداللہؓ کی روایت جس میں معراج میں خدا کے قرب کی تصریح ہے، اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

فمن لم یبلغه من هٰذا الحدیث	پس جس شخص کو اس حدیث کا اتنا ہی ٹکڑا کہ
الا هٰذا القدر مقطوعًا عن غیره	خدا معراج میں آنحضرتؐ سے قریب ہوا،

ولم یعتبرہ باول القصۃ واٰخرھا اشتبہ علیہ وجھہ و معناہ الوقوع وکان قصاراہ امار الحدیث من اصلہ واما الوقوع فی التشبیہ وھما خطتان مرغوب عنھما و اما من اعتبر اول الحدیث باٰخرہ فانہ یزول عنہ الاشکال فانہ مصرح فیھما بان کان رویا لقولہ فی اوّلہ "وھو نائم" وفی اٰخرہ "استیقظ" وبعض الرویا مثل یضرب لیتاول علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ و بعض الرویا لایحتاج الی ذٰلک بل یاتی کالمشاھدۃ۔[1]

حدیث کے دوسرے ٹکڑوں سے الگ ہو کر پہنچا اور اس نے آغاز روایت اور آخر روایت کو باہم ملا کر نہ دیکھا تو اس حدیث کا مطلب اس پر مشتبہ ہو جائے گا اور اس کا انجام یہ ہو گا کہ یا وہ اصل حدیث سے انکار کر دے اور یا یہ کہ وہ خدا کی تجسیم کا قائل ہو جائے اور یہ دونوں باتیں ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن جو شخص اوّل و آخر حدیث کو ملا کر دیکھے گا تو اس سے اشکال رفع ہو جائے گا۔ کیونکہ حدیث کے شروع میں اور آخر میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا۔ کیونکہ شروع میں ہے کہ آپؐ سو رہے تھے کہ آپؐ نے دیکھا اور آخر میں ہے کہ اس کے بعد آپؐ بیدار ہوئے۔ بعض خواب برنگ تمثیل ہوتے ہیں جن کی تعبیر اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح اس قسم کے خوابوں کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ کی طرح ہوتے ہیں۔

امام صاحب کے بعد شیخ الاشراق نے اس کا عالم نام رکھا اور اس کی کچھ کیفیت بیان کی مگر

[1] فتح الباری، جلد سیزدہم۔

انہوں نے عالمِ مثال اور مُثُلِ افلاطونیہ کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی اپنی بعض تصنیفات میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ خواجہ حافظ کے ہاں یہ خیال پایا جاتا ہے۔ ع عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است"۔ حضرات نقشبندیہ میں نہیں معلوم یہ خیال کب سے قائم ہے۔ بہر حال امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے زمانہ کے بہت پہلے سے یہ خیال ان میں پایا جاتا ہے کیونکہ امام ربانی کی تحریروں میں متعدد مقام پر اس کا ذکر ہے۔ ان کے بعد تو حضرات مجددیہ کی تصنیفات میں اس عالم کی نیرنگی اور بوقلمونی پر نہایت پُراسرار مباحث ہیں۔ علمائے متکلمین میں جس کو سب سے پہلے اس نظریہ کو علمِ کلام میں استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا، وہ مجدد الفِ ثانیؒ کے ایک مُرید مُلّا بدرالدین ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں مجدد صاحب کو لکھتے ہیں:۔

پس عذاب قبر در عالم مثال خواہد بود در	پس عذاب قبر بھی عالمِ مثال میں ہوگا۔ اسی
رنگ آلے کہ در خواب در عالمِ مثال نمایند۔	طرح جس طرح کہ خواب میں مثالی رنگ میں دراوٗ
و نوشتہ بودند کہ ایں سخن شاخہائے بسیار دارد	تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ بھی انہوں نے
و اگر قبول نمایند فروغ بسیار بریں سخن متفرع	لکھا کہ اس مسئلہ سے بہت سی شاخیں نکل سکتی
خواہد ساخت۔	ہیں اور اگر آپ قبول فرمائیں تو اس سے بہت
(مکتوبات جلد سوم، مکتوب سی دیکم)	سے فروع پیدا ہو سکیں گے۔

یہی چند منتشر خیالات تھے جن کو شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک عالم بنا دیا۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں عالمِ مثال کا ایک باب باندھا ہے اور اس کے تمام اصول و فروع بیان کئے ہیں۔ ہم اس موقع پر شاہ صاحب کے اس باب کا پورا ترجمہ درج کرتے ہیں:۔

"جاننا چاہیئے کہ بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عالمِ موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی ہے اور جس میں معانی (اعراض و حقائق) ان اجسام کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں

جو اوصاف کے لحاظ سے ان کے مناسب ہیں۔ پہلے اس عالم میں اشیاء کا ایک گونہ وجود ہو لیتا ہے تب دنیا میں ان کا وجود ہوتا ہے اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے بالکل اس عالم مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے۔

اکثر وہ اشیاء جو عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں اس عالم میں منتقل ہوتی اور اُترتی ہیں اور عام لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب خدا نے رحم کو پیدا کیا تو وہ کھڑا ہو کر بولا کہ یہ اس شخص کا مقام ہے جو قطع رحم سے پناہ مانگ کر تیرے پاس پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اور آنحضرتؐ نے فرمایا کہ سورۂ بقر اور آل عمران قیامت میں بادل یا سائبان یا صف بستہ پرندوں کی شکل میں آئیں گی اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت کریں گی جنہوں نے ان کی تلاوت کی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں اعمال حاضر ہوں گے تو پہلے نماز آئے گی، پھر خیرات، پھر روزہ الخ۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ نیکی اور بدی دو مخلوق ہیں جو قیامت میں لوگوں کے سامنے کھڑی کی جائیں گی نیکی نیکی والوں کو بشارت دے گی اور برائی برائی والوں کو کہے گی کہ "ہٹو ہٹو"۔ لیکن وہ لوگ اس سے چمٹے ہی رہیں گے اور آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت میں اور جتنے دن ہیں، وہ معمولی صورت میں حاضر ہوں گے لیکن جمعہ کا دن چمکتا دمکتا ہوا آئے گا۔ اور آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت میں دنیا ایک بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی۔ جس کے بال کھچڑی، دانت پیلے اور صورت بدنما ہوگی۔ اور آنحضرتؐ نے نے فرمایا کہ جو میں دیکھتا ہوں کیا تم بھی دیکھتے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمہارے گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں جس طرح بادل کے قطرے۔ اور آنحضرتؐ نے معراج کی حدیث میں فرمایا کہ اچانک چار نہریں نظر آئیں۔ دو نہریں اندر تھیں اور دو باہر۔ میں نے جبریلؑ سے پوچھا کہ "یہ کیا ہے"۔ بولے "اندر کی نہریں تو جنت کی ہیں اور باہر کی نیل اور فرات ہیں"۔ اور آنحضرتؐ

نے کسوف کی نماز میں فرمایا کہ بہشت اور دوزخ میرے سامنے مجسّم کرکے لائی گئیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میرے اور قبلہ کی دیواروں کے بیچ میں بہشت و دوزخ مجسّم ہو کر آئیں۔ میں نے ہاتھ پھیلائے کہ بہشت سے انگور کا ایک خوشہ توڑوں۔ لیکن دوزخ کی گرمی کی لپٹ سے رُک گیا۔ اور حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے حاجیوں کے چور کو اور ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلی کو باندھ کر مار ڈالا تھا اور ایک فاحشہ عورت کو بہشت میں دیکھا جس نے کتّے کو پانی پلایا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بہشت اور دوزخ کی وسعت جو عام لوگوں کے خیال میں ہے وہ اس قدر مسافت (یعنی کعبہ کی چار دیواری) میں نہیں سما سکتی اور حدیث میں ہے کہ بہشت کو مکروہات نے اور دوزخ کو شہوات نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پھر جبرئیلؑ کو خدا نے حکم دیا کہ جاکر ان کو دیکھیں۔ اور حدیث میں ہے کہ بلا جب نازل ہوتی ہے تو دُعا اس سے کشتی لڑتی ہے اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ خدا نے عقل کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ آگے آ۔ تو وہ آگے آئی۔ پھر کہا کہ پیچھے ہٹ تو پیچھے ہٹ گئی۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ دونوں کتابیں پروردگار عالم کی طرف سے ہیں۔ الخ اور حدیث میں ہے کہ "قیامت میں موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی۔ پھر دوزخ اور بہشت کے درمیان ذبح کر دی جائے گی۔ اور خدا نے فرمایا کہ "ہم نے اپنی رُوح مریمؑ کے پاس بھیجی تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن کر آئی۔" اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جبرئیلؑ آنحضرتؐ کے سامنے آتے تھے۔ اور آپؐ سے باتیں کرتے تھے اور کوئی اُن کو نہیں دیکھتا تھا۔ اور حدیث میں ہے کہ قبر ہفتاد در ہفتاد گز چوڑی ہو جاتی ہے۔ یا اس قدر سمٹ آتی ہے کہ مُردہ کی پسلیاں بھُرکس ہو جاتی ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ فرشتے قبر میں آتے ہیں اور مُردہ سے سوال کرتے ہیں اور مُردہ کا عمل مجسّم ہو کر اُس کے سامنے آتا ہے اور نزع کی حالت میں فرشتے حریر یا گزی کا کپڑا لے کر آتے ہیں۔ اور

فرشتے مُردہ کو ہوے کے گُرز سے مارتے ہیں۔ مُردہ شور کرتا ہے اور اس کے شور کی آواز مشرق سے مغرب تک کی چیزیں سُنتی ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ قبر میں کافر کے اوپر ننانوے اژدہے سے مسلط ہوتے ہیں جو اس کو کاٹتے ہیں تا بقیامت۔ اور حدیث میں ہے کہ جب مُردہ قبر میں آتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھہرو نماز پڑھ لوں۔ اور حدیث میں اکثر جگہ آیا ہے کہ قیامت میں خدا بہت سی مختلف صورتوں میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا۔ اور آنحضرتؐ خدا کے پاس اس حالت میں جائیں گے کہ خدا اپنی کُرسی پر بیٹھا ہوگا اور یہ کہ خدا انسانوں سے بالمشافہ بات چیت کرے گا۔ اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

ان حدیثوں کو جو شخص دیکھے گا تین باتوں میں سے ایک نہ ایک بات اس کو ماننی پڑے گی۔ یا تو ظاہری معنی مراد لے اور اس صورت میں اس کو ایک ایسے عالم کا قائل ہونا پڑے گا جس کی کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں (یعنی عالمِ مثال) اور یہ صورت وہ ہے جو اہلِ حدیث کے قاعدے کے مطابق ہے۔ چنانچہ سیوطی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود میری بھی یہی رائے ہے اور یہی مذہب ہے یا اس بات کا قائل ہو کہ دیکھنے والے کے حاسّہ میں واقعات کی یہی شکل ہوگی اور اس کی نظر میں وہ اسی طرح جلوہ گر ہوں گے۔ گو اس کے حاسّہ کے باہر اس کا وجود نہ ہو۔ قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ آسمان اس دن صاف دھواں بن کر آئے گا اس کے معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسی کے قریب قریب لیے ہیں یعنی یہ کہ لوگوں پر قحط پڑا تھا تو جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو اس کو بھوک کی وجہ سے آسمان دھواں سا معلوم ہوتا تھا۔ ابنِ ماجہ (مشہور محدث تھے) سے مروی ہے کہ جن حدیثوں میں خدا کے اُترنے اور مرئی ہونے کا ذکر ہے، ان کے معنی یہ ہیں کہ خدا مخلوقات

کی نظر میں ایسا تغیر پیدا کر دے گا کہ وہ خدا کو ایسی حالت میں دیکھیں گے کہ وہ اُتر رہا ہے اور جلوہ دکھا رہا ہے اور اپنے بندوں سے گفتگو اور خطاب کر رہا ہے۔ حالانکہ خدا کی جو شان ہے اس میں نہ تغیر ہوگا نہ خدا منتقل ہوگا۔ اور یہ اس لئے ہوگا کہ لوگ جان لیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سب باتیں بطور تمثیل کے بیان کی گئی ہیں جن سے مقصود کچھ اور ہے۔ لیکن جو شخص صرف اسی احتمال پر بس کرتا ہے میں اس کو اہل حق میں شمار نہیں کرتا۔ امام غزالی نے عذاب قبر کے بیان میں ان تینوں مقامات کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ان تمام واقعات کے ظاہری معنی صحیح ہیں اور ان کے اندرونی اسرار مخفی ہیں۔ لیکن ارباب بصیرت کے نزدیک یہ اسرار فاش اور کھلے ہوئے ہیں تو جن لوگوں پر یہ اسرار فاش نہ ہوں اُن کو ان کے ظاہری معنوں کا انکار مناسب نہیں ہے کہ ایمان کا آخری درجہ تسلیم اور اقرار ہے۔"

اس کے بعد دوسرے متفرق ابواب میں وحی، معراج، رویتِ ملائکہ، ملاقاتِ انبیاءؑ، براق، سدرۃ المنتہیٰ وغیرہ سب کی تشریح اسی عالم میں کی ہے۔ ہم نے آگے چل کر ایک باب عالمِ رویا کا قائم کیا ہے۔ اس میں دکھایا ہے کہ اس اصول کی صحت پر آیات و احادیث سے استناد ہو سکتا ہے۔

ان تمام نظریات پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا درجہ دلائل و براہین کا نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ان میں سے ہر نظریہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ بظاہر ان چیزوں کے تسلیم کرنے میں عقل کو جو استحالہ یا کم از کم استبعاد نظر آتا ہے، وہ کم یا دور ہو جائے۔ اس لئے ہر گروہ نے اپنے اپنے ذوق اور طریقِ فکر کے مطابق اپنے تجربیات اور مشاہدات کے ذریعہ سے ایک ایسا تمثیلی نظریہ قائم کیا ہے جس پر قیاس کر کے وہ باتیں جو تجربہ

مشاہدہ سے ماوراء ہیں، ان کا کچھ دھندلا سا خاکہ ذہنِ انسانی میں قائم ہو جائے کہ وہ ان کے انکار و استبعاد کی جرأت نہ کر سکے اور قلبِ بدگمان اور عقلِ نارسا کسی قدر تسلی پا سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ شاہد سے غائب پر، محسوسات سے غیر محسوسات پر، تجربیات سے ناممکن التجربہ حقائق پر، جسمانی قوانینِ فطرت سے روحانی خصائص پر استشہاد کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ع

کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

معجزات

ہمارے متکلمین کے نزدیک معجزہ وہ امر ہے جس کو اللہ تعالےٰ کسی پیغمبر کے دعویٰ کی صداقت کے لئے دنیا پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ خارق عادت ہو تو گویا معجزہ کی عام تعریف یہ سمجھنی چاہیئے کہ معجزہ اس خارقِ عادت چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لئے صادر ہو۔ اب معجزہ کے ثبوت میں اصل اشکال جو پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ عالمِ کائنات ایک نظامِ خاص پر قائم ہے۔ ہر شئے کی ایک علّت اور ہر حادثہ کا ایک سبب ہے۔ علّت اور سبب کے بغیر کوئی شئے پیدا نہیں ہوتی۔ علّت و معلول کا جو سلسلہ اشیاء میں نظر آتا ہے ان میں باہم اس قدر لزوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے منفک نہیں ہو سکتے۔ ہر شے میں ایک خاصیت ہے جو اس سے الگ نہیں ہو سکتی اور نیز جس شے میں جس چیز کی خاصیت نہیں ہے، اُس کا اُس سے صدور بھی نہیں ہو سکتا۔ آگ جلاتی ہے۔ سمندر بہتا ہے۔ درخت ساکن ہے۔ پتھر چلتا نہیں۔ سُورج میں نور ہے۔ کنکر بولتے نہیں۔ سنکھیا زہر قاتل ہے۔ انسان مر کر پھر جیتا نہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آگ نے جلایا نہیں۔ سمندر دفعتہً تھم گیا۔ درخت چلنے لگا۔ پتھر حرکت کرنے لگا' آفتاب میں سیاہی آگئی۔ زہر کھا کر آدمی مرا نہیں اور انسان مر کر ایک اشارہ سے پھر جی اُٹھا تو درحقیقت وہ اس

پورے نظامِ فطرت کو جس پر دنیا قائم ہے درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ علل واسباب کے تار و پود کو بکھیر دینا چاہتا ہے، اور اشیاء کے اُن طبائع اور خواص کے علانیہ انکار پر آمادہ ہے جو بارہا کے تجربے سے ثابت ہو چکے ہیں اور جن میں کبھی تخلف نہیں ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظامِ فطرت، یہ سلسلہ علل واسباب، یہ طبائع اور خواص اس درجہ ناقابلِ تنسیخ ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تغیر و تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ اور حکماء کے ایک گروہ کے نزدیک یہ نظام، یہ سلسلہ، یہ اصول ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ حکمائے اسلام کا گروہ (مثلاً فارابی، ابنِ سینا، ابنِ مسکویہ وغیرہ) اس بات کا قائل ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اس نظامِ فطرت اور سلسلۂ علل واسباب میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور نہ دنیا میں کوئی شے بغیر علتِ عادیہ اور سببِ طبعی کے پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ معجزات اس نظام و سلسلہ سے الگ ہیں اور وہ فطرت کی قانون شکنی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ بھی علل واسبابِ طبعی کے نتائج ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہم ان علل واسباب کے احاطہ سے اب تک قاصر ہیں۔ اور وہ اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں۔ ممکن ہے کہ تحقیقاتِ انسانی کا دائرہ کبھی اتنا وسیع ہو جائے کہ ان کے علل واسباب ہمارے فہم میں آجائیں۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ عالم میں ایک خاص نظامِ فطرت، موجودات میں سلسلۂ علل و معلولات اور اشیاء میں طبائع و خواص ہیں۔ لیکن ہم اُن کی اس درجہ ہمہ گیری کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کسی حال میں اور کسی طریق سے شکست نہیں ہو سکتے۔ آج تک ہمارا علم یہ ہے کہ نباتات دانہ سے، پرندے انڈے اور حیوانات نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ممکن ہے کہ کل وہ ان بیج کے وسائط اور ذرائع کے بغیر دفعتہً پیدا ہو جائیں۔ غرض یہ کہ خرقِ فطرت کلیتہً محال نہیں ہے۔ اشاعرہ اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نہ تو عالم میں حقیقتہً قوانینِ فطرت ہیں۔ اور نہ خود اشیا کے اندر خواص ہیں۔ بلکہ ہر شے سے جو فعل سرزد ہوتا ہے اس کو

درحقیقت اللہ تعالیٰ اسی وقت اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ اشاعرہ کے اس عقیدہ کا نہ صرف مدعیان عقل نے بلکہ اربابِ ظواہر[1] تک نے مضحکہ اڑایا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خیال ایسا نہیں ہے کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

فلاسفہ اور حکما کی وہ جماعت جو قوانینِ فطرت کے ناقابلِ شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور اس بنا پر معجزات وخوارق سے قطعی انکار کرتی ہے، امام رازی نے لکھا ہے[1] کہ گو خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے۔ مگر وہ متعدد ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بنا پر خوارق فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لئے لازم ہو جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ وہ "تولد ذاتی" کے قائل ہیں۔ یعنی یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظامِ خاص کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدتِ حمل کے اندر وہ شکمِ مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک متعین زمانہ کے بعد وضعِ حمل ہوتا ہے۔ پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند، قوی ہیکل، ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہ دفعتہً ان بیچ کی منازل کو طے کئے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں۔ یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لے کر اس کے عالمِ شباب کے عہد تک اس مجموعۂ عناصر کو جو سالہا سال صرف کرنے پڑے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لئے ایک خاص قسم کے اعتدالِ ترکیب کی ضرورت تھی۔ جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا۔ حیات پیدا ہو گئی۔ اس بنا پر اگر کسی مجموعۂ عناصر

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے ردِ منطق میں، ابن حزم ظاہری نے فصل فی ملل والنحل میں اس کی پُرزور تردید کی ہے۔ اردو کے جدید علم کلام کے بانیوں نے بھی اس کا کچھ کم مذاق نہیں اڑایا۔ استاد مرحوم نے تو تقریباً اپنی ہر کلامی تصنیف میں اشاعرہ کے اس خیال کو "حماقت" سے تعبیر کیا ہے [1] مطالب عالیہ بحث (نسخہ قلمی موجود دار المصنفین)، و تفسیر کبیر سورۂ اعراف۔

ہیں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیات انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ حمل، خون، گوشت، وضع حمل، شیر خوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے، اچھا خاصا ایک نوجوان مٹی کے تپلہ سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جاندار اور ذی روح بن جاتے ہیں اسی کا نام "تولدِ ذاتی" ہے۔

اس تفصیل کی بنا پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ذی روح کی پیدائش کے لئے دنیا میں جو سلسلۂ اسباب عادۃً جاری ہے اس کے خلاف ہو سکتا ہے۔ تو پھر عصا سانپ بھی ہو سکتا ہے، مُردے زندہ بھی ہو سکتے ہیں، پہاڑ سونا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے۔ تولدِ ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیج کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

۲۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو کچھ حوادث ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مادّہ، (ہیولی) ہی کے تغیرات کے نام ہیں۔ مادّہ (ہیولیٰ) اس تمام عالمِ عنصری کا ایک ہی ہے۔ اس بنا پر عالم میں انواع، اشکال اور خواص کے یہ لاکھوں اور کروڑوں تنوّعات اور اختلافات جو ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا سببِ مؤثر اگر بالفرض خود مادّہ ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ تمام دنیا میں ایک ہی شکل اور ایک ہی خاصیت ہو تو تم کہو گے کہ یہ اختلاف و تنوّع مادّہ کے اختلافِ استعداد سے پیدا ہوا لیکن استعداد تو تاثر اور انفعال کا نام ہے۔ علّتِ فاعلہ اور سببِ مؤثر کیا ہے؟ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اجرامِ فلکیہ کی گردش اور رفتار ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ بھی تسلیم کرتے

ہیں کہ اجرامِ فلکی کی اس گردش و رفتار اور اختلافِ اشکال کی نہ کوئی حد و نہایت ہے اور نہ وہ کسی قانونِ فطری کے ماتحت ہیں اور نہ اُن کا علم ہم کو ہو سکتا ہے۔ تو اس اصول کے صحیح باور کر لینے پر عجائبِ قدرت اور خوارقِ فطرت کی وہ کونسی مثال ہے جس کے محال ہونے کا دعویٰ وہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یا تو وہ کسی سببِ مؤثر کی بنا پر ہوتا ہے یا بلا سببِ مؤثر کے ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں خرقِ عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر یہ کہئے کہ یہ حوادث بلا سببِ مؤثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں تو گویا آپ نے خود خرقِ عادت کو تسلیم کر لیا۔ پھر دنیا میں کوئی عجیب سے عجیب اور مستبعد سے مستبعد بات بھی ناممکن نہیں رہتی۔ اور اگر یہ کہئے کہ یہ سبب مؤثر کے نتائج ہیں تو دو حال سے خالی نہیں یا یہ سببِ مؤثر صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور یہ تمام حوادث و تاثیرات اس کے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث و تاثیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطرارانہ طبعی طور سے سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک۔ پہلی صورت میں معجزات اور خوارق کے صدور میں کوئی استحالہ نہیں۔ کیونکہ اس مدبر و مؤثر کا جب جیسا ارادہ ہو وہ شئے اسی طرح واقع ہوگی۔ کوئی اس کا مانع نہیں۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مؤثرِ عالم سے زمانۂ قدیم سے ایک ہی طور پر سرزد ہوتی چلی آتی ہیں جیسے آفتاب سے روشنی۔ ایسی حالت میں ایک عالم واحد قدیم ازلی سبب و مؤثر سے یہ ہر نئی آن اور نئے لمحہ میں نئی نئی اور مختلف شکل و صورت اور خواص کی اشیاء کیونکر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ آپ کہیں گے کہ علت تو بے شک واحد قدیم ہے مگر علت کے وجود کے ساتھ معلول میں بھی تو استعداد اور قبولیت کا مادہ پیدا ہونا چاہیئے۔ مادہ میں یہ استعداد و صلاحیت گردشِ فلکی کے مختلف اشکال کا نتیجہ ہے۔ لیکن ابھی

یہ کہا جا چکا کہ آپ کے نزدیک اشکالِ فلکی کی نہ تو کوئی حد و پایاں ہے اور نہ وہ کسی خاص قاعدہ اور اصول کے اندر محدود ہیں۔ اس بنا پر حوادثِ عالم کے اختلاف اور نیرنگی کا باعث اگر گردشِ فلکی کا اختلاف اور نیرنگی ہے تو ایسی صورت میں یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ جو چیز آپ کو بظاہر خلافِ فطرت اور خلافِ عادت معلوم ہوتی ہے وہ کسی خاص شکلِ فلکی کا نتیجہ ہو۔

گذشتہ تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے معجزات کے امکان پر حسبِ ذیل دلائل قائم کئے ہیں:۔

(۱) تاثیراتِ فلکیہ۔ معجزات کے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لئے کوئی مادّی علت ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے اور ہم تمام معمولات کی تشریح مادّی اور طبعی علل و اسباب سے کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حکماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ گردشِ افلاک اور گردشِ نجوم کا اس دُنیا کے حوادث پر بہت بڑا اثر ہے اور قوائے فلکی اس عالم کے واقعات میں مؤثر ہوتے ہیں ایسی صورت میں اگر کسی بظاہر عجیب و غریب شئے کی تعلیل ہم مادّی و طبعی علل و اسباب سے نہیں کر سکتے تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ اس کے اسباب فلکی و سماوی ہوں۔

(۲) علل خفیہ۔ یہ ہم کو تسلیم ہے کہ تمام حوادث کسی نہ کسی سببِ طبعی کی بنا پر ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سببِ طبعی ہمارے علم و فہم میں آجائے۔ دُنیا میں بیسیوں اسرارِ قدرت ہیں جن کی اب تک تحلیل نہیں ہو سکی ہے۔ اس بنا پر ممکن ہے کہ معجزات بھی اسبابِ طبعی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہوں لیکن ان کے اسباب و علل اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہوں۔ مثلاً یہ کہ انبیاءؑ نے چالیس دن تک ایک ساتھ روزہ رکھا اور اس مدت میں ایک دانہ بھی انہوں نے نہیں کھایا۔ لیکن بایں ہمہ اُن کی قوتِ جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ بظاہر عجیب بات ہے، مگر سببِ طبعی سے الگ نہیں ہے۔ ہم کو کیوں بھوک لگتی ہے؟ اس لئے کہ ہمارے

قوائے معدہ غذا کو مضم کر لینے کے بعد اس کے خون کو جسم کے مختلف حصّوں میں پہنچا دیتے ہیں تو ان کے لئے پھر کوئی کام باقی نہیں رہتا اور ان کو کام کی تلاش ہوتی ہے۔ لیکن ہم روز مرہ دیکھتے ہیں کہ بیماری کے سبب یا خوف طاری ہو جانے کے باعث سے یا کسی غم کے سبب سے جسم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کئی کئی روز تک معدہ کے قویٰ معطّل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنا کام انجام نہیں دیتے۔ اس لئے اس کو بھوک بھی نہیں لگتی۔ اس بنا پر اگر یہی حالت کسی نفس کی اس بنا پر ہو جائے کہ اس کو روحانیت کے ساتھ شدّتِ انہماک اور جسمانیات سے قطع علائق ہو گیا ہے تو اس کے قوائے جسمانی بھی معطّل ہو سکتے ہیں اور وہ مدّت تک فاقہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے معجزات کی تشریح بھی کی جا سکتی ہے۔

(۳) قوّتِ کمالیہ۔ اس عالم میں جس قدر انسان ہیں، ان کی نفسانی خصوصیات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو عجیب و غریب اختلافات نظر آتے ہیں۔ ایک بلید الفہم اور کودن ہے تو دوسرا زیرک اور ذی فہم ہے۔ ایک کو بولنے کا شوق ہے تو دوسرے کو سُننے کا، ایک علم کا عاشق ہے تو دوسرا اس کا دشمن۔ ایک کے علوئے ہمّت اور بلند حوصلگی کے سیلاب کے سامنے مشکلات کے بڑے بڑے پہاڑ بھی خس و خاشاک ہیں۔ دوسرا اتنا پست ہمّت اور ضعیف الارادہ ہے کہ وہ تنکے کو بھی پہاڑ جانتا ہے۔ ایک اس قدر قوی الحافظہ ہے کہ معمولی سی معمولی بات بھی اس کے ذہن کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتی۔ دوسرے کو موٹی موٹی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ پھر علم و فن کے عشّاق میں بھی کسی کو ادبیات سے لگاؤ ہے، کسی کو عقلیات کا چسکا ہے، کسی کو منقولات میں مزہ ملتا ہے۔ قوّت شہوانیہ کے لحاظ سے دیکھو تو کسی کو سواری کا شوقین پاؤ گے، کسی کو لباس و پوشاک اور وضع و قطع کا، کسی کو کھانے پینے کا۔ ایک کو صرف دولت جمع کرنے میں مزہ ملتا ہے تو دوسرے کو اس کے اُڑانے میں لُطف حاصل ہوتا ہے۔ کوئی طبعاً حلیم ہے تو دوسرا سرتا پا غضب کا شعلہ۔ ایک خلقی طور سے قانع

ہے تو دوسرا حریص اور طمّاع کوئی بد زبان ہے مگر بدکردار نہیں، دوسرا بظاہر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہے مگر بباطن سنایت بداطوار اور خفیف الحرکۃ ہے۔ ان میں سے ہر وصف و خاصیت کے بھی سینکڑوں مدارج اور مراتب ہیں۔ الغرض صفات و خواص نفسانی کے مظہر اس قدر گوناگوں اور بوقلموں ہیں کہ وہ حصر و تحدید میں بھی نہیں آسکتے۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک انسان کے نفس میں جو خصوصیات ہیں، ان کے مطابق جو اعمال و آثار اس سے صادر ہوتے ہیں ان پر اس کو مطلق تعجب نہیں آتا۔ لیکن دوسرے اعمال و آثار جن کے خصائص اس کے نفس میں نہیں ہیں، ان پر اس کو سخت تعجب آتا ہے۔ بلکہ اگر ان اشخاص کو اس نے خود دیکھا نہ ہو تو اس کو ان خصائص کا یقین مشکل سے آئے گا۔ ایک بخیل کے نزدیک بذل و کرم کی راہ میں تمام گھر بار لٹا دینا ایک مافوق البشریۃ کارنامہ ہے۔ ایک دنیا دار جاہ پسند اور حریص آدمی کو ایک زاہد قانع اور متواضع آدمی کو دیکھ کر تعجب آتا ہے۔ معمولی حافظہ والوں سے کوئی کہے کہ امام بخاری کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں اور اندلس کے ایک نابینا ادیب کو آغانی کی بیس جلدیں نوکِ زبان تھیں تو اس کو یقین نہیں آئے گا۔ تیمور، بابر، ہنیبال اور نپولین کی قوتِ عزم و ارادہ کے قصّے کمزور اور ضعیف ارادہ کے آدمیوں کو معجزہ معلوم ہوں گے۔ ایک کمزور ارادہ کا آدمی خود اپنی اولاد و اہل و خدام کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ لیکن غیر معمولی عزم و ارادہ کے لوگ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں پر اس طرح استیلا حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ اس کے ہاتھ میں پیکرِ بے جان بن جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے خصائص کے اختلاف کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تمام نفوسِ انسانی کے اتحادِ ماہیت کے باوجود یہ اختلافات کہاں سے آئے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر نفس کی جوہریت دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لئے ایک سے جو خصوصیات اور افعال صادر ہوتے ہیں وہ دوسرے سے نہیں ہوتے یا یہ کہ ہر جسم کی ترکیبِ عنصری میں اختلافِ مزاج ہے۔ جس کے سبب سے ایک کی خصوصیات

دوسرے سے نہیں ملتیں۔ بہر حال ان دو میں سے جو پہلو بھی اختیار کیجئے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ممکن ہے کہ بعض ایسے نفوس بھی ہوں، جن کی روحانی یا جسمانی قوت میں کوئی خاص ایسی بات ہو جس کی بنا پر ان سے عجیب و غریب اعمال اور تصرفات صادر ہوتے ہیں جن کا صدور عام انسانوں کی روحانی و جسمانی قوت سے باہر ہے اور اس لئے وہ ان کو مستبعد اور ناقابلِ فہم نظر آتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک بلید کو ایک ذی فہم کے افعال پر، ایک ضعیف الحافظہ کو ایک قوی الحافظہ کی قوت پر، ایک طماع و حریص کو ایک قانع و زاہد کے حالات پر، ایک کمزور اور ضعیف الارادہ کو قوی الارادہ اور مستحکم العزم پر تعجب آتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نفوس جن میں معجزات کی یہ قوت ہے، نادر الوجود ہیں۔ اس لئے عموماً ان کے خصائص اور آثار پر تعجب اور استبعاد بھی معمول سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) قوتِ نفسیہ۔ ہر انسان اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے۔ گویا ایک قوت ہے جو اس کے تمام قالبِ جسمانی پر مسلط ہے۔ اور یہ جسم اس کے امر و ارادہ کے ماتحت اس کے حکم کو اس طرح بجا لاتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا۔ یہ تصرف اور عمل ہر نفسِ انسانی اپنے جسم کے اندر کرتا ہے اور یہ معمولی اور ادنیٰ نفوس کی قوت کی نیرنگی ہے۔ لیکن جو نفوس ان سے زیادہ طاقتور ہیں وہ اپنے جسم کے باہر دوسرے نفوس اور اجسام کو بھی اپنا مطیعِ فرمان کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے جن کو کمال کا معجزانہ حصہ ملا ہے۔ ان کے لئے یہ سارا مادی عالم مثل جسم کے ہوتا ہے اور وہ اسی طرح اس عظیم الشان جسم میں تصرف کرنے لگتے ہیں جس طرح معمولی انسان اپنے جسم میں کرتے ہیں۔

(۴) تاثیراتِ نفسانیہ۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نفسِ انسانی میں جو جذباتی تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے جسمِ مادی کو متاثر کر دیتے ہیں۔ رات کوئی چیز دیکھی اور اس کا ہیبت ناک

تصوّر کیا اور گھبرا کر چیخ اُٹھا یا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کسی درخت کی پتلی شاخ پر چڑھتے یا چھت کی منڈیر یا پتلے تختہ کے پُل پر سے گذرتے ہوئے خوف طاری ہُوا، ہاتھ پاؤں میں لغزش ہوئی اور آدمی گر پڑا۔ غصّہ سے آدمی کا چہرہ سُرخ اور خجالت و شرمندگی سے زرد پڑ جاتا ہے۔ آدمی نے کسی ناگوار واقعہ کا تخیّل کیا۔ غصّہ آگیا۔ غصّہ سے بدن میں گرمی پیدا ہوگئی اور گرمی سے پسینہ آگیا۔ محض وہم سے آدمی ڈر جاتا ہے بلکہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی مَر جاتا ہے۔ ان تمام واقعات میں دیکھو کہ نفسانی اثرات مادّی جسم کو متاثر کر دیتے ہیں۔ یہ تو کمزور نفوس کا حال ہے۔ لیکن جو لوگ کہ اربابِ نفوسِ قدسیہ ہیں۔ وہ اپنے نفسانی اثرات سے دوسرے اجسام کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اور ان میں عجیب عجیب تغیّرات اور تصرّفات کر سکتے ہیں۔

یہ آخری دلیلیں بعینہٖ وہی ہیں جو آج ہپنوٹزم (تقویم مقناطیسی) اور مسمرازم کے نام سے لوگ پیش کرتے ہیں۔

معتزلہ اور اشاعرہ دونوں فطرت شکنی اور خرقِ عادات کو تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں تک ہم ان کی عبارتوں سے سمجھ سکتے ہیں اس نتیجہ میں دونوں کا اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اصل نظریہ میں ہے۔ معتزلہ یہ سمجھتے ہیں کہ خاصیت واثر، علّیت و معلولیّت و سببیّت نفسِ اشیا میں ہے۔ یعنی خود اشیاء کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو ایک کو علّت و سبب اور دوسری کو معلول و مسبّب بناتی ہے۔ آگ کی طبیعت میں جلانا اور برف کی طبیعت میں ٹھنڈک پیدا کرنا ازل سے اللہ تعالےٰ نے رکھ دیا ہے۔ اسی کا نام طبیعت ہے۔ جس سے اس خاصیت کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے معتزلہ سمجھتے ہیں کہ آگ سے سوزش اور برف سے ٹھنڈک کا جو صدور ہوتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ نفسِ آگ یا برف کی طبیعت میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آگ میں سوزش اور برف میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ اور جب کوئی معجزۂ نبوی ظاہر ہوتا ہے

تو یہ طبیعت یا اس کی خاصیت تھوڑی دیر کے لئے بدل دی جاتی ہے۔ یا روک دی جاتی ہے۔

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ خود اشیا کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک علت وسبب اور دوسرا معلول ومسبّب ہو۔ نفسِ آگ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ہم گرمی کا سبب قرار دیں۔ اور نہ نفسِ برف کے اندر ٹھنڈک طبیعت کے طور پر موجود ہے۔ بلکہ مختلف اشیاء کے متعلق ہم کو جو مختلف احساسات ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی سے گرمی، کسی سے سردی، کسی سے سختی، کسی سے نرمی، کسی سے جلن، کسی سے ٹھنڈک، یہ ہمارے ذاتی احساسات ہیں جن کو ہم حسبِ ارادۂ الٰہی اشیا میں محسوس کرتے ہیں۔ ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ ہم ایک شئے کے بعد دوسری شئے کو ہوتے ہوئے جب دیکھتے ہیں تو ہم ایک کو علت اور دوسری کو معلول سمجھنے لگتے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں علت ومعلول میں لزوم کا کوئی طبعی تعلق نہیں۔ اگر ارادۂ الٰہی بدل جائے تو ہم آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی محسوس کرنے لگیں۔ نفسِ آگ اور برف کی طبیعت میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس تغیر کو محال قرار دے اور اس لئے حسبِ ارادۂ الٰہی معجزات کا صدور ہوا کرتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا اصل بانی جہم ہے۔ جس کے انتساب سے فرقۂ جہمیہ قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد ابوالحسن اشعری نے اس کی پیروی کی۔ علامہ موصوف نے مسئلۂ مذکور کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:۔

لکن من لا یثبت الاسباب و	لیکن متکلمین میں جو لوگ اسباب وعلل
العلل من اھل الکلام کالجھم	کے منکر ہیں جیسے جہم اور اس مسئلہ میں جہم کے
وموافقیہ فی ذٰلک مثل ابی الحسن	جو موافق ہیں جیسے ابوالحسن اشعری اور
الاشعری واتباعہ یجعلون	ان کے پیرو، وہ یہ مانتے ہیں کہ ہم کو صرف

المعلوم اقتران احد الامرين بالآخر لمحض مشيئة القادر المريد من غير ان يكون احدهما سببًا للآخر ولا مولدًا له .

یہ معلوم ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ایک لگاؤ اور علاقہ ہے اور یہ لگاؤ اور علاقہ صرف اُس قادر و ذی ارادہ کی مشیّت سے ہے، بغیر اس کے کہ ایک دوسرے کا سبب ہو یا ایک دوسرے کو پیدا کرتا ہو۔

واما جمهور العقلاء من المسلمين وغير المسلمين اهل السنة من اهل الكلام والفقه والحديث والتصوف وغيرهم من اهل السنة من المعتزلة وغيرهم فيثبتون الاسباب ويقولون كما يعلم اقتران احدهما بالآخر يعلم ان في النار قوة تقتضي الحرارة وفي الماء قوة تقتضي البرودة وفي العين قوة تقتضي الابصار وفي اللسان قوة تقتضي الذوق ويثبتون الطبيعة التي تسمى الغريزة والنجرة والخلق والعادة ونحو

جہمیہ اور اشاعرہ کے علاوہ اور تمام عقلاءِ مسلمان یا غیر مسلمان، مسلمانوں میں اہلِ سنت ہوں خواہ وہ متکلم ہوں اہلِ فقہ ہوں، اہلِ حدیث ہوں، اہلِ تصوف ہوں اور غیر اہلِ سنت میں معتزلہ ہوں یا کوئی اور فرقہ ہو۔ یہ سب لوگ اسباب کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کو یہ معلوم ہے کہ ایک کا دوسرے سے لگاؤ اور علاقہ ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ آگ میں ایک قوت ہے جو گرمی کو چاہتی ہے اور پانی میں ایک قوت ہے جو ٹھنڈک کو مقتضی ہے اور اسی طرح آنکھ میں ایک قوت ہے جو رویت کا باعث ہے اور زبان میں ایک قوت ہے جو مزہ پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ طبیعت کو ثابت کرتے ہیں۔ جس کا دوسرا نام فطرت، خلقت، عادت،

ذٰلك من الاسماء۔ وغیرہ ہے۔

اوپر خرقِ عادت کے امکان کے متعلق چار مذہب ہم نے نقل کئے ہیں۔ یہی مذاہب آج بھی فلسفہ کی مملکت میں قائم ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس باب میں صرف دو ہی مذہب ہو سکتے ہیں۔ ایک اُن لوگوں کا جو کسی نہ کسی طرح سے باریٔ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں اور دوسرا ان لوگوں کا جو اس کے یکسر منکر ہیں۔ دوسرا گروہ حکمائے طبیعیین کا یا مادہ پرستوں کا ہے جن کے نزدیک عالمِ مادی کے باہر کچھ نہیں ہے اور تمام کائنات ذرّاتِ مادہ کے باہمی تاثیر و تاثر کی جلوہ انگیزیاں ہیں اور سلسلۂ علل و معلول اور اسباب و مسببات اور آثار و خواص کے مظاہر اور نتائج ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کی جماعت معجزہ اور خرقِ عادت پر کیونکر ایمان لا سکتی ہے۔ جو لوگ ان کے سامنے فلسفیانہ حیثیت سے براہِ راست معجزہ اور خرقِ عادت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک بے سود کوشش کرتے ہیں اور اگر عقلی حیثیت سے خرقِ عادت کا ثبوت بھی بہم پہنچ گیا تو جب وہ اس بنیاد کو جس پر نبوت اور شریعت کی عمارت قائم ہے، یعنی ایک برتر خالق قوت کا وجود تسلیم نہیں کرتے تو اس خرقِ عادت کے ثبوت سے اربابِ مذاہب اور پیروانِ شرائع کی کیا مقصد برآری ہو سکتی ہے؟

اشاعرہ نے اثباتِ مدعا کا طریقہ اختیار کرنا چاہا ہے کہ پہلے معجزہ اور خرقِ عادت کا امکان اور وقوع ثابت کیا جائے اور اس معجزہ اور خرقِ عادت سے نبوت پر استدلال کیا جائے۔ نبوت کے ثبوت سے ایک قادرِ مطلق کا ثبوت ہاتھ آئے گا اور پھر اس کے احکام شریعت کا ثبوت بہم پہنچے گا۔ اس طریقۂ استدلال کو اختیار کرنا درحقیقت اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ ع

ایں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

صحیح راستہ ان کے مقابلہ میں یہ ہے کہ پہلے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا جائے۔ اس

کے بعد نبوت، شریعت، خرقِ عادت، معجزہ سب کچھ ثابت ہو جائے گا۔ جب تک اس چٹان پر بنیاد قائم نہ ہوگی عمارت مستحکم نہیں ہو سکتی۔

اسبابِ خفیہ کی توجیہ بے کار ہے دوسرا فرقہ باری تعالےٰ کے وجود کا قائل ہے اور معجزہ کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ وہ اس کے وقوع کے کچھ ہی اسباب بیان کرے۔ وہ درحقیقت خرقِ عادت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ یا اس کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور اِس سے اُس کو کوئی چارہ نہیں۔ حکمائے اسلام فارابی اور ابنِ سینا وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ معجزہ اسبابِ خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے اور اس کے اندرونی طبعی علل واسباب ہوتے ہیں۔ اس لئے خرقِ عادت لازم نہیں آتا اور معمولی نظامِ عالم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ میں بحرِ قلزم (ریڈ سی) حائل تھا۔ حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو۔ دفعتہً دریا خشک ہو گیا اور راستہ پیدا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر اُتر گئے۔ لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب کر مر گیا۔ وہ اس کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ دریا میں مدِ جزر تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تو جزر تھا اور دریا پایاب ہو گیا تھا۔ اور جس وقت فرعون دریا میں داخل ہوا، مد شروع ہو گیا اور وہ ڈوب گیا۔ ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہہ پر وارد ہوتے ہیں کہ توراۃ اور قرآن مجید نے اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے، نظر انداز کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہو گیا۔ آیا یہ اتفاقی امر تھا اور ممکن تھا کہ اس کے برعکس ہوتا کہ یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈوب جاتے اور یا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے جزر اور فرعون کے لئے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا۔ یا ایسے اسباب بہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزر کے وقت پہنچیں اور فرعون مد کے وقت پہنچے اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی

گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھتے۔ پہلی صورت میں تو معجزہ کیا نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے اور دوسری صورت میں خرقِ عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں۔ اور خرق عادت کے تسلیم کر لینے کے بعد خدا کی قدرتِ مطلقہ پر بھی ایمان لانا ہوگا۔

حکمائے اسلام کی غلطی کا سبب اصل یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے ارسطو کی تقلید کی ہے۔ اور مسئلہ علت میں تمام تر مشائیہ کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے کہ ذات واجب الوجود علت اولیٰ یا عقلِ اوّل کی علتِ تامہ ہے اور علتِ تامہ سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا اور اضطراراً اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں اس کے ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کی صحیح مثال آفتاب اور روشنی کی ہے کہ آفتاب کی روشنی علتِ تامہ ہے جب آفتاب نکلے گا روشنی کا ظہور ہوگا۔ خواہ وہ موانع کی وجہ سے کبھی ہم کو نظر نہ آئے اور آفتاب سے اس روشنی کا صدور آفتاب کے قصد اور ارادہ سے نہیں ہے بلکہ اس سے مجبوراً اور اضطراراً یہ روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ عقلِ اوّل کے پیدا ہونے کے بعد عالم کائنات کا تمام کارخانہ باہمی سلسلۂ علل و معلول سے خود بخود پیدا ہونے لگا۔ اور تمام عالم ایک ایسے نظام میں بندھ گیا کہ اب خالقِ اوّل کو اس میں دست اندازی کی مطلق قدرت ہی نہیں۔ کی توجیہ ظاہر ہے کہ اس مذہب کا پیرو سلسلۂ علل و معلول کو نہیں توڑ سکتا اور اس لئے وہ خرقِ عادت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی ظاہری سلسلۂ علل و معلول سے نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے وقوع سے کوئی انکار کر سکتا ہے اس لئے ایک طرف اس کو لامحالہ ان واقعات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے[1] اور دوسری طرف چونکہ

---

[1] حکمائے اسلام میں مسئلہ خرقِ عادت کا سب سے بڑا منکر بوعلی سینا ارشادات میں لکھتا ہے:

ولکنها تجارب لما ثبتت طلب	لیکن یہ تجربے ہیں جب وہ ثبوت کو پہنچ
اسبابها ثم انی لو اقتصصت	گئے تو ان کے اسباب کی تلاش ہوئی

(بقیہ اگلے صفحے پر)

وہ خدا کو مضطر اور مجبور مان چکا ہے اس لئے براہِ راست ان واقعات کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ بلا سبب اور بے علت کے کوئی شے ہو نہیں سکتی اس بنا پر اسباب و علل خفیہ کے سایہ کے سوا اس کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ مگر آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ یہ مورچہ بھی محفوظ نہیں اور خدا کو سوائے قادرِ مطلق ماننے چارہ نہیں۔

اشاعرہ اور معتزلہ میں نتیجہ کا اختلاف نہیں

اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ صرف نظریہ کا فرق ہے اس سے نفسِ خرقِ عادت اور معجزہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ امر کہ اشیاء کے طبائع میں فی نفسہٖ خواص اور آثار ودیعت ہیں یا اللہ تعالیٰ بروقت ان کو پیدا کر دیتا ہے، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے کسی پہلو کے اثبات اور دوسرے کی نفی پر کوئی دلیل نہیں قائم کی جا سکتی اور معجزہ کے سلسلہ میں ہم کو اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا کوئی پہلو بھی صحیح ہو، بہر حال دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اشیاء کی عادتِ جاریہ کو اللہ تعالیٰ توڑ دیتا اور بدل دیتا ہے۔

خرقِ عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلۂ اسباب و علل پر یقین ہے

الغرض معجزہ بمعنی خرقِ عادت سے صرف اُس فریق کو انکار ہے جو یا خدا کا قطعاً منکر ہے یہ کہ وہ خدا کو قادر و ذی ارادہ نہیں مانتا۔ اور نا قابلِ شکست سلسلۂ علل و معلول کے گورکھ دھندے پر یقینِ کامل رکھتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تمام نظمِ کائنات باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اپنے اس عقیدۂ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتوں کو بھی بلا

(بقیہ حاشیہ) جزئیات هذا الباب فيما شاهدناه وفيما حكى عمن صدقناه لطال الكلام.

اور اگر اس قسم کے جزئیات کا تتبع کریں جو ہم نے خود مشاہدہ کیا یا ان لوگوں سے جن کو ہم معتبر سمجھتے ہیں سنا ہے، تو بہت طول ہو جائے گا۔

دلیل تسلیم کئے بیٹھے ہیں اور اس لئے خرقِ عادت کے قبول کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی۔

سلسلۂ اسباب و علل پر علمِ انسانی کو احتوا نہیں

(۱) گویا انہوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لئے ہیں وہ نظامِ کائنات کے چلانے کے لئے کافی ہیں۔ اس کے لئے کسی اور دست اندازی کی ضرورت نہیں۔

(۲) کائنات کے چہرۂ اسرار کو انہوں نے تمام تر بے نقاب کر لیا ہے اور ہر شے کی علت اور خاصیت انہوں نے دریافت کر لی ہے۔

حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت ہیں۔ اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں زمین نام ایک آبادی کے چوتھائی خشک حصے کے بعض اجزائے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکی ہے۔ اس مبلغِ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

جن چیزوں تک ان کی رسائی ہوئی بھی ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ چیز اس طرح چل رہی ہے لیکن یہ حقیقت کہ وہ کیوں چل رہی ہے اور اگر اس کے خلاف چلے تو کیا استحالہ لازم آئے گا، یہ ایک معمہ ہے اور ہمیشہ معمہ رہے گا۔ اجرامِ فلکیہ اور طبقاتِ ارضیہ کو چھوڑ دو کہ وہ دور ہیں۔ تم یہ کہتے ہو۔ کہ بجلی میں یہ قوت ہے، سنکھیا میں یہ اثر ہے، مقناطیس کا یہ خاصہ ہے۔ لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کیوں ایسا ہے؟ اور نزدیک آؤ۔ اپنے جسم کی دنیا کو دیکھو۔ تم صرف یہ جانتے ہو کہ سانس کی آمد و رفت ہمارے پھیپھڑوں کی حرکت سے ہے۔ نبض کی رفتار قلب کے قبض و بسط کی ڈوری سے وابستہ ہے۔ تمہارا نفس یا ذہن لمحوں میں ہزاروں میل کی خبر لیتا ہے اور خدا جانے عجائباتِ نفسانی کے کیا کیا تماشے دکھاتا ہے، لیکن کوئی یہ حل کر سکا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دل کو کس نے مضطرب بنا رکھا ہے، پھیپھڑوں کی دھونکنی کس

طرح روز و شب مصروفِ عمل ہے، دماغ کے ذہنی افعال کیونکر سرانجام پاتے ہیں۔ جب اتنے قریب کی چیز تمہارے فلسفۂ علل و اسباب کے دائرہ سے باہر ہے تو دور دراز کی اشیاء کی نسبت تمہارا دعوائے علم کس قدر تمسخر انگیز ہے۔

حکماء یعنی سائنٹسٹ علانیہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ صرف "کیسے" کا جواب دے سکتے ہیں "کیوں" کا جواب ان کے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ وہ فلسفی بھی ایک نظامِ خیال پر متفق نہیں ہیں۔ بلکہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ردّ منطق میں لکھا ہے:۔

"فلاسفہ کوئی ایک متحد الخیال جماعت نہیں جس کا علم الہیات و طبیعیات وغیرہ میں کوئی ایک مذہب ہو۔ بلکہ وہ مختلف الخیال فرقے ہیں۔ اور ان کے اندر آراء اور خیالات کا اتنا اختلاف ہے کہ اس کا احاطہ بھی مشکل ہے۔ ان کے باہمی اختلافات تو اس سے بھی زیادہ ہیں جس قدر کسی ایک آسمانی مذہب کے مختلف فرقوں کے اندر ہیں۔"

اس اختلافِ رائے اور اس اختلافِ خیال کی بنا پر کسی فلسفہ کا یہ دعویٰ کہ مذہب کا فلاں مسئلہ فلسفہ کے خلاف ہے اس لئے ناقابلِ قبول ہے کہ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ یہ مسئلہ ہماری رائے یا ہماری جماعت کی رائے کے خلاف ہے۔ اس لئے ناقابلِ تسلیم ہے تو یہ مذہب ہی پر کیا موقوف ہے ہر نظامِ فلسفہ کا قائل دوسرے نظامِ فلسفہ کے بطلان پر اسی زور و قوت سے اس استدلال کو کام میں لا سکتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے جس قدر فرقے (اسکول) اور نظامات (سسٹم) ہیں درحقیقت وہ اسرارِ کائنات کے متعلق ایک مرتب خیال کی کڑیاں ہیں۔ ان مرتب خیال کی کڑیوں کو مان کر جس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے وہ اس کا فلسفہ ہے۔ اسی طرح مذہب بھی اپنا ایک نظامِ خیال رکھتا ہے اور جو لوگ اس نظامِ خیال پر یقین رکھتے ہیں ان کی اس سے تشفی ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر معجزہ کا امکان یا وقوع کسی نظامِ خیال کے خلاف ہے تو یہ نفسِ اختلاف اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ یہ لازم

آئے گا کہ ہر فلسفیانہ مسئلہ اس لئے باطل ہے کہ دوسرے نظامِ فلسفہ کے وہ خلاف ہے۔

نظامِ عالم کے چلانے کے لئے علل و اسباب کے کافی ہونے کے فلسفہ پر یقین رکھنے کے لئے سب سے پہلی بحث آغازِ آفرینش کی آتی ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شے اس سبب سے پیدا ہوئی اور اس شے کی پیدائش کا سبب یہ ہے۔ لیکن کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ مادہ کہاں سے آیا؟ اور اس کے حدوث کا سبب کیا ہوا؟ عناصر کیونکر اور کیوں وجود میں آئے؟ یہ نوع بنوع چیزیں کیونکر بن گئیں؟ ہمارے جواب میں اُن نظریات کا ذکر نہ کیجئے جن کا نام اصولِ ارتقاء اور انتخابِ طبعی وغیرہ ہے کہ ان کی علمی حیثیت مفروضات اور وہمیات سے زیادہ نہیں اور ان کی اخیر سرحد بالآخر لاعلمی اور جہالت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ مادہ کی ابتدائی بنیاد چاہے اربع عناصر کو بتایئے یا جواہر فردہ کو یا سالمات کو یا ایتھر کو یا برق پاروں کو جن کو بھی بتاؤ، لیکن ان کے حدوث کی علت نہیں بتائی جا سکتی اور نہ بتا سکتے ہیں کہ بالآخر وہ کہاں سے آئے؟

اب تو حیوانات نطفہ سے، پرندے انڈے سے اور درخت گٹھلی سے پیدا ہوتے ہیں اور بغیر ان کے اُن کا پیدا ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کا پہلا حیوان، پہلا پرندہ اور پہلا درخت بغیر کسی نطفہ، کسی انڈے اور کسی گٹھلی کے پیدا ہوا یا نہیں؟ اگر ہاں کہتے ہیں تو آپ نے اپنے دعوٰی کے خلاف ایک شہادت قبول کر لی اور اگر انکار کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلا نطفہ، پہلا انڈا اور پہلی گٹھلی انسان، پرندہ اور درخت کے بغیر پیدا ہوئی۔ غرض اس گتھی کو آپ اپنے ناخنِ حکمت سے کسی طرح سلجھا نہیں سکتے اور ناچار آپ کو سلسلۂ علل و اسباب کے مذہب سے برگشتہ ہونا پڑے گا۔

حقیقی علت خدا کی قدرت اور ارادہ ہے

جہاں آپ اپنے سلسلۂ اسباب و علل کو چند قدم بڑھا سکتے ہیں، وہاں بھی بالآخر سپر انگن ہونے سے چارہ نہیں۔ پانی

بادل سے برسا، بادل بخارات سے بنے، بخارات پانی سے اُٹھے جو سورج کی تپش سے گرم ہو کر یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض پانی بخارات سے پیدا ہوا اور بخارات پانی سے پیدا ہوئے۔ اس دور کے عقدۂ لاینحل کو آپ حل کر سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجیے جس کی مشیت اور ارادہ سے سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ اسباب و علل صرف اس کی مشیت و ارادہ کے مظاہر ہیں اور وہ اپنی عادت کے مطابق ایک طریقِ خاص پر اس کو چلا رہا ہے۔ لیکن وہ اس کا پابند نہیں ہے۔ صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی، انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لئے عادت کے خلاف کوئی بات ظہور پذیر کر دی۔ علت و معلولیت کا تعلق جو بظاہر نظر آتا ہے، ہم نے اس کی عادتِ جاریہ کی یک رنگی اور یکسانی سے اس کو سمجھ لیا ہے کہ اس کی عادتِ جاریہ یک رنگی اور یکسانی اختیار نہ کرتی تو مخلوقات اپنے منافع کے حصول اور مضرتوں کے دفع کے لئے پہلے سے کوئی تیاری نہ کر سکتیں۔

مولانا روم اور اسباب و علل اور معجزہ کی حقیقت عارفِ روم نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں ادا کیا ہے:۔

سنتے بنہاد و اسباب و طُرق　　طالبال را زیر ایں ازرق تتق

اللہ تعالیٰ نے آسمان کے ان نیلے پردوں کے نیچے کام کرنے والوں کے لئے علل، اسباب اور عادات مقرر کر دیئے ہیں۔

بیشتر احوال بر سنت رود　　گاہ قدرت خارقِ سنت شود

دنیا کے زیادہ تر واقعات ان ہی عاداتِ جاریہ کے مطابق ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی قدرتِ الٰہی اس عادت کو توڑ بھی دیتی ہے۔

سنت و عادت نہادہ بامزہ　　باز کردہ خرقِ عادت معجزہ

طریق و عادات (یعنی اسباب و علل) کو اس نے خوش آیند بنایا ہے، لیکن پھر معجزہ سے خرقِ عادت بھی کر دیتا ہے۔

اے گرفتارِ سبب! بیروں مپر　　لیک غرقِ آں مسبب ظن مبر

اے وہ جو اسباب و علل کی زنجیر میں گرفتار بے حد سے زیادہ نہ اُڑ اور یہ خیال نہ کر کہ ان اسباب و علل کے بنانے والے کو ہم نے علۃ العلل اور مسبب الاسباب سے کاہو گیا۔

ہر چہ خواہد او مسبّب آورد　　قدرتِ مطلق سببہا بر درد

وہ حقیقی مسبب الاسباب جو چاہے کرے اور اس کی قدرت علی الاطلاق اسباب کو توڑ دے۔

لیک اغلب بر سبب راند نفاد　　تا بداند طالبے جستن مراد

لیکن بیشتر وہ اسباب ہی کے مطابق دنیا کو چلاتا ہے تاکہ کام کرنے والوں کو اپنے حصولِ مقصد کا راستہ معلوم ہو۔

چوں سبب نبود چہ رہ جوید مرید　　پس سبب در راہ می آید پدید

اگر اسباب معلوم نہ ہوں تو کام کرنے والوں کو راہ کیونکر ملے یہی اسباب تو نشانات بن کر نمودار ہوتے ہیں۔

ایں سببہا بر نظرہا پردہ ہاست　　کہ نہ ہر دیدار صنعش را سزاست

یہ ظاہری اسباب نگاہوں کے پردے ہیں۔ کیونکہ ہر آنکھ اس کی صنعت کو نہیں دیکھ سکتی۔

دیدۂ باید سبب سوراخ کُن　　تا حجب را بر کند از بیخ و بُن

اس کے لئے ایسی آنکھ چاہیئے جو اسباب کا پردہ چاک کر دے تاکہ حجابات اُٹھ جائیں

از مسبّب می رسد ہر خیر و شر　　نیست اسباب و وسائط را اثر

درحقیقت ہر نیک و بد اسی اصلی مسبب الاسباب کے یہاں سے پہنچتا ہے اور اس میں ان درمیانی اسباب و وسائط کو دخل نہیں۔

با دو خاک و آب و آتش بندہ اند　　با من و تو مُردہ با حق زندہ اند

ہوا، مٹی، پانی اور آگ سب خدا کے محکوم ہیں یہ ہمارے تمہارے سامنے تو بے جان مگر خدا کے سامنے جاندار ہیں۔

سنگ بر آہن زنی بیرون جہد　　ہم بہ امرِ حق قدم بیرون نہد

جب پتھر لوہے پر مارو تو اس سے آگ نکلتی ہے یہ خدا ہی کے حکم سے اپنا قدم باہر نکالتی ہے۔

آہن و سنگ از ستم بر ہم مزن　　کایں دو می زایند ہم چو مرد و زن

لوہے اور پتھر کو بے فائدہ ایک دوسرے پر مت مارو کہ یہ دونوں نر و مادہ ہیں جو آگ کا بچہ پیدا کرتے ہیں۔

سنگ و آہن خود سبب آمد ولیک　　تو بہ بالاتر نگر اے مرد نیک

پتھر اور لوہا گو یہ دونوں آگ کا سبب ہیں۔ لیکن ذرا اس سے آگے بڑھ کر غور کرو۔

کایں سبب را آن سبب آورد پیش　　بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش

کہ اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب (خدا) نے آگے کر دیا یہ ظاہری سبب خود بخود بلا سبب کب پیدا ہوا ہے۔

آن سبب را آن سبب عامل کند　　باز گاہے بے پرد عاطل کند

اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب نے دنیا میں مؤثر اور عامل بنا دیا ہے پھر جب چاہے وہ اس کو بے اثر اور بیکار کر سکتا ہے۔

واں سببہا کا بنیاراں رہبر است　　آں سبب ہا زیں سببہا برتر است

جو اسباب کہ انبیاؑ کے کاموں میں پیش پیش ہوتے ہیں وہ ان ظاہری دنیاوی اسباب سے بلند تر اور برتر ہیں۔

ایں سبب را محرم آمد عقلِ ما　　واں سببہا راست محرم انبیاءؑ

ان ظاہری علل و اسباب کی محرم تو ہماری انسانی عقلیں ہیں لیکن اُن حقیقی اسباب کے محرم انبیاؑ ہیں۔

چونکہ ظاہر بین انسان ان اسباب و علل کو دیکھ کر اصل علۃ العلل اور مسبب الاسباب کو بھول جاتے ہیں اور وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اس لئے انبیاؑ اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں اور ظاہری علل و اسباب ان کے لئے بے کار کر دیئے جاتے ہیں۔

ہست بر اسباب اسباب دگر　　در سبب منگر دراں افگن نظر

ان ظاہری اسباب کے اوپر حقیقی اسباب بھی کارفرما ہیں۔ ان ظاہری اسباب کو نہ دیکھو حقیقی اسباب پر غور کرو۔

انبیاؑ در قطعِ اسباب آمدند　　معجزاتِ خویش بر کیواں زدند

انبیاؑ قطعِ اسباب کے درپے ہیں اور اپنے معجزات کا جھنڈا انہوں نے مریخ میں گاڑ دیا ہے۔

بے سبب مر بحر را بشگافتند　　بے زراعت چاشِ گندم یافتند

بغیر کسی سبب ظاہری کے انہوں نے سمندر کو شق کر دیا اور کھیتی کے بغیر گیہوں کا خوشہ حاصل کیا۔

جملہ قرآں ہست در قطعِ سبب　　عزِّ درویش و ہلاکِ بولہب

تمام قرآن قطعِ اسباب کے بیان سے بھرا ہے۔ آنحضرتؐ کا غلبہ اور ابولہب کی بربادی بھی اسی طرح ہوئی۔

مرغ بابیلے دو سہ سنگ افگند　　لشکرِ زفتِ حبش را بشکند

پرندے کنکریاں پھینکتے ہیں اور حبش کے سیاہ لشکر کو شکست دیتے ہیں۔

پیل را سوراخ سوراخ افگند　　سنگِ مرغِ کو بیالہ بر زند

یہ کنکریاں جو اوپر سے آتی ہیں ہاتھیوں کے بدن میں چھید کر کے ڈال دیتی ہیں

ہمچنیں ز آغاز قرآں تا تمام　　رفضِ اسباب است و علت والسلام

اسی طرح شروع سے آخر تک قرآن اسباب و علل کے مؤثر حقیقی ہونے کا منکر ہے۔

علت، خاصیت اور اثر کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل علت، خاصیت اور اثر کی تحقیق پر مبنی ہے۔ اشیاء میں جو خواص اور آثار ہیں ان کا علم ہم کو کیونکر ہوتا ہے؟ محض تکرارِ احساس سے جس کا دوسرا نام تجربہ ہے۔

جب ہم آگ کے پاس جاتے ہیں تو گرمی اور سوزش کا احساس کرتے ہیں اور پھر

جب جب ہم آگ کے پاس گئے تو ہم کو اسی قسم کا احساس ہوتا رہا۔ اس سے ہم میں یہ یقین پیدا ہوا کہ آگ کا خاصہ اور اثر گرمی اور سوزش ہے۔ فرض کرو کہ اگر تکرارِ احساس سے یہی تجربہ ہم کو برف سے حاصل ہو جائے تو یقیناً ہم کہہ دیں گے کہ برف کی خاصیت سوزش اور گرمی ہے۔ برف اور آگ دونوں آپ کے سامنے ہیں۔ دونوں کو اچھی طرح غور سے دیکھیے۔ کیا ان کی ذات میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جس کی بنا پر احساس بلکہ تکرارِ احساس سے قبل آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ ایک میں گرمی اور دوسرے میں ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کوئی شخص کافور اور سنکھیا دونوں کی تھوڑی تھوڑی مقدار لاکر رکھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے آپ ان چیزوں سے واقف نہ تھے۔ اب آپ دونوں کو غور سے دیکھیے اور خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھیے۔ سونگھ کر، چکھ کر، چھو کر کسی طرح آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے خواص و آثار کیا ہیں؟ یہ فیصلہ ناممکن ہے جب تک ان کا بار بار تجربہ نہ کیا جائے اور ہر بار کے عمل سے ایک ہی نتیجہ ظاہر نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کے خواص و آثار کا علم صرف یکسانی عمل اور تجربہ پر موقوف ہے۔

عمل کی اسی یکسانی اور تجربہ کی بنا پر ہم علل و معلولات اور اسباب و مسببات کا مسئلہ قائم کرتے ہیں اور اسی کی بنا پر مدعیانِ عقل و دانش وہ صنم کدہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے پرستاروں کے نام نیچری، میٹریلسٹ، مادہ پرست، فطرت پرست اور طبیعی ہیں۔ وہ جب ایک شے سے ایک ہی عمل اور اثر کا بار بار تجربہ کرتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ اُس شے سے اُس خاصیت و اثر کا انفکاک قطعاً محال ہے اور جب ایک شے کے بعد فوراً دوسری چیز پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھتے ہیں اور کبھی اس میں تخلف نہیں پاتے، تو یہ یقینِ کُلّی کر لیتے ہیں کہ دوسری شے معلول و مسبب اور پہلی شے علت و سبب ہے اور یہ کلیہ قائم کر لیتے ہیں کہ گرمی و سوزش کا سبب آگ ہے۔ ٹھنڈک اور برودت کا سبب برف ہے۔ موت کا سبب سنکھیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ

آگ کا خاصہ جلانا، برف کا خاصہ ٹھنڈا کرنا، سنکھیا کا خاصہ انسان کی زندگی کا ختم کر دینا ہے معجزہ کے امکان سے چونکہ ان کے خیال کے مطابق ان آثار و خواص کا انکار یا علل و اسباب کا ابطال لازم آتا ہے یعنی یہ ماننا پڑتا ہے کہ آگ ہو اور جلائے نہیں، سمندر ہو اور غرق نہ کرے۔ اس لئے وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معجزہ قطعاً محال ہے۔

اسباب و علل محض عادی ہیں لیکن ابھی ثابت ہو چکا کہ ہم جن کو آثار و خواص یا اسباب و علل کہتے ہیں محض اس تجربہ پر ان کی بنیاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس شے کو ہوتے دیکھا ہے اور اس سے یہ توقع یا زیادہ سے زیادہ ظنِ غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ بھی جب یہ شے پیدا ہوگی تو اس کے بعد دوسری شے پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اس سے یہ یقین کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا اور ہمارے علاوہ شروع سے آج تک اور جن جن لوگوں نے اس کو دیکھا ہے ان کے مشاہدہ کا بھی یہی نتیجہ نکلا گیا اور آئندہ بھی اُن کے مشاہدہ کا یہی نتیجہ نکلا کرے گا۔ آج تک آگ کے متعلق اور جن آگوں کے متعلق آپ کا جو تجربہ ہے اس پر آپ یقین کر سکتے ہیں۔ لیکن محیطِ ارض کی ہر آگ کے متعلق جو آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے اور نہ آسکتی ہے، یہ کیونکر یقین پیدا کر سکتے ہیں کہ ان سب کا اثر جلانا ہی ہے اور نیز یہ اعتماد کس مقدمۂ یقین پر قائم کر لیتے ہیں کہ آئندہ تا قیامت آگ کا عمل و اثر ہمیشہ جلانا ہی رہے گا اور جب آپ کے اس یقین و اعتماد کے لئے کوئی دلیل قائم نہیں ہے تو چند آگوں کو دیکھ کر آپ اس قضیۂ کلیہ پر کیونکر ناقابلِ شکست یقین کی مہر لگا دیتے ہیں کہ دنیا کی ہر آگ جلاتی ہے اور ہمیشہ جلاتی رہے گی۔

اسبابِ عادیہ کا علم صرف تجربہ سے ہوتا ہے۔ غرض خواص و آثار اور اسباب و علل کی نسبت علمِ انسانی کا جہاں تک احاطہ ہے وہ صرف یکسانی عمل اور تجربہ کا نتیجہ ہے۔

ہم ایک شئے کے بعد دوسری شئے کو ہوتے ہوئے دیکھتے آئے ہیں۔ اس لئے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آیندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم ایک شخص کو آغازِ عمر سے دیکھتے آئے ہیں کہ وہ فلاں وقت سوتا ہے۔ فلاں وقت جاگتا ہے۔ مسجد میں فلاں دروازہ سے داخل ہوتا ہے۔ کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا ہے۔ سالہا سال کے مشاہدہ اور تجربہ کے بعد ہم اس کے متعلق بطریقِ ظنِ غالب خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس وقت اتنے بجے ہیں، اس لئے وہ اُٹھا ہوگا۔ اتنے بج کر اتنے منٹ آئے ہیں، اس لئے وہ سو گیا ہوگا۔ آج جب وہ نماز کے لئے جائے گا تو فلاں دروازہ سے داخل ہوگا اسی کا نام "عادت" ہے۔ مگر کیا کبھی کوئی اس حماقت میں بھی مبتلا ہوگا کہ سالہا سال کے تجربہ کے بعد وہ یقینی دعویٰ کر بیٹھے کہ اِس وقت اُس کا سونا یا نہانا محالِ قطعی ہے۔ اس وقت اُس کا جاگنا لامحالہ ضروری ہے۔ اور فلاں دروازہ سے اُس کا داخلہ عقلاً لازم ہے؟

اسباب و علل کا علم بدلتا رہتا ہے | اسی طریق پر اشیاء اور موجوداتِ عالم سے عادۃً جو مختلف آثار و نتائج کا صدور ہوتا رہتا ہے اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان اشیاء اور موجودات سے ان آثار و نتائج کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور عادۃً ایسا سمجھتے ہیں کہ آیندہ بھی ان سے یہی آثار و خواص صادر ہوں گے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل صحیح نہیں ہے۔ انسان ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے اس لئے اس کے افعال اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں۔ جن کو وہ جب چاہے بدل سکتا ہے۔ دیگر غیر ذی روح اشیاء کے افعال ارادی نہیں ہیں بلکہ خلقی ہیں اس لئے ان میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ درحقیقت ایک قسم کا مغالطہ ہے۔ آپ کی حرکات اور آپ کے افعال آپ کے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں جو بے ارادہ ہیں اور ارادہ آپ کے نفس یا روح یا ذہن کا فعل ہے۔ جس طرح آپ کی روح یا نفس یا ذہن کی قوتِ ارادہ آپ کے جامد اور بے جان مضغۂ گوشت اعضاء سے اپنی

حسب خواہش مختلف حرکات و افعال صادر کراتی ہے، اسی طرح روح اعظم کی قوت ارادہ اس بے چین عالم کائنات سے اپنی خواہش کے مطابق مختلف افعال اور حرکات صادر کراتی رہتی ہے اور چونکہ عموماً وہ اس کو ایک ہی نہج پر چلاتی رہتی ہے۔ اس لیے ہم کو اسبابِ عادیہ کا علم کسی قدر عطا ہو گیا ہے۔

اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ذہن کے اندر آگ اور گرمی، برف اور ٹھنڈک کے درمیان ایک تلازم پیدا ہو گیا ہے۔ جس کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ آگ سے گرمی اور برف سے ٹھنڈک کا انفکاک نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اگر آگ اور برف کے متعلق ہمارا آئندہ تجربہ بدل جائے تو یقیناً یہ تلازم کا خیال بھی بدل جائے گا مثلاً جس عہدِ قدیم میں گردشِ آسمانی اور دورِ نجوم حادثاتِ ارضی کے اسباب و علل یقین کئے جاتے تھے اور ستاروں کی مختلف چالوں اور ان کی خاص خاص اشکال سے حوادثِ عالم کی توجیہہ کی جاتی تھی، اس وقت ستاروں کی ایک خاص شکل کے ظہور یا کسی خاص ستارہ کے طلوع اور اس کے آثار و نتائج کے درمیان ایک خاص تلازم سمجھا جاتا ہو گا اور اس یقین کو کہ یہ دونوں باہم علت و معلول ہیں، ناقابلِ انکار سمجھا جاتا ہو گا۔ لیکن آج ایسا نہیں ہے۔

قدیم و جدید فنِ طب میں اب آسمان و زمین کا اختلاف ہے۔ دواؤں کے خواص و اثرات اور امراض کے علل و اسباب میں عظیم الشان تبدیلی ہو گئی ہے۔ مگر قدیم اطباء یا اب بھی قدیم طب کے واقف کاروں اور قدر شناسوں کے نزدیک ان کے تجربے اور یکسانیٔ عمل کی بنا پر جن دواؤں کے جو اثرات اور جن امراض کے جو علل و اسباب ہیں، وہ ان کے یقینیات میں داخل تھے اور ہیں۔ لیکن ممالک یورپ میں جہاں کوئی اس طب کا نام بھی نہیں جانتا اور اس کے تجارب و تحقیقات کا مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے، ہمارے اطبا کے یقین کردہ آثار و خواص اور اسباب و علل کو وہاں اوہام سے زیادہ رتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

خود اوہام کیا چیز ہیں؟ جاہل طبقوں اور وحشی قوموں میں بہت سے ایسے یقینیات ہیں جن کو آپ اوہام سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ان میں یہ اوہام کیونکر پیدا ہوئے؟ اسی تکرار تجربہ سے۔ انہوں نے کئی دفعہ دیکھا کہ جب صبح کو فلاں پرندہ بولا یا اُڑا تو فلاں بات ہوگئی۔ چند بار کے دیکھنے سے ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوگیا کہ اس کا یہ اثر ہے۔ حالانکہ معلوم ہے کہ اس پرندہ کے بولنے یا اُڑنے اور اس بات کے ہونے کے درمیان کسی قسم کا تلازم نہیں ہے۔ تاہم چونکہ اُن کا یقین اُن کے تجربہ پر مبنی ہے، اس لئے اس کے خلاف باور کرنا اُن کے لئے اتنا ہی محال ہے جتنا کہ آگ اور گرمی و سوزش کے درمیان تلازم اور ان دونوں کے درمیان علت و معلول پر عقیدہ رکھنے والوں کے لئے یہ تخیل کہ آگ موجود ہو اور اس سے گرمی اور سوزش کا اثر ظاہر نہ ہو۔

جن ملکوں میں خچر نہیں ہوتے، وہاں کے باشندے اپنے تجربہ کی بنا پر اس مسئلہ پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ دو مختلف النوع جانوروں میں باہم توالد و تناسل نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے خلاف ان کو یقین دلانا چاہیں کہ گھوڑے اور گدھے مل کر باہم اس فرض کو انجام دیتے ہیں اور اس سے خچر نام ایک تیسری نوع تیار ہوتی ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں ان کو کس قدر تامل ہوگا۔ لیکن کیا ان کا تامل ہندوستان و مصر میں مطابقِ واقعہ سمجھا جائے گا جہاں ہزاروں دفعہ یہ مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اسباب و علل کا علم تجربہ سے ہوتا ہے الغرض ہم جن کو اصولِ فطرت، نوامیسِ قدرت اور لاز آف نیچر کہتے ہیں وہ صرف روزمرہ کے مشاہداتِ عادیہ کے نام ہیں۔ ہم دیکھتے آئے ہیں کہ درخت کس طرح اُگتے ہیں۔ جاندار موجودات کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ آفتاب کس طرح طلوع ہوتا ہے۔ پانی کس طرح برستا ہے۔ ان کو دیکھتے دیکھتے ہم اس قدر عادی ہوگئے ہیں

کہ ہم ان کا اسی طرح ہونا ضروری اور اس کے خلاف ہونا محالِ قطعی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے، کچھ دنوں کے بعد وہ پھوٹتا ہے، اس میں کونپلیں نکل آتی ہیں، پھر وہ پودے کی شکل اختیار کرتا ہے، شاخیں نکلتی ہیں اور بڑھ کر درخت ہو جاتا ہے۔ ایک قطرۂ آب خون اور خون سے گوشت بن جاتا ہے اس میں رگیں، پٹھے اور ہڈیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دل و دماغ اور جگر و گردہ اپنی اپنی جگہ پر بن جاتے ہیں، پھر کہیں سے اس میں روح آجاتی ہے، پھر اس آئینہ میں احساس و عقل جلوہ آرا ہوتی ہے۔ ایک مدتِ متعینہ کے بعد وہ پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے۔ اس طرزِ پیدائش کو دیکھتے دیکھتے حیرت زائی اور استعجاب و استبعاد کی روح ہم سے بالکل فنا ہو گئی اور ہم کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے کہ ایک جامد دانہ نامی درخت کی شکل میں اور ایک بے جان قطرۂ لایعقل ایک جاندار و ذی عقل انسان کی صورت میں کیونکر بدل گیا۔ لیکن ہمیں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بے جان لکڑی جاندار سانپ بن گئی اور عیسیٰؑ نام ایک بچہ بن باپ کے پیدا ہو گیا تو ہماری محدود عقل اور تجربہ کا پُرغرور سر انکار سے ہلنے لگتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ کبھی ہم نے ایسا ہوتے دیکھا نہیں۔ آفتاب روز پورب سے طلوع ہوتا ہے اور پچھم میں جاکر غروب ہوتا ہے۔ ہم کو اس پر مطلق تعجب نہیں ہوتا اور نہ یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے اور جب یہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن آفتاب پورب کے بجائے پچھم سے نکلے گا تو ہم اس کو خلافِ عقل کہتے ہیں۔ کیا پورب سے اس کا نکلنا عقل کے موافق تھا؟ اور تم آفتاب کو اگر پورب سے نکلتے نہ دیکھتے تو خود بخود عقلاً یہ فیصلہ کر لیتے کہ اس کو پورب ہی سے نکلنا چاہیئے اور مغرب ہی میں ڈوبنا چاہیئے۔ عموماً انسان کے ایک سر، دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور دو پاؤں اور ہر ہاتھ پاؤں میں پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخِ طبعیٔ انسانی کی کوئی کتاب پڑھئے تو

معلوم ہوگا کہ قدرت کے مستثنیات کی بھی کوئی بھی انتہا نہیں اور سینکڑوں ہزاروں بچے اس کے خلاف پیدا ہوتے ہیں۔ اب جس طرح آپ اس پر اعتراض نہیں کرتے کہ انسان کے دو ہی ہاتھ اور دو ہی پاؤں کیوں ہوتے ہیں، اس پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے کہ اس بچہ کے چار ہاتھ اور چار پاؤں کیوں ہیں۔ اور جس طرح آپ کو اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ آدمی جی کر مر کیوں جاتا ہے، ایسے ہی اس پر حیرت نہ کیجئے مر کر جی کیونکر جاتا ہے۔ ان دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک واقعہ کو آپ نے بار بار دیکھا ہے اور دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن کسی چیز کا دیکھنا اور نہ دیکھنا کسی چیز کے فی نفسہٖ محال یا ممکن ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتی۔

حاصل یہ ہے کہ ہم کو معجزات کے متعلق جو استبعاد نظر آتا ہے اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے گذشتہ مشاہدات و تجربات کے خلاف ہوتا ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس کے گذشتہ مشاہدات اور تجربات میں غلطی کا ہونا یا اُن میں انقلاب ہو جانا کچھ محال نہیں۔ طبیعیاتِ جدیدہ نے طبیعیاتِ قدیمہ کی تحقیقات کی دیوار ڈھا دی۔ حکمائے جدید نے حکمائے قدیم کے سینکڑوں تجربات باطل کر دیئے۔ ہیئتِ قدیم اور ہیئتِ جدید میں آسمان اور زمین کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ اختراعاتِ جدیدہ نے سینکڑوں اور ہزاروں قدیم مستبعدات اور ممتنعات کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا۔ جب ہمارے گذشتہ تجربات اور تحقیقات کا یہ حال ہے تو انسانی تحقیقات و تجربات کی آئندہ صحت کی کون ضمانت کر سکتا ہے؟ فلسفۂ یونان پڑھ کر ہم یقین کرتے تھے کہ زمین ساکن اور آفتاب متحرک ہے۔ اب روزِ روشن کی طرح یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ آفتاب ساکن اور زمین متحرک ہے۔ اس لئے اگر کسی پیغمبر کی زبان سے اس وقت یہ خیال ادا ہوتا کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہے تو حکمتِ قدیمہ کی درس گاہ

میں یہ خیال شاید جاہلانہ اور مضحکہ انگیز سمجھا جاتا۔ پھر حکمتِ جدیدہ کے دانایانِ روزگار کو آج مذہب کی جو چیز مضحکہ انگیز نظر آتی ہے کیا معلوم کہ کل خود ان کی تحقیقات "حکمتِ مستقبلہ" کے مدرسہ میں قابلِ مضحکہ نہ ٹھہرے گی۔

الغرض صفحاتِ بالا سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نبی نوعِ انسان کے اصل سرمایۂ علم علل و معلوم ہیں جو کچھ ہے وہ صرف ان کے تجربہ کی کمائی ہے اور اسی کی بنا پر استدلالِ تمثیلی کے طور پر وہ ایک چیز کو چند بار دیکھ کر اپنے ذہن میں ایک حکمِ کُلّی پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک سیب کو دیکھا۔ اس کی خوشبو کو سونگھا۔ اس کے مزہ کو چکھا۔ اب دوسرا سیب ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کی شکل و صورت اور رنگ کو دیکھ کر، اُس کی خوشبو کو سونگھ کر ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی سیب ہے اور اس کا مزہ ایسا ہوتا ہے اور پھر چند سیبوں کو دیکھ کر ہم یہ حکمِ کُلّی لگا دیتے ہیں کہ ہر سیب ایسا ہوتا ہے اور اس کا یہ خاصہ اور اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے برف کو دیکھا۔ اس کی شکل و صورت، رنگ و مزہ اور ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ اور پھر کئی دفعہ اس کے دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ ہم نے ہر دفعہ پہلی برف کی مثل دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ یہ بھی برف ہے اور ہر برف ٹھنڈی ہوتی ہے۔ یہی حال اس قضیہ کا ہے کہ "ہر آگ جلاتی ہے"۔ اب غور کیجیے کہ آپ کے یہ قضایا جو محض استدلالِ تمثیلی کی بنیاد پر قائم ہیں، عقلاً کیونکر ناقابلِ شکست یقین بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ عادۃً اپنی عملی اور کاروباری دنیا کے لئے ان پر یقین کر کے جلبِ منافع اور دفعِ مضار میں ان سے کام لیں اور یہی علتِ عادیہ کی حقیقت و مصلحت ہے۔

علامہ ابنِ تیمیہ کا بیان کہ اسباب و علل تجربی ہیں

ہم نے جس پرداز پر مسئلہ علیت کی تشریح کی ہے یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ علامہ ابنِ تیمیہ نے الرد علی المنطق میں جابجا اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں اس کی تلخیص اس لئے درج کرنا چاہتے ہیں کہ

مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ ناظرین کے سامنے آجائے۔

کھانے کے بعد آسودگی، پینے کے بعد سیری بدیہی تجربیات میں ہے۔ اسی طرح لذت وغیرہ کا احساس ہے کہ جب انسان اس کا احساس کرتا ہے تو اس کے بعد فوراً ایک اثر پاتا ہے۔ پھر جب بار بار اس شے کے احساس کے بعد وہی اثر پاتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہی شے اس اثر کا سبب ہے۔ اسی کا نام تجربیات ہے۔ قضائے کلیہ کی اصل یہی تجربیات ہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ مثلاً جب ایک شخص کسی خاص دوا کو استعمال کرتا ہے اور یہ پاتا ہے کہ اس سے فلاں مرض دور ہو گیا یا فلاں قسم کا نقصان ہو گیا تو مرض کا اس سے پیدا ہو جانا یا زائل ہو جانا تجربہ ہے۔ یہی حال دیگر آلام و لذات کا ہے جو مشمومات، مسموعات، مرئیات اور ملموسات سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ حس اس کو سونگھتی یا دیکھتی یا سنتی یا چکھتی یا چھوتی ہے۔ پھر نفس میں جو لذت کا احساس ہوتا ہے وہ وجدانیات میں سے ہے۔ حس کو وہ حواس باطن سے دریافت کرتا ہے۔ اب نفس میں جو اعتقادِ کلی قائم ہو جاتا ہے کہ اِس جنس کے ہر فرد سے لذت حاصل ہوتی ہے اور اِس جنس کے ہر فرد سے الم حاصل ہوتا ہے وہ من قبیل تجربیات ہے۔ کیونکہ حواس ظاہرہ و باطنہ سے شے کلی کا احساس نہیں ہو سکتا۔ حکم کلی کا جو اعتقاد نفس میں قائم ہو جاتا ہے۔ وہ حس اور عقل کے مجموعہ سے ہوتا ہے اور اسی کا نام تجربیات ہے۔ مثلاً یہ اعتقاد کہ کھانے اور پینے کی چیزوں سے آسودگی اور سیری پیدا ہوتی ہے اور زہر قاتل کے استعمال سے آدمی مر جاتا ہے اور بیماری پیدا کرنے والے اسباب سے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے اور اس بیماری کا فلاں اسباب و ذرائع سے استیصال ہو جاتا ہے۔ یہ کُل کے کُل قضایائے تجربیہ ہیں۔ کیونکہ حس تو صرف جزئی اور شخصی چیزوں کا احساس کرتی ہے۔ لیکن جب ایک شے سے ایک ہی احساس بار بار ہوتا ہے تو عقل ادراک کرتی

ہے کہ اس مشترک امر کی وجہ سے جو ان تمام افراد میں تھا، یہ بات پیدا ہوئی اور یہ چیز فلاں قسم کی لذت پیدا کرتی ہے اور اس شے سے فلاں قسم کی تکلیف پیدا ہوتی ہے۔

"یہی حال حدسیات کا ہے کہ ان کی جزئیات کا علم احساس سے ہوتا ہے۔ لیکن تکرار سے عقل قدرِ مشترک کا اندازہ لگا لیتی ہے۔ مثلاً جب چاند کی روشنی کا اختلاف آفتاب کے مقابلہ کے اختلاف سے دیکھتے ہیں تو گمان کر لیتے ہیں کہ چاند کی روشنی آفتاب سے حاصل ہوئی ہے۔ یا یہ دیکھتے ہیں کہ ثوابت کی حرکت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا اور وہ سب ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فلک ایک ہے۔ اسی طرح جب سبع سیارہ کے اختلافِ حرکات کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہر سیارہ کا فلک دوسرے سے مختلف ہے۔

قیاس کی بحث میں علامہ ممدوح کہتے ہیں۔

فلاسفہ نے یقینیات کو صرف چند قضایا میں محدود کر دیا ہے جس میں سے ایک حسیات ہیں۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ حس سے ہرگز کسی عام اور کلی شے کا ادراک نہیں ہو سکتا اس لئے فقط حسیات سے کوئی قضیۂ کلیہ عامہ نہیں بن سکتا جو برہانِ یقینی کا کوئی جزو بن سکے۔ تمثیلاً اہلِ منطق کہتے ہیں کہ "آگ جلاتی ہے"۔ حالانکہ اس قضیہ کی عمومیت اور کلیت کا علم تجربہ اور عادت سے ہوا ہے جو قیاسِ تمثیلی کی ایک قسم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا علم اس طرح ہوا کہ آگ میں جلانے والی قوت موجود ہوتی ہے، تو یہ علم بھی کہ "ہر آگ میں یہ قوت موجود ہوتی ہے"، ایک حکمِ کلی ہے جو احساس سے نہیں دریافت ہو سکتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ضروری ہے کہ آگ کی صورتِ نوعیہ میں یہ قوت موجود ہو اور جس میں یہ قوت موجود نہ ہوگی وہ آگ نہ ہوگی تو یہ دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو مفیدِ یقین نہیں۔ کیونکہ یہ قضیہ کہ "جس شے

میں یہ قوت ہوتی ہے وہ جلاتی ہے "اس میں تمثیل، شمول، عادت اور استقرائے ناقص کو دخل ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ جو شخص یہ دعوے کرتا ہے کہ "آگ ہر شئے کو جو اس کے اندر پڑتی ہے جلا دیتی ہے"، وہ غلطی کرتا ہے۔ کیونکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس شے میں جلنے کی قابلیت ہو۔ ورنہ وہ ہر شئے کو نہیں جلا سکتی۔ جس طرح پتھر اور یاقوت کو نہیں جلا سکتی یا ان اجسام کو نہیں جلا سکتی جس میں مانعِ آتش دوائیں لگا دی گئی ہوں خرقِ عادت کی بحث کا مقام دوسرا ہے۔ بہر حال قضایائے حسیہ میں کوئی کلیہ ایسا نہیں ہے جس کا نقض نہ ہو سکے اور درحقیقت قضیۂ کلیہ حسیہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قضیۂ حسیہ مثلاً "یہ آگ جلاتی ہے"، اس میں جس صرف ایک خاص چیز کا ادراک کرتی ہے اور حکمِ کلی جو عقل لگا دیتی ہے تو فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ نفس ان خاص افراد اور مثالوں کے دیکھنے کے بعد اپنے میں یہ استعداد پیدا کر لیتا ہے کہ اس کے اندر یہ الہام پیدا ہو جائے کہ ہر آگ جلاتی ہے اور یہی حکمِ کلی ہے، تو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بھی قیاسِ تمثیلی ہی ہے اور اس کی کلیت اور عمومیت پر اس وقت تک وثوق نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم تمام افراد میں مشترک ہے اور یہ اسی وقت تک ممکن ہے جب تمام افراد کا تجربہ کر لیا جائے پھر بھی قضایائے عادیہ میں سے کوئی قضیہ ایسا نہیں ہے، جس کا ٹوٹنا باتفاقِ عقلاء جائز نہ ہو۔ بلکہ فلاسفہ تک خرقِ عادت کو جائز سمجھتے ہیں، مگر وہ اس کے لئے فلکی طبعی اور نفسیاتی اسباب بیان کرتے ہیں اور ان ہی تینوں اسباب کی طرف خرقِ عادت کو منسوب کرتے ہیں۔ اور اسی سے انبیاءؑ کے معجزات، اولیا کی کرامات اور سحر وغیرہ کو ثابت کرتے ہیں۔"

اسی قیاس کی بحث کے آغاز میں علامہ ممدوح لکھتے ہیں:

" اور یہی حال تجربیات کا ہے۔ لوگوں نے عموماً تجربہ کیا ہے کہ پانی پینے سے سیری ہوتی

ہے، اور گلا گٹ جانے سے آدمی مر جاتا ہے اور ضربِ شدید سے تکلیف ہوتی ہے۔ ان تمام قضیوں کا علم محض تجربہ کی بنا پر ہے۔ کیونکہ جس نے ایک خاص سیری کا ادراک کیا ہے اور گلا کٹنے سے ایک خاص شخص کو مرتے دیکھا ہے اور مارنے سے تکلیف ایک خاص شخص نے محسوس کی ہے۔ اب یہ حکم کہ جو شخص ایسا کرے گا یہ خاص اثر پیدا ہوگا تو یہ قضیۂ کلیہ حس سے نہیں معلوم ہوگا بلکہ اس کے ساتھ حکمِ عقلی کا لگاؤ بھی ہے۔

تجربہ سے جو اثرِ معیّن کسی شے معیّن میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نسبت یہ دیکھنا ہے کہ اس شے معیّن میں اور اس کے اثرِ معیّن میں ایک خاص تلازم ہے اور اسی سے عادتِ مستمرہ کا علم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب ان دونوں کے درمیان کسی مناسبت کا بھی شعور ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ جہاں وہ شے پائی جاتی ہے وہاں وہ اثر بھی پایا جاتا ہے اور جہاں وہ اثر پایا جاتا ہے وہاں وہ شے بھی پائی جاتی ہے اور نیز یہ کہ جہاں وہ شے نہیں پائی جاتی وہ اثر بھی نہیں پایا جاتا اور جہاں وہ اثر نہیں پایا جاتا وہاں وہ شے بھی نہیں پائی جاتی۔ اب جس قدر اس لزوم میں ظنیت پائی جائے گی اسی قدر علیت کا اعتقاد بھی ظنی ہوگا۔ اور جس قدر اس لزوم میں قطعیت ہوگی اسی قدر لزوم کے اعتقاد میں قطعیت ہوگی اور یہی قضایا مے عادیہ ہیں، جیسے طب کے تجربیات وغیرہ، یا یہ علم کہ روٹی کھانے سے آسودگی اور پانی پینے سے سیری ہوتی ہے اور کپڑے پہننے سے بدن میں گرمی اور برہنگی سے بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے۔ ....

پس تجربیات سے علم حاصل ہونے کا سبب ایک شئے کا دوسری شے کے بعد ہونے سے اور تکرارِ اثر سے پیدا ہوتا ہے۔"

تجربیات کی بنا شہادت اور روایت اور تاریخ پر ہے | غرض ان مباحث کا ماحصل یہ ہے

کہ اشیاء کے خواص اور موجودات کے اسباب کا علم ہم کو محض تجربہ سے حاصل ہوا ہے۔ اب یہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ کیا تجربی یقین کے پیدا ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اس یقین کرنے والے نے اس کا تجربہ کیا ہو۔ ہم دنیا میں ہزاروں تجربی مسائل پر یقین رکھتے ہیں، مگر ان میں سے بہت کم ہمارے ذاتی تجربہ میں آئے ہیں۔ طبعیات، کیمیائیات، طبیات، فلکیات، ارضیات کی ہزاروں باتیں ہیں جن پر ہم یقین رکھتے ہیں مگر ہمارے ذاتی تجربہ میں بہت کم آئی ہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ گو وہ ہمارے ذاتی تجربہ میں نہیں آئی ہیں لیکن ان علوم کے ماہرین نے ان کا تجربہ کیا ہے اور ہم کو ان کی شہادت کا اس لئے یقین ہے کہ وہ اپنے اپنے علوم میں کامل دست گاہ رکھتے تھے اور اپنے ذاتی تجربوں کو انہوں نے اپنی تصنیفات میں لکھ دیا ہے تو گویا آپ نے قبول کر لیا کہ دوسروں کے تجربیات بھی مفیدِ یقین ہیں۔ بشرطیکہ خود ان تجربہ کرنے والے علماء پر آپ کو وثوق ہو، اور ان کے تجربیات صحیح و مستند شہادتوں اور واسطوں سے آپ تک پہنچیں۔

دنیا کے واقعات کا سب سے بڑا دفتر تاریخ ہے جو عہدِ ماضی کی ظلمت میں ہمارے لئے چراغِ راہ ہے اس چراغ میں تیل کون برابر ڈالتا جاتا ہے کہ یہ بجھتا نہیں؟ وہ راویانِ اخبار اور ناقلانِ حکایات ہیں جو ایک عہد سے دوسرے عہد تک اس کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ روایت کہیں منقطع ہو جائے تو عہدِ ماضی کی دنیا بھی عالمِ مستقبل کی طرح تیرہ و تار ہو جائے۔ لیکن تاریخ کی ہر شہادت آسانی کے ساتھ قبول نہیں کر لی جاتی۔ بلکہ اس کے لئے چشم دید گواہوں کا وجود، ان کی صداقت اور راست شعاری اور پھر اس کے بعد بیچ کے واسطوں کی سچائی اور راست گفتاری اور عدم فریب کے ثبوت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اگر یہ شرائط پوری پوری ہو جائیں تو روایاتِ منقولہ کی صداقت میں کسی کو شک نہ ہونا چاہیئے۔

فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں

حقیقت میں فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں۔ فلسفہ تو اشخاص یا جماعتوں کے منتظم خیالات کی اور سائنس کائناتِ فطرت کے تجربی اکتشافات کی تاریخ ہے۔ فلسفہ کی درس گاہ کا ہر پروفیسر نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اس مسئلہ میں یونان، اسلام اور یورپ کے فلاں فلاں اساطینِ فلسفہ کی یہ رائیں ہیں۔ کیا اس وثوق کی بنیاد صرف شہادتِ تاریخی پر نہیں ہے؟ آغازِ آفرینش سے لے کر اس وقت تک دنیائے انسانی نے علم و اکتشاف، تجربۂ و دانش کا جو سرمایہ جمع کیا ہے کیا وہ بجز شہادتِ تاریخی کے کسی اور طریقہ سے حاصل ہوا؟ یا ہو سکتا ہے؟ یا آئندہ ہوگا؟ آپ یقین رکھتے ہیں کہ جسم بہتر بسیط عنصروں سے مرکب ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن پانی کے دو جز ہیں۔ سنکھیا کے استعمال سے آدمی مر جاتا ہے۔ مگر ان میں سے ایک بات بھی آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے۔ البتہ چونکہ صحیح اور مستند ذریعوں سے آپ تک یہ تحقیقات پہنچی ہیں اس لئے آپ ان کو باور کرتے ہیں۔ لندن اور پیرس کو آپ نے خود نہیں دیکھا۔ لیکن بایں ہمہ آپ کو ان شہروں کے وجود میں شک نہیں۔ مگر کوہ قاف کے پرستان کے وجود پر آپ کو یقین نہیں۔ اس لئے کہ پہلے دو شہروں کے وجود کی خبر آپ نے بہ کثرت لوگوں سے اور ایسے ثقہ اور مستند لوگوں سے سنی ہے کہ آپ اس میں شک نہیں کر سکتے۔ لیکن کوہِ قاف کے پرستان کے عینی شاہدوں تک آپ کا سلسلۂ روایت صحیح اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچا ہے۔ اس لئے آپ کو اس کے وجود میں بہت حد تک شک ہے۔ اسی طرح ہیئت و فلکیات کے اکثر مسائل مثلاً ستاروں کی چالیں، خاص ستاروں کا طلوع و غروب وغیرہ کسی نہ کسی ہیئت دان اور فلکی کا مشاہدہ ہے اور پھر صدیوں کے مشاہدات یک جا ہو کر آپ کے سامنے ہیئت و فلکیات کا ناقابلِ انکار دفتر بن کر آتا ہے۔ مگر غور کیجئے کہ اس دفترِ بے پایاں کا ہر ایک مشاہدہ بجز تاریخی روایت و شہادت کے کسی اور طریقہ

سے پہنچا ہے یا پہنچ سکتا ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ آفتاب روشن ہے۔ پتھر سخت ہے۔ کھانے سے سیری ہوتی ہے۔ چوٹ سے تکلیف ہوتی ہے۔ غرض تمام قضایائے تجربیہ جن پر علوم و فنون کی بنیاد قائم ہے اور جن کی عمومیت و کلیت کا آپ کو یقین یا ظنِ غالب ہے ان کی اس کلیت اور عمومیت کا یقین یا غلبۂ ظن صرف آپ ہی کے ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر قضیہ کی عمومیت اور کلیت کے بنانے میں آپ کے سوا اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں اور بیسیوں نسلوں کے مشاہدات کو دخل ہے۔

اور یہ مشاہدات آپ تک تحریری یا زبانی تاریخی شہادتوں کے ذریعہ سے پہنچے ہیں۔ تب جا کر وہ انسانی مسلمات میں داخل ہوئے ہیں۔

تاریخی شہادتوں کی شرائطِ استناد

لیکن تاریخی شہادت کے مستند ہونے پر آپ کچھ قیود بھی عائد کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اخیر راوی چشم دید گواہ ہو۔ یعنی یہ کہ وہ واقعہ کے وقت مقامِ واقعہ پر حاضر ہو اور خود اس کا بلا واسطہ ذاتی علم حاصل کیا ہو۔ وہ راست گفتار ہو، اس کا حافظہ صحیح اور درست ہو، فریبی اور جھوٹا نہ ہو۔ اسی طرح آغازِ سلسلۂ روایت سے لے کر آخر تک بیچ کا ہر راوی بھی ان ہی صفات سے متصف ہو۔ جہاں تک ان صفات میں ترقی ہوگی۔ واقعہ کے متعلق آپ کے علم اذعان میں بھی ترقی ہوگی اور جہاں تک ان میں کمی ہوگی آپ کے علم اذعان میں بھی کمی ہوگی۔

مسلمانوں کا علمِ روایت

اب مسلمانوں کے علمِ اخبار یا علمِ نقل و روایت یعنی اصولِ حدیث پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ بعینہٖ یہی اصول انہوں نے ہر روایتی شہادت کے قبول کرنے کے لئے مقرر کیا ہے۔ سلسلۂ روایت کے ان اوصاف میں جس قدر بھی نقص ہوگا اس جزوِ واقعہ

کے علم اذعان میں بھی اسی قدر نقص ان کے نزدیک پیدا ہوگا۔ پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی طرف جس قدر بھی صحیح و مستند معجزات منسوب ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی صداقت کو اس اصول پر پرکھا نہ گیا ہو۔ ہیوم نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "فہمِ انسانی" میں جہاں معجزات پر بحث کی ہے، انجیل کے بیان کردہ معجزات کی نسبت وہ اس لئے بے اعتباری ظاہر کرتا ہے کہ مصنفینِ انجیل جو ان واقعات کے راویٔ اوّل ہیں، ان میں سے کوئی واقعہ کا چشم دید گواہ نہیں ہے۔ لیکن ہیوم کو اگر اسلامی طرزِ روایت و اصولِ حدیث کی احتیاطوں سے آگاہی ہوتی تو کبھی اسلام کے معجزات کی نسبت اس بے اعتباری کا اس کو موقع نہ ملتا۔

صحیح معجزاتِ نبویؐ کے پہلے رُواۃ یعنی وہ صحابۂ کرامؓ جو واقعات کے چشم دید گواہ ہیں، صدقِ مقال راست گفتاری پر ان کی زندگی کا ایک ایک حرف گواہ ہے اور ان کی عقل، رزانت اور متانتِ رائے پر ان کے کارنامے شاہدِ عدل ہیں، بیچ کے رُواۃ وہ محدثینِ عظام ہیں جن کی سچائی، راستی اور حفظ و فہم پر اسمائے رجال کے اوراق کی مہریں ثبت ہیں۔ پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے علی رؤسِ الاشہاد کہا اور بار بار کہا کہ "جو شخص میری طرف کسی جھوٹی بات کی نسبت کرے گا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کسی خبر کو بیان کرتے ہوئے کانپ جاتے تھے۔ بیچ کے ثقہ اور مستند رواۃ بھی انتہائی انسانی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اس پر بھی ان کی تمام روایات کا درجہ یکساں نہیں ہے۔

اگر روایت کے ہر دور میں راویوں کی تعدادِ کثیر شریک ہو تو اس کو خبر متواتر کہتے ہیں۔ اور اگر ہر دور میں گو تعداد کثیر نہ ہو، لیکن دو یا دو سے زیادہ ہوں تو وہ مستفیض اور مشہور ہے اور اگر کسی دور میں ایک ہی راوی رہ گیا ہو تو اس خبر کو خبر احاد کہتے ہیں۔ معجزاتِ نبویؐ مختلف طرق سے مروی ہیں اور اسی کے اعتبار سے ان کی صحتِ بیان کا درجہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعد کے

لوگوں نے آپؐ کی طرف بہت سے ایسے معجزات منسوب کر دیئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے محدثین نے نہایت جانفشانی اور ایمان داری سے اُن روایات کو معیار پر پرکھ پرکھ کر الگ کر دیا ہے اور اس کتاب کی جلد اوّل کے مقدمہ میں تمام و کمال بحث موجود ہے۔

معجزات کے ثبوت پر یہ طرزِ استدلال گو عجیب ہے مگر غلط نہیں۔ دنیا میں ہر واقعہ کے ثبوت کا یہی طریقہ ہے اور وہی اس باب میں بھی کار آمد ہے۔ یہ کیسی زبردستی ہے کہ جس طرزِ استدلال پر دنیائے یقین کا عملی کاروبار چل رہا ہے اس کو اگر مذہب استعمال کرے تو مدعیانِ عقل کی جبینِ متانت پر بل پڑ جاتے ہیں۔

نادیدہ واقعات پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف روایات کی شہادت ہے

دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے اُس کے علم کے دو ہی طریقے ہیں یا تو انسان اس واقعہ کے وقت موجود ہو گا یا موجود نہ ہو گا۔ پہلی صورت میں اس کا علم اس کے احساس و مشاہدہ پر موقوف ہے اور وہ روایت کے تمام جھگڑوں سے بے نیاز ہے جیسے کہ ان صحابہؓ کا اُس معجزہ کے متعلق علم جو ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ اور دوسری صورت میں اس واقعہ کا علم صرف روایت سے ہو سکتا ہے اور اس کے سوا کوئی ذریعۂ علم اس کے لئے دنیا میں موجود نہیں ہے۔ آپ کا فرض صرف اس قدر ہے کہ روایت کی اچھی طرح تنقید کر لیجیے اور جس طرح دنیا کے دوسرے عملی کاروبار میں واقعات پر یقین کرنے کے ذرائع استعمالِ عام میں ہیں اس باب میں بھی ان ہی کو استعمال کیجیے۔ عقلی احتمالات اور ذہنی شبہات کی کوئی حد نہیں ہے۔ مگر کبھی روزمرّہ کے معاملات میں وہ آپ کے یقین کی سدِ راہ نہیں ہوتے۔

خبرِ احاد پر بھی عملاً یقین ہوتا ہے

متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبرِ احاد تک پر آپ روزانہ یقین کرتے ہیں۔ خطوط، تار، اخبارات آج کل کی زندگی کا جزو ہیں اور ان میں سے

ہر ایک پر آپ کو کامل وثوق ہے۔ رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزاء واقعات وایجادات وطبّی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ آج تمام تجارت کا دار و مدار ان ہی تاروں پر ہے۔ یہ شدید مالی خطرات کا موقع ہے۔ مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبر احاد کو یقین کر لیتا ہے اور اپنی تمام دولت اس کی نذر کر دیتا ہے اور کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کہ کسی نے غلط کہا ہو، ممکن ہے غلط لکھ گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو۔ یہ تمام احتمالاتِ عقلی قائم ہو سکتے ہیں مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔

ہم شفاخانوں میں جاتے ہیں اور عطّاروں اور کمپونڈروں سے دوائیں لے کر باطمینان تمام ان کو استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ معلوم ہے کہ ان شفاخانوں میں اکسیر اور سنکھیا دونوں کی بوتلیں پہلو بہ پہلو رکھی ہیں۔ ممکن ہے کہ تنہا دوا بنانے والے کی یہ اطلاع کہ یہ دوا تمہارے نسخہ کے مطابق ہے، غلط ہو اور اس لئے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے۔ مگر کبھی یہ خدشہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا اور ہم بخوشی اپنی جان کو خبرِ احاد کے یقین کی نذر کر دیتے ہیں۔ پھر معجزات اور مذہب ہی کے باب میں شہادت کے مسئلہ پر تمام عقلی احتمالات اور شکوک کا ازالہ ضروری کیوں تصوّر کیا جاتا ہے۔

واقعات پر یقین کے لئے اصلی بنیاد امکان اور عدم امکان کی بحث نہیں بلکہ روایت کے ثبوت اور عدم ثبوت کی ہے

آج کل مغربی علم تاریخ اور فنِ روایت کا بڑا کارنامہ یہ اصول سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ کیا وہ ممکن بھی ہے اور جب یہ طے ہو جائے تو روایت

کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے تمام واقعی علوم، ہمارے تجربہ اور روایات ہی پر مبنی ہیں۔ اس لئے کسی شے کے ممکن اور ناممکن ہونے کا فیصلہ محض مشاہدہ کی تحقیق پر ہی مبنی ہے۔ اس لئے علمِ تاریخ اور فنِ روایت کی بنیاد اس کے امکان اور عدمِ امکان کی بحث پر قائم نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہمارے علمائے اصول نے بتایا ہے صرف اس پر قائم ہے کہ آیا یہ واقعہ روایتہً صحیح بھی ہے یا نہیں؟

جس درجہ کا واقعہ ہو اُسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیئے

ہم کو اس اصول کی صحت سے انکار نہیں ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اُسی درجہ کی شہادت بھی ہونی چاہیئے۔ لیکن درجہ نام کمیتِ اشخاص سے زیادہ کیفیتِ اشخاص کا ہے۔ ایک واقعہ کو چند آدمی بیان کرتے ہیں مگر ان کی راست گفتاری معرضِ بحث میں ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص اس کے خلاف اپنی روایت بیان کرتا ہے جس کی صداقت مسلّم ہے، جس کی راست گفتاری کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے، جس کی سمجھ اور حافظہ اور وثوق کا ہم کو علم ہے اور جس کی دوسری اخلاقی صفات جن کا روایت پر اثر پڑتا ہے نہایت بلند ہیں تو ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیثیت سے دوسری شہادت پہلی شہادت سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ راویوں کی ان صفات کی واقفیت کا روایاتِ اسلامیہ کے سوا دنیا میں کسی اور قوم و مذہب کی روایات کے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے دنیا کے اور مذاہب اور قوموں کی روایات کے مقابلہ میں اسلامی روایات کی ایک خاص اہمیت ہے۔

معجزات دراصل تجربیات کے خلاف نہیں ہوتے

اس موقع پر ایک اور مسئلہ کو بھی صاف کرنا ہے۔ عام طور سے معجزات کی شہادت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ معجزہ کی شہادت سینکڑوں ہزاروں شہادتوں کے خلاف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ناقابلِ یقین ہے یہ حقیقت میں ایک قسم کا مغالطہ ہے۔ ہزاروں لاکھوں شہادتیں اس بات کی بے شک ہیں کہ آگ نے

فلاں فلاں موقع پر جلایا۔ اب جو شخص ایک معجزہ کو بیان کرتا ہے کہ فلاں موقع پر آگ نے نہیں جلایا تو یہ شہادت ان ہزاروں لاکھوں شہادتوں کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ ان سے الگ ایک واقعہ ہے۔ اس روایت سے اُن لاکھوں، ہزاروں شہادتوں کی مخالفت اور انکار اس وقت لازم آتا کہ جن موقعوں کے متعلق یہ کثیر التعداد شہادتیں اپنا مشاہدہ بیان کرتی ہیں اُن کی تکذیب و تغلیط کی جاتی۔ دو شہادتوں کی باہمی ترجیح کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دونوں ایک ہی خاص واقعہ کو مختلف نتیجوں کے ساتھ بیان کریں اور یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ جن آگوں کے جلانے کے متعلق سینکڑوں شہادتیں موجود ہیں۔ معجزہ کا راوی ان کی تغلیط و تکذیب نہیں کرتا۔ بلکہ ایک خاص آگ کی نسبت اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے۔ جس کے متعلق ان کو نفیاً یا اثباتاً کوئی علم نہیں مثلاً ایک طرف ایک شخص کی تنہا یہ شہادت ہوتی کہ پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کے ہاتھوں سے پانی کا چشمہ اُبلنے لگا۔ دوسری طرف سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی یہ شہادت ہوتی کہ نہیں ایسا واقعہ نہیں تو بیشک اس موقع پر دوسری شہادت کو پہلی شہادت پر ترجیح دی جا سکتی اور تمام مسلمان اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر کسی معجزۂ نبوی کے متعلق اس قسم کی مخالف شہادت موجود ہو تو وہ اس معجزہ کو صحیح معجزات نبوی کی فہرست سے خارج کر دیں گے

معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں | الغرض معجزہ کی شہادت کے متعلق اصل بحث یہ نہیں کہ یہ ممکن ہے یا ناممکن، بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ یہ شہادت کس درجہ کی ہے اور اس کے رُواۃ کی صحیح البیانی کا کیا پایہ ہے۔ اس کے لئے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کی راستی، دیانت، صدقِ مقال اور ان کی اخلاقی زندگی کے دیگر پہلوؤں کے مطالعہ کی حاجت ہے۔ اور یہی شئے ہے جو معجزات کی شہادت کو طاقتور یا کمزور بنا سکتی ہے اور یہی ہمارے محدثین اور اہلِ اصول کا قانونِ شہادت ہے اور اسی طریق سے اہل السنۃ والجماعت معجزہ کو ثابت کرتے ہیں۔ علامہ ابو منصور عبد القاہر بغدادی اشعری کتاب الفرق میں اہل سنت کا مسلک لکھتے ہیں:-

و بهذا النوع من الاخبار (المستفيض) علمنا معجزة نبينا صلى الله عليه وسلم فى انشقاق القمر، و تسبيح الحصا فى يده وحنين الجذع اليه لما فارقه و اشباعه الخلق الكثير من الطعام اليسير نحو ذلك من معجزاته۔

اسی خبر مشہور کے ذریعہ سے ہم نے آنحضرتؐ کے معجزات کو جانا۔ مثلاً شقِ قمر، دستِ مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، شاخِ خرما کا گریہ و بکا کرنا اور تھوڑے کھانے سے بہت سے لوگوں کو سیر کردینا وغیرہ۔

خلاصۂ مباحث گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل سطروں میں کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ معجزہ خرقِ عادت اور قاعدۂ علت و معلول کی استثنائی شکست کا نام ہے جس کو اللہ تعالےٰ اپنے کسی پیغمبر کی سچائی کی نشانی کے طور پر لوگوں پر ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ خرقِ عادت اور قاعدۂ علت و معلول کی شکست ممکن بلکہ واقع ہے۔

۳۔ کیونکہ عاداتِ طبعی اور سلسلۂ علل و معلول کا علم ہم کو تجربہ سے ہوا ہے۔

۴۔ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہو اس کی کلیت اور عمومیتِ عقلی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس سے معجزہ کے محال ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ تجربہ کی بنیاد ذاتی مشاہدہ یا دوسرے مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر ہے۔

۶۔ اس لئے معجزہ کا ثبوت ذاتی مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر مبنی ہے

۷۔ اسلامی روایات اور صحیح معجزاتِ نبویؐ کی شہادت اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی کوئی

تاریخی روایت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور اس سے معجزات اور خوارقِ عادت کا وقوعی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

یقینِ معجزات کے اصولِ نفسی اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خطاب فلسفہ اور منطق سے تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ عملی دنیا کا کاروبار ارسطو کے بنائے ہوئے اصول و قواعد پر نہیں چل رہا ہے بلکہ خالقِ فطرت اپنے وضع کردہ اصول و قواعد پر اس کو چلا رہا ہے۔ واقعات کسی حد تک تعجب انگیز اور دور از عقل ہوں تاہم انسانوں کی بڑی تعداد دلیل و برہانِ منطقی کے بغیر صدقِ دل سے ان پر یقین رکھتی ہے۔ کسی واقعہ پر یقین رکھنے کے لئے اس کا فہمِ انسانی میں آجانا اور عقل و استدلال کی میزان میں اس کا پورا اُتر جانا ضروری نہیں ہے۔ ایک طبیعی فلسفی سے لے کر عامی تک مادّہ کے وجود پر یقین رکھتا ہے۔ حالانکہ استدلال سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک واقعہ کی جب روایت کی جاتی ہے تو کچھ لوگ بے دلیل اس کو فوراً تسلیم کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ استدلال و برہان کے باوجود اس کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اگر استدلال کی قوت سے وہ خاموش بھی ہو جائیں تو ان کے دل کو تسلی نہیں ہوتی۔ جو اشخاص کسی جماعت یا ملک کے اندر کام کرتے ہیں ان کی سچائی اور خلوص و ایثار کے متعلق سب لوگوں کی رائے برابر نہیں ہوتی۔ ایک جماعت جس زور و قوت سے ان کے صدق و اخلاص پر ایمان رکھتی ہے، دوسری جماعت اسی زور و قوت کے ساتھ ان کو خائن اور ریاکار جانتی ہے۔ حالانکہ دونوں کے سامنے اُن کے اعمال کا ایک ہی نقشہ پیش رہتا ہے۔ مگر نتائج مختلف ہوتے ہیں اور دو میں سے کوئی اپنے دعویٰ پر کھلے دلائل نہیں رکھتا۔ اس لئے ایمان و کفر اور یقین و شک کے وجوہ منطقی طرزِ استدلال سے نہیں بلکہ زیادہ تر نفسیاتی اصول و قواعد سے ماخوذ ہیں۔

امام غزالی اور یقین اور اذعان کی صورتیں

امام غزالی نے الجام العوام میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی[1] ہے کہ واقعات کا اذعان اور یقین ہمارے اندر کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "عام مسلمانوں کو علمِ کلام کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو خدا نے اپنی توحید وصفات وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور یہ باتیں بدیہی نہیں کہ ان کے لئے دلائل کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح ہم کو پیغمبر کی تصدیق کی ضرورت ہے اور یہ تصدیق مسئلۂ معجزات پر غور وفکر کئے اور معجزہ کی حقیقت اور شرائط کے جانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اس بنا پر علمِ کلام کی اشد ضرورت ہے تو امام صاحب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ "عام مخلوق کو صرف ان چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے اور ایمان اس یقینِ جازم کا نام ہے جس میں تردد اور شک نہ ہو۔ اور اس میں خطا اور غلطی کا خیال اس کو نہ ہو۔ اس یقینِ جازم کے چھ درجے ہیں۔ جو چھ مختلف طریقوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ پہلا درجہ اس یقین کا ہے جو ایسے دلائل سے حاصل ہو جن میں برہان کے تمام منطقیانہ شرائط ایک ایک کرکے پائے جائیں اور ان دلائل کے مقدمات کا ایک ایک حرف اچھی طرح جانچ لیا گیا ہو۔ یہاں تک کہ کسی میں شک وشبہہ اور غلطی والتباس کا احتمال نہ رہا ہو۔ اس اصول کے مطابق تو بہت کم لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جن کو یقین کا یہ مرتبہ نصیب ہو سکے بلکہ ہر زمانہ میں ایک دو آدمی سے زیادہ اس معیار پر پورے نہیں اُتر سکتے۔ اگر نجات صرف اسی یقین پر منحصر ہو، تو نجات پانے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔ بلکہ انسانوں کے لئے دنیا کے واقعات پر یقین کرنے کی بہت کم گنجائش نکل سکے گی اور شاید ریاضیات کے علاوہ کہیں اور اس صورتِ یقین کا پیدا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

---

[1] الجام العوام عن علم الکلام۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اُن مسلمات سے یقین حاصل ہو جن کو عام طور سے لوگ مانتے ہیں اور اربابِ عقل کے حلقوں میں وہ مقبول و مشہور ہیں، جن میں شک کا اظہار کرنا لوگ معیوب سمجھتے ہیں اور نفوسِ انسانی ان کے انکار سے اِبا کرتے ہیں۔ ان مقدّمات سے استدلال بعض لوگوں میں ایسا یقینِ جازم پیدا کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا تزلزل راہ نہیں پا سکتا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اُن خطابیات کے ذریعہ سے یقین پیدا کیا جائے جن کو لوگ عام بول چال اور عملی کاروبار میں استعمال کیا کرتے ہیں اور عادۃً ان کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر طبعِ انسانی میں خاص طور سے اس مسئلہ کی طرف غیر معمولی انکار یا شدید تعصّب نہ ہو اور سامع میں تشکیک، مناظرہ اور خواہ مخواہ کرید اور حجت کی عادت نہ ہو اور اس کی فطرتِ صالحہ سادہ اور صاف ہو تو اس طریقہ سے اکثر افرادِ انسانی کو یقین کی دولت ہاتھ آسکتی ہے اور اسی لئے قرآن مجید نے اسی طرزِ استدلال سے اکثر کام لیا ہے۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ جس شخص کی دیانت اور ایمان داری پر یقین ہو اور اس پر کامل اعتقاد ہو، بکثرت لوگ اس کے مدّاح ہوں یا تم خود اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کی ہر بات کو صحیح باور کرتے ہو تو اس کا کہنا تمہارے اندر یقین پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے اپنے بزرگوں اور استادوں اور مرشدوں کے بیان کا حرف بحرف یقین کر لیتے ہیں۔ ایک بڑا شخص کسی کی موت کی خبر دیتا ہے تو ہر شخص اس کو باور کر لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو کسی کی سچائی یا پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کا یقین ہو جائے تو بلا پس و پیش اس کی ہر بات کو صحیح تسلیم کرے گا۔ چنانچہ حضرتِ صدیقؓ دیا اور اکابر صحابہؓ کو آنحضرت کے ساتھ جو حُسنِ اعتقاد تھا وہ اسی قسم کا تھا۔ اس لئے آپؐ جو کچھ فرماتے تھے اُن کو اس کے باور کرنے میں کسی دلیل و برہان کی حاجت نہ تھی۔

۵۔ حصول یقین کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ روایت کی صورتِ حال کی ایسے دوسرے قرائن سے تصدیق ہو جن سے گو ایک مناظرہ پسند اور حجت طلب شخص کی تشفی نہ ہو مگر عام اشخاص کی ان سے تسلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر شہر میں یہ عام خبر پھیلی ہوئی تھی کہ امیرِ شہر بیمار ہے، اسی اثنا میں قلعہ سے گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک شاہی غلام نے آکر روایت کی کہ امیر نے وفات پائی تو اس روایت کے تسلیم کر لینے میں عام لوگوں کو کوئی جائے انکار نہیں رہتی گو اس کی صحت کی راہ میں آپ بیسیوں عقلی احتمالات پیدا کرتے رہیں۔ یہی سبب ہے کہ کتنے اعرابی تھے جنہوں نے ایک دفعہ آنحضرتؐ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا یا آپؐ کی دل آویز اور پُر اثر باتیں سنیں یا آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کو مشاہدہ کیا اور بے دلیل و برہان آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے (کیونکہ انہوں نے پہلے آپؐ کی نبوت کا چرچا تو سنا تھا۔ لیکن اس دعوی کی صداقت نے ان کے دل میں پوری طرح گھر نہیں کیا تھا۔ مگر جب اتفاق سے آپؐ کے دیدار کا ان کو موقع ملا تو قرائنِ حال اور آثارِ قیافہ کے ذریعہ سے نیک و بد اور اچھے بُرے کی تمیز کا جو ایک خاص جوہر انسان میں ودیعت ہے اس نے فیصلہ کر دیا کہ یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط)

۶۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ جو روایت بیان کی جائے اگر وہ سامع کے مزاج، اخلاق اور خواہش کے مطابق اور مناسب ہو تو اس کے صحیح تسلیم کر لینے میں اس کو کبھی پس و پیش نہ ہوگا۔ اس حصولِ یقین میں نہ تو حسنِ اعتقاد کی ضرورت ہے اور نہ قرائن و آثار کی تائید کی۔ یہ فطری اور طبعی مناسبت خود حصولِ یقین کے لئے کافی ہے۔ (یہی سبب ہے کہ سابقینِ اسلام میں وہی صحابہؓ داخل ہیں جو فطرۃً نیک اور طبعاً راستی پسند اور جویائے حق تھے)

ان ہی مختلف طریقوں سے لوگ یقین اور اذعان کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور یہی طریقے غیبیات اور معجزات پر بھی یقین کرنے کے ہیں۔

معجزہ اور سحر کا فرق اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں، سحر، طلسم، نیرنگ، شعبدہ سے بھی اسی قسم کی باتیں دکھائی جا سکتی ہیں۔ سحر و طلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنی مسمریزم اور ہپنوٹزم کے سمجھ لئے جائیں۔ ایسی صورت میں ایک پیغمبر اور ساحر و شعبدہ باز اور مسمریزر کے درمیان کیا فرق ہو ہوگا؟ یہ سوال ہے جس پر علمِ کلام میں بڑی بڑی بحثیں ہیں۔ معتزلہ اور ارباب ظواہر میں علامہ ابنِ حزم کا یہ دعویٰ ہے کہ معجزہ کے علاوہ سحر و طلسم و شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریبِ نظر ہیں۔ لیکن معجزہ سے قلب حقیقت اور تبدیلِ خاصیت ہو جاتی ہے۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے جو عظیم الشان عجائب سرزد ہوتے ہیں مثلاً سمندر کا خشک ہونا، چاند کا شق ہو جانا وغیرہ۔ یہ چیزیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتیں۔ حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جوابات سے اشکال کی اصلی گرہ نہیں کھلتی۔ ایک شخص اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بظاہر ایک خارقِ عادت کرشمہ پیش کرتا ہے۔ اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکا اور نظر بندی ہے یا رمزِ الٰہی ہے یا معمولی کام ہے یا عظیم الشان کارنامہ ہے، نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ ان اشیاء کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز نمایاں نہیں ہو سکتا۔ نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہوئی یا شر میں یا یہ کہ ضروری ہے کہ یہ خوارقِ عادت محلِ خیر میں صرف ہوں یا محلِ شر میں، اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں ہو سکتی، بہت کچھ قابلِ بحث ہے۔ ایک مسمریزر اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج کرتا ہے۔ یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے۔ تو کیا آپ اس کو

معجزہ کہہ دیں گے؟

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائباتِ امور میں دو عظیم الشان فرق ہیں۔ ایک یہ کہ معجزہ براہِ راست خدا کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائبِ امور اسبابِ طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعدائے دعوتِ الٰہی کی ہلاکت یا مبلغِ رسالت کی تائید اور مومنین صادقین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے۔ محض کھیل تماشہ، شعبدہ بازی اور بازی گری اس کا مقصد نہیں ہوتی اور سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل بن جاتی ہے، یہ ہے کہ ساحر و بازی گر و شعبدہ باز صرف تماشہ، کرتب اور عجائبات دکھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی، ارادوں کی بے گناہی، دلوں کی طہارت اور صفائی، شریعت الٰہی کی تبلیغ، قلوب کے تزکیہ اور سیہ کاریوں کے قلع و قمع کے نہ وہ مدعی ہوتے ہیں اور نہ یہ خواص اور کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن انبیاءؑ کی معصوم زندگی، پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص و کیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں۔ قدم قدم پر خدا ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے۔ اُن کی صدائے حق جماعتوں، قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی سچائی، راستی اور صداقت پر ان کے سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے۔ وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق و صفا کی مُہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ مگر کافر کو مومن، بدکار کو عفیف، بے باک کو متقی، بخیل کو فیاض، سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا۔ وہ لوہے کو زرِ خالص کی صورت میں بدل سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا۔

یہ ظاہری اشتباہ اور التباس صرف نبی اور ساحر و متنبی (جھوٹے پیغمبر) ہی میں

نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ اور ملی جلی ہوئی ہے۔ صبر اور بے حمیتی، توکل اور کاہلی، بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف، حق گوئی اور گستاخی، شجاعت اور تہوّر، ان کے ڈانڈے باہم اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ انسان کی قوّتِ ممیزہ کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے۔ لیکن اہلِ نظر ان دونوں حقیقتوں کے ظاہر تشابہ سے فریب میں نہیں آتے۔ ان دونوں کی ظاہری شکل وصورت گو ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص وآثار اس درجہ متفاوت اور متمائز ہیں کہ ایک دوسرے کی حدود اور فرق وامتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری حیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لئے گو دونوں ایک ہوں، مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ، پاکیزگی کا فرشتہ، شریعت کا حامل، گنہگاریوں کا طبیب اور قلوب کا معالج ہوتا ہے، اور دوسرا محض تماشاگر یا شعبدہ باز یا مصنوعی حیلہ گر اور نقال۔

ایک عطائی اور طبیب حاذق، ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جنرل، ایک حرف شناس اور ماہر علوم، ایک مکار اور زاہد، ایک مصنوعی اور حقیقی صوفی کے درمیان شاید کبھی عوام فرق نہ کر سکیں، مگر جب ان دونوں کے آثار وخصائص اور علامات وقرائن باہم ملائے جائیں تو ظلمت ونور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہوتا ہے۔

مولانا روم نے اس فرقِ مراتب کو مثنوی میں نہایت عمدہ تشبیہات کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ ہیں — فرق شاں ہفتاد سالہ راہ ہیں

اس طرح کی لاکھوں ہم شکل چیزیں ہیں — لیکن ان میں کوسوں کا فاصلہ ہے

ہر دو صورت گر بہم ماند رواست — آبِ تلخ وآبِ شیریں راصفاست

دونوں کی صورتیں اگر باہم مشابہ ہوں تو کچھ حرج نہیں — میٹھا اور تلخ پانی دونوں کا رنگ ایک ہی طرح صاف ہوتا ہے۔

ہر دو یک گل خوردہ زنبور و نحل — لیک شد زان نیش و زیں دیگر عسل

بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہیں — لیکن اُس سے زہر اور اِس سے شہد پیدا ہوتا ہے

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب — زیں یکے سرگیں شد و زاں مشکناب

دونوں قسم کے ہرن ایک ہی گھاس کھاتے اور ایک ہی پانی پیتے ہیں۔ مگر اِس سے مینگنی اور اُس سے مشک پیدا ہوتا ہے۔

ہر دو نے خوردند از یک آب خور — آں یکے خالی و آں پُر از شکر

دونوں قسم کی نے ایک پانی سے پرورش پاتی ہیں — لیکن ایک مزہ سے خالی اور دوسرے سے شکر پیدا ہوتی ہے۔

ایں خورد زاید ہمہ بخل و حسد — و آں خورد آید ہمہ نورِ اَحد

ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے بخل و حسد پیدا ہوتا ہے — اور دوسرا وہی غذا کھاتا ہے اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے۔

ایں زمیں پاک ست و آں شورست و بد — ایں فرشتہ پاک و آں دیو است و دد

یہ زمین سیر حاصل ہے اور وہ بُری اور بنجر ہے — یہ مقدس فرشتہ ہے اور وہ شیطان اور جانور۔

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں درمیاں — درمیاں شاں "برزخٌ لا یبغیاں"

شیریں اور تلخ سمندر ملے ہوئے ہیں مگر ان کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے جس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

زرِّ قلب و زرِّ نیکو در عیار — بے محک ہرگز نہ دانی اعتبار

کھوٹے اور کھرے سونے کی تمیز — کسوٹی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

صالح و طالح بہ صورت مشتبہ — دیدہ بکشا ہی کہ گردی منتبہ

نیک اور بد کار کی صورتیں ملتی جلتی ہیں — آنکھیں کھولو تو تمیز ہو سکے گی۔

بحرِ را نیمیش شیریں چو شکر — طعمِ شیریں، رنگ روشن چوں قمر

دریا کا آدھا حصہ شکر کی طرح شیریں ہے — مزا میٹھا اور رنگ چاند کی طرح سپید ہے

نیم دیگر تلخ ہم چوزہر مار
طعم تلخ و رنگ مظلم قیر وار

دوسرا نصف حصہ سانپ کے زہر کی طرح ہے
مزا کڑوا اور رنگ تار کول کی طرح سیاہ ہے۔

اے بسا شیریں کہ چو شکر بود
لیک زہر اندر شکر مضمر بود

بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو شکر کی طرح میٹھی ہیں
لیکن ان کے باطن میں زہر چھپا ہے۔

جز کہ صاحب ذوق نشناسد بیاب
او شناسد آب خوش از شور آب

صاحب ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے
وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری۔

جز کہ صاحب ذوق بشناسد طعوم
شہد را نا خوردہ کے داند ز موم

صاحب ذوق کے سوا مزے کی تمیز اور کون کر سکتا ہے۔
جب تک شہد کو نہ کھاؤ موم اور شہد میں کیونکر تمیز کر سکتے ہو۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس
ہر دو را بر مکر پندارد اساس

اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا
اور سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے۔

ہر کرا در جان خدا بنہد محک
ہر یقین را باز داند از شک

خدا نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہے
وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے۔

چوں شود از رنج و علت دل سلیم
طعم صدق و کذب را باشد علیم

جب آدمی کے دل میں بیماری نہیں ہوتی
تو وہ صدق اور کذب کے مزے کو پہچانتا ہے

اب صرف یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ جو قوت حیرت زا خوارق کی قوت رکھتی ہے، اس کا رُخ بھی نہایت آسانی کے ساتھ بدلا جا سکتا ہے۔ یعنی ساحر بے تکلف اپنی ساحرانہ قوت کو دنیا کے تزکیۂ اخلاق و اصلاحِ عالم میں صرف کر سکتا ہے اور اس سے کوئی محالِ عقلی لازم نہیں آتا۔ لیکن امکانِ عقلی اور امکانِ واقعی دو مختلف چیزیں ہیں۔ یہ عقلاً ممکن ہے کہ ہر شخص بادشاہ ہو سکتا ہے۔ عالم عصر ہو سکتا ہے۔ کشور کشا ہو سکتا ہے۔ مگر واقعاً اور عملاً یہ قدرت ہر شخص کو

حاصل نہیں ہوتی۔

اس لئے ساحر محض ایک تماشا گر ہوتا ہے۔ اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس قوت سے تزکیۂ نفوس، تطہیرِ اخلاق اور اصلاحِ عالم کا کام لے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ساحر اور شعبدہ گر نے اصلاحِ عالم کا فرض ادا نہیں کیا۔ لیکن پیغمبر اپنے معجزانہ کارناموں سے دنیا کو اُلٹ دیتا ہے، بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل و ریحان سے اس خاکدانِ عالم کو سجا دیتا ہے۔

معجزہ دلیل نبوت ہو سکتا ہے یا نہیں اسی تقریر سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں؟ اشاعرہ کا جواب اثبات میں اور معتزلہ کا نفی میں ہے۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر کن بحث ابنِ رُشد نے کشف الادلہ میں کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ مثلاً جب ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے قوم کے عقائد و اعمال اور اخلاق کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوا ہے۔ لیکن جب اس سے اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے دلیل طلب کی جاتی ہے تو وہ خشک چشمے کو پانی سے لبریز کرتا ہے، چاند کو دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے۔ یہ تمام واقعات اگرچہ نہایت عجیب و غریب ہیں۔ لیکن ان دلائل کو دعویٰ کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

فرض کیجئے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا ماہر ہے اور اس کے ثبوت میں انسان کو جانور اور جانور کو انسان بنا دیتا ہے، تو اس واقعہ سے اس کے فلسفہ اور ریاضی کا کمال کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے؟ اشاعرہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اسی کمال کے اظہار کے لئے معجزہ طلب کیا جاتا

ہے۔ اور انبیاءؑ کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جاتا ہے۔ اخبارِ بالغیب اور تصرّف فی الکائنات، اور ان دونوں کو اجزائے نبوّت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے۔ اخبارِ بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرّف فی الکائنات سے اس کی عملی قوّت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ خرقِ عادت کا نام ہے۔ اس میں کوئی نزاع نہیں کہ اشیاء اور حقائق کے خصائص اور علل خدا کے امر و حکم سے ہیں۔ اب جو شخص ان خصائص و علل کو اپنے معجزہ سے توڑ دیتا ہے، وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے ان اسباب و علل کو بنایا ہے وہی اس کو توڑ سکتی ہے اور یہ شکست و خرق چونکہ اس کے واسطہ سے ظاہر ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اُسی کا فرستادہ ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا ہے۔ رعایا پوچھتی ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم بادشاہی قاصد ہو؟ وہ اس کے جواب میں بادشاہ کی مُہر اور انگوٹھی پیش کرتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعوائے پیامبری کو مُہر اور انگوٹھی سے براہِ راست کوئی مناسبت نہیں۔ لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ مُہر اور انگوٹھی بادشاہ ہی کی نشانی ہے جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نشانی دے کر بھیجا گیا ہے۔

علمِ کلام کی کتابوں میں ایک عام مثال یہ دی جاتی ہے کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی دربار اور جلوس کے رسم و آداب خاص ہوتے ہیں۔ بادشاہ دربار میں معمولی فرش پر نہیں بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے۔ جلوس میں وہ پا پیادہ نہیں، بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے۔ ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمعِ عام میں آتا ہے۔ یہ مجمع اس کو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قاصد بادشاہ سے کہتا ہے کہ اے بادشاہ! اگر میں حقیقۃً تیرا

فرستادہ ہوں تو رسم وعادت کے خلاف تو فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل۔ بادشاہ اس کے مطابق دربار میں فرش پر جلوس کرتا ہے اور پیادہ پا چلتا ہے۔ بادشاہ کا یہ عمل یقیناً اس بات کی تصدیق ہوگی کہ وہ شاہی قاصد ہے۔ اسی طرح دنیا کے اسباب وعلل، اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کے رسوم وعادات ہیں۔ پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ کفار اس کے قاصدِ الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے اے خدا اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنی رسوم وعادات کے خلاف معجزہ اور خرقِ عادت دکھا۔ وہ دکھاتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔

لیکن معجزہ اگر دلیلِ نبوت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کا استدلال ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو برہان یقینی نہیں کہا جا سکتا، تاہم دلیل کا انحصار صرف برہانیات میں نہیں ہے، بلکہ اس کی اور بھی متعدد قسمیں ہیں اور معجزہ ان مقدمات میں داخل ہو سکتا ہے۔

ابن رشد نے کشف الادلہ میں معجزہ کو خطابیات میں داخل کیا ہے۔ یعنی معجزہ اگرچہ نبوت پر بالذات یقینی طور پر دلالت نہیں کرتا تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلۂ کائنات میں عجیب وغریب تصرف کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہر شخص اس کے کمال روحانی کا اعتراف کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور اپنے دعویٰ میں صادق ہوگا۔ ان دونوں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاح روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں، تاہم عوام کی دلفریبی کے لئے یہ کافی ہے۔

لیکن اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلماتِ خصم سے استدلال کیا جاتا ہے اور تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاس جدل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ زمانۂ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ہوتے ہیں، ان میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت قوتِ ضرور

ہوتی ہے اور وہی پیغمبر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس بنا پر جب کوئی پیغمبر کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس مورثی اور مسلّمہ عقیدہ کی بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے۔ یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لئے دلیل و حجت نہیں ہو سکتا تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیلِ نبوّت ہے اور ان ہی کے طلب و اصرار سے اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے، اُن کو اس کے ذریعہ سے ساکت کیا جاتا ہے اور وہ اُن کے لئے دلیل ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان اس بحث میں خلطِ مبحث ہو گیا ہے۔ اشاعرہ کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیلِ نبوّت ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے اور معتزلہ کا اعتراض اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اشاعرہ اس کو منطقی دلیل کہیں۔ دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورہ میں نہیں بلکہ عام اور لفظی معنی (نشان) میں استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر جب معجزہ سرے سے دلیلِ منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ انواعِ دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بے سود ہے۔ چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوّت پر دلالتِ عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔ شرحِ مواقف بحثِ معجزات میں ہے:۔

وھذہ الدلالۃ لیست دلالۃ	معجزہ کی دلالت نبوّت پر محض دلالتِ
عقلیۃ محضۃ کدلالۃ	عقلی نہیں ہے جیسے فعل کی دلالت وجود
الفعل علی وجود الفاعل و	فاعل پر یا فعل کے استحکام و نظم کی دلالت
دلالۃ احکامہ واتقانہ علیٰ	فاعل کے علم پر عقلی ہے کیونکہ دلائل عقلی
کونہ عالما بما صدر عنہ فان	اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں
الادلۃ العقلیۃ ترتبط نفسہ	اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول

بمدلولاتها ولایجوز تقدیرها
غیر دالة علیها ولیست المعجزة
کذلك بل هی دلالة عادیة
کما اشار الیه بقوله وهی عندنا
ای الاشاعرة اجراء الله عادته
بخلق العلم بالصدق عقیبه
ای عقیب ظهور المعجزات

پر دال نہ ہوں۔ اور معجزہ کی دلالت کی
صورت ایسی نہیں ہے۔ بلکہ معجزہ کی دلالت
دلالتِ عادیہ ہے۔ جیسا کہ صاحبِ مواقف
نے اپنے ان لفظوں میں کہا ہے کہ یہ دلالت ہمارے
(اشاعرہ کے) نزدیک اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ
کی عادت یہ ہے کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو
صاحبِ معجزہ کی سچائی کا علم وہ لوگوں کے دلوں
میں پیدا کر دیتا ہے۔

آج کل کے محاورۂ علمی میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ "معجزہ کی دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے" یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی (سائیکالوجیکل) دلیل ہے۔ عادتِ انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت وکبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارقِ عادت اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

آج گو نبوّت نہیں مگر ولایت ہے۔ آج بھی جس شخص کی نسبت باخُدا اور ولیٔ کامل ہونے کا خیال لوگوں میں ہوتا ہے تو فوراً یہ سوال ہوتا ہے کہ اُن سے کچھ کرامتیں بھی صادر ہوتی ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ملا اور خود ذاتی مشاہدہ بھی ہوا تو اس شخص کی نسبت حُسنِ اعتقاد بڑھ جاتا ہے۔ یہ عام تقاضائے انسانی ہے۔ اس میں مومن و کافر، عقلمند و بے وقوف اور فرنگی و فرنگی کی کوئی تخصیص نہیں۔

لیکن جو طبیعتیں فطرۃً اثر پذیر نہیں، بلکہ معاند، متعصب اور کور باطن ہیں، اُن کے لئے یہ خوارق و معجزات قطعاً بے سود ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا عناد، تعصب اور کور باطنی حُسنِ ظن کے بجائے ہمیشہ سُوءِ ظن کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور وہ بڑے سے بڑے معجزہ کو بھی دیکھ کر یہی کہہ دیتے ہیں کہ سحر و جادو اور طلسم و نیرنگ ہے۔ اس لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ مدعیٔ نبوت کے اخلاق، خلوص، پاکیزگی و طہارت کا امتحان کیا جائے۔ جس میں یہ باتیں ثابت ہو جائیں گی، عادۃً ناممکن ہے کہ وہ کاذب اور جھوٹا ہو۔ امام غزالی نے منقذ میں، امام رازی نے مطالب عالیہ میں اور عارفِ روم نے مثنوی میں نہایت تفصیل سے اس بحث کو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ نبوت کی اصلی دلیل معجزہ نہیں بلکہ تعلیم و ارشاد اور قوتِ علم و عمل کا کمال ہے۔

امام غزالی کی تقریر نبوت کے کچھ آثار و خواص ہیں۔ اگر کسی شخص کی نسبت یہ شبہہ ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں تو اس کا علم صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہو سکتا ہے۔ یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہو، جیسی صحابہؓ کو تھی۔ یا خبرِ متواتر سے اور سُن کر ہو، جیسی اب عام لوگوں کی ہے۔ نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی جس میں ہوتی ہے، وہی آمادۂ تصدیق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر تم کو طب اور فقہ سے کچھ واقفیت ہے اور ان کا ذوق رکھتے ہو، تو جو شخص فقیہہ یا طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کے احوال کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سُن کر فوراً فیصلہ کر سکتے ہو کہ یہ طبیب یا فقیہہ ہے یا نہیں اور اسی طرح تم امام شافعی کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کر سکتے ہو۔ گو آج امام شافعی اور جالینوس کا وجود نہیں، مگر ان کی سوانح اور تصنیفات پڑھ کر اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ امام شافعی فقیہِ کامل اور جالینوس طبیبِ حاذق تھے یا نہیں۔ اسی طرح گو آنحضرتؐ ہمارے درمیان نہیں۔ مگر آپؐ کی سیرتِ مبارکہ، آپؐ کی شریعت، آپؐ کی تعلیمات، آپؐ کے ارشادات

موجود ہیں جن سے آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہر شخص کر سکتا ہے۔ اسی معیار سے کسی مدعی نبوت کے دعویٰ پر یقین کرنا چاہیئے، لاٹھی کے سانپ اور قمر کے شق ہونے سے نہیں۔ کیونکہ اگر ان خوارق پر نظر ڈالو اور دوسرے بے شمار قرائن اور شہادتوں کو ان کے ساتھ نہ ملاؤ تو ممکن ہے کہ یہ خطرہ پیدا ہو کہ یہ جادوگری اور نظر بندی ہے۔[1]

امام رازی کی تقریر امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت اور متعلقاتِ نبوت کی بحث سب سے زیادہ استیعاب سے لکھی ہے۔ ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ نبوت کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں دو جماعتیں ہیں۔ ایک کا مذہب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل معجزہ ہے۔ یہ جمہور اہل مذاہب کا مسلک ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو خود غور کرنا چاہیئے کہ صداقت و راستی کیا ہے۔ اس کے بعد ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو نبوت کے دعویٰ کے ساتھ لوگوں کو دینِ حق کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی دعوت مؤثر ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو باطل پرستی سے ہٹا کر حق پرستی کی طرف لا رہی ہے تو ہم یقین کر لیں گے کہ یہ سچا پیغمبر ہے۔ یہ مذہب عقل سے قریب تر ہے اور اس راہ میں شکوک و شبہات کم ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانیت کا کمال قوتِ علمی و عملی کی تصحیح، تکمیل اور تزکیہ ہے۔ اس قوت کے لحاظ سے انسان کے تین طبقے ہیں۔ ایک وہ جو اس میں ناقص ہے۔ یہ عام انسان ہیں۔ دوسرا وہ جو خود کامل ہے مگر دوسروں کو کامل نہیں بنا سکتا۔ یہ خواص اور صلحا کا درجہ ہے۔ تیسرا وہ جو خود کامل ہے اور دوسروں کو بھی کامل کر دیتا ہے۔ یہ انبیاءؑ ہیں۔ اس کمال و نقص کے ہزاروں متفاوت درجے اور مرتبے ہیں اور ان ہی کے لحاظ سے اُن کی قوت و مرتبہ کا اندازہ ہوگا۔ ان کی قوتِ علمی کے سامنے تمام مقدمات بدیہی ہوتے ہیں۔

---

[1] المنقذ من الضلال۔

اور معارفِ الٰہی پر ان کو عبور ہوتا ہے اور ان کی قوتِ عمل اس عالمِ جسمانی میں تصرفات کرتی ہے اور یہی معجزات کا مقصد ہے۔ اس قوتِ علمی و عملی کے کمال کے ساتھ یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو ان دونوں میں پست اور ناقص ہیں، اپنے فیضِ صحبت اور فیضِ تعلیم سے کامل کر دیتے ہیں اور امراضِ قلبی کا علاج کرتے ہیں، تو یہی ان کی نبوت کی دلیل ہے۔

امام رازی نے اس تفصیل کے بعد یہ دعوی کیا ہے کہ اثباتِ نبوت کا یہی طریقہ قرآن مجید نے اختیار کیا ہے اور چند سورتوں کی تفسیر لکھ کر دکھایا ہے کہ ان میں نبوت کے یہی آثار و خصائص بیان ہوئے ہیں[1]

مولانا روم کے حقایق مولانا روم نے اس بحث کو عمدہ تشبیہات اور تمثیلات سے اس درجہ قریب الفہم بنا دیا ہے کہ تمام شکوک و شبہات دفع ہو جاتے ہیں۔ اس سے پہلے مولانا کے وہ اشعار لکھے جا چکے ہیں جن میں یہ دکھایا ہے کہ نبوت کی تصدیق کے لئے سب سے پہلی چیز حُسنِ ذوق ہے۔ آبِ شیریں اور آبِ شور صورت و شکل اور رنگ و بو دونوں میں ایک ہوتے ہیں۔ مگر صرف صاحبِ ذوق ان دونوں کا فرق محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح نبی اور متنبی کو ظاہری شکل و صورت اور دعوائے نبوت میں یکساں نظر آتے ہیں مگر صاحبِ ذوق ان دونوں کے آثار و خصائص سے فوراً تمیز کر لیتا ہے:۔

جز کہ صاحب ذوق نشناسد بیاب — او شناسد آبِ خوش از شورِ آب

غور کر، صاحبِ ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے — وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری ہے۔

جز کہ صاحب ذوقِ نشناسد طعوم — شہد را نا خوردہ کے داند ز موم

---

[1] مطالب عالیہ کا پیش نظر قلمی نسخہ ناقص ہے۔ یہ فصل راغب پاشا نے اپنے سفینہ میں تمام و کمال نقل کی ہے اور مولانا شبلیؒ نے الکلام کے ضمیمہ میں اس کو شائع کر دیا ہے۔ دیکھو سفینۂ راغب پاشا۔

صاحبِ ذوق کے سوا مزے کی تمیز اور کون کر سکتا ہے
اگر شہد نہ کھایا ہو تو موم اور شہد میں تمیز کیونکر کر سکتے ہو

سحر را با معجزہ کردہ قیاس
ہر دو را بر مکر پندارد اساس

اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا
اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب ہے۔

زرِ قلب و زرِ نیکو در عیار
بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار

تم کھوٹے اور کھرے سونے کا فرق
کسوٹی پر پرکھے بغیر نہیں کر سکتے۔

ہر کرا در جاں خدا بنہد محک
ہر یقین را باز داند اُو ز شک

خدا نے جس کی روح میں یہ کسوٹی رکھی ہے
وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے۔

چوں شود از رنج و علت دل سلیم
طعمِ صدق و کذب را باشد علیم

جب آدمی کا دل بیماری سے پاک ہو
تو وہ صدق و کذب کے مزہ کو پہچان لے گا۔

دوسری چیز طلب ہے۔ جب تک دل میں کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ جس کا دل صداقت و راستی کا بھوکا نہیں وہ غذائے روحانی کا طالب نہیں۔ اور جب دل میں طلب اور روح میں بے قراری پیدا ہو جاتی ہے اس وقت وہ دلیل و برہان کے لفظی مباحث سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ کسی کو اگر پیاس ہو اور وہ تم سے پانی طلب کرے اور تم پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کرو کہ یہ پانی ہے تو کیا وہ تمہارے اس دعوے پر دلیل مانگے گا کہ پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ پانی ہے یا نہیں؟ بلکہ وہ بلا دلیل نہایت شوق سے اپنا ہاتھ بڑھائے گا اور پانی پینے لگے گا۔

تشنۂ را چوں بگوئی رو شتاب
در قدح آب است بستان زود آب

جب کسی پیاسے کو کہو کہ جلد جاؤ
دیکھو وہ پیالہ میں پانی ہے۔

ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است رو
از برم اے مدعی! مہجور شو

کیا کوئی پیاسا اس وقت یہ کہتا ہے کہ یہ فقط تمہارا دعویٰ ہی ہے چلو ہٹو۔

یا گواہ و حجتی بنما کہ ایں　　جنس آب است و ازاں ما معین

یا کیا وہ کہتا ہے کہ پہلے اس دعویٰ کی دلیل لاؤ۔ یہ پانی ہے۔

یا بہ طفلِ شیر، مادر بانگ زد　　کہ بیا من مادرم ہاں اے ولد

یا جب شیر خوار بچہ کو اس کی ماں بلا کر کہتی ہے کہ اے بچہ! میں تیری ماں ہوں۔

طفل گوید مادرا حجت بیار　　تاکہ با شیرت بہ گیرم من قرار

تو بچہ یہ کہتا ہے کہ اپنی ماں ہونے پر دلیل پیش کرو۔ تب میں تمہارا دودھ پیوں گا۔

در دلِ ہر اُمتی کز حق مزہ است　　روئے و آوازِ پیغمبر معجزہ است

جس کے دل میں حق کا مزہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے خود پیغمبر کا چہرہ اور پیغمبر کی آواز معجزہ ہوتی ہے۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند　　جانِ اُمّت در درون سجدہ کند

جب پیغمبر باہر سے آواز بلند کرتا ہے تو　　اُمت کی روح اندر ہی اندر سجدہ کرتی ہے۔

زانکہ جنسِ بانگ او اندر جہاں　　از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جاں

سبب یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی آواز کی سی کوئی آواز روح کے کانوں نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔

تیسری چیز اتحادِ جنسیت ہے۔ معجزات کا مقصد عموماً معارض کو لاجواب اور خاموش کرنا ہوتا ہے۔ لاجواب و خاموش کر کے تم خصم کو زیر کر سکتے ہو۔ مگر اس کے دل میں تشفی نہیں پیدا کر سکتے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی اور راستی کا عنصر ہے وہ خود اپنی ہم جنس شے کے طلب گار اور خریدار ہوتے ہیں۔

موجبِ ایمان نباشد معجزات　　بوئے جنسیت کند جذبِ صفات

درحقیقت معجزات ایمان کا باعث نہیں ہوتے　　بلکہ اتحادِ جنسیت کی بو اس کی صفات کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

معجزات از بہر قہر دشمن است　　بوئے جنسیت سوئے دل بردن است

معجزات تو مخالفت کو دبانے کے لئے ہوتے ہیں　　اور اتحادِ جنسیت کی بُو دل کو متاثر کرنے کے لئے ہے۔

قہر گردد دشمن اما دوست نے　　دوست کے گردد بہ بستہ گردنے

دبا کر تم دشمن کو زیر کر سکتے ہو مگر دوست نہیں بنا سکتے　　جس کو زبردستی گردن باندھ کر زیر کر دو وہ دوست کیونکر ہو سکتا ہے۔

معجزات کا صدور اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ معاندین یہ سمجھ کر کہ پیغمبر کاذب ہے، اس سے کسی خرقِ عادت کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ یقین کرتے ہیں کہ وہ اس کو پیش نہیں کر سکتا اور اس طریقہ سے لوگوں میں اس کی رسوائی ہوگی اور اس کے دعویٰ کی تکذیب ہو جائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس خرقِ عادت کو ظاہر کر دیتا ہے اور اس سے پیغمبر کی رسوائی اور فضیحت کے بجائے اس کی صداقت اور راست بازی اور عالم آشکارا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر معجزہ اُس کے صدق پر ایک نشانی اور آیت بن جاتا ہے۔ فرعون نے جادوگروں کو جمع کر کے چاہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسوا کرے، مگر یہی واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور فرعون کی ناکامی کا سبب بن گیا اور سینکڑوں جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کر دی اس بنا پر معاندین کا وجود اعلانِ نبوت کی بلند آہنگی اور شہرت کے لیے ضروری ہے۔

منکراں را قصد از لالِ ثقات　　ذل شدہ عزو ظہورِ معجزات

مخالفوں کا یہ ارادہ کہ طلب معجزہ سے نیکوکاروں کو لغزش دے دیں ان کی ذات اور معجزات کے غلبہ و عزت کا باعث ہو گیا۔

قصدِ شان زاں کار ذلِ ایں بدہ　　عینِ ذل عزِ رسولاں آمدہ

ان کا ارادہ اس طلب معجزہ سے پیغمبر کی ذلت تھی، لیکن یہ تذلیل کا ارادہ پیغمبروں کی عزت کا باعث ہو جاتا ہے

گر نہ انکار آمدے از ہر بدے　　معجزہ برہان چرا نازل شدے

اگر کوئی بدکار پیغمبر کا انکار نہ کرتا　　تو معجزہ برہان بن کر کیوں نازل ہوتا۔

خصم منکر تا نہ شد مصداق خواہ — کے کند قاضی تقاضائے گواہ

جب تک فریق دوم دعویٰ سے منکر اور خواہان تصدیق نہ ہو قاضی گواہ و شاہد کب طلب کرتا ہے۔

معجزہ ہمچوں گواہ آمد زکی! — بہر صدقِ مدعی در پیشگی

اسی طرح اے عقل مند! معجزہ بھی پیغمبر کا گواہ ہے جو مدعی کی تصدیق کے لئے سامنے آیا ہے۔

طعنہ چوں می آمد از ہر ناشناخت — معجزہ می داد حق و بنواخت

جب کوئی ناشناس طعنہ کرتا تھا۔ تو خدا پیغمبر کو معجزہ دے کر نوازش فرماتا تھا۔

مکر آں فرعون سی صد تو شدہ — جملہ ذلِ او و قمعِ او شدہ

فرعون موسیٰؑ کے مقابلہ میں سینکڑوں چالیں چلا مگر ان میں سے ہر ایک خود اسی کی ذلت اور بیخ کنی کا باعث ہوئی۔

ساحراں آوردہ حاضر نیک و بد — تا کہ جرحِ معجزہ موسیٰؑ کند

اس نے اچھے بُرے ہر قسم کے جادوگر جمع کئے۔ تاکہ موسیٰؑ کے معجزہ کو باطل کرے۔

تا عصا را باطل و رسوا کند — اعتبار او ز دلہا بر کند

اور عصائے موسیٰؑ کی قوت کو باطل و رسوا کر دے۔ اور لوگوں کے دلوں سے اس کے اعتبار کو کھوئے

عینِ آں مکر آیتِ موسیٰؑ شدہ — اعتبارِ آں عصا بالا شدہ

لیکن عین یہی سازش موسیٰؑ کی صداقت کی نشانی ہو گئی اور اس سے اس عصا کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

معجزہ سے مقصود اگر معاندین کو خاموش اور رسوا کرنے کے علاوہ ان کے دلوں کو متاثر کرنا ہوتا تو اس کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی کہ عصا کو سانپ بنایا جائے اور قمر کو دو ٹکڑے کر دیا جائے اور اس کے ذریعہ سے قلوب کو متاثر کیا جائے۔ ان جمادات و نباتات پر تصرف کر کے قلوب میں تصرف کرنے سے زیادہ صاف اور سیدھا راستہ

یہ تھا کہ براہِ راست خود دلوں میں تصرّف کیا جائے کہ وہ صدائے نبوّت کے سننے کے ساتھ لبیک پکار اٹھیں۔ معاندین کا معجزہ طلب فرقہ جو انبیاءؑ سے جمادات و نباتات پر ان کے اثرات کا طالب ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قبولِ ایمان پر آمادگی ظاہر کرتا ہے، خود ان کی یہ طلب ان کے ضمیر کی پستی اور قلب کی سیاہی کی دلیل ہے۔ جن کے آئینۂ دل پاک و صاف ہوتے ہیں وہ بلا واسطۂ جمادات و نباتات، پیغمبر سے براہِ راست خود اس اثر کو قبول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ معجزہ سے ہر شخص کو ہدایت نہیں ملتی۔ اس کے لئے بھی استعداد کی ضرورت ہے۔ دریا کی طراوت اور اُس کے روح افزا ہونے میں شک نہیں، لیکن اس میں خشکی کے پرند زندہ نہیں رہ سکتے۔

معجزہ کاں بر جماداتے اثر　　یا عصا یا بحر یا شق القمر

معجزہ جو بے جان چیزوں پر اثر و تصرّف کرتا ہے، مثلاً عصا کا سانپ ہو جانا، سمندر کا پھٹ جانا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔

گر اثر بر جان زند بے واسطہ　　منفصل گردد بہ پنہاں رابطہ

اگر وہ معجزہ براہِ راست روح کو متاثر کرے۔ تو اندر اندر روح سے اس کا رابطہ پیدا ہو۔

بر جمادات آں اثر ہا عاریہ است　　آں پئے روحِ خوشِ متواریہ است

لیکن غیر ذی روح چیزوں پر اس کا اثر عاریتہً ہے اور روح کے لئے وہ پوشیدہ ہے۔

تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر　　جنبد انساں بے ہیولائے خمیر

مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس غیر ذی روح شے کی اثر پذیری کو دیکھ کر روحِ انسانی اثر پذیر ہو۔

بر زند از جانِ کامل معجزات　　بہ ضمیر جانِ طالب چوں حیات

لیکن معجزہ روحِ کامل کو خود بے واسطہ اور براہ راست متاثر کرتا ہے اور طالب کے لئے زندگی ہوتا ہے۔

معجزہ بحر است و ناقص مرغِ خاک　　مرغِ خاکی رفت دریم شد ہلاک

معجزہ کی مثال دریا کی ہے اور ناقص کی خشکی کے پرندہ کی۔ خشکی کا پرندہ دریا میں جائے گا تو ڈوب جائے گا۔

مرغِ آبی در وے ایمن از ہلاک　　ماہیاں را مرگ بے دریاست خاک

لیکن آبی پرندہ اس میں جائے تو موت سے بے پرواہ رہے گا۔ بلکہ مچھلیوں کے لئے تو دریا کے بغیر خشکی موت ہے۔

الغرض ناقصین اور معاندین کے لئے جس طرح صدقِ نبوت کے دوسرے دلائل بے کار ہوتے ہیں، معجزہ کی شہادت بھی بے کار ہوتی ہے۔ معجزہ طلب فرقہ شاذ و نادر ہی دولتِ ایمان پاتا ہے۔ لیکن وہ ہستیاں جو براہِ راست پیغمبر کے وجود سے اثر پذیر ہوتی ہیں ان کو قبولِ اثر کے لئے معجزہ کے واسطہ کی حاجت نہیں۔ ابوجہل معجزہ جمادات دیکھ کر بھی کافر ہی رہا اور ابوبکرؓ معجزۂ دل سے صدیق اکبر ہوئے۔

از ستیزہ خواست بوجہل لعین　　معجزات از مصطفیٰ شاہِ مبیں

ابوجہل نے عناد سے آنحضرتؐ سے معجزہ طلب کیا۔

معجزہ جست از نبی بوجہل سگ　　دید و نفزود ش ازاں الّا کہ شک

لیکن یہ معجزہ دیکھ کر بھی شک کے سوا اس کو یقین نہ پیدا ہوا۔

لیک آں صدیقِ حق، معجز نخواست　　گفت ایں رُو خود نہ گوید غیرِ راست

لیکن ابوبکر صدیقؓ نے معجزہ طلب نہ کیا انہوں نے کہا کہ یہ چہرۂ نبویؐ سچ کے سوا جھوٹ کہہ نہیں سکتا۔

صحابہؓ کو کیونکر رسالت کا یقین آیا

اب یہاں پہنچ کر مفروضات اور نظریات کو جانے دیجئے واقعات کو لیجئے۔ آنحضرتؐ نے جب آوازۂ نبوت بلند کیا تو اس آواز کی تائید کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ عرب کا ذرہ ذرہ اس صدائے حق کا دشمن تھا۔ آپؐ پشتہا پشت کی خوگر دہ عادات کے ترک کی دعوت دیتے تھے۔ موروثی مذہب جو لوگوں

کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا، آپؐ اس کی مذمت کرتے تھے۔ جن بتوں اور دیوتاؤں کے رعب وہیبت سے وہ کانپتے تھے، آپؐ ان کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے۔ سرقہ، ڈاکہ، لوٹ، مار، قتل، خون ریزی، کینہ، عداوت، سود، قمار، زنا، شراب، غرض وہ تمام افعال جو عرب کے خصائص بن گئے تھے، آپؐ ان کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ بریں آپؐ کے دستِ مبارک میں کوئی ظاہری مادّی طاقت نہ تھی۔ دولت وخزانہ نہ تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لئے بجز مصائب اور بلایا کے آپؐ کے پاس کوئی ظاہری قابلِ معاوضہ چیز نہ تھی۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام کا نام لینے کے ساتھ وہ اپنے گھر سے بے گانہ، اپنی جائیداد سے محروم، اپنے خاندان سے ناآشنا، اپنے وطن سے مہجور، اکابرِ شہر اور روسائے قریش میں رسوا و بدنام، اور ہر قسم کی مصیبتوں کا ہدف اور نشانہ بن جائے گا۔ غریب مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ بے رحمیاں اور سفاکیاں کی جارہی تھیں وہ سب کے سامنے تھیں۔ بایں ہمہ ایک خلقت تھی کہ آستانۂ محمدیؐ کی تلاش میں چلی آتی تھی۔ عرب کے دور دور کے قبائل سے لوگ چھپ کر پہنچتے تھے اور بیعت کرکے واپس جاتے تھے۔ اور آخر وہ بھی جو سالہا سال تک آنحضرتؐ کے دشمن تھے، اسلام کے شدید مخالف اور بدر و اُحد اور احزاب و خندق کے بانی تھے، وہ بھی ایک روز سرِ اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئے۔

آخر اس کے کیا اسباب تھے؟ اور کیونکر ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور صداقت کا یقین آیا۔ عیسائیوں کی طرح یہ کہنا آسان ہے کہ "محمدؐ نے لڑ کر لوگوں کو مطیع بنالیا"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہزاروں جان نثار لڑنے والے کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوئے؟ ان کو کس نے لڑکر مطیع بنایا؟ اب اگر اسلام لانے والوں کے اسباب پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب کے اسلام لانے کا ایک ہی سبب نہ تھا۔ سینکڑوں ہزاروں آدمی

ایک متحد نتیجہ کا یقین رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے یقین کے اسباب و علل کی تلاش کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کے یقین کے اسباب و علل اور اذعان کے طُرق اور ذریعے مختلف ہیں۔ ہزاروں صحابہؓ نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی۔ آپؐ کی رسالت پر ایمان لائے۔ آپؐ کی صداقت پر یقین کیا۔ مگر یہ تصدیق، یہ ایمان اور یہ یقین کسی ایک سبب کا نتیجہ نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف معجزہ ہی نبوت کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ہر طبیعتِ صالحہ اور قلبِ سلیم کے لئے پیغمبر کی صداقت کی مختلف دلیلیں مؤثر اور کارگر ہوئی ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ صرف دعوئے نبوت کو سُن کر ایمان لے آئے۔ محض دعویٰ کی صداقت نے ان کو ہر دلیل و برہان سے بے نیاز کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبیدہ بن جراحؓ یہ دیکھ کر اسلام لے آئے کہ ابوبکرؓ سا دانش مند اس صداقت سے متاثر ہے۔ حضرت خدیجہؓ ایمان لائیں مگر یہ کہہ کر کہ آپؐ جیسے اخلاقِ گراں مایہ کا انسان جو غریبوں کا مولیٰ، مقروضوں کا ماویٰ اور مسافروں کا ملجا ہے، کبھی شیطان کے پنجہ میں نہیں گرفتار ہو سکتا۔ حضرت انیس غفاریؓ اور حضرت عمرو بن عنبسہ سلمیؓ یہ دیکھ کر اسلام لائے کہ آپؐ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ، حضرت جبیر بن مطعمؓ، نجاشی بادشاہ حبش وغیرہ سینکڑوں اشخاص کلامِ ربانی سُن کر حلقہ بگوش ہو گئے۔ حضرت ضمادؓ بن ثعلبہ ازدیؓ نے نفس کلمہ طیبہ سننے کے ساتھ نعرۂ حق بلند کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ چہرۂ انور کو دیکھتے ہی پکار اُٹھے کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں۔ حضرت ضمام بن ثعلبہؓ رئیسِ بنی سعد اس طرح اسلام لائے کہ انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ دربار نبویؐ میں آکر آنحضرتؐ کو قسم دلائی کہ تم کو سچ مچ خدا نے بھیجا ہے اور جب آپؐ نے قسم کھائی تو وہ مسلمان ہو گئے۔

اوس و خزرج کے بہت سے لوگ اپنے یہودی ہمسایوں سے سُنا کرتے تھے کہ ایک نبیؐ آخرالزماں کا ظہور ہونے والا ہے۔ جب انہوں نے آپؐ کی تقریر سُنی تو پہچان لیا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں۔ فتح مکّہ کے بعد سینکڑوں قبائل اسلام لانے پر اس لئے مجبور ہوئے کہ خانۂ خلیلؑ ایک جھوٹے پیغمبر کے قبضہ میں نہیں جاسکتا۔ ایک پورا قبیلہ صرف آپؐ کی فیّاضی سے متاثر ہو کر کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پکار اُٹھا۔ متعدد شعرائے عرب اور اصحاب علم صرف قرآن مجید کے اثر کو دیکھ کر دِل کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ متعدد قریشی جانباز جو معرکۂ بدر سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، مسلمانوں کے آداب و اخلاق کو دیکھ کر اسلام لے آئے۔ صلحِ حدیبیہ کے بعد مکّہ کے ہزاروں آدمیوں کو جب مسلمانوں سے بے تکلّف میل جول کا موقع ملا تو وہ اسلام کی صداقت کے اعتراف پر مجبور ہو گئے۔ ابوسفیان جس کو نہ تو معجزات اور خوارقِ عادات متاثر کر سکے اور نہ بدر و خندق کی تلواریں اس کو مرعوب کر سکیں، ہنا آنحضرتؐ کا رشتۂ دامادی اس کے سخت دل کو نرم کر سکا، وہ اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے ضمیر کے اعتراف کو نہ روک سکا کہ قیصرِ روم اپنے تختِ جلال پر بیٹھ کر، مکّہ کے بوریا نشین پیغمبر کے پاؤں دھونے کی آرزو رکھتا ہے۔ ثمامہ بن آثال، ہند زوجۂ ابوسفیان، ہبار بن الاسود، وحشی قاتلِ حمزہؓ یہ دیکھ کر مسلمان ہو گئے کہ آپؐ دشمنوں کے ساتھ بھی کس محبّت سے پیش آئے۔ قیصرِ روم صرف آپؐ کے چند اوصاف اور اسلام کے چند مناقب سُن کر اظہارِ حق پر مائل ہو گیا۔ حضرت عدی بن حاتمؓ قبیلہ طے کے عیسائی رئیس تھے۔ وہ آپؐ کو بادشاہ سمجھ کر مدینہ آئے۔ مگر یہاں انہوں نے دیکھا کہ مدینہ کی ایک لونڈی آتی ہے اور آپؐ اس کی حاجت روائی کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کا دل اندر سے پکار اُٹھا کہ آپؐ بادشاہ نہیں پیغمبر ہیں۔

ایسے لوگ بھی تھے جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلہ میں مادی معجزات سے متاثر ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتے تھے۔ قریش کے بہت سے لوگ فتح روم کی پیشین گوئی کو پوری ہوتے دیکھ کر اسلام لے آئے۔ ایک سفر میں ایک قبیلہ کی عورت آپؐ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھ کر اپنے قبیلہ میں جاکر کہتی ہے کہ آج میں نے عرب کے سب سے بڑے جادوگر کو دیکھا اور اسی استعجاب نے پورے قبیلہ کو مسلمان کر دیا۔ متعدد یہودی اس لئے مسلمان ہوگئے کہ گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی گئی تھیں، وہ حرف بہ حرف آپؐ میں صحیح نظر آتی تھیں۔ متعدد یہودی علماء نے آپؐ کا امتحان لیا اور جب آپؐ نے از روئے وحی ان کے جوابات صحیح دیئے تو وہ آپؐ کی نبوت پر ایمان لائے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس وقت آپؐ کو سچا رسول تسلیم کروں گا جب یہ خرمے کا خوشہ آپؐ کے پاس آکر آپؐ کی رسالت کی شہادت دے۔ اور جب یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مسلمان ہوگیا۔[1] ایک سفر میں ایک اعرابی نظر آیا۔ آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا "آپؐ کی صداقت کی شہادت کون دیتا ہے"۔ آپؐ نے فرمایا "سامنے کا درخت" اور یہ کہہ کر آپؐ نے اس درخت کو بلایا۔ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر آپؐ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور تین بار اس کے اندر سے کلمۂ توحید کی آواز آئی۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا۔[2] سراقہ

---

[1] جامع ترمذی، معجزات۔ [2] مسند دارمی، باب، ما اکرم الیہ اللہ نبیہ من ایمان الشجر۔

بن مالک رضؓ جو ہجرت کے وقت آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتے آرہے تھے، جب اُنہوں نے دیکھا کہ آپؐ کی دُعا سے تین دفعہ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تو ان کو یقین ہو گیا کہ اسلام کے اقبال کا ستارہ نقطۂ اوج پر پہنچ کر رہے گا۔ چنانچہ خطِ امان حاصل کیا اور بعد کو مسلمان[1] ہو گئے۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند — جانِ اُمت در دل سجدہ کند
بر زند از جانِ کامل معجزات — بر ضمیرِ جانِ طالب چوں حیات

---

[1] صحیح بخاری جلد اول ہجرت۔

دلائل و معجزات
اور
فلسفۂ جدیدہ

(نوشتۂ مولانا عبدالباری صاحب ندوی، سابق استاد فلسفۂ جدیدہ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن)

وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ○

(یونس : ۱۰۱)

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے اُن کے لئے آیات و نذر بے کار ہیں۔

لیکن

در دلِ ہر کس کہ دانش رامزہ است　　روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است
(عارف رومؒ)

متکلمین و حکمائے اسلام نے عقلی حیثیت سے معجزہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ گذشتہ مباحث میں نظر سے گزر چکا ہے۔ "سیرت" کے اس حصہ کو اصلاً معجزاتِ نبویؐ کی نقلی اور روایاتی تحقیق سے تعلق تھا۔ تاہم ضمناً قدیم کلامی مباحث بھی ایک حد تک آگئے ہیں۔ ذیل میں اِس موضوع پر صرف عقلائے مغرب کی ترجمانی کرنی ہے اور جدید تحقیقات و خیالات کی روشنی میں جو نتائج نکلتے ہیں ان کو پیش کرنا ہے۔

آغازِ کتاب میں نبوّت اور معجزہ کے مفہوم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے سب سے پہلے اس پر ایک نظر اور ڈال لو۔

مفہومِ نبوّت جس طرح رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی کا آنا قانونِ قدرت ہے اسی طرح یہ بھی ایک سنت الٰہی ہے کہ جب عالمِ انسانیت پر ضلالت و گمراہی کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اس کے مطلع سے ہدایت و رہنمائی کا نور طلوع کرتا ہے اور اگرچہ جس طرح ظلمتِ شب میں چھوٹے بڑے ستارے اپنی جھلملاہٹ سے کچھ نہ کچھ روشنی پیدا کرتے رہتے ہیں اسی طرح عام مصلحین و مجدّدین کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی حد تک ضلالتِ انسانی کی سیاہی کو کم کرتا رہتا ہے، تاہم آفتاب کی ضیا پاشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے اس کے سامنے ستاروں کی جھلملاہٹ بالکل ماند پڑ جاتی ہے اور کرۂ ارض دفعتہً بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

سلسلۂ مصلحین کے اسی آفتابِ ہدایت کا نام ادیان و شرائع کی اصطلاح میں نبی، پیغمبر یا رسول ہے۔ عام مصلحین کے ہاتھ میں صرف انسانی عقل و بصیرت کی مشعل ہوتی ہے لیکن مشکوٰۃ نبوّت سے جو نورِ ہدایت اُبلتا ہے اس کا سرچشمہ وہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہوتا ہے جس سے عام مادّی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ پیغمبر وہ کچھ دیکھتا ہے جو ہم نہیں دیکھتے۔ وہ کچھ سُنتا ہے جو ہم نہیں سُنتے۔ اس کے احوال و کوائف سے ہم ناآشنا اور اس کی عقل و حواس سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھو کہ پیغمبرانہ خصائص کی اصلی روح کو عالمِ ناسوت سے ماورا عالمِ غیب کے ساتھ تعلّق و ربط ہے۔ انسان اسی عالمِ اسرار و غیوب کو اپنی محدود تعبیر میں عالمِ قدس، عالمِ روح، عالمِ مثال وغیرہ سے موسوم کرتا ہے۔

مفہومِ معجزہ حاملِ رسالت اپنے ابنائے جنس کو جو دعوت دیتا ہے اور دنیا کو جو پیام پہنچاتا ہے اس کی سچائی کی واضح ترین دلیل یا آیت اگرچہ خود یہ پیام اور اس کے حامل کا مجسم وجود ہوتا ہے تاہم بہ اقتضائے لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ یا بہ لحاظ اتمامِ حجّت اس داعیٔ حق کے تعلّق سے کچھ ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں

اور ان کی توجیہہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو واماندہ پاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ سرد ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدہا بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے۔ آنحضرتؐ نے چشم زدن میں "مسجدِ حرام" سے لے کر "مسجدِ اقصیٰ و سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیر کر لی۔ ان واقعات کی توجیہہ سے چونکہ عقلِ انسانی عاجز ہے اس لئے ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے، عالمِ غیب کے ساتھ اُس کے روابط کی نشانی و آیت یا تائیدِ غیبی کا کام دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی زبان میں اس قسم کے واقعات کا نام بیّنات، براھین یا زیادہ تر آیات (یا آیات بیّنات) ہے۔ محدثین ان کو "دلائلِ نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں اور حکماء و متکلمین کی اصطلاح میں ان ہی کو معجزات کہا جاتا ہے۔

ترتیبِ مباحث معجزات کی جو نوعیت ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلی بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیا ان کا وقوع ممکن بھی ہے یا نہیں؟ قدماء نے علل مخفیہ وغیرہ سے توجیہ معجزات کی جو کوششیں کی ہیں ان کا مدعا حقیقتہً امکان ہی کو ثابت کرنا ہے۔ مگر حکمت و فلسفہ کے دورِ جدید میں امکان کے ساتھ ایک دوسری زیادہ اہم بحث شہادت کی پیدا ہو گئی ہے۔ نفسِ امکان سے تو اب شاید ہی کسی حکیم یا فلسفی کو انکار ہو۔ البتہ یہ امکان اس قدر بعید الوقوع معلوم ہوتا ہے کہ یقینِ وقوع کے لئے عام واقعاتِ تاریخی کے درجہ کی شہادت کافی نہیں خیال کی جاتی۔

لیکن چونکہ امکان اور شہادت دونوں کی بحث کا اصلی مرجع معجزانہ واقعات کا قابلِ یقین واذعان ہونا یا نہ ہونا ہے۔ اس لئے امکانِ و شہادت دونوں سے زیادہ اہم سوال خود یقین کی ماہیت و اسباب کا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس طرف بحثِ معجزات کے ضمن میں

متقدمین و متاخرین میں سے جہاں تک علم ہے، کسی کا بھی ذہن نہیں گیا۔ صفحات ذیل میں نہ صرف اس اہم سوال کا مستقلاً جواب دیا گیا ہے بلکہ دراصل یہی جواب معجزہ کے متعلق تمام مباحث کا مقطع اور خاتمۂ سخن ہے۔

بہرکیف اس خاکہ کی بنا پر ترتیب مباحث یہ ہوگی:۔

۱۔ امکانِ معجزات۔

۲۔ شہادتِ معجزات۔

۳۔ استبعادِ معجزات۔

۴۔ یقینِ معجزات۔

۵۔ غایتِ معجزات۔

امکان معجزات

یوں تو یورپ میں معجزات پر بیسیوں مستقل کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اس بحث پر ہیوم[1] نے جو چند اوراق لکھے تھے وہ سارے طومار پر بھاری ہیں اور گو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس موضوع پر یہ سب سے پہلی تحریر تھی تاہم وقوعِ معجزات کے خلاف جو آخری حربہ استعمال کیا جا سکتا ہے وہ بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اوراق کے کم و بیش دو صدیاں گزر جانے پر بھی موافق و مخالف دونوں کے قلم کی روشنائی ان ہی نقوش کے مٹانے یا اجاگر کرنے میں صرف ہوتی رہی ہے۔

ہیوم کا استدلال ہیوم کے استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ

---

[1] HUMAN UNDERSTANDING "فہم انسانی" (باب بحثِ معجزات)

۱۔ انسان کے علم و یقین کا مدار تمام تر تجربہ پر ہے۔ جس طرح آدمی تجربہ سے یہ جانتا ہے کہ آگ لکڑی کو جلاتی اور پانی سے بجھ جاتی ہے۔ اسی طرح تجربہ ہی کی بنا پر وہ اس کا بھی یقین رکھتا ہے کہ جب تک دروغ بیانی کا کوئی خاص سبب نہ ہو لوگ علی العموم سچ بولتے ہیں یعنی جس چیز کی وہ روایت یا تصدیق کرتے ہیں وہ عام طور پر تحقیق کے بعد صحیح ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ جس نسبت سے کسی امر کے متعلق گزشتہ تجربات کی شہادت قوی یا ضعیف ہوتی ہے اُسی نسبت سے ہمارے دل میں اذعان، شک یا انکار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔

فرض کرو کہ تمہارے محلّہ میں ساٹھ ستر برس کی عمر کا ایک بوڑھا فقیر رہتا ہے جس کو تم بچپن سے دیکھتے ہو کہ چیتھڑے لپیٹے ہوئے بھیک مانگ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ پیری و فاقہ کشی سے ہڈّیوں کا صرف ڈھانچ رہ گیا ہے۔ کل تک تم نے اس کو اسی حال میں دیکھا تھا۔ آج تمہارا ایک پڑوسی آکر کہتا ہے کہ "وہ بیچارہ بڈّھا فقیر رات کو مر گیا"۔ تم کو اس بیان کے باور کرنے میں کوئی تامّل نہیں ہوتا۔ لیکن یہی پڑوسی اگر یہ بیان کرے کہ میں نے اس فقیر کو نہایت قیمتی لباس میں اعلیٰ درجہ کی موٹر پر سوار واہٹ وے کی دوکان پر کچھ چیزیں خریدتے دیکھا تو تم کو سخت اچنبھا ہوگا۔ اور اگر پڑوسی کی صداقت کا غیر معمولی طور پر تم کو اعتبار نہیں ہے یا اور بہت سے معتبر لوگ اس کی تصدیق نہیں کرتے تو اس بیان کے قبول کرنے میں تم بہت زیادہ پس و پیش کرو گے۔ تیسری صورت یہ فرض کرو کہ اس پڑوسی نے یہ بیان کیا کہ میں نے اس پیر فرتوت، پوست و استخوان فقیر کو آج دیکھا کہ بیس پچیس برس کا جوان رعنا ہے۔ اب تم اپنے پڑوسی کو یا تو محض لاغی سمجھو گے یا یہ خیال کرو گے کہ اس کو کچھ نہ کچھ دھوکا ہوا ہے، لیکن

اس بیان کی واقعیت کا اذعان ہرگز تمہارے دل میں نہ پیدا ہوا ہوگا۔ کیوں؟

صرف اس لئے کہ اس قسم کی مثال انسان کے گزشتہ تجربات میں ایک بھی نہیں ملتی۔ اسی بنا پر اس کو خلافِ فطرت یا خارقِ عادت قرار دیا جاتا ہے جس کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ سمجھ لینا کہیں زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ راوی کو کوئی دھوکا ہوا یا وہ دانستہ جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ سچے سے سچے آدمی کا جھوٹ بول دینا یا عاقل سے عاقل انسان کا دھوکا کھا جانا بجائے خود ایک نادر الوقوع شئے سہی تاہم عدیم الوقوع نہیں ہے اور خرقِ عادت کے مقابل میں اس کا وقوع بہت زیادہ ممکن و قابلِ قبول ہے۔

۳۔ معجزہ اسی صنف کے عدیم الوقوع یا قانونِ فطرت کے خارق واقعہ سے عبارت ہوتا ہے، ورنہ پھر وہ معجزہ نہیں رہتا۔ اس لئے کہ اگر یہ محض نادر الوقوع شئے کا نام ہو جس طرح کہ کسی آخری درجہ کے مدقوق کا صحت یاب ہو جانا یا ایک مفلس کا رات بھر میں دولت مند ہو جانا، تو یہ ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہ کے لئے عام انسانی زندگی ہی میں کچھ نہ کچھ تجربات ملتے ہیں۔ مثلاً مفلس کے گھر میں کوئی دفینہ نکل آسکتا ہے۔ بخلاف اس کے معجزہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیل و توجیہہ عام تجربات کی دسترس سے باہر ہو۔

اس لئے معجزہ گویا بذاتِ خود آپ اپنی تردید ہے۔

اس استدلال کو خود ہیوم کے الفاظ میں بھی سُن لینا چاہیے:۔

"معجزہ نام ہے قوانینِ فطرت کے خرق کا اور چونکہ یہ قوانین مستحکم اور اٹل تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں، اس لئے معجزہ خود اپنے خلاف اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی تجربی ثبوت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ان باتوں پر قطعی یقین رکھتے

ہیں کہ تمام انسان فانی ہیں۔ سیسہ آپ ہی آپ ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا۔ آگ لکڑی کو جلاتی اور پانی سے بجھ جاتی ہے۔ صرف یہی کہ یہ امور قوانینِ فطرت کے مطابق ثابت ہو چکے ہیں اور اب ان کا توڑنا بغیر قوانینِ فطرت کے توڑے یا بہ الفاظ دیگر یوں کہو کہ بلا معجزہ کے ناممکن ہے۔ جو چیز عام قانونِ فطرت کے اندر واقع ہوتی ہے وہ کبھی معجزہ نہیں خیال کی جاتی۔ مثلاً یہ کوئی معجزہ نہ ہوگا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں تندرست و توانا ہے، اچانک مرجائے۔ کیونکہ اس قسم کی موت گو نسبتہً قلیل الوقوع سہی لیکن پھر بھی بارہا مشاہدہ میں آچکی ہے۔ البتہ یہ معجزہ ہوگا کہ کوئی مُردہ زندہ ہو جائے۔ کیونکہ ایسا کبھی کسی ملک میں نہیں دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا جس واقعہ کو معجزہ کہا جاتا ہے اس کے خلاف تجربہ کا مستمر و متواتر ہو جانا ضروری ہے ورنہ پھر یہ معجزہ کے نام سے نہ موسوم ہوگا اور چونکہ کسی شے کا متواتر تجربہ خود ایک قطعی ثبوت ہے تو گویا معجزہ کی نفسِ حقیقت و ماہیت ہی میں اس کے وجود کے خلاف ایک قطعی و براہِ راست ثبوت موجود ہے اور ایسا ثبوت جو نہ اس وقت تک معجزہ کو ثابت ہونے دے سکتا ہے اور نہ خود باطل کیا جا سکتا ہے جب تک اس کے خلاف اس سے بڑھ کر ثبوت نہ پیدا کیا جائے۔"

"لہٰذا صریح نتیجہ یہ نکلتا ہے (جو ایک کُلّی اصول کی حیثیت رکھتا ہے) کہ کوئی تصدیقِ شہادت معجزہ کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ یہ ایسی نہ ہو جس کی تکذیب خود اس معجزہ سے بڑھ کر معجزہ ہو جس کو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے۔ اور اس صورت میں بھی دلائل میں باہم تصادم ہوگا۔ جو دلیل جتنی زیادہ قوی ہوگی اپنی زائد قوت کے مناسب یقین پیدا کرے گی۔ فرض کرو کہ ایک شخص آکر مجھ سے کہتا ہے کہ اس نے ایک مُردہ کو دیکھا کہ زندہ ہو گیا تو میں ذرا سوچنے لگتا ہوں کہ آیا یہ زیادہ ممکن ہے کہ یہ شخص دھوکا دینا

چاہتا ہو یا خود دھوکا کھا گیا ہو یا یہ اغلب ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے صحیح ہو۔ میں ان دونوں معجزوں میں موازنہ کرتا ہوں اور جدھر کا پلّہ زیادہ جھکتا معلوم ہوتا ہے اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں اور ہمیشہ اسی احتمال کو رد کرنا پڑتا ہے جس میں معجزہ پن زیادہ نظر آتا ہے۔ البتہ اگر روایت کی تکذیب واقعۂ روایت سے بڑھ کر معجزہ ہو تو اس صورت میں بے شک مجھ کو روایت کے یقین پر مجبور ہو جانا پڑے گا۔ لیکن اس کے بغیر قطعاً ناممکن ہے[1]

غرض ہیوم کے استدلال اور اس کی تعریفِ معجزہ کی رُو سے اگر ایک طرف ہم اپنی میزانِ عقل میں کسی خارقِ عادت واقعہ کی شہادت اور روایت کو رکھیں اور دوسری طرف اس کے خلاف دنیا کے ہزارہا سال کے مستمر و متواتر تجربہ کو، تو ظاہر ہے کہ یہ شہادت چاہے کتنی ہی معتبر و وقیع کیوں نہ ہو، تاہم اس متواتر تجربہ کے ہم وزن کسی حال میں نہیں ٹھہر سکتی۔ لہٰذا انسانی شہادت کی کوئی کمیّت و کیفیّت بھی معجزہ کے یقین و اثبات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی جان کے دشمن اور اپنے سب سے بڑے منکر فرعون کے گھر میں پرورش پائی۔ ہیوم سے بڑھ کر معجزہ کا کون دشمن و منکر ہو گا۔ لیکن اس انکار کو جب اس کے فلسفے کی روشنی میں دیکھو تو نظر آتا ہے کہ قبولِ معجزات کی راہ میں عقل کی خود فریبی کا جو سب سے زبردست طلسم حائل تھا اس کو ہیوم ہی نے توڑا اور ہمیشہ کے لئے برباد کر دیا ہے جس کے بعد راستہ کے صرف چند کانٹوں کا ہٹانا باقی رہ جاتا ہے۔ چراغ کے تلے اندھیرا۔ آدمی بارہا اپنے ہاتھ کی مشعل سے دوسروں کو راستہ دکھلاتا ہے اور خود نہیں دیکھ سکتا۔

---

[1] فہم انسانی۔ باب بحثِ معجزات۔

انسان کے ذہن میں جس قدر یہ اعتقاد راسخ ہے شاید ہی کوئی اور ہو کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ مادّی علل و اسباب اور قویٰ و خواص کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اپنے ظہور کے لئے ایک اٹل اور غیر متغیر علّت رکھتا ہے۔ ہر شئے اپنے اندر کوئی نہ کوئی ایسی قوّت یا خاصّہ رکھتی ہے جس سے اس وقت تک اُس کا انفکاک ناممکن ہے جب تک یہ خود اپنی ذات و حقیقت سے منفک نہ ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ میرا قلم میز کی ایک جانب سے دوسری جانب کو چلا گیا ہو بے اس کے کہ کسی ہاتھ یا کسی اور مادّی شئے نے اس کو حرکت دی ہو۔ اس کاغذ پر جو نقوش تم کو نظر آ رہے ہیں ضرور ہے کہ ان کو کسی نہ کسی قلم نے کھینچا ہے۔ اسی طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ انار کے درخت سے آم کا پھل یا آم کے درخت سے انار کا پھل پیدا ہو۔ آم کے درخت سے ہمیشہ آم اور انار کے درخت سے ہمیشہ انار ہی پیدا ہوگا۔

غور کرو جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نہ جلا سکی تو تم کو اس کے باور کرنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے؟ اسی لئے کہ آگ جب تک آگ ہے جلانے کا خاصّہ اس سے منفک نہیں ہو سکتا۔ اس کو ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کی تمیز نہیں۔ اژدہا ایک جاندار مخلوق ہے جو تولید مثل کے قاعدے سے اپنی ہی جیسی جاندار مخلوق سے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کیوں کر اژدہا بن گیا۔ انسان کا بچّہ اپنے والدین کے بندھے ہوئے اور مشترک عملِ توالد و تناسل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کیوں کر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے۔ دس قدم کی مسافت طے کرنے کے لئے بھی آدمی کو اپنے پاؤں یا کسی اور مادّی وسیلہ کی احتیاج ہوتی ہے اور جس قدر مسافت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر اُس کو

قطع کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ لہٰذا یہ کیوں کر یقین کیا جائے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے بلا معمولی وسائلِ مادّی کے استعمال کے طرفۃ العین میں "مسجدِ حرام" سے "مسجدِ اقصیٰ" اور "سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیر کر لی۔ زمین و آسمان کی آیات کا مشاہدہ کیا اور تمام انبیائے سابقینؑ سے گفتگو فرمائی۔ پھر یہ تمام مراحل اتنے وقفہ میں کیوں کر طے ہو سکتے ہیں کہ واپسی پر کواڑ کی زنجیر ہل رہی ہو اور بستر کی گرمی ہنوز قائم ہو۔

سلسلۂ علل و اسباب و اشیاء کے افعال و خواص ہی کے اصول و قوانین کا نام حکماء و فلاسفہ کی اصطلاح میں قوانینِ فطرت ہے جن کا خرقِ محال خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کششِ ثقل ایک قانونِ فطرت ہے جس کا یہ اقتضا ہے کہ جب تم ڈھیلے کو اوپر پھینکو گے تو وہ لوٹ کر ہمیشہ نیچے آجائے گا۔ فضا میں اس کا معلق رہنا ناممکن ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن دو عناصر کے ایک خاص مقدار میں ملنے کا خاصہ یہ ہے کہ پانی بن جاتا ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔

قوانینِ فطرت کی حقیقت اب دیکھو کہ جن چیزوں کو تم قوانینِ فطرت کا لقب دیتے ہو اور جو بظاہر اس قدر قطعی اور اٹل نظر آتے ہیں، واقعات کی کسوٹی پر ان کی کیا بساط ٹھہرتی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ نمک نمکین اور شکر میٹھی کیوں ہوتی ہے تو یہ سوال تم کو ایسا ہی مہمل و مضحک معلوم ہوگا جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ جزو کُل سے چھوٹا کیوں ہوتا ہے۔ جزو کی حقیقت ہی یہ ہے کہ کُل سے چھوٹا ہو۔ اسی طرح لوگ سمجھتے ہیں کہ نمکینی اور مٹھاس نمک اور شکر کی حقیقت میں داخل ہیں۔ لیکن سوچو کہ کیا نمک کی نفسِ ذات میں تم کو کوئی ایسی شئے نظر آتی ہے جس کی بنا پر بلا اس کو چکھے ہوئے تم یہ حکم لگا سکو کہ اس کا مزہ بالضرورت شکر کے

مزہ سے مختلف ہونا چاہیے۔ صرف دونوں کے چکھنے اور تجربہ کی بنا پر نمک کو نمکین اور شکر کو شیریں یقین کیا جاتا ہے۔ سنکھیا زہر ہے جس کے کھانے سے آدمی مرجاتا ہے۔ سنکھیا کا ایک ٹکڑا لے کر اس کو خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھو۔ اس کی ذات یا حقیقت میں کہیں کوئی ایسی شئے محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے تم بلا تجربہ اس کو موت کی علّت قرار دے سکو؟ جس شخص نے سنکھیا کبھی نہیں دیکھا یا اُس کے اثر سے ناواقف ہے، اس کو تم بہ آسانی کھلا سکتے ہو۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس کو خود سنکھیا کے اندر کوئی ایسی شئے نہیں نظر آتی جس سے بلا سابق تجربہ کے وہ اُس کے زہرِ قاتل یا علّتِ موت ہونے کا علم و یقین حاصل کر سکے۔ بیسویں صدی کے سائنسدان کے لئے یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ پانی دو مختلف اجزا یا عناصر سے مرکّب ہے۔ لیکن جب تک اس حقیقت کا تجربہ نہیں ہوا تھا، ڈھائی ہزار سال تک حکماء اور عقلائے عالم پانی کو ایک مفرد و بسیط عنصر یقین کرتے رہے حالانکہ پانی کی جو صورت و شکل کاونڈس[1] کے سامنے تھی وہی طالیس[2] ملطی کے سامنے بھی تھی۔ سنکھیا اور شکر کے بجائے اگر ہم کو سمیّت اور شیرینی کا تجربہ پتھر کی کنکریوں میں ہوتا تو ہم ان کو اسی طرح مہلک (ہلاکت کی علّت) و شیریں یقین کرتے جس طرح آج سنکھیا اور شکر کو کرتے ہیں۔

جان اسٹورٹ مل نے اپنی مشہور کتاب "نظامِ منطق"[3] میں اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے کہ

"آج سے پچاس سال پہلے وسط افریقہ کے باشندوں کے نزدیک غالباً کوئی واقعہ اس سے

---

[1] جس نے پانی کو بسیط عنصر کے بجائے آکسیجن و ہائیڈروجن سے مرکّب ثابت کیا۔ [2] یونان کا پہلا فلسفی جو پانی کو مبدءِ عالم جانتا تھا۔ [3] "سسٹم آف لاجک" کتاب سوم باب ۳ فصل ۲۔

زیادہ تجربہ کی قطعیت و یکسانی پر مبنی نہ تھا جتنا یہ کہ تمام انسان کالے ہوتے ہیں اسی طرح کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اہلِ یورپ اس کو فطرت کی یکسانی کی ایک بالکل قطعی و غیر مشتبہ مثال سمجھتے تھے کہ تمام ہنس سفید ہوتے ہیں[1]۔ مزید تجربہ کے بعد افریقہ و یورپ والوں دونوں کو معلوم ہوا کہ یہ خیالات غلط تھے۔ لیکن اس تجربہ کے لئے ان کو پانچ ہزار برس انتظار کرنا پڑا اور اس طویل مدت میں انسانی آبادی کے دو بڑا عظم فطرت کی ایک ایسی یکسانی پر یقین کرتے رہے جس کا حقیقتہً کوئی وجود نہ تھا۔"

کائناتِ فطرت کی وسعتِ بیکراں کو دیکھتے ہوئے آج بھی نوعِ انسان کے تجربہ پر مبنی قوانینِ فطرت کی بساط اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ اس تجربہ کی تھی کہ "تمام انسان کالے ہوتے ہیں" اور "تمام ہنس سفید"۔ انیسویں صدی کے ایک مشہور فلسفی ڈاکٹر وارڈ نے اسی حقیقت کو ایک مفروض مثال کے پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ فرض کرو کہ

"افریقہ کے کسی صحرا میں ایک نہایت عظیم الشان سلسلۂ عمارت ہے جو چاروں طرف ایک چار دیواری سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر ایک خاص ذی عقل مخلوق آباد ہے جو اس احاطہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ یہ عمارت ایک ہزار سے زائد کمروں پر مشتمل ہے جو سب مقفل ہیں اور کنجیوں کا پتہ نہیں کہ کہاں ہیں۔ بڑی محنت و جستجو کے بعد کل پچیس کنجیاں ملتی ہیں جن سے اِدھر اُدھر کے پچیس کمرے کھل جاتے ہیں جو سب ہم شکل ہیں۔ لہٰذا کیا اس بنا پر اس احاطہ کے اندر رہنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیں کہ بقیہ نو سو پچہتر کمرے بھی اسی شکل کے ہیں"[2]

---

[1] وسطِ افریقہ کے آدمی کالے اور یورپ کے ہنس سفید ہوتے ہیں۔ مِل کی "منطق" کتاب سوم، باب ۲۱ فصل ۴ حاشیہ۔

قوانینِ فطرت یا خواصِ اشیاء و علاقہ تعلیل (علت و معلول) کی مذکورۂ بالا حقیقت اگرچہ اب حکمت (سائنس) و فلسفہ دونوں کے مسلّمات میں داخل ہے۔ لیکن اِس حقیقت کو سب سے پہلے جس شخص نے اُجاگر کیا وہ معجزات کا منکر ہیوم ہی تھا۔ اس لئے خود اسی کی زبان سے سُنو کہ جس چیز کو وہ خرقِ عادت کہہ کر ناممکن قرار دیتا ہے اس کے عدمِ امکان کا کیا وزن ہے:

"جب[1] ہم اپنے آس پاس کی خارجی چیزوں پر نظر کرتے ہیں اور مختلف علتوں کے افعال کو غور سے دیکھتے ہیں تو ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس کے اندر کسی قوت یا لزوم کا پتہ چلتا ہو۔ نہ ان کی کوئی ایسی صفت نظر آتی ہے جو معلول کو اس طرح علت سے جکڑے ہوئے ہو کہ ایک کو دوسرے سے مستنبط کرنے میں خطا کا امکان نہ ہو۔ ہم کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک واقعہ کا ظہور دوسرے کے بعد ہوتا ہے۔ بلیرڈ کی ایک گیند میں ضرب لگانے سے دوسری میں حرکت ظاہر ہوتی ہے۔ پس حواسِ ظاہری سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کی بساط اسی قدر ہے۔ اشیا میں اس تقدم و تاخر یا تبعیت کے پائے جانے سے ذہن کو نفسِ تبعیت کے علاوہ کوئی اور احساس یا التسامِ باطنی نہیں حاصل ہوتا۔"

"کسی شئے کو پہلی دفعہ دیکھنے سے ہم کبھی قیاس نہیں کر سکتے کہ اس سے کیا معلول یا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ حالانکہ اگر علت کے اندر کسی قوت یا انرجی کا پتہ محض ذہن دوڑانے سے چل سکتا تو بلا کسی سابق تجربہ کے ہم اس نتیجہ و معلول کی پیشین گوئی کر دیتے اور پہلی ہی نظر میں قطعی حکم لگا دیتے۔"

---

[1] فہمِ انسانی، باب ۷، فصل ۱۔

"حقیقتِ امر یہ ہے کہ کائناتِ مادّی کا ایک ذرّہ بھی ایسا نہیں ہے جس کی صفاتِ محسوسہ کی بنا پر ہم اس کے اندر کسی قوّت کا سراغ لگا سکیں یا قیاس سے بتلا سکیں کہ اس سے کوئی اور دوسری شے ایسی وجود پذیر ہو سکتی ہے جس کو معلول کا لقب دیا جاتا ہے۔ صلابت، امتداد، حرکت۔ یہ چیزیں بجائے خود مستقل صفات اور ایسے واقعہ کا نشان نہیں دیتیں جس کو ان کا نتیجہ کہا جا سکے۔ موجوداتِ عالم میں ہر آن تغیّر و تبدّل جاری ہے۔ ایک چیز دوسری چیز کے بعد برابر آتی جاتی رہتی ہے۔ لیکن وہ قوّت و طاقت جو اس ساری مشین کو چلاتی رہتی ہے، ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور اجسام کی کسی محسوس صفت میں اپنا کوئی نشان نہیں رکھتی۔ ہم یہ واقعہ جانتے ہیں کہ آگ کے شعلہ میں گرمی پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں (گرمی و شعلہ) میں کیا لزوم ہے؟ اس کے قیاس سے ہمارا تخیّل قطعاً عاجز ہے۔"

اسی سلسلہ میں چند صفحات بعد کی ایک اور طویل عبارت[1] کا یہاں اقتباس مناسب ہے جس سے آگے چل کر کام پڑے گا:

"عام طور پر لوگوں کو فطرت کے پیش پا افتادہ اور مانوس واقعات و افعال کی توجیہہ میں کوئی دشواری نہیں نظر آتی (مثلاً بھاری چیزوں کا نیچے آجانا، درختوں کی بالیدگی، حیوانات میں توالد و تناسل یا غذا سے جسم کی پرورش وغیرہ کے واقعات) بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان صورتوں میں ان کو علّت کی بذات خود اس قوّت کا علم، احساس ہے جس کی بنا پر یہ اپنے معلول کو مستلزم ہے اور اس لئے ظہورِ معلول میں خطا کا امکان نہیں۔ بات یہ ہے کہ تجربہ یا عادتِ دراز کی وجہ سے ان کے ذہن میں ایک ایسا میلان و رجحان پیدا ہو جاتا

---

[1] فہم انسانی باب ۷، فصل ۱۔

ہے کہ علت کے سامنے آتے ہی اس نتیجہ کا یقین ہو جاتا ہے جو معمولاً اس کے ساتھ پایا گیا ہے اور یہ مشکل سے ممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر ہو سکتا تھا۔ صرف اُس صورت میں جبکہ غیر معمولی واقعات و حوادث ظاہر ہوتے ہیں مثلاً زلزلہ، وبا یا کوئی اور عجیب و غریب بات تو البتہ ان کی صحیح علت کا پتہ نہیں لگتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجیہہ و تشریح کیسے کی جائے۔ اس مشکل میں پڑ کر لوگ علی العموم کسی اَن دیکھی صاحبِ عقل و ارادہ ذات کے قائل ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ناقابلِ توجیہہ ناگہانی واقعات اسی ذات کے پیدا کردہ ہیں۔ لیکن فلاسفہ کی باریک بیں نگاہ کو نظر آتا ہے کہ روزمرہ کے معمولی واقعات کی پیدا کرنے والی قوت بھی اسی طرح نامعلوم اور ناقابلِ توجیہہ ہے جس طرح کہ انتہائی سے انتہائی غیر معمولی واقعات کی..... چنانچہ بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ بلا استثنا تمام واقعاتِ عالم کا مبداء اسی ذات کو قرار دیں جس کی طرف عوام صرف معجزات اور فوق الفطرت واقعات و حوادث کے ظہور کو منسوب کرتے ہیں..... ان کے نزدیک ہر معلول کی واقعی اور براہِ راست علت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ ہوتا ہے..... بلیرڈ کی ایک گیند جب دوسری گیند سے ٹکراتی ہے تو خود خدا اپنے ارادۂ خاص سے اس کو متحرک کر دیتا ہے اور یہ ارادہ ان عام قوانین کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اپنی مشیت سے کائنات پر حکم فرمائی کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔"

جب یہ مسلّم ہو چکا کہ قوانینِ فطرت کی بنیاد تمام تر تجربہ پر ہے اور تجربہ کے ناقابلِ خطا ہونے کا کبھی کسی حالت میں بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو پھر ظاہر ہے کہ کسی شئے کو

خلافِ فطرت یا خارقِ عادت کہہ کر اس کو غلط یا ناممکن کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے چنانچہ خود ہیوم کا اپنے اسی اصول پر دعویٰ ہے کہ "جس شئے کا تصور ممکن ہے وہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہو سکتی اور جو شئے مستلزمِ تناقض نہ ہو اس کو کسی حجت و برہان یا عقلی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا۔"[1]

پروفیسر ہکسلے جو فلسفی سے زیادہ حکیم (سائنٹسٹ) ہے اور جس کی جگہ حکماء کی صفِ اوّل میں ہے، اس نے ہیوم کے اس قول کو اپنی تحریروں میں جا بجا نقل کر کے اس کی نہایت شدت سے تائید کی ہے۔ خود ہیوم کے نظریۂ معجزات پر بحث کرتے ہوئے[2] پہلے تو معجزہ کے متعلق اس کی اس تعریف کی تغلیط کی ہے کہ "وہ نام ہے قوانینِ فطرت کے خرق کا" اور بتلایا ہے کہ معجزات کے معنی زیادہ سے زیادہ "انتہائی حیرت انگیز واقعات[3] کے ہو سکتے ہیں"۔ پھر اسی ضمن میں ہیوم کے مذکورۂ بالا قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

"لیکن معجزہ کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہے۔ لہٰذا خود ہیوم ہی کے دعویٰ کے مطابق معجزہ کو کسی برہانی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا۔"

"با ایں ہمہ ہیوم خود اپنے ہی اصول کے خلاف اور بالکل متناقض ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ مُردہ کا زندہ ہو جانا معجزہ ہے کیوں کہ ایسا پہلے کبھی کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں ہوا ہے۔"

اس ارتکابِ تناقض کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے طنزاً لکھا ہے کہ اگر ہیوم کے "استدلال کی مہملیت کو برہنہ کر کے دیکھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ جو چیز پہلے کبھی نہیں واقع

---

[1] فہم انسانی باب ۱۰ [2] ہکسلے کی کتاب "ہیوم" باب "متعلق معجزات"، [3] انگریزی میں معجزہ کے لئے جو لفظ مستعمل ہے (مریکیل) اس کے لفظی معنی بھی "حیرت انگیز" کے ہیں۔

ہوئی وہ آئندہ بغیر قوانینِ فطرت کے خرق کے نہیں واقع ہو سکتی۔"

ہکسلے کا ایک نہایت دلچسپ مضمون "ممکنات و ناممکنات" ہے۔ اس میں بھی ہیوم اس کے پیشِ نظر ہے اور اپنی حکیمانہ ذمہ داری کے پورے احساس و شعور کے ساتھ لکھتا[1] ہے کہ

"صحیح معنی میں بجز تناقض کے اور کسی بھی ایسی چیز سے میں واقف نہیں ہوں جس کو "ناممکن" کہنا حق بجانب ہو۔ منطقی ناممکنات کا وجود ہے۔ لیکن طبعی ناممکنات کا قطعاً کوئی وجود نہیں۔ "مربع مدور، ماضی موجود، دو متوازی خطوط کا تقاطع" یہ چیزیں ناممکنات سے ہیں اس لئے کہ "مدور" "موجود" اور "تقاطع" کا تصور ہی "مربع" "ماضی" اور "متوازی" کے تصور کے متناقض ہے۔ لیکن پانی پر چلنا یا پانی کو شراب بنا دینا، بچہ کا بے باپ کے پیدا ہونا، مردہ کو زندہ کر دینا یہ چیزیں مفہوم بالا کی رو سے ناممکنات سے نہیں ہیں۔"

"ہاں اگر ہم یہ دعویٰ کر سکتے کہ فطرتِ اشیا کے متعلق ہمارے علم نے تمام ممکنات کا کامل احاطہ کر لیا ہے تو شاید یہ کہنا بجا ہوتا کہ آدمی کی صفات چونکہ پانی پر چلنے یا ہوا میں اڑنے کے متناقض ہیں اس لئے یہ افعال اس کے لئے "ناممکن" ہیں۔ لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ علمِ فطرت کی انتہا تک پہنچنا کیسا! ابھی تک ہم اس کی ابتدا اور ابجد سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ بلکہ ہماری قوتیں اس قدر محدود ہیں کہ کبھی بھی ہم ممکناتِ فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ واقع ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے اس کا ہم کو علم ہے۔ باقی جو کچھ واقع ہونے والا ہے اس کی نسبت ہم صرف ایک توقع قائم کر سکتے ہیں جس کی بنیاد کم و بیش گزشتہ تجربہ کے صحیح سمجھنے پر ہے جس سے ہم کو خیال ہوتا ہے کہ مستقبل

---

[1] ہکسلے کی کتاب ہیوم باب ۸۔

ماضی کے مماثل ہوگا۔"

اس میں شک نہیں کہ کچھ دن پہلے بعض گوشوں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ "کائنات کا ہر ذرّہ قانون کا پابند ہے"۔ اور "وہم و بے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے اور عقل و حکمت بہترین دوست۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں عقیدۂ معجزات کا پتہ چلے اس پر حملہ کریں۔"[1]

لیکن یہ باتیں قریباً چوتھائی صدی قبل کی ہیں۔[2] ۱۹۲۷ء کے بعد کوانٹم نظریہ کی بدولت سائنس میں جو بھونچال آیا ہے اس نے سائنس کی دنیا میں بھی اب ایسے بے باکانہ و مدّعیانہ نعروں کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ فلسفہ میں تو علّت و معلول کے لزوم و وجوب کی بنیادوں کو ہیوم کیا ہیوم سے صدیوں پہلے امام ابوالحسن اشعری ہی نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ البتہ سائنس کی بنیاد ہی فطرت کی یکسانی یا علّیت کے اٹل قانون پر رکھی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ خود سائنسی تجربات و اخبارات ہی کی راہ سے یہ اٹل قانون نہ صرف مجروح و متزلزل ہو گیا ہے بلکہ سر آرتھر ایڈنگٹن جیسے اکابرِ سائنس کے نزدیک اس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا پڑا ہے۔ چند سال قبل دنیا کی سائنس کی تازہ ترین معلومات و خیالات پر "ماڈرن بلیف"[3] کے نام سے رسائل کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا۔ اس کے جستہ جستہ یہ اقتباسات پڑھو کہ

"کوانٹم نظریہ نے بڑا زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ مادّی دنیا میں اب تک علّت و معلول کے قانون کی فرمانروائی کو اٹل تصوّر کیا جاتا تھا۔ سارے طبعی واقعات و حوادث

---

[1] WONDERS OF LIFE (عجائباتِ حیات)، از ہیگل باب ۳ معجزات۔ [2] معجزات پر سیرت کا یہ ٹکڑا آج ۱۹۴۵ء سے ۲۴ سال قبل لکھا گیا تھا۔ [3] پورا نام OUTLINE OF MODERN BELIEF ہے، مرتبہ جے۔ ڈبلیو۔ این۔ سولیون (J. W. N. SULIVAN) اور ڈبلیو گریسن (W. GRIERSON) حصہ چہارم، باب ۶۔

بالکلیہ جبری یا وجوبی قوانین کے تابع یقین کئے جاتے تھے۔ سلسلۂ علل و معلومات میں کہیں کوئی خلل و رخنہ نہ تھا۔ مگر ۱۹۲۷ء میں اس خیال و یقین کو سخت دھکا لگا اور ماہرینِ طبیعیات نے دیکھا کہ علیت کے وجوب و کلیت کو مادی دنیا سے رخصت کرنا پڑا اور سارے قرائن اسی کے نظر آتے ہیں کہ وجوبی و قطعی علیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

ابھی بالکل حال تک قانونِ علیت کو سائنسی تحقیقات کا بالاتفاق بنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اسی اصول کو ترک کر دینے کا سوال پیدا ہوگیا ہے کہ آیا کارخانۂ فطرت میں ہر واقعہ لزوماً کسی ایسے دوسرے واقعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے جس کو علت کہا جاتا ہے، یا اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حوادثِ فطرت کی تہ میں کوئی ایسی شے کارفرما ہے جس کو اختیار یا آزادئ ارادہ کہا جاتا ہے۔"

ماحصل یہ کہ اس وقت تک طبعی مظاہر کی تحلیل کا نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ہم کو کہیں بھی وجوبی یا جبری قانون کی موجودگی کی شہادت نہیں ملتی۔[1]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوانینِ فطرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں بلکہ "ان" کی حیثیت اعداد و شمار کے لئے قوانین کی رہ جاتی ہے۔ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں کوئی ایسا قانون نہیں جانتی ہیں کہ فلاں شخص چالیس برس کی عمر میں مرجائے گا لیکن اتنا جانتی ہیں کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد آدمی چالیس کے سن میں مرجائیں گے یعنی افراد کی نسبت کامل ناقابلِ پیش بینی ہونے کے باوجود جماعت کی نسبت پیش بینی ممکن ہے۔ بس قوانینِ فطرت فقط اسی معنی میں موجود ہیں اور سائنسی پیش گوئی یا پیش بینی ہوسکتی ہے۔[2]

---

[1] بحوالہ جنرل آف فلاسفی بابت ۱۹۳۳ء۔ [2] پورا نام OUTLINE OF MODERN BELIEF ہے (جدید عقائد کا خاکہ)

بالفاظِ دیگر قانونِ فطرت کی نوعیت دراصل قانونِ عادت کی ہے یعنی کسی خاص فرد کے بارے میں وجوباً پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ وہ فلاں عمر میں مرجائے گا البتہ عادۃً یہ معلوم ہے کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد چالیس سال کی عمر میں مرجائیں گے۔ مذہب کی زبان میں اسی قانونِ عادت کو عادۃ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بنا پر بھی عملِ فطرت کی یکسانی یا قوانینِ فطرت کے نفسِ وجود کا انکار نہیں لازم آتا۔ البتہ ان قوانین کا منشا اندھے، بہرے، بے علم و اختیار مادّہ کے اٹل وجوب ولزوم سے نہیں بلکہ ایک علم و اختیار والی ذات (اللہ تعالیٰ) کی عادتِ جاریہ سے ہے جو کسی حکمت و مشیّت کے تحت کبھی کبھی اس عادتِ جاریہ کے خلاف بھی کرسکتی اور کرتی ہے۔ یہی معجزہ ہے اور بقول مشہور سائنسدان ڈاکٹر کارپنٹر کے کہ قائلِ مذہب سائنسدان کو اس کے ماننے میں کوئی عقلی دشواری نہیں پیش آسکتی کہ خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف بھی کر سکتا ہے۔ ہم کو معجزات کے خلاف سائنس کے کسی ایسے فتوے کا علم نہیں جو معتبر شہادت کی موجودگی میں ان کے قبول سے مانع ہو۔[1]

جب کارپنٹر کے زمانہ ہی میں سائنس کا کوئی ایسا فتویٰ معلوم نہ تھا تو اب کوانٹم نظریہ کے بعد جبکہ کلام و فلسفہ کے نرے قیاسات سے گزر کر خود سائنس کی دنیا میں اور سائنس ہی کی راہ سے فطرت یا علّیت کے نام نہاد اٹل قوانین کا وجود اتنا مشتبہ ہوگیا ہے کہ مادّی دنیا سے بظاہر ان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنا پڑ رہا ہے تو اور بھی سائنس کا یا قوانینِ فطرت کے خرق کا نام لے کر کسی معجزہ کا انکار کس منہ سے کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بقول کارپنٹر

(بقیہ حاشیہ) مرتبہ جے۔ ڈبلو۔ ان سولیوان (J. W. N. SULIVAN) و واٹر گیرسن (W. GRIERSON) حصہ چہارم باب ۶۔

[1] دیکھو فرانک بلیارڈ کی THE MIRACLE OF UNBELIEF

ہی کے اصل سوال صرف یہ ہے کہ آیا اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے یا نہیں جس سے معلوم ہو کہ خالق فطرت کبھی کبھی خلافِ فطرت بھی کر دیا کرتا ہے"[1]

یہ صرف ممکن ہی نہیں ہے کہ خالق فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف کر سکتا ہے یعنی معمولی سلسلۂ علل و اسباب و معلومات کو توڑ سکتا ہے۔ بلکہ ایک اور نامور عالمِ طبیعیات پروفیسر ڈالبیر[2] کا اعتراف یہ ہے کہ اس امر کی ہمارے پاس خاصی شہادت موجود ہے جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض طبعی حوادث اس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے تمام معمولی علل و اسباب غائب ہوتے ہیں۔ اجسام حرکت کرتے ہیں درانحالیکہ نہ کوئی شخص ان کو چھو رہا ہے اور نہ برقی یا مقناطیسی عوامل کا پتہ ہے۔ اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ ایک نفس کا خیال دوسرے نفس میں بلا کسی وساطت کے پہنچ سکتا ہے اور جس قسم کے واقعات کو معجزہ سمجھا جاتا تھا ان کا وقوع اب عیر اغلب نہیں رہا ہے۔

ہکسلے کو اگرچہ اس بارے میں ہیوم سے شدید اختلاف ہے کہ "معجزہ نام قوانین فطرت کے خرق کا ہے" لیکن تصریحاتِ بالا سے قانونِ فطرت کی جو حقیقت ثابت ہوتی ہے اس کو اگر وضاحت کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو ہمارے نزدیک معجزہ کی یہ تعریف چنداں قابل اعتراض نہیں رہ جاتی:۔

(۱) قوانین فطرت عبارت ہیں قوانینِ عادت سے۔

---

[1] دیکھو فرانک بیلارڈ کی THE MIRACLE OF UNBELIEF [2] دیکھو اس کی کتاب MATTER, ETHER, MOTION (مادہ۔ ایتھر، حرکت)

(۲) جو ہم کو بذاتِ خود اشیا کے اندر نہیں معلوم بلکہ ان کی بنیاد تمام تر گزشتہ تجربہ پر ہوتی ہے۔ جس کے خلاف ہونا ہمیشہ ممکن ہے اور کسی اصلی استحالہ کو مستلزم نہیں۔

(۳) لہٰذا قوانینِ فطرت کے خلاف ہونا (یعنی ان کا خرق) بذاتِ خود ممکن، عقلاً جائز بہ الفاظ دیگر یہ کہ معجزہ عقلاً بالکل جائز و ممکن ہے۔



شہادتِ معجزات

امکان وقوع کے لئے کافی نہیں لیکن کسی امر کا صرف عقلاً جائز و ممکن ہونا اس کے وقوع کی دلیل نہیں۔ یہ عقلاً بالکل جائز و ممکن تھا کہ اکبر ہندوستان کے ساتھ انگلستان کا بھی بادشاہ ہوتا۔ مگر واقعاً ایسا نہیں۔ کسی شے کے وقوع کو قبول کرنے کے لئے دو صورتیں ہیں۔ (۱) غیر مشتبہ مشاہدہ یا (۲) تشفی بخش شہادت۔ غیر مشتبہ مشاہدہ کی صورت میں کوئی شے بحث طلب نہیں رہ جاتی، مثلاً

آنحضرتؐ نے ایک سفر میں حضرت جابرؓ سے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ انہوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈھا پانی نہیں ملا۔ انصار میں ایک شخص تھے جو خاص طور پر آپؐ کے لئے پانی ٹھنڈا کر کے رکھتے تھے۔ حضرت جابرؓ نے آپؐ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی تو آپؐ نے ان کو اُن انصاری کے پاس بھیجا۔ لیکن اُن کے پاس بھی اس قدر کم پانی نکلا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ ہی میں جذب ہو کر رہ جاتا۔ حضرت جابرؓ نے آنحضرتؐ کو اس کی خبر دی تو آپؐ نے اس برتن کو منگا بھیجا اور ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا اور اس کو ہاتھ سے دبا دیا۔ پھر حضرت جابرؓ کو برتن دیا اور طشت طلب فرمایا۔ آپؐ نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلائیں اور اس طشت کے اندر رکھ کے حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کہہ کر آپؐ کے ہاتھ پر پانی گرائیں۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا۔ پہلے آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی ابلا۔ پھر تمام طشت بھر گیا

یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا۔[1]

اب اگر حضرت جابرؓ نے اس واقعہ کو بچشم خود مشاہدہ کیا اور ان کو اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہیں تھا تو ظاہر ہے کہ اُن کو اس کے یقین و قبول میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ البتہ ہمارے لئے اس کے باور کرنے میں یہ بحث پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ فی نفسہٖ ممکن ہے یا ناممکن اور حضرت جابرؓ کی شہادت کہاں تک قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے۔

لہٰذا امکانِ معجزات کا مرحلہ طے ہو چکنے کے بعد دوسری بحث شہادتِ معجزات کی پیدا ہوتی ہے۔

ہیوم کا فتویٰ ہیوم کا روایاتِ معجزہ کے متعلق اگرچہ آخری فتویٰ یہی ہے کہ اس کے اثبات کے لئے انسانی شہادت کی کوئی کمیت و کیفیت نہیں کافی ہو سکتی۔ تاہم نفس خارقِ فطرت واقعات کے لئے اس کے نزدیک بھی انسانی شہادت کا ایک درجہ ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ان کو قبول کیا جا سکتا ہے:

"فرض کرو کہ تمام زبانوں کے تمام مصنفین اس پر متفق ہوں کہ یکم جنوری ۱۶۰۰ء سے لے کر آٹھ دن تک برابر روئے زمین پر تاریکی چھائی رہی۔ یہ بھی فرض کرو کہ اس خارقِ عادت واقعہ کی روایت آج تک لوگوں کی زبان پر ہے اور دوسرے ممالک سے جو سیاح آتے ہیں وہ بے کم و کاست اور بلا شائبۂ تناقض وہاں کے لوگوں کی یہی روایت بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانہ کے حکماء کا کام شک کے بجائے اس واقعہ کا یقین کر کے اس کی توجیہ اور اس کے علل و اسباب

---

[1] دیکھو کتاب ہذا، بیان عام معجزات۔

کی جستجو ہوگی۔ کائناتِ فطرت میں زوال و انحطاط، فنا و فساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثہ سے اس کی تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابلِ قبول ہوگی، بشرطیکہ یہ شہادت نہایت وسیع، متواتر اور متفق علیہ ہو۔[1]

ہیوم کا تعصب اب اگر یہی واقعہ کسی نبی کی طرف منسوب کرکے معجزہ قرار دیا جائے تو ہیوم کے نزدیک اس پر یقین کرنے کے لئے کوئی انسانی شہادت قابلِ قبول نہ ہوگی کیوں؟ اس لئے کہ "اِس قسم کی شہادت خود اپنی تکذیب ہے"۔ حتیٰ کہ "جس معجزہ کی بنا کسی انسانی شہادت پر ہو، وہ حجت و استدلال کے بجائے محض تمسخر انگیز چیز ہے"۔ مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک و خرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں۔ لہٰذا مذہب کی طرف نفسِ انتساب ہی معجزہ کے حیلہ و فریب ہونے کا پورا ثبوت ہے۔ مذہب جیسی مقدس شے کی تائید میں لوگ بے ضرر کذب و افترا سے باک نہیں کرتے۔ پیمبر (معاذ اللہ) عزتِ پیمبری کے شوق میں ہر طرح کے خطرات کو گوارا کرسکتا اور مکر و احتیال پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ انسان زود اعتقاد اور بالطبع عجائب پسند ہے۔ معجزات کا قبولِ عام اور بآسانی شائع و ذائع ہوجانا خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ انسان میں عجائب پرستی کا کیسا شدید میلان ہے اور اس لئے عجائب پرستی کے تمام بیانات کو بجا طور پر اشتباہ کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر معجزات اور فوق الفطرت باتوں کے خلاف ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد زیادہ تر جاہل اور وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ ایک عقل مند آدمی پرانے زمانہ کی حیرت زا تاریخوں کو پڑھ کر پکار اٹھتا ہے کہ عجب بات ہے کہ اس قسم کے خارقِ عادت واقعات ہمارے

---

[1] فہم انسانی باب ۱۰۔

زمانہ میں نہیں ظاہر ہوتے۔ انہی وجوہ کی بنا پر دعویٰ ہے کہ مذہب کے نام سے جتنے معجزات بیان کئے جاتے ہیں، وہ سب کے سب محض خرافات اور انسان کی اوہام پرست فطرت کا ڈھکوسلا ہیں[1]۔

بلاشبہہ شہادت کی جرح و تعدیل اور تحقیق و تنقیح کے وقت یہ تمام امور قابلِ لحاظ ہیں۔ لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک شئے بھی ایسی ہے جس کی بنا پر محض معجزہ یا مذہب کا نام آتے ہی کسی غیر معمولی و خارق عادت واقعہ سے انکار کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مذہب کے نام سے ہیوم کا یہ ایسا ناقابلِ حمایت اور صریح تعصب تھا جس کے لئے صدائے تائید حکمت و فلسفہ کے سنجیدہ حلقوں سے نہیں اُٹھ سکتی تھی اور اگر کسی معجزہ کی تصدیق میں تشفی بخش شہادت موجود ہو تو اس کے قبول سے محض معجزہ ہونے کی بنا پر کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک سفر میں

> صحابہؓ بھوک سے اس قدر بیتاب ہوئے کہ اونٹنیاں ذبح کرنا چاہیں۔ لیکن آپؐ نے تمام لوگوں کے زادِ راہ کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ایک چادر بچھائی گئی اور اس پر تمام زادِ راہ ڈھیر کیا گیا۔ اس تمام سامان کی مجموعی مقدار نے صرف اس قدر زمین کا احاطہ کیا جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی اور اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی۔ لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لئے[2]۔"

کافی شہادت اب اس روایت میں اگر ان امور کی کافی شہادت مل جائے کہ

(۱) تمام زادِ راہ صرف ایک بکری کے بیٹھنے کی جگہ میں آگیا تھا۔

---

[1] یہ تمام قریب قریب ہیوم ہی کے الفاظ ہیں جو تم کو اس کے مضمون "معجزات" میں جا بجا ملیں گے۔

[2] دیکھو کتاب ہذا بیان عام معجزات۔

(۲) اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی۔

(۳) سب لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا۔

(۴) اپنے اپنے توشہ دان بھر لئے۔

تو ہکسلے جیسے حکیم و فلسفی تک کو اس روایت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

چنانچہ اسی نوعیت کا ایک معجزہ حضرت مسیح علیہ السلام کا انجیل میں مذکور ہے کہ پانچ روٹیوں اور مچھلیوں سے پانچہزار آدمیوں کا پیٹ بھر گیا اور پھر بھی اتنے ٹکڑے بچ رہے جن کو جمع کرنے سے بارہ ٹوکریاں بھر گئیں[1] لیکن اس معجزہ کے باور کرنے میں روایۃً و درایۃً جو دشواریاں نظر آتی ہیں ان کو پوری طرح واضح کرنے کے بعد بھی ہکسلے نے لکھا ہے کہ

"اگر یہ ثابت ہو جائے کہ (۱) کھانا شروع کرتے وقت روٹیوں اور مچھلیوں کا وزن کیا تھا (۲) ۵ ہزار آدمیوں میں یہ تقسیم کی گئیں بلا اس کے کہ ان کی کمیت یا کیفیت میں کوئی اضافہ ہوا ہو، (۳) تمام آدمی واقعاً پوری طرح آسودہ ہو گئے اور (۴) اس کے بعد ٹوکریوں میں جو ٹکڑے جمع کئے گئے ان کا وزن کیا تھا تو پھر ممکنات و ناممکنات کے بارے میں میرے موجودہ خیالات کچھ ہی ہوں لیکن مذکورۂ بالا چار چیزوں کی تشفی بخش شہادت کے بعد مجھ کو ماننا پڑے گا کہ پچھلے خیالات غلط تھے اور اس معجزہ کو ممکناتِ فطرت کی ایک نئی اور خلاف توقع مثال سمجھوں گا"[2]

غرض معجزہ نہ صرف فی نفسہ ایک ممکن الوقوع شے ہے بلکہ "تشفی بخش شہادت" کی بنا پر اس کے وقوع کا یقین بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ بحث رہ جاتی ہے کہ آیا مذہبی یا تاریخی کتابوں میں جو معجزات مذکور ہیں ان کے یقین کرنے کے لئے "تشفی بخش شہادت"

---

[1] یوحنا، باب ۶، آیات ۵ ۔ ۱۴۔ [2] مقالات ہکسلے جلد پنجم۔

موجود ہے۔

اس سوال کا جواب ہیوم کو تو نفی میں دنیا ہی چاہیئے تھا لیکن یہاں پہنچ کر ہکسلے بھی سپر افگندہ ہوجاتا ہے اور ہیوم کے جواب سے لفظاً و معنیً کامل طور پر اتفاق کرلیتا ہے[1]۔

"یہ سچ ہے کہ معجزات کے ناممکن ہونے کا دعویٰ نہیں ثابت کیا جاسکتا لیکن مجھ کو کوئی ایسی شے قطعاً نہیں معلوم جس کی بنا پر میں ہیوم کے اس وزنی فتوی میں کچھ ترمیم کرسکوں کہ

"تاریخ کے سارے دفتر میں ایک بھی ایسا معجزہ نہیں ملتا جس کی تصدیق و تائید میں ایسے فہمیدہ، باہوش اور تعلیم یافتہ لوگوں کی کافی تعداد موجود ہو جن کے خود فریب و مغالطہ میں پڑنے کا ہم کو اندیشہ نہ ہو۔ جن کی راست بازی اس درجہ غیر مشتبہ ہو کہ کسی مصلحت کی بنا پر دوسروں کو فریب دہی کا ان پر گمان نہ ہوسکے۔ جو لوگوں کی نگاہ میں ایسی عزت و شہرت رکھتے ہوں کہ اگر ان کا جھوٹ کھل جائے تو ساری عزت خاک میں مل جائے۔ ساتھ ہی جن واقعات کی وہ روایت یا تصدیق کر رہے ہیں وہ ایسے علی الاعلان طریقے سے اور ایسے مشہور مقام پر واقع ہوئے ہوں کہ ان کی نسبت دروغ بیانی چھپ ہی نہ سکے۔ حالانکہ انسانی شہادت کو قطعی بنانے کے لئے یہ تمام باتیں ضروری ہیں"

ہیوم نے کہنے کو تو کہدیا کہ قبولِ معجزات کے لئے جس درجہ کی شہادت درکار ہے اس کا تاریخ کے دفتر میں کہیں پتہ نہیں۔ لیکن معجزات کے عدم قبول کی کیا واقعاً یہی وجہ ہے؟ اور کیا اس نے اپنے اس دعویٰ کی چند ہی صفحات آگے بڑھ کر خود تردید نہیں

---

[1] مقالات ہکسلے، جلد پنجم۔

کردی ہے۔

فرانس میں کوئی مشہور درگاہ ہے "جس کے تقدس پر (بقول ہیوم) لوگ مدتوں فریفتہ رہے ہیں":

"بہروں کو سماعت، اندھوں کو بصارت مل جانا اور بیماروں کا اچھا ہو جانا اس مقدس درگاہ کی معمولی کرامتیں تھیں جن کا ہر گلی کوچے میں چرچا رہتا تھا۔ لیکن سب سے حیرت انگیز اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی کرامتیں ایسے اشخاص کو حَکَم یا ثالث بنا کر اُن کے روبرو ثابت کر دکھائی گئی ہیں جن کی دیانت پر حرف رکھنا ناممکن ہے۔ پھر ان پر ایسے گواہوں کی مُہرِ تصدیق ثبت ہے جن کی شہرت و سند مسلّم ہے۔ جس زمانہ میں ان کرامتوں کا ظہور ہوا وہ علم کا زمانہ ہے اور جگہ بھی ایسی جو دنیا کا مشہور ترین خطہ ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کرامتیں چھاپ چھاپ کر ہر جگہ شائع کی گئیں۔ بااین ہمہ یسوعی فرقہ تک کو ان کی تکذیب یا پردہ دری کی مجال نہ ہوئی۔ حالانکہ یہ لوگ خود اہلِ علم تھے مجسٹریٹ ان کی حمایت پر تھا، اور ان خیالات کے جانی دشمن تھے جن کی تائید میں یہ معجزات پیش کئے جاتے تھے۔ اب یہ بتاؤ کہ کسی امر کی توثیق و تصدیق کے لئے اتنی تعداد میں موافق حالات ہم کو کہاں میسّر آسکتے ہیں اور ان دَل بادَل شہادتوں کے خلاف ہمارے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ یہ واقعات بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارقِ فطرت ہیں۔ اور معقول پسند آدمیوں کی نگاہ میں ان کی تردید کے لئے بس یہی ایک دلیل کافی ہے۔"[1]

اللّٰھم احفظنا من شرور انفسنا۔

ہیوم کا صریح تناقض ایک ہی مضمون کے اندر ایسے زبردست فلسفی کی ایسی صریح

[1] فہم انسانی باب ۱۰۔ قابل توجہ فقرات کو زیر خط میں مؤلف ہذا نے کیا ہے۔

تناقض بیانی جس قدر حیرت افزا ہے اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا یقین ہمیشہ اس کی منطق کا ساتھ نہیں دیتا۔ جبریہ اس کے قائل ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے اور اس دعویٰ پر انہوں نے اٹل سے اٹل دلائل قائم کر دیئے ہیں تاہم دیکھو کہ چوبیس گھنٹے کی زندگی میں وہ خود کتنے لمحے ان دلائل کی بنا پر اپنے کو مجبورِ محض یقین کرتے ہیں ہیوم کے دلائل فلسفہ نے بیشک یہ ثابت کر دیا کہ معجزہ فی نفسہٖ ناممکن نہیں لیکن پھر بھی دل سے یہ کھٹک نہیں نکلتی کہ "یہ واقعات (معجزات) بذات خود ناممکن اور سراسر خارقِ عادت ہیں" اور ان کی تردید کے لئے بس یہی ایک دلیل کافی ہے۔ فرانس کی درگاہ کے متعلق جو کرامتیں مشہور ہیں ان کی توثیق و تصدیق کے لئے اسی درجہ کی شہادت اس کو مل گئی جس کا چند صفحہ پہلے اس کے نزدیک تاریخ کے سارے دفتر میں وجود نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ان کرامتوں سے قطعی انکار ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ معجزات کا یقین کرانے کے لئے کسی معجزہ یا کرامت کی تائید میں صرف ممکن سے ممکن انسانی شہادت کا مہیا کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ پہلے اس کے عدمِ امکان کا وسوسہ پوری طرح ذہن سے نکالنا چاہیے اور پھر خود یقین کی ماہیت و اسباب پر بحث کرنی چاہیے۔

انتہائی استبعاد اوپر[1] اگرچہ ہم نے ہیوم کی اس تعریف میں چنداں مضائقہ نہیں خیال کیا تھا کہ معجزات نام ہے خارقِ فطرت واقعات کا۔ لیکن تم نے اقتباس بالا کے آخری زیرِ خط جملہ میں دیکھ لیا کہ "خارق" کا لفظ کس قدر گمراہ کن ہے۔ خود ہیوم ہی کے فلسفہ کی رُو سے معجزات کا بالذات ممکن ہونا قطعی طور پر محقق ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس کی زبانِ قلم

---

[1] دیکھو صفحات بالا۔

اس لغزش سے اپنے کو نہیں بچا سکتی کہ "یہ واقعات (معجزات) بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارقِ فطرت ہیں"۔ اصل یہ ہے کہ نفسی اہتلافات کی بنا پر ہمارے ذہن میں یہ غلط خیال بُری طرح جاگزیں ہو چکا ہے کہ فطرت یا قانونِ فطرت ایک اٹل اور ناممکن التغیر شئے ہے اس لئے کسی واقعہ کو خارقِ فطرت کہتے ہی اس کے ناممکن ہونے کا تصور ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔

لہٰذا جب یہ مختتم طور ثابت ہو چکا ہے کہ خود معجزہ کی ذات میں عدمِ امکان داخل نہیں ہے بلکہ "تشفی بخش شہادت" کی موجودگی میں اس کا یقین کیا جا سکتا ہے تو اس کو "خارقِ فطرت" کی گمراہ کن تعبیر کے بجائے پہلے کے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ "انتہائی حیرت انگیز" واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن "انتہائی حیرت انگیز" سے بھی مناسب تر تعبیر "انتہائی مستبعد" کی ہو گی۔

استبعادِ معجزات

فطرت کی یکسانی ایک عام خیال جو اس "حیرت انگیزی" میں اضافہ کرتا ہے، یہ ہے کہ کارخانۂ فطرت کے تمام پرزے ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں ہی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ حکما جب تک فطرت کی یک رنگی پر زور دیتے ہیں تو اسی مغالطہ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ مل کو اپنی "منطق"[1] میں اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ فطرت کی کارفرمائی ہمیشہ یکسانی پر مبنی ہوتی ہے۔ ہم خود غور کریں تو کچھ نہ کچھ مثالیں ایسی سامنے آتی رہتی ہیں جن سے یہ مغالطہ دور ہو جانا چاہیئے۔ ابھی آج ہی اخبار پڑھتے وقت اس قسم کے دو واقعے نظر پڑے[2]۔

---

[1] نظام منطق کتاب سوم، باب۔ [2] یہ دونوں واقعے آج ۲۷ فروری ۱۹۲۲ء کے لیڈر میں مذکور ہیں۔

عورتوں کے علی العموم بہ وقتِ واحد ایک لڑکا ہوتا ہے یا کبھی کبھی دو، لیکن حال میں مکسکو (امریکہ) میں ایک عورت کے ایک ساتھ آٹھ لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک دوست سے اس واقعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کچھ عرصہ ہوا کہ برہما میں ایک عورت کے چھ لڑکے ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی۔

طبی دنیا کا عام تجربہ ہے کہ جب خون کی حرارت ۱۰۷ یا ۱۰۸ درجے پر پہنچ جاتی ہے تو آدمی نہیں بچتا۔ لیکن برسٹل میں انفلوائنزا کی مریض ایک لڑکی کا بخار ۱۱۴ درجے تک پہنچ گیا پھر بھی وہ اچھی ہوگئی اور زندہ ہے خود حیرت زدہ ڈاکٹر کی شہادت ہے کہ

"جب وہ پہلی دفعہ اس لڑکی کو دیکھنے کے لئے بلایا گیا تو اس کی حرارت ۱۱۲ نکلی۔ خیال ہوا کہ تھرمامیٹر میں کچھ نقص ہے۔ دوسرا تھرمامیٹر منگا کر لگایا تو پھر وہی ۱۱۲۔ ڈاکٹر کو اب بھی یقین نہ آیا۔ اس نے دو تھرمامیٹر اور آزمائے۔ بالآخر یقین کرنا پڑا۔ کچھ علاج سے بخار اپنی معتدل حالت پر آگیا۔ لیکن رات کو پھر بڑھ گیا اور دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر نے دیکھا تو ۱۱۴ تھا۔ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بہرحال علاج سے فائدہ ہوا اور اب مریضہ خاصی روبصحت ہے۔"

ترکیون متی (ٹرگنامیٹری) یا "مساحۃ المثلثات" وغیرہ ریاضیاتِ عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے۔ دس، گیارہ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ اسکول کی چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں، اُن کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے۔ جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و محنتی اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلّم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے، وہ بہت ترقی کرتے ہیں، تو تیرہ چودہ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر پاتے ہیں۔

غالباً ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے اخبار "لیڈر" (بھارت) میں راج نرائن نامی گیارہ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا معجزۂ ریاضیات اسی عنوان سے چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی علم کی مدد کے اعلیٰ الجبرا، ترکیون متی، تحلیلی اقلیدس (جامیٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہے۔

ولادتِ مسیحؑ (بے باپ کے) یا احیائے موتیٰ سے بڑھ کر کس شے میں انتہائی استبعاد یا اعجاز ہو سکتا ہے۔ لیکن سائنس کی تحقیقات نے (جس کے نزدیک انسان کی حقیقت عالمِ حیوان سے زیادہ نہیں، عالمِ حیوانات ہی کے اندر اُس کے نظائر بھی تلاش کر لئے۔ چنانچہ ہکسلے جیسے سائنسدان نے معجزات ہی کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> "رہا مریمؑ کے کنوارپن میں مسیحؑ کا پیدا ہونا تو یہ نہ صرف ممکن التصوّر شے ہے بلکہ علم الحیات کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض اصنافِ حیوانات میں یہ روزانہ کا واقعہ ہے۔ یہی حال احیائے موتیٰ کا ہے۔ بعض جانور مر کر مومیات کی طرح بالکل خشک ہو جاتے ہیں اور عرصہ تک اسی حالت میں رہتے ہیں۔ لیکن جب ان کو مناسب حالات میں رکھ دیا جاتا ہے تو پھر جان آجاتی ہے"[1]

ایجاداتِ سائنس | یہ تو سائنس کا علمی و تحقیقاتی پہلو تھا۔ ایجادی و اختراعی پہلو نے بھی اس سے کم "انتہائی حیرت انگیز" اعجاز نمائیاں نہیں کی ہیں۔

لاسلکی ذریعۂ پیغام رسانی کی ایجاد سے پہلے یہ کس قدر مستبعد بلکہ ایک حد تک ناقابلِ تصور بات تھی کہ آپ بمبئی میں بیٹھے ہیں اور آپ کا دوست لندن میں۔ درمیان میں ہزارہا میل سمندروں کی پہنائی حائل ہے۔ تار وغیرہ کوئی محسوس شے آپ دونوں کے مابین رابطہ نہیں۔ پھر بھی چشم زدن میں آپ اس کو اپنا پیام پہنچا سکتے ہیں۔ ایک منٹ میں ساٹھ

---

[1] مقالات ہکسلے۔ جلد پنجم۔

سیکنڈ ہوتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے بھی سولہ حصے کیجئے اور اس سولھویں حصہ میں یہ پیام بارہ ہزار میل سے زائد کی مسافت طے کرسکتا ہے۔[1]

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ آپ صرف پیام ہی نہیں پہنچا سکتے ہیں بلکہ حال ہی میں ایک فرانسیسی سائنسداں نے اس معجزہ کا دعویٰ کیا ہے کہ بمبئی میں اپنے میز پر بیٹھے بیٹھے آپ اسی لاسلکی کے ذریعہ سے لندن، پیرس یا نیویارک میں چک پر اپنے دستخط ثبت کرسکتے ہیں۔ قریب قریب (یعنی سیکڑوں میل) کے مقامات تک اس کے کامیاب تجربات ہو بھی چکے ہیں۔[2]

تنویم | طبیعیات کے ان کرشموں کو دیکھ چکنے کے بعد اب ذرا نفسیات کے اس شعبہ کی تحقیقات کو سامنے لائیے جس کا نام ہپناٹزم ہے۔ عربی میں اس کو تنویمِ مقناطیسی کہتے ہیں لیکن ہم صرف تنویم یا عملِ تنویم سے تعبیر کریں گے۔

اس عمل کی کرامات ہمارے زمانہ کے ایک نہایت ہی بلند پایہ محقق نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"عاملِ تنویم اپنے معمول سے جو کچھ بھی کہتا ہے اس کو وہ یقین کرلیتا ہے اور جس چیز کا حکم کرتا ہے اس کو بجالاتا ہے حتیٰ کہ جو چیزیں معمولی حالت میں آدمی کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی عامل کے حکم سے واقع ہوسکتی ہیں۔ مثلاً چھینک، چہرے کا سرخ یا زرد پڑ جانا، حرارتِ خون کا کم یا زیادہ ہوجانا، حرکتِ قلب میں تیزی یا سستی پیدا ہوجانا وغیرہ وغیرہ"۔

تم معمول کو یقین دلا سکتے ہو کہ وہ یخ ہوا جارہا یا آگ میں جلا جارہا ہے۔ تم اس

---

[1] معارف [2] انڈین ریویو بابت جنوری ۱۹۲۲ء۔

کو آلو کھلاؤ لیکن یہ یقین دلا سکتے ہو کہ شفتالو کھا رہا ہے۔ تم اس کو سرکہ پلا کر یقین دلا سکتے ہو کہ شراب پی رہا ہے۔ نو سادر میں اس کو کالوگنی کی بو محسوس ہو سکتی ہے۔ کرسی اس کو شیر نظر آسکتی ہے۔ جھاڑو اس کے لئے خوبصورت عورت بن جا سکتی ہے۔ راستہ کا شور اُس کو موسیقی معلوم ہو سکتا ہے ..... جوان آدمی اپنے کو بچہ یا نپولین اعظم سمجھنے لگ سکتا ہے۔"

"سر یا دانتوں کا درد دور کر دیا جا سکتا ہے۔ وجعِ مفاصل وغیرہ کے مریض کو اچھا کیا جا سکتا ہے۔ بھوک فنا کر دی جا سکتی ہے یہاں تک کہ ایک شخص نے چودہ دن تک کھانا نہیں کھایا ..... جس چیز سے تم چاہو اسی چیز سے معمول بہرا یا اندھا ہو جا سکتا ہے۔ مثلاً فلاں لفظ وہ نہ سنے۔ لاکھ اس کے سامنے چیخو نہ سُنے گا، یا فلاں آدمی کو وہ نہ دیکھے۔ اس کے سامنے کھڑا کر دو وہ نہ دیکھ سکے گا۔"[1]

اس عمل کے وقت معمول پر ایک نیند کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اس کا نام تنویم ہے۔ لیکن عمل کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے مثلاً جس مرض کے لئے تم عمل کرو وہ ہمیشہ کے لیئے دور ہو سکتا ہے یا فرض کرو کہ معمول سے تم یہ کہہ دو کہ آئندہ سال جنوری کی بیس تاریخ کو صبح نو بجے اپنے پلنگ کے پاس ایک شیر کھڑا دیکھو گے۔ سال بھر کے بعد ٹھیک اسی وقت پلنگ کے پاس معمول کو شیر دکھائی دے گا۔

گو عملِ تنویم کے تجربات زیادہ تر نیند کی کیفیت طاری کرنے کے بعد ہی کئے جاتے ہیں لیکن اس کیفیت کا نمایاں طور پر طاری ہونا کامیابیٔ عمل کے لازمی شرائط میں نہیں ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مول کا خیال تو یہ ہے کہ ایسے معمول نسبتہً کم ہوتے ہیں جن پر کیفیتِ نوم

---

[1] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب "پرنسپلس آف سائیکالوجی (اصولِ نفسیات)، جلد دوم باب ۳۷۔

طاری ہوتی ہو[1] ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عمل کا اثر افراد ہی تک محدود نہیں بلکہ جماعتوں اور مجمعوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر البرٹ مول کا ابھی نام لیا جا چکا ہے۔ اس جرمن فاضل کی کتاب "ہپناٹزم" اپنے موضوع پر سب سے بہتر نہایت محققانہ اور مستند خیال کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب میں دکھلایا ہے کہ بہت سے معجزات کی توجیہہ نہایت آسانی کے ساتھ تنویم مقناطیسی سے کی جا سکتی ہے۔ معجزات ہی پر کیا موقوف ہے۔ سحر و عملیات تک کے صدہا عجائب کی گرہ کھل جاتی ہے اور جن واقعات پر عقلا نے اوہام و اباطیل کی مُہر ثبت کر دی تھی وہ قوانینِ مادّی کی طرح قوانینِ نفسی کے حقائق بن گئے ہیں۔

معجزاتِ شفا بہت سے معجزات و کرامات کا تعلق امراض کی ایسی شفا سے ہے جو طب کے مادّی وسائلِ علاج پر مبنی نہیں اور اس کے لئے مدّعیانِ عقل کے ہاں اس کا نام "وہم پرستی" تھا۔ لیکن آج تنویمی تحقیقات نے ایک نیا اور نہایت کامیاب اصولِ علاج منکشف کر دیا ہے جو عام مادّی وسائل اور استعمالِ ادویہ سے قطعاً مستغنی ہے اور اس بے دوا کے علاج سے بہرے شنوا ہو جاتے ہیں، پھیپھڑے اور سل کے امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے، آنکھوں کی بیماریاں جاتی رہتی ہیں۔ وجعِ مفاصل دُور ہو جاتا ہے، زخم بھر آتے ہیں[2]۔ کیا اس کے بعد بھی انجیل کی روایاتِ مسیحائی کو "محض خوش اعتقادی یا اکاذیب کا طومار" کہنا خود اپنے جہلِ مرکب کی گواہی نہ ہو گی؟

فرانس کی جس مشہور درگاہ کی کراماتِ شفا کا اوپر ذکر گزرا ہے، ہیوم نے معتبر سے معتبر شہادت کے باوجود ان کو "قطعاً ناممکن" قرار دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر مول بلا کسی مطالبۂ شہادت

---

[1] ڈاکٹر مول کی کتاب "ہپناٹزم"۔ [2] ایضاً ص۔

کے قدیم مصری اور یونانی مندروں کی کرامات شفا کو تنویم ہی کا معجز نما نفسی اثر سمجھتا ہے[1]۔ غرض جو چیز ہیوم کے نزدیک "قطعاً ناممکن" تھی مول کے نزدیک اب اس میں اتنا استبعاد بھی باقی نہیں کہ کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کرے۔

جان اسٹورٹ مل نے معجزہ کی تعریف یہ کی تھی کہ "وہ عبارت ہے ایسے واقعہ سے جس کے پہلے وہ لوازم و شرائط نہ پائے جاتے ہوں جو دوبارہ اس کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہوتے ہیں"۔ لیکن آج ہمارے سامنے وہ لوازم و شرائط موجود ہیں جن کی بنا پر عصا اسی طرح اژدہا بن سکتا ہے جس طرح کہ کرسی شیر نظر آسکتی ہے تم کہو گے کہ تو پھر اس صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعجاز کیا رہا۔ اس کا جواب آئے گا۔ سر دست تم صرف اتنا سمجھ لو کہ عصا کا اژدہا بن جانا اتنا مستبعد واقعہ نہیں ہے جس پر یقین کے لئے نفس نوعیت واقعہ کی بنا پر کسی غیر معمولی شہادت کی احتیاج ہو۔

عام تجربات تنویمی تجربات کے علاوہ یوں بھی کچھ نہ کچھ ایسے پُر اسرار واقعات مشاہد و مسموع ہوتے رہتے ہیں جن کی توجیہہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہوتی اور جو بہت سے معجزات کے متعلق ہماری حیرت و استبعاد میں کمی پیدا کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے صوبہ کے مشہور انگریزی اخبار "لیڈر" نے پچھلے[2] سال اپریل میں بردوان کا ایک عجیب و غریب واقعہ چھاپا تھا جو نامہ نگار کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

> "بردوان میں ایک عجیب پُر اسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کر دی ہے۔ لالہ کندن لال کپور ایک کھتری زمیندار گیارہ ماہ حال کو چھ بجے شام کے وقت مرا۔ متوفی چونکہ سوریہ بنسی کھتری تھا، اس لئے جب تک دوسرے دن صبح

---

[1] ڈاکٹر مول کی کتاب ہپناٹزم۔ [2] ۱۹۴۶ء۔

آفتاب نہ نکل لیا۔ اس کی لاش جلائی نہیں گئی۔ جلانے سے پہلے اس کے لڑکے انند لال نے ایک خالی کمرہ میں جہاں کوئی اور نہ تھا، لاش کا فوٹو لیا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں۔ ان تصویروں میں سے دو کو تو خاندان کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکے کی ہیں جن کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ باقی تین تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہ جا سکیں۔"

ٹائمس آف سیلون" میں ایک انگریز پلانٹر (چائے کا کاشتکار) نے اپنے قلیوں کی قربانی اور پوجا کے کچھ مشاہدات لکھے تھے جو اس کو عجیب معلوم ہوتے تھے ان میں یہ بھی تھا[1]۔

"ایک شخص آگ کی سوراخ دار چٹی ہتھیلی پر رکھ کر مندر کے گرد رقص و طواف کرتا تھا۔ اس نے مجھ کو یقین دلایا کہ یہ چٹی اس کو بالکل گرم نہیں محسوس ہوتی تھی حالانکہ جب میں نے تجربتہً چٹی کے اسی حصہ کو جو اس شخص کی ہتھیلی پر تھا، چھوا تو میری انگلی جل گئی۔ ان کا بڑا پجاری کم و بیش ایک منٹ تک آگ میں ہاتھ ڈالے رہا اور کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی طرح اور بھی کئی قلیوں نے نہایت غیر معمولی حرکتیں کیں۔"

ان چشم دید عجائب کو لکھ کر پلانٹر نے ناظرینِ اخبار سے درخواست کی ہے کہ اگر کسی اور صاحب نے اس قسم کے واقعات دیکھے ہوں تو براہِ مہربانی اطلاع دیں یا اگر اُن کی کوئی توجیہہ، تشریح ہو سکتی ہو تو کریں۔ اس پر خود "ٹائمس" نے لکھا ہے کہ "سیلون اور ہندوستان دونوں جگہ مذہبی رسوم کے مواقع پر اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں

---

[1] "لیڈر" نے "ٹائمس آف سیلون" کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

آتے ہیں۔ مثلاً کولمبو میں محرم کے موقع پر لوگ آگ میں چلتے ہیں۔ ہم کو نہیں معلوم کہ ایسے واقعات کی اب تک علمی توجیہہ ہو سکی ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ لوگ اپنے آپ پر عمل تنویم کر لیتے ہیں[1]۔

بہرحال توجیہہ ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن اڈیٹر ٹائمس نے پلانٹر کے بیان کی تکذیب نہیں کی۔ نہ کسی مزید شہادت کا مطالبہ کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح کے واقعات اور بھی وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں۔ جن کو سامنے رکھنے کے بعد پلانٹر کا بیان اتنا مستبعد نہیں رہتا کہ نفسِ نوعیتِ واقعات ہی کی بنا پر ان کی تغلیط و تردید کر دی جائے یا کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کیا جائے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس واقعہ کو غلط کو سمجھو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نہ جلا سکی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی بنا پر تم ان کی نبوت کا اقرار نہ کرو لیکن نفسِ واقعہ سے انکار کا کیا حق حاصل ہے؟

رویائے صادقہ رویا یا خواب کی تشفی بخش عقدہ کشائی سے حکمت و فلسفہ کا ناخن اب تک عاجز ہے۔ مختلف اصنافِ خواب کی توجیہہ کے لئے جو جو نظریات فرض کئے گئے ہیں، وہ خود ایک خوابِ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن قدرت اپنی عجائب آفرینیوں کے لئے انسانی توجیہات کا انتظار نہیں کرتی۔

تم کسی مبصر آدمی سے دریافت کرو۔ اس کو اپنی زندگی کے بہت سے ایسے خواب یاد ہوں گے جو واقعاتِ مستقبل کی تمثیلی یا صریحی پیش بینی تھے۔ میرے ایک فلسفی دوست کو اپنے خوابوں کی صحت کا اس قدر تجربہ ہے کہ جب کسی شخص سے خواب میں اُن سے بے لطفی

---

[1] تنویم مقناطیسی کی تحقیقات کی رُو سے آدمی خود اپنے اوپر بھی عمل کر سکتا ہے۔

ہوجاتی ہے تو بیداری میں اس کے نتیجہ کے لئے وہ تیار رہتے ہیں اور اکثر کچھ نہ کچھ بدمزگی کی نوبت آہی جاتی ہے۔ مجھ کو اپنے خواب بہت ہی کم یاد رہتے ہیں۔ لیکن جو جس قدر زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد رہتا ہے اسی قدر زیادہ صحیح نکلتا ہے۔ ۱۹۲۰ء کے روزنامچہ میں (۱۵ اپریل) ایک جگہ لکھا ہے کہ

"آج دوپہر کو سویا تو کیا خواب دیکھتا ہوں کہ "ح" کا خط آیا ہے۔ جس میں "س" کا بھی ایک خط ملفوف ہے۔ اٹھنے کے بعد ڈاک آئی تو یہ خواب بالکل واقعہ تھا۔ انتہا یہ کہ خطوں کا جو مضمون خواب میں دیکھا تھا وہی قریب قریب بیداری میں بھی پایا۔"

حالانکہ مجھ کو "ح" کے خط کا کوئی انتظار نہ تھا اور "س" کا خط تو حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا۔"

پروفیسر ہلپرکت اسیریا کے آثارِ قدیمہ کا ایک مشہور ماہر ہے۔ اس نے دوبابلی کتبات کے متعلق ایک اشکال کو جو بیداری میں حل نہیں ہوسکا تھا، خواب میں حل کیا اور وہ بھی اس طرح کہ بابل کے ایک پرانے کاہن نے خواب میں آکر اس کی رہنمائی کی۔[1]

جب عام لوگوں کے یہ تجربات ہیں تو پھر اس میں کیا استعجاب و استبعاد رہ جاتا ہے کہ بعض نفوسِ قدسیہ (انبیاء) کے تمام خواب رویائے صادقہ یا ایک طرح کے وحی والہام ہوتے ہیں۔ رسالت پناہؐ پر وحی کی ابتدا رویائے صادقہ (صالحہ) سے ہوئی تھی۔ اخبار بالغیب کی گرہ بھی بڑی حد تک رویائے صادقہ سے کھل جاتی ہے۔

حقیقی اسرارِ نبوت اسرارِ نبوت میں سب سے زیادہ پُراسرار مقام وہ ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام کو خدا خود ندا دیتا ہے نَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ۔ جہاں سے موسیٰ علیہ السلام

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مضمون "ڈریم"

کو وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا کی بنا پر کلیم اللہ کا شرف عطا ہوتا ہے اور جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا میں[1] قَابَ قَوْسَیْنِ یا اس سے بھی کم کی دوری رہ جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں منطق و استدلال کا "حجابِ اکبر" اٹھ جاتا ہے اور ظنی علم کی جگہ کشف و مشاہدہ کا حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو کس نے ندا دی؟ موسیٰ علیہ السلام نے طور پر کس سے کلام کیا؟ اور لَنْ تَرَانِیْ کے باوجود کیا دیکھا؟ وہ کونسی ہستی تھی جس میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف قَابَ قَوْسَیْنِ کی دوری تھی؟ اور اَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی کا ماجرا کیوں کر پورا ہوا؟ ان سوالات کا جواب جامۂ تحدید میں رہ کر نہ دیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

حقیقی آیاتِ نبوت کی عام مثالیں عام معجزات کی جو نوعیت ہے چونکہ اُس کی مثالیں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، معمولی واقعاتِ زندگی میں بھی ملتی رہتی ہیں لہٰذا اسی نسبت سے ان کے استبعاد میں بھی بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن "وادیٔ ایمن" "سدرۃ المنتہیٰ" کی واردات جو اصلی معجزات اور مقامِ نبوت کی حقیقی "آیات کبریٰ" ہیں، ان کی بظاہر کوئی مثال اس عالم ناسوت میں نہیں نظر آتی جس سے عام انسانوں کو ان کے فہم میں مدد ملے۔ بیشک لَنُرِیَكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰی کا "رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"۔ اور یہ سچ ہے کہ آفتاب کی عالم افروزی کا اندازہ ستاروں کی چمک سے نہیں ہو سکتا۔ تاہم بہ قدرِ استعداد تجلّیٔ طور کا ہلکا سا پرتو ذرات پر کبھی کبھی پڑ ہی جاتا ہے اور چشمِ بینا کی ہدایت کے لئے اتنا ہی بس ہے۔

انبیائے مرسلینؑ کے بعد اولیاءِ مقربین کے ہاں ان تجلّیات کی کافی شہادتیں ملتی ہیں۔ لیکن عام انسانی سطح سے چونکہ یہ درجہ بھی بہت بلند ہے اس لئے اور نیچے اُتر کر ہم کو اپنی سطح کی کچھ مثالیں تلاش کرنی چاہئیں۔

---

[1] یا جبریلؑ میں۔

پروفیسر ولیم جیمس جو ہمارے زمانہ کا سب سے نامور محقق نفسیات ہے اور جس کا شمار اکابر فلاسفہ میں ہے، اُس نے لوگوں کے ذاتی وارداتِ مذہب یا مذہبی تجربہ و شعور کے مختلف اصناف پر پانچسو صفحات سے زائد کی ایک کتاب لکھی ہے[1]۔ اس میں بلا قیدِ مشرق و مغرب انبیاء و اولیا، عوام و خواص، علماء و حکماء سب کے "تجرباتِ مذہبی" کی آپ بیتی واردات کو یکجا کیا۔ اسی ذخیرہ میں سے ہم صرف عام انسانی سطح کے چند واقعات کا بہ ترتیبِ ذیل انتخاب کرتے ہیں:۔

سب سے پہلے جیمس نے اپنے ایک بے تکلف اور نہایت ہی ذہین و زیرک دوست کے متعدد تجربات لکھے ہیں۔ اس دوست کو کبھی کبھی رات کے وقت جبکہ یہ کتب بینی میں مشغول ہے یا خالی بیٹھا ہے، ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر کوئی موجود ہے۔ پلنگ کے پاس ہے۔ اپنی گود میں اس کو دبا رہا ہے۔ گو وہ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے یا کیا ہے تاہم نفس کی موجودگی کا اس سے کہیں زیادہ اس کو یقین ہے جتنا کہ دن کی روشنی میں کسی ذی روح کی موجودگی کا ہو سکتا ہے۔ وہ اس کو کسی متشخص ذات یا انسان کی طرح نہیں دیکھ رہا ہے پھر بھی اپنے تمام محسوسات سے زیادہ اس کے حقیقی و واقعی ہونے کا اذعان ہے۔

"اس کی موجودگی میں نہ کوئی ابہام و التباس ہے نہ یہ شعر یا موسیقی کے وجد و کیف کا سا پیدا کردہ کوئی جذبہ ہے بلکہ یہ ایک قوی شخصیت کی نہایت قریب موجودگی کا قطعی علم و یقین ہے اور اس کے چلے جانے کے بعد میرے حافظہ میں اس کی یاد ایک حقیقت کی طرح تازہ ہے۔ ہر چیز جو میں دیکھتا یا سنتا ہوں خواب ہو سکتی ہے

---

[1] اس کا نام THE VARITIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE (تجربۂ مذہبی کی اصناف) ہے۔ پروفیسر کا انتقال ابھی ۱۹۱۰ء میں ہوا ہے۔

لیکن یہ واقعہ خواب نہ تھا۔"

یہ دوست کوئی وہم پرست نہیں ہے۔ بلکہ جیمس کو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ اِن تجربات کو مذہبی رنگ میں کیوں نہیں تعبیر کرتا۔ اس کے بعد ایک اور شخص کا بیان ہے۔

"میری آنکھ بہت رات رہے کھُل گئی..... ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر جگا دیا اور پہلے میں یہی سمجھا کہ کوئی شخص اندر گھس آیا ہے..... میں نے پھر سونے کے لئے کروٹ بدل لی۔ فوراً ہی محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے اور یہ کچھ عجیب احساس تھا۔ کسی عام ذی حیات شخص کی موجودگی کا نہیں بلکہ ایک روحانی وجود کا احساس تھا۔ ممکن ہے کہ تم کو اس پر ہنسی معلوم ہوتی ہو لیکن میں وہ بیان کرتا ہوں جو مجھ پر گزری۔ بجز اس کے کہ میں ایک روحانی وجود سے اس کو تعبیر کروں اور کوئی بہتر صورت مجھ کو اپنے احساس کے ادا کرنے کی نہیں ملتی..... ساتھ ہی مجھ کو ایک یہ دہشت بھی محسوس ہوئی کہ کوئی عجیب و خوفناک واقعہ ظاہر ہوا چاہتا ہے۔"

ایک سائنس داں کے اعتراف سُنو:

بیس اور تیس سال کی عمر کے مابین میں بتدریج لاادری اور لامذہب ہو گیا تھا۔ تاہم اس غیر متعین شعور سے میں کبھی خالی نہیں رہا جس کا نام ہربرٹ اسپنسر نے "حقیقتِ مطلقہ" رکھا ہے۔ لیکن اسپنسر کی طرح یہ حقیقت میرے لئے محض ناممکن العلم نہ تھی۔ کیونکہ گو میں نے طفلانہ طریقہ سے خدا سے دعائیں مانگنا چھوڑ دیا تھا اور مذہبی رسم کے مطابق کبھی نماز نہیں پڑھی نہ دستِ بدعا ہوا تاہم میرا زیادہ حال کا تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ عملاً اس ذات کے ساتھ مجھ کو وہی تعلق رہا ہے جو دعا اور نماز کا ہوتا ہے۔ جب مجھ پر کوئی مصیبت پڑی خواہ وہ خانگی ہو یا کاروباری یا جب میں کسی معاملہ کے متعلق پریشان و متردد ہوا اور

میرا دل بیٹھنے لگا تو اعتراف کرتا ہوں کہ استعانت کے لئے میں اسی تعلق کی طرف بھاگا جو اس ذات کے ساتھ مجھ کو حاصل تھا ..... اس نے ہمیشہ میری نُصرت کی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تائید غیبی نے مجھ کو بے انتہا قوی کر دیا ہے ..... میں پاتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا تعلق دراصل شخصی تھا۔ کیونکہ اِدھر چند سال سے اس سے استعانت کی قوّت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے جس سے مجھ کو ایک صریح فقدان کا شعور ہے ..... اور اقرار ہے کہ میں اپنی زندگی میں ایک بڑی قوت و نُصرت سے محروم ہو گیا ہوں ..... جس ذات کو میں "اس" سے تعبیر کر رہا ہوں یہ اسپنسر کی نامعلوم حقیقت نہ تھی۔ بلکہ یہ میرا خدا تھا جس کی تائید پر مجھ کو بھروسہ تھا لیکن جس کو نہیں معلوم میں نے کس طرح گُم کر دیا۔"

سوٹیزرلینڈ کے ایک شخص کی آپ بیتی یہ ہے کہ

میں پوری طرح صحیح و تندرست تھا ..... کسی قسم کی تھکن، بھوک یا پیاس قطعاً نہ تھی۔ طبیعت بالکل چاق اور شگفتہ تھی۔ گھر سے جو خبر ملی تھی اچھی تھی۔ غرض دور و نزدیک کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی۔ ہوشیار رہنما ہم لوگوں کے ساتھ تھا۔ راستہ میں بھٹکنے کا بھی مطلقاً اندیشہ نہ تھا۔ مختصر طور پر اپنی اس حالت کو یوں ادا کر سکتا ہوں کہ میرا دل و دماغ اس وقت کامل توازن کی حالت میں تھا کہ یکایک مجھ کو اپنے اندر ایک طرح کا ارتفاع محسوس ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ خدا موجود ہو گیا اور اس کی رحمت و قوت میرے سارے وجود میں نفوذ کر رہی ہے۔ یہ کیفیت اس درجہ شدید تھی کہ ساتھیوں سے بہ مشکل اتنا کہہ سکا کہ آگے چلو میرا انتظار نہ کرو۔ اب مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہ تھی۔ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ آیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا

کیا کہ اُس نے ایک حقیر اور میری جیسی گناہگار مخلوق پر اتنا بڑا رحم و فضل فرمایا کہ زندگی ہی میں اپنے کو پہچنوا کر اپنی ربوبیت کا کرشمہ دکھلایا۔ میں نے اس سے نہایت الحاح کے ساتھ دعا کی کہ میری زندگی تمام تر اس کی رضا جوئی میں بسر ہو۔ جواب ملا کہ بس تو روز بروز عاجزی و مسکنت کے ساتھ میری رضا پر چلنے کی کوشش کر اور اس کا فیصلہ مجھ خدائے قادر و توانا پر چھوڑ دے کہ اس سے بھی زیادہ شعور کے ساتھ تو مشاہدۂ حق کے قابل ہوا ہے یا نہیں ..... یہ احساس و اثر اس قدر گہرا اور واضح تھا کہ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا موسیٰؑ نے کوہ طور پر کچھ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس قدر بیان کر دینا اور مناسب ہوگا کہ اس عالمِ وجد میں خدا کسی شکل و صورت اور رنگ و بو سے متصف نہ تھا نہ میں اس کی موجودگی کی کوئی خاص جگہ محسوس کر رہا تھا۔"

جیمس نے تو اس قسم کے تجربات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ لیکن ہم ایک طویل بیان کے دو جملوں کے اقتباس پر بس کرتے ہیں۔ قیاس اور اخذِ نتائج کے لئے اُمید ہے کہ یہی تین چار مثالیں کافی ہوں گی۔ امراضِ دماغی کے ایک ماہر ڈاکٹر نے خود اپنا تجربہ لکھا ہے کہ

"اس کے بعد مجھ پر ایک انتہائی فرحت و انبساط کی کیفیت طاری ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک ایسی اشراقی یا انشراحی حالت پیدا ہوئی جس کا بیان ناممکن ہے۔ اس حالت میں دوسری چیزوں کے ساتھ اس بات کا بھی مجھ کو صرف یقین نہیں بلکہ عینی مشاہدہ ہوا کہ کائنات بے جان مادہ سے نہیں بنی ہے بلکہ ایک ذی حیات وجود ہے۔ مجھ کو خود

اپنے اندر ایک ابدی حیات کا احساس ہوا۔ یہ کیفیت صرف چند سیکنڈ تک رہی لیکن اس کی یاد اور حقیقت کا احساس آج چوتھائی صدی گزر جانے پر بھی اسی طرح تازہ ہے۔"

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اب یہ حدیث پڑھو کہ

ایک دفعہ صبح کی نماز کے لئے آپؐ دیر سے برآمد ہوئے۔ نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ ٹھہر جائیں۔ پھر فرمایا کہ آج شب کو میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی کہ میرے لئے مقدر تھیں۔ تو نماز ہی میں کچھ اونگھ سا گیا (نعست) اس حالت میں میں نے دیکھا کہ جمالِ الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے۔ خطاب ہوا، اے محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی "نہیں اے میرے رب میں نہیں جانتا۔" اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں۔ سوال ہوا یا محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں، عرض کی ہاں میرے رب ..... الخ[1]

اس میں کلام نہیں کہ مکالمہ طور اور ماجرائے اسراء (معراج) کا مقام مذکورہ بالا مثالوں سے اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ انبیاء کا مقام انسانوں سے بلند ہونا چاہیے تاہم "عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است۔" ان مثالوں سے ایک نہ ایک حد تک اس مقامِ برتر کا دھندلا سا تصور پیدا کیا جا سکتا ہے اور ہمارے مدعا کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

---

[1] پوری حدیث کے لئے دیکھو آگے ذکرِ مشاہدات۔

مقدماتِ ثلثہ | یقینِ معجزات کے لئے ہماری منطقِ استدلال کے تین مقدمات تھے۔ جن میں سے دو کو تو ہیوم اور ہکسلے نے بترتیب پورا کر دیا تھا تیسرا مختلف اصنافِ استبعاد کے شواہد سے پورا ہو جاتا ہے۔ ان مقدماتِ ثلثہ کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) معجزات بذاتِ خود کوئی ناقابلِ تصور یا ناممکن الوقوع شے نہیں ہیں۔ (ہیوم)

(۲) زیادہ سے زیادہ ان کو "انتہائی حیرت انگیز" یا "انتہائی مستبعد" واقعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لئے (الف) انسانی شہادت کی بنا پر ان کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ (ب) البتہ "انتہائی حیرت انگیزی" و استبعاد کی وجہ سے بظاہر اُن کو قبول کرنے کے لئے جو شہادت مطلوب ہے اُس کو بھی ہر لحاظ سے انتہائی حد تک قابلِ اعتبار ہونا چاہیے (ہکسلے)

(۳) لیکن معجزات میں جس قسم کا استبعاد یا حیرت انگیزی پائی جاتی ہے اس کے شواہد چونکہ عام انسانوں کے مادی، نفسی یا روحانی تجربات میں بھی ملتے رہتے ہیں جن کے قبول و یقین کے لئے لوگ کوئی غیر معمولی شہادت طلب نہیں کرتے۔

لہٰذا یقینِ معجزات کے لئے بھی کسی غیر معمولی شہادت کی ضرورت نہیں۔

اصلی بحث یقین کی ہے | لیکن سوال یہ ہے کہ ہیوم و ہکسلے کی ناقص منطق سے اگر کوئی شخص گمراہ ہو گیا تھا تو کیا وہ اس منطق کا صرف تیسرا مقدمہ پورا کر دینے سے راہِ راست پر آ جائے گا اور کیا اب صفحاتِ بالا کے پڑھ لینے سے معجزہ کا کوئی منکر نہ رہ جائے گا؟ مجھ کو تو اندیشہ ہے کہ محض یہ سیاہ نقوش ایک منکر کو بھی مومن نہ بنا سکیں گے آپ کہیں گے کہ شاید استدلال ہی بودا ہے لیکن کیا دنیا کا کوئی قوی سے قوی استدلال

بھی صرف اپنی قوتِ استدلال کی بنا پر کسی کو معجزات کا یقین دلا سکتا ہے؟ ارسطوؔ[1] مِل اور ہیگلؔ جو منطق کے "اقانیم ثلثہ" ہیں، کیا یہ سب مل کر بھی کوئی ایسی منطق یا عقلی استدلال پیدا کر سکتے تھے جو بذاتِ خود ہر عام و خاص کو معجزات کا یقین دلا دیتا؟

ان سوالات کا جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر معجزات کے متعلق خالی امکانِ وقوع اور شہادتِ وقوع کی بحث چنداں اہم نہیں رہ جاتی بلکہ اصلی بحث یقین کی ماہیت اور اس کے علل و اسباب کی ہے۔

یقینِ معجزات

یقین کی ماہیت یقین کی فلسفیانہ ماہیت پر کوئی مفصل و مستقل بحث چھیڑنا مقصود نہیں ہے نہ یہاں چنداں اس کی ضرورت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نفسِ تصور اور اس کے یقین میں کیا فرق ہے۔

یہاں ہمارے مقصد کے لئے صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ ریاضی کے تصوراتِ مجردہ[2] کی طرح امورِ واقعیہ (واقعات) کے متعلق ہمارا یقین ناقابلِ تغیر یا اطلاقی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ بلکہ لذت و الم، حیرت و استعجاب، رنج و غم، محبت و نفرت، ارادہ و خواہش وغیرہ دیگر کیفیاتِ نفسی کی طرح محض ایک اضافی و تغیر پذیر ذہنی کیفیت کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] ارسطو اور مِل علی الترتیب قیاسی و استقرائی منطق کے امام ہیں جن کا تعلق اضافی حقائق و علوم سے ہے۔ لیکن ہیگل (جرمنی) نے منطق کے زمین و آسمان ہی بدل دیئے یعنی منطق کو مابعد الطبیعیات بنا کر اس کے ذریعہ "حقیقتِ مطلقہ" کا سراغ لگانا چاہا ہے۔ [2] معجزات کا تعلق چونکہ تاریخ اور روایت کے واقعات سے ہے نہ کہ ریاضی کی مجردات سے، اس لئے ہم مجرداتِ ریاضیہ کے علم و یقین کی جو نوعیت ہے اس (باقی اگلے صفحہ پر)

جس طرح کسی واقعہ سے ہر شخص کے نفس میں کیفیاتِ بالا کا پیدا ہونا یا یکساں طور پر پیدا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر آدمی کے دل میں اس واقعہ کا یقین یا ایک ہی معنی میں یقین پیدا ہونا بھی لازمی نہیں۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں ایک روایت مذکور ہے کہ اسکندریہ کا کتب خانہ حضرت عمرؓ کے حکم سے اس بیدردی کے ساتھ جلایا گیا کہ چھ مہینہ تک مصر کے حماموں کا ایندھن بنا رہا۔ علم کا فدائی اور حکمت و فلسفہ کا عاشق اس روایت کو پڑھ کر کفِ افسوس ملنے لگتا ہے اور اس کے دل میں نفرت و غصہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اسی روایت کو اگر ایک سپاہی پڑھتا ہے تو نہ وہ اپنے اندر کوئی نفرت و غصہ پاتا ہے اور نہ اتنا افسوس کرتا ہے۔ اس کے نزدیک قلعہ انٹورپ کی بربادی کتب خانۂ اسکندریہ سے کہیں زیادہ ماتم انگیز ہے۔ لیکن یہی روایت اگر کسی صوفیٔ عارف کی نظر سے گزرے تو رنج و غصہ کی جگہ اس کو انتہائی مسرت ہو سکتی ہے کہ "حجابِ اکبر" کا یہ "دفترِ بے معنی" اسی سلوک کا مستحق تھا۔ "صد کتاب و صد ورق در نار کن"۔

تم نے دیکھا کہ ایک ہی چیز سے مختلف اشخاص پر مختلف بلکہ متضاد جذبات طاری

(بقیہ حاشیہ) کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ورنہ دراصل یہ یقین بھی کسی ایسی اطلاقی اور اٹل یا ناقابلِ تغیر بنیاد پر قائم ہے جس کا انکار نہ ہو سکے بلکہ مل جیسے منطقی و فلسفی کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ریاضیات کا مفروضۂ قطعیت محض ایک وہم و فریب ہے جس طرح براق کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے آدھے گھوڑے اور آدھے انسان کا یہ نہیں لازم آتا کہ براق کا وجود یقینی اور واقعی ہے۔ اسی طرح دائرہ کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے ایسی شکل کا جس کے نصف قطر تمام برابر ہوں، یہ نہیں لازم آتا کہ واقعاً ایسا کوئی دائرہ موجود بھی ہے۔ انتہا یہ کہ مل کے نزدیک اس میں بھی کوئی تناقض نہیں کہ دو اور تین مل کر چھ ہو سکتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۵

ہوئے۔ جذبات کی طرح یقین و عدمِ یقین کے بھی متضاد اثرات طاری ہوئے ہیں۔ جن اہلِ یورپ کے دل میں مسلمانوں کی وحشت و جہالت کا تعصب راسخ تھا اور جن کی طبیعت تنقیصِ اسلام کی ہر شہادت کو قبول کرنے پر حریص تھی انہوں نے نہ صرف شہادت کی تحقیق و تفتیش کے بغیر اس خبر کا یقین کر لیا بلکہ اس کی روایتی و درایتی تضعیف کے بعد بھی ان کا یقین قائم رہا۔ لیکن انہی اہلِ یورپ میں جو گروہ اس درجہ اسلام کے ساتھ عداوت نہیں رکھتا تھا کہ اس کے جذبۂ انصاف پسندی کو تعصب نے مغلوب کر لیا ہو اس کو تحقیق کے بعد یہ روایت ہی سرے سے بے اصل و مضحکہ خیز نظر آئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مسلمان مؤرخ جو کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کو دامنِ اسلام پر وحشت و جہالت کا ایک بدنما داغ سمجھتا تھا اور کسی طرح اس کا محبتِ اسلام سے لبریز دل اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا، اس کی تحقیقات نے اس روایت کو نہ صرف دشمنوں کا صریح افترا و بہتان قرار دیا۔ بلکہ اُلٹا خود ان ہی افترا پرداز دشمنوں کو اصلی مجرم ثابت کر دکھایا ع

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا[1]

نظریاتِ حکمت کا یقین یقین کی یہ جذباتی و اضافی حیثیت صرف واقعاتِ تاریخ و روایت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ فلسفہ و حکمت (سائنس) کے نظریات و نظامات کا یقین بھی یہی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر جیمس نے "ارادۂ یقین" اور "جذبۂ عقل پرستی"[2] کے عنوان سے دو نہایت دلچسپ مضمون لکھے ہیں۔ ان میں اس نے دکھایا ہے کہ ہمارا یقین کس قدر خواہش و ارادہ یا جذبات کی اضافی کیفیات کا پابند ہے اور سائنس و فلسفہ کی بنیاد جس عقل پرستی پر ہے وہ بھی دراصل مذہب پرستی یا عجائب پرستی کی نوعیت کا محض ایک جذبہ ہے۔

(حواشی [1] و [2] بر صفحہ ۱۵۸)

یکسانی کا جذبہ | ایک فلسفی یا حکیم فلسفیانہ یا حلیمانہ فکر و تفحص میں کیوں اپنا سر کھپاتا ہے؟ زیادہ تر اس "خواہش" کی بنا پر کہ عالم میں جو ایک تشتت و پریشانی، کثرت و پراگندگی نظر آتی ہے کوئی ایسا اصول یا قانون دریافت ہو جائے جو اس کثرت و پراگندگی کو وحدت و یکسانی کے رشتہ سے مربوط و مسلسل کر دے۔ اس قانون و اصول کے عقلی یا صحیح ہونے کا کیا معیار ہے صرف یہی کہ اس کے قبول و باور کرنے سے ہمارے دماغ کی حیرانی و پریشانی رفع ہو جاتی ہے اور کارخانۂ فطرت میں یکسانی و ہمواری کی موجودگی کا ایک خوشگوار و لذیذ احساس یا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ لذت کہ پراگندہ واقعات دراصل کسی ایک ہی مخفی واقعہ کے مظاہر ہیں، اُسی طرح کی لذت ہے جو کسی گویئے کو پراگندہ آوازوں کے ایک نغمہ یا راگ میں منتظم کر دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ کون شخص اس امر کی دلفریبی کو نہ محسوس کرے گا کہ سیب کو زمین کے ساتھ وہی تعلق ہے جو چاند کو اس کے ساتھ ہے۔ غبارہ اُسی قانون کے ماتحت اوپر چڑھتا ہے جس کے تحت پتھر نیچے گرتا ہے۔ اس یقین میں کس کے لئے لذت نہ ہو گی کہ پہاڑ پر چڑھنے یا درخت کے کاٹنے میں جس طاقت سے ہم کام لیتے ہیں وہ وہی ہے جو آفتاب کی اُن کرنوں میں پائی جاتی ہے جو اُس غلّہ کو پکاتی ہیں جس کا صبح ہم

حواشی صفحہ ۱۵۸ ۱ دیکھو رسائل شبلی مضمون کتب خانۂ اسکندریہ۔ ۲ انگریزی میں ان دونوں مضامین کا نام علی الترتیب WILL TO BELIEVE اور SENTIMENTS OF RATIONALISM ہے جو دیگر مضامین کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ افسوس کہ یہاں ہم بہ خوف طوالت ان سے زیادہ استفادہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جو انگریزی داں اصحاب یقین کی حقیقت و نوعیت کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں، ان کو یہ دونوں مضمون ضرور پڑھنے چاہئیں۔

نے ناشتہ کیا ہے۔[1]

نظم و یکسانی کی لذت کے لئے انسان کی فطرت جس درجہ حریص ہے اسی کو ملحوظ رکھ کر ہمارے زمانہ کے ایک زبردست معلّمِ فلسفہ پروفیسر روائس نے تنبیہ کی ہے کہ "جہاں کہیں بھی ہم کو کسی قانونِ فطرت کی وحدت و یکسانی کا یقین محسوس ہو، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس احساسِ وحدت کا بڑا حصہ اصل فطرت کی واقعی وحدت کے بجائے اس ناقابلِ استیصال جذبہ پر مبنی ہو سکتا ہے جو وحدت و نظم کی پسندیدگی کے لئے خود ہمارے نفوس کے اندر موجود ہے۔"[2]

یہی تعصب تھا جس کی بنا پر ایک بڑے سائنسدان نے جیمس سے کہا کہ "کلامِ نفسی کا دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو بھی تمام اہلِ سائنس کو اس کے دبانے اور چھپانے پر ایکا کر لینا چاہیے کیونکہ اس سے فطرت کی یکسانی اور نیز بہت سی ایسی چیزوں کی تکذیب ہوتی ہے جن کے مانے بغیر سائنس داں اپنا کام نہیں چلا سکتے۔" اس قول کو نقل کر کے جیمس نے لکھا ہے کہ اگر یہی سائنس داں حضرات کلامِ نفسی کو سائنس کے حق میں مفیدِ مطلب پاتے تو اس سے اغماض کے بجائے نہ صرف اس کی شہادت کی تحقیق پر آمادہ ہو جاتے بلکہ یہی شہادت یقین کے لئے کافی ہوتی۔[3]

اب تم ہی فیصلہ کرو کہ کیا "عقل پرست" سائنس کے تعصبات "وہم پرست" مذہب کے تعصبات سے کچھ بھی کم یا مختلف ہیں اور کیا اہل سائنس کا انکارِ معجزات

---

[1] جیمس کا مضمون "جذبہ عقلیت" SENTIMENT OF RATIONALITY [2] دیکھو اصولِ نفسیات جلد دوم بحوالہ

[3] ارادۂ یقین ۔ THE RELIGIOUS ASPECT OF PHILOSOPHY

وحدت ویکسانی کے مذکورۂ بالا تعصب کا نتیجہ نہیں ہے ؟

نظریاتِ فلسفہ کا یقین خیر اہلِ سائنس یا حکما کو تو خود ہی بڑی حد تک اس امر کا اعتراف ہے کہ سائنس کے نظریات و نوامیس زیادہ تر اضافی اور مفروضی حیثیت رکھتے ہیں لیکن فلاسفہ یا متألہین، جو حقائقِ عالیہ اور صداقتِ مطلقہ کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان کے اصول و نظریات پر تو انسانی جذبات یا ذاتی میلانات کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ کس قدر حسرت انگیز منظر ہے کہ سب سے زیادہ فلسفہ ہی کے مذاہب و نظامات شخصی جذبات و خواہشات کا عکس نظر آتے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ جتنے فلاسفہ اتنے ہی مذاہب۔ حتیٰ کہ ایک عام دلچسپ تقسیم کی رُو سے فلاسفہ کی دو قسمیں یہ قرار پائی ہیں کہ رونے والے (بکائیہ) اور ہنسنے والے (ضحکیہ) فلاسفہ جن کو زیادہ سنجیدہ اصطلاح میں علی الترتیب "شرّیہ" اور "خیریہ"[1] کہا جاتا ہے یا اُن کو "یاسیہ" اور "رجائیہ" بھی کہہ سکتے ہو۔ اگر نفسیاتی تحلیل کی جائے تو اس اختلاف کا منبع رونے اور ہنسنے، یاس و رجاء، امید و بیم وغیرہ کے ذاتی جذبات و احوال ہی ثابت ہوں گے

دورِ جدید کا ایک زبردست فلسفی شوپنہار جس کا شمار فلسفہ کے اکابر ائمہ میں ہے اور جو فلاسفہ کی رونی جماعت کا ایک نامور فرد ہے، اس کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ "صداقتِ مطلقہ" صرف ارادہ یا خواہش ہے نہ کہ عقل یا فکر اور یہ ارادہ چونکہ "بے عقل" ہے اس لئے اس کی کوئی غایت نہیں۔ دنیا میں کوئی فلاح و سعادت نہیں بلکہ یہ تمام تر "بے مقصد" ارادہ کا ایک کھلونا یا تماشا ہے۔ خارجی عالم اسی "بے عقل و بے مقصد" ارادہ کی محض ایک تصویر ہے۔

---

[1] انگریزی میں ان کا لقب علی الترتیب PESSIMISTS اور OPTIMISTS

کرۂ عقل کی سب سے اونچی سطح پر بسنے والے ان فلاسفہ کے باہمی اختلافات بلکہ تضادِ آراء کا یہ عالم ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا تمام تر عقل پر مبنی ہے کوئی مدّعی ہے کہ اس کا وجود سراپا بے عقلی ہے۔ کوئی شخصی خدا کا یقین رکھتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ شخصی خدا ناقابلِ تصوّر ہے۔ کسی کو ذہن سے باہر خارجی دنیا کا اذعان ہے۔ کوئی ثابت کرتا ہے کہ خارجی دنیا کا وجود محض وہم و فریب ہے۔ کسی کی زبان پر ہے کہ ایک مستقل و قائم بالذّات روح ہے۔ کوئی پکارتا ہے کہ نفس کے تغیر پذیر احوال کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ سلسلۂ علل ناتناہی ہے۔ کوئی مانتا ہے کہ نہیں، ایک علّۃ العلل ہے کوئی انسان کو مجبورِ محض پاتا ہے اور کوئی مختار۔ کوئی مبدء عالم کی وحدت کا قائل ہے اور کوئی کثرت کا۔ بظاہر مہمل سے مہمل بات بھی تم کو ایسی نہ ملے گی جس کا باور کرنے والا عاقل سے عاقل فلسفی نہ ملتا ہو۔

عقلِ انسانی کی ان ہی حیرانیوں کو دیکھ کر آدمی پکار اٹھتا ہے کہ کسی چیز کو حق کہنے کے صرف یہ معنی ہیں کہ جب تم اس کو حق یقین کرو تو حق ہے ورنہ نہیں[1]۔ اور خصوصاً موجودہ زمانہ میں تو اس سرعت و کثرت کے ساتھ نظریات اُبل پڑے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے زیادہ واقعی خیال کرنا قریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ اس قدر مختلف ہندسات، اس قدر مختلف منطقیں، اس قدر مختلف طبیعیاتی و کیمیاوی مفروضات پیدا ہو گئے ہیں کہ صحیح سے صحیح اصول کے نسبت بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعیت کا پرتو ہونے کی بجائے محض انسانی ذہن کی ایجاد ہے[2]۔

---

[1] نظریاتِ علم (THEORIE OF KNOWLEDGE) از پروفیسر واکر۔ بحوالہ ارادۂ یقین

[2] معنی صداقت (THE MEANING OF TRUTH)

مشاہدات کا یقین تم سمجھتے ہوگے کہ علم و یقین کی یہ اضافی یا ذہنی نوعیت زیادہ سے زیادہ اصول و نظریات تک محدود ہوگی۔ باقی مشاہدات و محسوسات جو ان اصول و نظریات کا آخری مرجع ہیں، وہ تو بہرحال کوئی اضافی شے نہیں ہوسکتے کیونکہ ان کے متعلق زید و عمرو کی نوعیتِ یقین میں کوئی تفاوت ناممکن ہے۔ لیکن تمہارا یہ "ناممکن" نہ صرف "ممکن" بلکہ واقعہ ہے۔

دن رات کے ان معمولی تجربات کا تو ذکر ہی کیا کہ ایک چیز جو ایک آدمی کو خوبصورت معلوم ہوتی ہے دوسرے کو بدصورت نظر آتی ہے، ایک کو خوش مزہ محسوس ہوتی ہے دوسرے کو بدمزہ۔ آلاتِ حسّ و مشاہدہ کی ساری دنیا عبارت ہے رنگ و بو، آواز و مزہ، سردی و گرمی، شکل و صورت، طول و عرض (امتداد)، پستی و بلندی، دوری و نزدیکی سے لیکن کیا ان میں سے ایک شئے کے متعلق بھی عامی، حکیم اور فلسفی سب کا یقین یکساں نوعیت رکھتا ہے۔

عامی آدمی اپنے حواس کی مذکورۂ بالا ساری دنیا کو ٹھوس خارجی حقائق یقین کرتا ہے لیکن حکیم یا سائنس داں کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں۔ اور "آج کل کے سائنسدان تو بار بار اس حقیقت کو دہراتے رہتے ہیں کہ اشیاء در اصل وہ یا ویسی نہیں جیسی کہ ہمارے حواس کو محسوس ہوتی ہیں"[1] ذہن یا احساس سے باہر نہ کوئی رنگ ہے نہ بو، نہ کوئی آواز ہے نہ مزہ، لیکن حکمت کو چونکہ اپنی تحقیقات میں قدم قدم پر مادّہ و قوت کے الفاظ دہرانا پڑتے ہیں اس لئے خالص حکیم کے دل میں مادّہ پرستی کا ایک ایسا جذبہ و میلان پیدا ہوجاتا ہے کہ باوجود اس اقرار کے کہ "مادّہ کسی نامعلوم

---

[1] ماڈرن بلیف۔ (MODERN BELIEVE)

شئے کا نام ہے۔" پھر بھی کسی نہ کسی مفہوم میں اُس کے وجود خارجی کے یقین پر اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ بخلاف اس کے فلسفہ یا مابعد الطبیعیات کا عالِم چونکہ حکیمانہ تعصبات سے بالاتر ہے لہذا بے جھجک سرے سے وجود مادّہ ہی کا انکار کر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بس جو کچھ وجود ہے وہ ذہن یا نفس کا۔

مگر یقین کی گردن دلائل سے کب جُھکتی ہے۔ ممکن ہے کہ چند لمحات کے لئے حکیم یا فلسفی عالم رنگ و بو یا مادّہ کے وجود فی الخارج کے خلاف یقین پر قائم رہ سکتا ہو لیکن بالآخر اس کو جبلّت کی حکومتِ قاہرہ اسی نقطہ پر واپس لاتی ہے جہاں سے غور و فکر نے اس کو منحرف کیا تھا اور شب و روز کی زندگی میں وہ عالمِ رنگ و بو کے وجودِ خارجی پر اسی طرح اذعان رکھتا ہے جس طرح ایک عامی آدمی۔

غرض یقین اپنی ماہیت کی رُو سے تمام تر صرف ایک نفسی میلان ہے جو نہ علم کا پابند ہے نہ جہل کا۔ جس کا انحصار نہ عقل پر ہے نہ بے عقلی پر۔ جو نہ سچ پر موقوف ہے نہ جھوٹ پر۔ وہ فلسفہ، حکمت، علم و عقل سب چیزوں سے پیدا ہو سکتا ہے اور کسی سے بھی نہیں پیدا ہو سکتا اور جب پیدا ہونا چاہتا ہے تو کلیفرڈ کے اس مشورہ کا منہ نہیں دیکھتا کہ "جھوٹ پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ ہمیشہ یقین کے بغیر رہو۔"

کیا عجیب بات ہے کہ یقین کی اس ماہیت پر بھی کہ وہ دلائل کا کوئی منطقی نتیجہ نہیں بلکہ محض ایک ذہنی میلان ہے، خود اسی شخص کی نکتہ رس نظر پڑی تھی جو یقینِ معجزات کا سب سے بڑا مخالف ہے۔ چنانچہ "ارسٹاٹیلین سوسائٹی" کے ایک ممبر براڈ نامی نے تین چار سال ہوئے ہیوم کے نظریۂ معجزات پر ایک مضمون کے ضمن میں خود ہیوم کے اصول کی بنا پر لکھا ہے[1] کہ

---

[1] دیکھو ارسٹاٹیلین سوسائٹی (جمعیۃ ارسطاطالیسہ) لندن کی روداد بابت ۱۷-۱۹۱۶ء۔

"ہیوم کو یقینِ معجزہ سے اس لئے انکار ہے کہ معجزہ گذشتہ مستمر تجربہ کے منافی ہوتا ہے مثلاً گذشتہ تجربہ یہ ہے کہ الف کے بعد ہمیشہ ب ظاہر ہوتا رہا ہے جس سے ہمارے اندر ایک قوی یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ آئندہ بھی ب ہمیشہ الف کے تابع ہوگا۔ ایک مذہبی آدمی معجزہ پر اس لئے یقین کرتا ہے کہ اس کے اندر عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے یقین کا ایک فطری میلان موجود ہے جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو۔ دونوں صورتوں میں یقین کا نفسیاتی سبب ظاہر ہے۔ ہیوم کا عدمِ یقین اس کے اس فطری میلان پر مبنی ہے کہ جو کچھ پہلے ہوا ہے وہی آئندہ بھی ہوگا اور مذہبی آدمی کا یقین اس کی عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے قبول کرنے کے فطری میلان پر مبنی ہے جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو۔ لیکن خود ہیوم کو تسلیم ہے کہ گذشتہ مستمر تجربہ سے آئندہ پر حکم لگانے کا ہم کو کوئی منطقی حق حاصل نہیں ہے لہٰذا مذہبی آدمی کا یقین معجزات پر اور ہیوم کا یقین قوانینِ فطرت پر (جس کا نتیجہ معجزات کا عدمِ یقین ہے) منطق کی نگاہ میں دونوں بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں یقین نفسیاتی علت پر مبنی ہے اور کسی صورت میں بھی کوئی منطقی علت ہیوم نہیں پیش کر سکتا۔"

جب یہ معلوم ہو چکا کہ یقین کی ماہیت صرف ایک طرح کا غیر منطقی میلانِ نفسی ہے تو اس کے اسباب کی جستجو منطق و فلسفہ کے دلائل میں بے سود ہے، منطقی یا فلسفیانہ دلائل زیادہ سے زیادہ میلانِ یقین کی تقویت و تضعیف کا کام دے سکتے ہیں لیکن خود اس میلان کی تخلیق اُن کے بس سے باہر ہے۔ یہ میلان بذاتِ خود ایک نفسی حقیقت

ہے۔ لہٰذا اس کے اسبابِ تخلیق کا سراغ نفسیات (علم النفس) ہی کے اوراق میں مل سکتا ہے۔ کم و بیش تمام علمائے نفسیات نے یقین کی ماہیت و اسباب پر بحث کی ہے لیکن ہمارے لئے یہاں علم النفس کی عام تفصیل طلب طرزِ بحث سے ہٹ کر کسی قدر مختلف اور مختصر راہ زیادہ مناسب ہوگی۔

نفسیاتِ یقین البتہ بنیادِ بحث کے لیے استناداً کسی معتبر شہادت کا سامنے رکھنا ضروری ہے جس کے لئے عہدِ حاضر میں امریکہ کے سب سے بڑے استادِ نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کا نام مستند ترین ضمانت ہو سکتا ہے۔ اس لئے پہلے ہم پروفیسر موصوف کی کتاب "اصولِ نفسیات" کے باب احساسِ حقیقت (جلد دوم) سے اسبابِ یقین کے متعلق چند اصولی باتیں بلفظہٖ نقل کرتے ہیں:

(۱) "معالجات (تدابیرِ شفا طبی) کے بارے میں انسان کی زود اعتقادی اسی قسم کے نفسی اسباب (یعنی جذباتی احوال) پر مبنی ہے۔ حتیٰ کہ جب کوئی محبوب و عزیز شخص خطرناک بیماری یا تکلیف میں مبتلا ہو تو ناگوار سے ناگوار شے بھی زود اعتقادی کی راہ میں نہیں حائل ہو سکتی (خصوصاً عورتوں کے لئے، جس شے میں کچھ بھی امید شفا ہو اس کے کرنے سے تسلی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جو علاج بھی ایسی حالت میں تجویز کیا جائے وہ آتش گیر مادہ کے لئے چنگاری کا کام دیتا ہے۔ طبیعت فوراً اس پر عمل کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے۔ آدمی اس علاج کا سامان کرتا ہے اور کم از کم ایک دن کے لئے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ خطرہ جاتا رہا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یقین آفرینی کے بڑے اسباب امید و بیم وغیرہ کے جذبات ہیں جن کے احاطۂ اقتدار میں ماضی، مستقبل اور حال تینوں داخل ہیں۔"

اس کے بعد دوسرے ہی صفحہ پر ہے کہ

(۲) سب سے زیادہ یقین آفریں وہ نظریہ ہوتا ہے جو ہمارے محسوسات کی تشفی بخش توجیہہ کے علاوہ ایسی چیزیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوں اور جو ہمارے حاسۂ جمال پرستی اور جذباتی و عملی ضروریات کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہوں۔

لیکن ہم کو یہاں نفسیاتِ یقین کے متعلق اصل میں جس مختصر متن کی شرح کرنی ہے وہ یہ ہے کہ

(۳) "ارادہ (خواہش) اور یقین (جس کے معنی نفس اور اشیا کے مابین ایک خاص تعلق کے ہیں) ایک ہی نفسیاتی واقعہ کے دو نام ہیں۔"

خواہشِ یقین ارادہ اور یقین کے ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے یقین کے لئے لازمی ہے کہ پہلے دل میں اس کے یقین کا ارادہ یا خواہش پیدا ہو۔ یقین ایک قسم کی تشفی ہے۔ جب تک اس کے لئے طلب و تشنگی نہ موجود ہو یہ نہیں حاصل ہوتا۔ پانی پینے اور اس سے سیراب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے پیاس لگے۔ لیکن اکثر پیاس لگنا ہی پانی پی لینے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ شرط یہ ہے کہ اس کے پینے سے کوئی روکنے والا خیال موجود نہ ہو مثلاً پانی کا دشمن کے ہاتھ سے ملنا، اس کی ناپاکی کا شبہہ یا کسی بیماری کے لئے اس کے مضر ہونے کا اندیشہ۔ اسی طرح نفسِ پیاس کے علاوہ کبھی کبھی ترغیبات کی موجودگی بھی پانی پینے پر آمادہ کر دیتی ہے مثلاً گرمی کے موسم میں کسی دوست کے یہاں صفائی و نفاست کے ساتھ کوری کوری صراحیوں میں ٹھنڈا پانی رکھا ہو۔ اور ان کے آس پاس لکھنو کے نازک کاغذی آبخورے چُنے ہوں تو بے پیاس کی پیاس لگ آتی ہے۔

موانع و مویداتِ یقین | یقین کی صورت میں ہم ان دونوں چیزوں کو علی الترتیب خواہشِ یقین کے موانع اور مؤیدات سے تعبیر کریں گے۔ جب کوئی چیز یقین واذعان کے لئے پیش کی جاتی ہے تو خواہش اور اس کے موانع و مؤیدات میں باہم ایک نفسی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور یقین یا عدم یقین کا فیصلہ اس معرکہ آرائی کے آخری نتیجہ پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر خواہش یقین زیادہ قوی ہے تو وہ بلا مؤیدات کی اعانت کے موانع پر غالب آجاتی ہے۔ اگر موانع زیادہ قوی ہیں تو وہ خواہش کو مغلوب کر دیتے ہیں۔ اگر موانع سرے سے نہیں موجود ہیں تو تنہا خواہش کافی ہو سکتی ہے یا اگر موانع بہت ہی معمولی درجہ کے ہیں تو ضعیف سے ضعیف خواہش بھی اپنے مؤیدات کی مدد سے ان کو زیر کر لے گی۔

عقلی یا منطقی دلائل کو زیادہ سے زیادہ ان ہی موانع و مؤیدات کی صف میں جگہ مل سکتی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس معرکہ کے تینوں (خواہش، موانع اور مؤیدات) پہلوانوں کا اصلی حربہ جذبات ہی ہوتے ہیں۔

اب اوپر اقتباسِ اوّل میں جیمس نے جو مثال دی ہے اس کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ یقین کے پیدا کرنے میں خواہش وارادہ کو کیا داخل ہے اور مؤیدات و موانع کا اس پر کیا اثر پڑتا ہے۔

فرض کرو کہ زید کے گھر میں ایک شخص مہینوں سے مریض پڑا ہے۔ طبّی علاج کوئی کارگر نہیں ہوتا۔ ایک دوست آکر کہتا ہے کہ شہر میں ایک متقی، پرہیزگار، بے طمع بزرگ ہیں جن کی دعا سے بہتوں کو فائدہ ہوا ہے تم بھی ان ہی کی طرف کیوں نہ رجوع کرو۔

ظاہر ہے کہ زید کے دل میں اس مریض کے لئے شفا طلبی کی خواہش موجود ہے۔ اب اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی (مانع) نہیں ہے تو بے تکلف دوست کے مشورہ پر

عمل کے لئے آمادہ ہو جائے گا اور طبیعت میں کم از کم کچھ دیر کے لئے شفا کی ایک امید بندھ جائے گی جس کا نام میلانِ یقین ہے۔ اب بزرگ موصوف کے پاس پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ اہلِ حاجت کا میلہ لگا ہوا ہے، پھر ان کے اتقا اور بے لوثی کی کچھ مثالیں آنکھ کے سامنے آتی ہیں تو لازماً ان چیزوں سے زید کے میلانِ یقین کی اور تائید و تقویت ہوتی ہے۔

لیکن اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی ہے۔ وہ نہایت سخت ملحد و مادہ پرست ہے۔ تو ایسی حالت میں وہ دوست کے مشورہ پر عمل کرنے کی جگہ الٹا اس سے طرح طرح کی بحثیں کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ دعا کے اثر کو قانونِ فطرت کے منافی بتائے گا۔ اس کی شہادت پر جرح کرے گا۔ جو لوگ ان بزرگ کے پاس حاجت لے کر جاتے ہیں ان کو اوہام پرست کہے گا اور اپنے اندر کوئی میلانِ یقین نہ محسوس کرے گا۔

البتہ اگر یہی مادہ پرست و بدعقیدہ زید ایک دولت مند آدمی ہے۔ مریض خود اس کا اکلوتا، نوجوان، ہونہار لڑکا ہے جو اس کی دولت کا تنہا وارث اور خاندان کا ایک ہی چراغ ہے۔ جس مرض میں اپنے بوڑھے باپ کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا یہ مرکز مبتلا ہے وہ نہایت خطرناک ہے۔ ڈاکٹر اور اطبا علاج کرتے کرتے تھک گئے اور جواب دے چکے ہیں تو ان حالات میں زید کی خواہشِ شفا طلبی جس درجہ قوی ہوگی معلوم ہے۔ ان ہی مواقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ اب زید کی ساری بدعقیدگی دھری رہ جائے گی۔ دوست کا مشورہ اس کی مایوسیوں میں امید کی ایک جھلک ثابت ہوگا۔ اس کی انتہائی طلب و تشنگی الحاد و مادہ پرستی کے تمام دلائل و موانع پر غالب آئے گی اور وہ بلا بحث و حجت دوست کے ساتھ ہو جائے گا اور جتنی ہی زیادہ اس کی خواہش قوی ہوگی اتنی ہی زیادہ امید و یقین کے ساتھ یہ ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔

لیکن اگر زید کے الحاد و بدعقیدگی کا جذبہ اتنا زبردست ہے کہ وہ اس کی قوی سے قوی خواہشِ شفا طلبی کو بھی زیر کرسکتا ہے تو بڑے سے بڑے بزرگ کی بزرگی بھی بیکار ثابت ہوگی اور دوست کی جانب سے دعا کی شفا بخشی کے دلائل و شواہد کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو رائیگاں جائے گا۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ میں غالباً اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے۔ ایمان و یقین کا حاسّہ قلب ہے۔ اگر وہ مختوم ہے تو پھر عقلِ انسانی کی کوئی منطق اس مختومیت کا ازالہ نہیں کرسکتی۔

ساحروں کے دل میں ذوقِ ایمان کی کچھ نہ کچھ تشنگی موجود تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر بے اختیار سربسجود ہو گئے اور پکار اٹھے۔ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى لیکن کیا فرعون کے معاند و مختوم قلب پر بھی کوئی معجزہ اثر کرسکا؟ انبیائے کرامؑ خصوصاً سید الانبیاءؐ کی حیاتِ طیبہ تمہارے سامنے ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں ابتدائی قبولِ اسلام کے صفحات پڑھو۔ ہر سطر ذوقِ ایمان و طلبِ یقین کے مذکورہ بالا نفسی حقائق سے معمور ملے گی۔

نفسیاتِ یقین کی شہادت واقعاتِ سیرت سے

حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ وہ بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص (آنحضرتؐ) جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی تعلیم و تلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے اور واپس جاکر بیان کیا کہ "وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے"۔ ان مؤیداتِ یقین کے بعد حضرت ابوذرؓ خود مکہ گئے اور گو اس وقت مکہ کی سرزمین پر اعلانِ اسلام کیلئے نہایت خطرناک موانع موجود تھے، تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے بعد ذوقِ ایمان کی تشفی نے اتنا جوش پیدا کردیا کہ عین حرم کے اندر حضرت ابوذرؓ نے نہایت

بلند آہنگی سے اعلان کرکے کہا" اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ "اس اعلان کی بدولت جان بچنی مشکل ہوگئی[1]

حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی آپؐ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کھیلے تھے۔ وہ گو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن آپؐ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دل میں نورِ حق موجود تھا۔ بالآخر ان بے رحمانہ ایذاؤں نے جو دشمنان اسلام آنحضرتؐ کو پہنچاتے تھے، اظہارِ اسلام پر بیتاب کر دیا۔ اظہار تو کر دیا، لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعتہً کیونکر چھوڑ دوں۔ تمام دن سوچتے رہے۔ آخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ "دین حق یہی ہے"[2]۔ موانعِ یقین موجود تھے، لیکن "دینِ حق" کے قبول اور اس کے داعی کی حمایت کا جذبہ ان موانع سے قوی تر تھا۔

قیصرِ روم کے پاس جس وقت داعیٔ اسلامؐ کا نامۂ مبارک پہنچا اور قیصر و ابوسفیان میں باہم جو گفتگو ہوئی اُس کے بعد گو قیصر کے ضمیر میں ایمان و اذعان کی روشنی پیدا ہوئی اور اس نے کہا کہ "مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا"۔ لیکن قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اُس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے۔ نامۂ مبارک پڑھے جانے کے بعد اور بھی برہم ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہل عرب کو دربار سے اٹھا دیا۔ اور گو اس کے دل میں نورِ ایمان آچکا تھا۔ لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی[3]۔ تخت و تاج کی حرص، دولتِ ایمان کی ترغیب سے قوی تر ثابت ہوئی۔

---

[1] یہ پورا واقعہ پڑھنے کے لائق ہے۔ دیکھو سیرۃ النبیؐ جلد دوم۔ [2] سیرۃ النبیؐ جلد اول طبع دوم۔

[3] سیرۃ النبیؐ جلد اول طبع سوم۔ پورا مکالمہ پڑھو۔

خسرو پرویز کے تاریک دل میں قیصرِ روم کے برابر بھی ایمان کی روشنی نہ تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا بخلاف اس کے نامۂ مبارک پر پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا۔ خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے"۔ پھر نامۂ مبارک چاک کر ڈالا۔ لیکن چند روز کے بعد خود سلطنتِ عجم کے پرزے اڑ گئے۔[1]

اسی قسم کے واقعات کی بنا پر مصنفِ سیرت نے اوائلِ دعوت میں اسلام لانے والوں اور اس کے مخالفین کے جو مشترک خصائص گنائے ہیں ان سے بھی تمام تر یقین کے ان ہی اصول و اسباب کی تائید ہوتی ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ تفصیل کے لئے خود سیرت (جلد اول طبع دوم) کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہاں اختصار کے ساتھ صرف ضروری خلاصہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

اسلام لانے والوں کے خصائصِ مشترک :-

(۱) "اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاشِ حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع و پاکیزہ اخلاق تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت ابوذرؓ وغیرہ کا شمار ان ہی طالبانِ حق میں ہے"۔ (خواہشِ یقین)

(۲) "بعض صحابہ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیرو کہتے تھے"۔ (موانعِ یقین کی کمی)

(۳) "یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصبِ اعظم میں سے کوئی منصب

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول، طبع دوم۔

نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اکثر ایسے تھے مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابوفکیہؓ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت وجاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی۔" (موانع کی کمی)

قریش سے بڑھ کر اسلام کا کون دشمن ہوگا۔ لیکن ان کی دشمنی کے کیا اسباب تھے؟

(۱) "مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش ہمسایگانِ خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندانِ الٰہی کہلاتے تھے جس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور و کلید بردار تھے۔" عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا۔ خلیلؑ بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی۔

"اسلام کا اصلی فرض اس طلسم کو برباد کر دینا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت و اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا۔ اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا اسی قدر وہ مخالفت میں سرگرم تھے۔"

(۲) "قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی۔ لیکن اسلام اور عیسائیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا۔" ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرتؐ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) "ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدیگر تھے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ۔ آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندانِ بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔"

(۴) "ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے۔ ابولہب نے حرمِ محترم کا غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا۔ اخنس بن شریق تمام دکذاب تھا۔ نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے

کی سخت عادت تھی۔ آنحضرتؐ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دار و گیر کرتے تھے جس سے اُن کی عظمت و اقتدار کی شاہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں بہیم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں۔"

غرض اولاً تو ان قریش میں ایمان و یقین کی خواہش کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ثانیاً اگر نفسِ خواہش کچھ موجود بھی ہوتی تو مذکورہ بالا موانع اس قدر زبردست تھے کہ جب تک یہ نہ ہٹا دئے جاتے اس خواہش کا ظہور ناممکن تھا۔

یقین کے متعلق اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ٹھہرتا ہے کہ

(۱) بذاتِ خود یقین عام انسانی جذبات و احساسات ہی کی طرح کا ایک نفسی میلان یا ذہنی کیفیت ہے۔ فلسفہ و حکمت بلکہ ریاضی تک کے منطقی دلائل سے جو یقین پیدا ہوتا ہے اس کی ماہیت بھی اس نفسی میلان سے زیادہ نہیں ہے۔

(۲) یقین کی بنیاد عقلی و نقلی تمام چیزوں میں یقین کی نفسِ خواہش اور پھر اس خواہش کے موانع و مؤیدات کا وزن ہے۔

(۳) ان بنیادی اسبابِ یقین کی تعمیر تمام تر ان جذبات و معتقدات اور مزعومات و مفروضات (علومِ عقلیہ) سے ہوتی ہے جو کسی شے کے قبول و یقین کو پیش کرنے سے پہلے افراد یا جماعت کے نفس میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ معجزات کے یقین و قبول کے لئے کس قسم کے معتقدات کی نفس میں پہلے سے موجودگی لازمی ہے۔

غایتِ معجزات

معجزہ منطقی دلیل نہیں اوپر آغازِ کلام میں معجزہ کا جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ معجزات نبوّت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ البتہ جو شخص مذہب کا قائل ہے، غیب پر ایمان رکھتا ہے اور اس سنّتِ الٰہی کا معتقد ہے کہ بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے خدا ان ہی کے اندر سے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو اپنے پیام کے ساتھ بھیجتا رہا ہے، اس کے سامنے جب کسی مقدس انسان کی طرف سے اس پیام کے حامل یا نبی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ داعی الی اللہ اپنے ظاہری و باطنی کمالاتِ اخلاقیہ و اوصاف حمیدہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے برتر نظر آتا ہے، تو اس شخص کے دل میں ایمان کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے۔ اب اگر اس پیغمبر سے کوئی معجزہ نما واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا اس کی طرف کسی معجزہ کا انتساب کیا جاتا ہے تو وہ اس کی صداقت کی ایک آیت یا نشانی کا کام دیتا ہے جس سے ذوقِ ایمان کی تقویت ہوتی ہے اور اس طرح ایمان کا تشنہ کام نفوس کے لئے ایک معنی کر کے معجزہ براہِ راست خود نبوّت کی نہیں البتہ مدعیٔ نبوّت کی صداقت کی ایک نفسی دلیل بن جاتا ہے۔

معجزہ کی اصلی غایت اس دلیل یا آیت کی جو غرض و غایت ہو سکتی ہے۔ اس کی نفسی حقیقت کو یوں سمجھو کہ مذہب کی بنیاد تمام تر اسرار و غیوب پر ہے۔ سب سے بڑا سرّ یا غیب بلکہ غیب الغیب خود خدا کا وجود اور اس کی ذات ہے۔ حشر و نشر، جنّ و ملک، وحی و الہام تمام چیزیں ایک عالمِ غیب ہیں۔ نبوّت نام ہے اسی عالمِ غیب کے ساتھ روابط و علائق کا۔

معجزہ میں بھی چونکہ ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے یعنی وہ عالمِ ظاہری کے سلسلۂ علل واسباب سے الگ معلوم ہوتا ہے اس لئے جو شخص غیب پر ایمان رکھتا ہے اس کا نفس قدرۃً اس یقین کی جانب مائل ہو جاتا ہے کہ جس برگزیدہ انسان سے معجزہ ظاہر ہوا ہے، وہ عالمِ غیب سے خاص تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص غیب پر ایمان نہیں رکھتا یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے معجزہ تصدیقِ نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے اور نہ آیت۔ کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شئے ہے کہ پہلے آدمی کا نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے اور وہ ہدایتِ خلق کے لئے انبیاءؑ کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے۔ جو آدمی نقطہ، خط یا سطح وغیرہ مبادیٔ اقلیدس ہی کا قائل نہیں اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو۔ جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لئے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے اسی طرح تفصیلاتِ مذہب پر یقین کرنے کے لئے پہلے نفسِ مذہب کا یقین ضروری ہے۔

مِل نے ہیوم کے انکارِ معجزات کی تنقیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جو شخص کسی فوق الفطرت ہستی اور انسانی معاملات میں اس کی مداخلت کا پہلے ہی سے قائل نہیں ہے اس کے سامنے اگر کسی انسان کی نسبت فوق الفطرت یا خارقِ عادت باتوں کی روایت کی جائے تو وہ ان کو معجزہ نہ مانے گا۔ معجزات سے خود خدا کا وجود نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ اس لئے اگر خدا کا اعتقاد پہلے ہی سے موجود ہو تو کسی فوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے علاوہ معجز نما واقعات کی اور بھی توجیہات ممکن ہیں..... یہاں تک تو ہیوم کی دلیل بامعنی کہی جا سکتی ہے لیکن اگر ایک ایسی

ذات کا وجود قطعی یا غالب طور پر بھی مان لیا جائے جو موجودہ نظام فطرت کی خالق ہے اور اس لیے اس میں تغیر و ترمیم بھی کر سکتی ہے، تو ہیوم کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے، جب تم نے خدا کو مان لیا تو پھر جس شئے کو اس کے ارادہ نے پیدا کیا تھا، اس پر اس ارادہ کا براہِ راست عمل واثر خواہ مخواہ کا فرض نہیں رہتا، بلکہ ایک سنجیدہ امکان بن جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں سوال کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور خدا کی مداخلت یا عدم مداخلت کا فیصلہ اس بحث پر ٹھہرتا ہے کہ کائنات فطرت میں اس کی سُنّت عمل کیا رہی ہے یا عقلاً کیا رہنا چاہیئے۔[1]"

غرض معجزہ کو معجزہ سمجھ کر اس کے یقین و قبول کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی پہلے غیب (خدا و مذہب) پر ایمان رکھتا ہو، اس کے بعد دیکھو کہ معجزہ کی مذکورۂ بالا غایت اور اس پر یقین کی اولین شرط کو پیش نظر رکھ کر وقوع معجزہ کی مختلف صورتیں یا توجیہات کیا ہو سکتی ہیں، جزوی شقوق یا فروعی احتمالات سے قطع نظر کر کے جن سے قدیم و جدید علم کلام کا دفتر پُر ہے، اصولی طور پر صرف وہی دو صورتیں نکلتی ہیں جن کی جانب مل نے اقتباس بالا میں اشارہ کیا ہے۔

---

[1] دیکھو Three Essays on Religion (مذہب پر تین مضامین) مطبوعہ ایشیائک پریس صفحہ ۹۸۔ نیز نظام منطق کتاب سوم باب ۲۵ فصل ۴۔ اسی میں مل نے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے وہ یہ کہ خدا کو مان لینے کے بعد معجزہ کو قانون فطرت کا سرے سے خارق ہی نہیں کہا جا سکتا پتھر کو اوپر پھینکو اور کوئی شئے بیچ میں مانع یا عائق نہ ہو تو اس صورت میں اس کا زمین پر لوٹ کر نہ گرنا یا ہوا میں معلق رہنا بے شک خلاف فطرت ہوگا لیکن اگر اس کو بیچ میں کوئی روک لے تو زمین پر نہ گرنا بالکل خارق عادت نہ ہوگا، کیونکہ مانع موجود ہے، معجزہ کی صورت میں جو ارادۂ خداوندی معمولی سلسلۂ علل و اسباب کا خالق ہے، وہی اس کے عمل سے مانع ہو جاتا ہے، لہٰذا معجزہ نہ خلاف فطرت ہے اور نہ بلا علت، کیونکہ عمل علت کی شرط تو یہ ہے کہ کوئی مانع نہ موجود ہو اور یہاں موجود ہے۔

۱۔ پہلی صورت | یہ ہے کہ خدا نے کارخانہ عالم چلانے کے لئے کچھ اصول وقوانین مقرر کردیئے ہیں جن کے مطابق اس کل کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر کام کرتا رہتا ہے اور ارادۂ الٰہی اپنی اس سنّتِ جاریہ میں کبھی کسی حالت میں کوئی تغیّر وتبدل نہیں کرتا، بقول اسپنوزا کے کہ "خدا کی خدائی اور اس کی حقیقی عظمت وحکمت کا اظہار اسی سے ہوتا ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر نظام کا پابند ہو، قدرتِ خداوندی کے معنی یہی ہیں کہ کارخانۂ فطرت اپنے ازلی یا اٹل قوانین کا تابع ہے[1]۔"

اس احتمال کی رو سے معجزہ کا وقوع بھی ان ہی ازلی قوانین کی کسی نہ کسی ایسی کارفرمائی کے ماتحت ہونا چاہیئے، جس کا کم ازکم ظہور معجزہ کے وقت عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور اس لیے معجزہ جو دراصل محض ایک فطری واقعہ ہوتا ہے، بظاہر لوگوں کو معجزہ نظر آتا ہے۔ مثلاً جس وقت تک عمل تنویم کے نفسی قوانینِ فطرت کا انکشاف نہیں ہوا تھا، عصائے موسیٰ کا اژدہا بن جانا معجزہ تھا، لیکن آج اس نفسی قانون کے جاننے والوں کے لیے کرسی کا شیر بن جانا فطری واقعہ ہے اور عصائے موسوی کے اژدہا نظر آنے کی بھی اس سے توجیہہ کی جاسکتی ہے۔

لیکن اس توجیہہ سے یہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں یہ واقعہ معجزہ نہ تھا، اس لیے کہ اس زمانہ تک معجزہ کی وہ غایت جس کا ابھی اوپر ذکر آچکا ہے، اس واقعہ سے پوری طرح حاصل تھی، یعنی اس میں ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے

---

[1] اسپنوزا جدید فلسفہ کا ایک نامور امام ہے دیکھو اس کا مجموعہ تصنیفات Spinosa's Work. جلد اول باب ۶ بحث معجزات۔

اور اس کا وقوع عالمِ ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا اس سے نبی کی تصدیق کا جو عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے، نفس میں میلان پیدا ہو سکتا تھا جیسا کہ ساحروں کے نفس میں پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔

البتہ آج یہ واقعہ البرٹ مول یا ولیم جیمس کے سامنے بیان کیا جائے تو وہ اس کو بجائے معجزہ کے صرف ایک فطری واقعہ سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس لئے اب اگر کوئی نبی یا ولی اپنی نبوت یا ولایت کی تصدیق کا میلان کسی معجزہ یا کرامت کے ذریعہ سے مول اور جیمس وغیرہ کے دل میں پیدا کرنا چاہے تو کوئی ایسی نشانی ظاہر کرنا ہوگی جس کی توجیہہ سے ان کا موجودہ علم اسی طرح عاجز ہو جس طرح کہ انبیائے سابقینؑ کے زمانہ میں ان کے معجزات کی توجیہ سے اس وقت کا علم عاجز تھا یا بعض کی توجیہہ سے اب بھی عاجز ہے۔ مثلاً شقِ قمر۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عملِ تنویم کے تجربات میں اگر تھوڑی سی قیاسی وسعت اور پیدا کر لی جائے تو شقِ قمر وغیرہ تقریباً ہر قسم کے خوارق کی توجیہہ ہو سکتی ہے۔

کیونکہ اس عمل کا دار و مدار تمامتر عامل کی قوتِ اثر آفرینی اور معمول کی اثر پذیری پر ہے۔ یہ نفسی تاثیر و تاثر کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے جس کی ادنیٰ مثالیں ہم کو روزانہ کی معمولی زندگی میں ملتی رہتی ہیں۔ ہماری زبان کی ایک عامیانہ مثل ہے کہ "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے"۔ جس کے یہی معنی ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے اوضاع و اطوار سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ نیک صحبت کے فوائد اور بری صحبت کے مضار کا بھید یہی نامحسوس تاثر ہے۔ جس قدر کسی شخص کی قوتِ ارادی یا قوتِ تاثیر زبردست

ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ وہ دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہے، دنیا کے اکابر رجال کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہی قوت رہی ہے، ان کے صرف کہنے کا لوگوں پر جو اثر پڑتا ہے، وہ دوسروں کے دلائل وبراہین کا نہیں پڑتا، اس کی بہترین زندہ مثال گاندھی جی ہیں، انھوں نے جس درجہ کے اسرار واعیانِ ملک سے چرخہ کتوالیا ہے اور اپنی سیدھی سادی گفتگو اور تحریروں سے جس طرح اس کی خوبیوں کا یقین ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دل میں پیدا کر دیا ہے، وہ بڑی حد تک اسی قوت کا کرشمہ ہے، ورنہ ملک میں ان سے زبردست خطیب، انشا پرداز اور منطقی سیکڑوں ملیں گے لیکن اثر آفرینی کا یہ سحر و جادو کسی کی تقریر، کسی کی تحریر اور کسی کے دلائل میں نہیں ملتا، غرض اثر آفرینی[1] کی یہی قوت ہے، جس کو عاملِ تنویم مشق سے بڑھا کر کرسی کو شیر اور جھاڑو کو حسین عورت بنا دے سکتا ہے۔

ان واقعات کی بنا پر ہم کو یقیناً اپنے قیاس میں اتنی توسیع کا حق حاصل ہے کہ ماہرینِ تنویم یا عام اکابر رجال و مصلحین کی قوتِ اثر آفرینی کے مقابلہ میں انبیائے کرامؑ کی وہبی و روحانی قوتِ تاثیر و نفوذ کا مرتبہ کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہوتا ہے اور اس لیے وہ اُن سے بھی بدرجہا زیادہ عجیب ومحیر العقول امور کا یقین لوگوں کے دل میں پیدا کر سکتے ہیں عامل تنویم، اثر آفرینی کے لیے کچھ نہ کچھ ظاہری حرکات وسکنات یا الفاظ وخطاب کا محتاج ہوتا ہے اور اس کا زیادہ تر اثر افراد تک محدود رہتا ہے، لیکن نبی کی اعلےٰ اور روحانی قوتِ تاثیر کے لیے صرف باطنی ارادہ کافی ہو سکتا ہے اور اس کا اثر افراد سے بڑھ کر جماعت تک کو

---

[1] انگریزی میں اس اثر آفرینی کے لیے (Suggestion) کی اصطلاح ہے جس کی پوری حقیقت کو تجربات اور مثالوں سے سمجھنے کے لیے انگریزی دان حضرات ڈاکٹر سیڈس کی دلچسپ کتاب "نفسیات اثر آفرینی" The Sociology of Suggestion کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

محیط ہو سکتا ہے۔

البتہ یہاں ایک وسوسہ دل میں پیدا ہو گا جس کا دور کر لینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ معجزہ کی اس توجیہ کو قبول کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی حقیقت ایک طرح کے سحر نظر بندی یا فریبِ حواس سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی جس شخص کو کوئی معجزہ نظر آتا ہے اس کا وجود خود اس شخص کی نظر، حواس یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذہن سے ماہر کسی خارجی وحقیقی شئے کی صورت میں نہیں ہوتا۔

بعض وسوسوں کا جواب اوپر معجزہ کی جو غایت معلوم ہو چکی ہے اس لحاظ سے اس وسوسہ کا صاف جواب تو یہ ہو گا کہ وہ غایت بہر نوع حاصل ہے۔ معجزہ فی نفسہٖ چاہے کوئی خارجی شئے ہو یا محض ذہنی، اصلی غرض صرف اتنی ہے کہ جس فرد یا جماعت کے سامنے کوئی معجزہ پیش کیا جائے اس کے علم کے لحاظ سے وہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ غیب رکھتا ہو۔ ہاں بظاہر اس سے بھی ایک اور قوی تر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں پھر نبی اور عاملِ تنویم یا ساحر میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اس اشکال کا حل بھی ضمناً اوپر ہی گزر چکا ہے کہ معجزہ بجائے خود نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے بلکہ جس شخص میں ظاہری و باطنی کمالات یعنی اصلی خصائصِ نبوت و اوصاف حمیدہ عام انسانوں کے مقابلہ میں فوق العادۃ حد تک مجتمع ہوتے ہیں، اس کے حق میں معجزہ محض تائیدِ مزید کا کام دے سکتا ہے اور جس شخص پر نبوت کے یہ اصلی خصائص و کمالاتِ روحانی مؤثر نہ ہوں وہ بلاشبہ نبی کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک بڑا ساحر قرار دے گا جیسا کہ منکرین نے ہمیشہ کہا ہے کہ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ[1]۔ إِنْ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ[2]۔ قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ[3]۔ وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ[4]۔ (القمر: ۲)

---

[1] ص: ۴ [2] الاعراف: ۱۰۹۔ [3] الصف: ۶۔ [4] متکلمینِ اسلام کے ہاں سحر و معجزہ کی بحث البقیہ اگلے صفحہ پر

لیکن اس وسوسہ کا (کہ توجیہہ بالا کی بنا پر معجزہ کی حقیقت کسی خارجی و واقعی وجود کی جگہ محض ایک ذہنی یا خیالی وہم کی رہ جاتی ہے) تحقیقی جواب دراصل مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے جو تمام عقلی موشگافیوں کی آخری عدالتِ مرافعہ ہے۔ اگر اس عدالت کا آخری فیصلہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ حقیقی یا واقعی وجود صرف خارجی چیزوں کا ہے بلکہ اس کے نزدیک تو یہی امر سرے سے مشتبہ ہے کہ خود خارج کا کوئی وجود ہے اور اساطینِ فلسفہ کی ایک بڑی جماعت (تصوریہ) کا مسلک یہ ہے کہ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"۔ حقیقی وجود صرف روح، ذہن یا نفس کا ہے۔ باقی دریا، پہاڑ، چاند، سورج، زمین و آسمان، جو کچھ دیکھتے ہو یہ سب

(بقیہ صفحہ ۱۸۰) ایک مستقل مسئلہ ہے۔ لیکن ان میں بھی اہلِ تحقیق کا مسلک یہی ہے کہ دونوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ہے۔ بعضوں کے نزدیک تو محض استعمال کا فرق ہے یعنی انبیاءؑ اور اولیا اپنے نفس کی قوتِ معجز نمائی کو مقاصدِ خیر کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ساحر مقاصدِ شر کے لئے (سفینۃ الراغب)۔ مولانا حمید الدین فراہی جن سے بڑھ کر موجودہ دنیائے اسلام میں شاید ہی کسی کو فہمِ قرآن کی سعادت حاصل ہو وہ بھی لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ سے یہی نتیجہ اخذ فرماتے ہیں کہ معجزہ اور سحر میں صرف یہ فرق ہے کہ ساحر فلاح یاب نہیں ہوتا یعنی وہ اپنی قوتِ سحر کو خود اپنے یا دوسروں کے لئے فلاح و خیر کے اغراض میں استعمال نہیں کرتا بلکہ علی العموم جادوگروں کی اخلاقی حالت نہایت پست ہوتی ہے۔

لیکن لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ کی نصِ قرآنی کا زیادہ صاف و صحیح مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساحر کا سحر جب نبی اور اس کے معجزہ کے مقابلہ میں آتا ہے تو وہ مغلوب و ناکام رہتا ہے، جیسا کہ عصائے موسیٰؑ کے مقابلہ میں ظاہر ہوا۔ اس سے سحر و معجزہ میں جب کہ دونوں میں مقابلہ ہو، ظاہری فرق و تمیز کا بھی ایک یقینی معیار ہاتھ آجاتا ہے۔ باقی دونوں کی باطنی حقیقت میں کیا فرق ہے؟ یہ تو فنِ سحر کا عالم ہی جان سکتا ہے جیسا کہ تمام فنی حقائق میں ہوتا ہے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدِ مقابل ساحروں نے فرق جان لیا تھا۔

تمہارے ذہن ہی کے اندر ہیں۔ مادّہ اور عالمِ مادّی محض ایک "وہم و گمان"[1] ہے۔ اس جماعت نے عالمِ خارجی کی ایک توجیہہ یہ کی ہے کہ جن چیزوں کو ہم موجوداتِ خارجی سمجھتے ہیں وہ صرف ذہن کے تصوّرات ہیں جو خدا ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ اسی راز کی طرف اکبر مرحوم نے باتوں باتوں میں اس طرح اشارہ کیا ہے کہ "جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا"۔ لہٰذا جس ذات یا قوت نے سارے ذہن میں عصائے موسوی اور ثابت و مسلّم قمر کا تصوّر پیدا کیا تھا اسی نے اگر تھوڑی دیر کے لئے عصا کی جگہ اژدہا اور قمرِ مسلّم کی جگہ شقِّ قمر کا تصوّر پیدا کر دیا تو دونوں کے وجود کی حقیقت و نوعیت میں کیا فرق پڑا۔

سائنس جس کا جذبۂ مادّہ پرستی دلائل سے لاجوابی اور خود مادّہ کو غیر مادّی و غیر جوہری کہنے کے باوجود مادّیات کے وجودِ خارجی سے یک قلم دست برداری پر راضی نہیں اور اس تارِ عنکبوت میں کسی نہ کسی طرح اُلجھا رہنا ہی پسند کرتا ہے، وہ بھی کم از کم محسوسات کی نسبت تو یہ ماننے پر مجبور ہی ہے کہ رنگ و بو، آواز و مزہ، سردی و گرمی وغیرہ کا وجود صرف ایک ذہنی احساس یا تصوّر ہے جس کو مادّہ نامی کوئی "نامعلوم شئے" ہمارے ذہن میں خلق کر دیتی ہے اور جس کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں۔ جب رنگ اور آواز جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں اس کے حقیقی و واقعی وجود کے صرف اتنے ہی معنی ہیں کہ ہم اس کا احساس و تصوّر رکھتے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ معجزات کے وجود کو ہم اس سے زیادہ

---

[1] مابعد الطبیعیات کے اس نازک مسئلہ کی توضیح کی گنجائش یہاں نہیں نکالی جا سکتی۔ البتہ دورِ جدید میں تصوریت کے بانیِ اوّل برکلے کا فلسفہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ جو لوگ فلسفہ کا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ تو اس کی اصلی کتاب "مکالمات" و "مبادی" کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ عام لوگ شاید "فلسفہ برکلے" سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

حقیقی و واقعی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

ایک اور اعتراض یہ تو وہ شبہات تھے جو معجزہ اور سحر و تنویم کی یکسانی یا معجزات کے محض ذہنی وجود کی بنا پر پیدا ہوتے تھے۔ لیکن ایک اور اعتراض معجزہ کی تمام ان توجیہات پر وارد ہوتا ہے جن کی رُو سے یہ فطرت کے معمولی غیر متغیر قوانین اور علل و اسباب (چاہے وہ نفسی ہوں یا طبعی و مادی) ہی کے کسی نہ کسی ایسے مخفی عمل کا معلول کیا جاتا ہے جس کا ظہورِ معجزہ کے وقت تک عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا۔ یہ ایک اعتراض معجزہ کے اضافی ہونے کا ہے۔ فرض کرو کہ شقِ قمر کی علت خواہ تنویم کی طرح کوئی نفسی قانون ہو یا کیمیاوی جذب و اتصال کی طرح جو چاند کے مختلف اجزا کو باہم ملحق کئے ہوئے ہے، کوئی ایسا مادی قانونِ رفع و افتراق ہو جس نے چاند کے دو ٹکڑے کر دئے ہوں، ان دونوں صورتوں میں شقِ قمر صرف اسی وقت تک معجزہ ہے جب تک کہ اس کے نفسی یا مادی قوانین و علل کا انکشاف نہیں ہوتا۔ لاسلکی پیام رسانی کے انکشاف سے پہلے اگر کوئی شخص ہندوستان میں بیٹھ کر ایک سکنڈ میں امریکہ کا کوئی واقعہ معلوم کر لیتا تو یہ کسی معجزہ سے کم نہ ہوتا۔ لیکن اب معمولی بات ہے۔

بلاشبہ اس معنی کر کے معجزہ یقیناً اضافی شے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کوئی معجزہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو اس احتمالِ اضافیت سے خالی ہو کیونکہ انسان کا علم ہی تمام تر اضافی ہے۔ اگر اس کا علم قطعی و محتتم طور پر تمام قوانینِ فطرت کا احاطہ کر سکتا تو البتہ کسی حد تک معجزہ کی نسبت یہ مطالبہ بجا ہو سکتا ہے کہ ابدالاباد تک کسی قانونِ فطرت سے اس کی توجیہہ نہ ہوئی چاہئے۔ لیکن جب ہمارا علم ہی اضافی ہے تو کوئی معجزہ احتمالِ اضافیت سے کیسے خالی ہو سکتا ہے؟ ایک مدعیٔ نبوت یہ اعجاز دکھلا سکتا ہے کہ ایک ہفتہ تک آفتاب غروب نہ

ہو، لیکن اس کا قطعی یقین کیسے دلایا جاسکتا ہے کہ آگے چل کر علمِ ہیئت کے اکتشافات سے اس اعجاز کی توجیہہ نہ ہو سکے گی؛ لہٰذا جو شئے آج معجزہ ہے بالفرض کل وہ طبعی واقعہ ثابت ہوجائے تو بھی اس سے آج اُس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا اور معجزہ کی غرض وغایت کو پورا کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ (دیکھو اوپر صفحہ ۱۷۴)

دوسری صورت یہ ہے کہ عام طور پر تو کارخانۂ کائنات ایک مقررہ سنّت یا بندھے ہوئے قوانین ہی کے ماتحت چلتا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی خدا اپنے مرسلین ومقربین کی تائید غیبی کے لئے اس سنتِ جاریہ میں مداخلت اور تغیّر وتبدّل کو بھی جائز رکھتا ہے۔ خواہ یہ تغیّر وتبدّل فطرت میں کسی نئے حذف واضافہ کی وساطت سے ہو یا اس کا منشا براہ راست ارادۂ الٰہی ہو اور جس طرح اسپنوزا کے نزدیک خدا کی خدائی اس میں نظر آتی ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیّر نظام کا پابند ہو اسی طرح "بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ ہر معلول کی براہِ راست علّت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ[1] ہے۔ ان فلاسفہ کے نزدیک وقوعِ معجزہ کے لئے بھی ارادۂ الٰہی کی براہِ راست مداخلت ہی والا احتمال زیادہ قابل قبول ہوگا۔

اس صورت کے مختلف احتمالات صورتِ مداخلت کے ان احتمالاتِ ثلٰثہ میں اگرچہ کوئی قطعی تفریق ہر جگہ نہیں کی جاسکتی تاہم جو موٹا سا فرق کیا جاسکتا ہے اسکو مثالوں سے سمجھ لینا چاہیئے۔

(۱) عام قانونِ فطرت یہ ہے کہ انسان کا بچہ بلا اتّصالِ جنسی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اس اتّصالِ جنسی سے جو مادۂ تولید رحمِ مادر میں داخل ہوتا ہے اس کو اگر خدا خود رحم کے اندر ہی پیدا

---

[1] دیکھو ص ۱۱۳-۱۱۵

کردے جس طرح کہ اور بہت سی رطوبات جسم میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، تو بلا اتصالِ جنسی لڑکا پیدا ہو سکتا ہے اور مداخلتِ خداوندی کی یہ صورت فطرت میں ایک نئے عارضی اضافہ کی وساطت پر مبنی ہوگی۔ ممکن ہے کہ ولادتِ مسیحؑ میں خدا نے اپنی مداخلت کی اسی صورت سے کام لیا ہو۔

(۲) اسی طرح اضافہ کے بجائے حذف کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ چاند کے مختلف اجزا جس کیمیادی جذب و اتصال کی قوت سے آپس میں پیوستہ ہیں ان میں سے صرف اس حصۂ قوت کو جو چاند کے نصفین میں موجبِ اتصال ہے، تھوڑی دیر کے لئے خدا حذف یا سلب کرے جس سے شقِ قمر کا معجزہ ظاہر ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی مادی واسطہ کا حذف و اضافہ کئے بغیر براہِ راست خدا نے ارادۂ کُنْ فَیَکُوْن سے قمر کو شق اور مسیحؑ کو پیدا کر دیا ہو۔

یہی آخری صورت عمیق النظر فلاسفہ و متکلمین اور اہلِ حق کا مذہب ہے بلکہ تنویمی احتمال کی تو خود کلام مجید کی رُو سے گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ تنویم کا عمل اس کے عامل کے علم و ارادہ کے تحت ہوتا ہے اور معجزات میں انبیاؑ کے علم و ارادہ کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ فرمائش و تحدی پر کسی آیت یا معجزہ کو خود پیش کر سکنے سے عجز کا صاف اعتراف اور اس امر کا غیر مشکوک اعلان کرتے ہیں کہ "آیات تو صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں"۔ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ، اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ رَبِّیْ اور اگر رسول ان کو پیش کرتا یا کر سکتا ہے تو صرف اللہ ہی کے براہِ راست حکم و اذن سے۔ خود کسی رسول میں ہرگز اس کی طاقت نہیں کہ اللہ کی مرضی و مشیت کے بغیر کوئی آیت یا معجزہ پیش کر سکے"۔ مَا کَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ اگر عاملِ تنویم کی طرح انبیاؑ اپنے ہی علم و ارادہ سے ظاہر کرتے ہوتے تو حضرت

موسیٰؑ علیہ السّلام اپنے عصا کو سانپ کی صورت میں ظاہر فرما کر خود اسی سے کیوں ڈرتے اور اس کے پھر عصا بنا دینے کو اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنی طرف کیوں منسوب فرماتا کہ ڈر نہیں ہم اس کو پھر ابھی چھڑی ہی بنا دیں گے۔ لَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ۔

باقی اور جتنے احتمالات اوپر بیان ہوئے وہ بھی بس احتمالات و تاویلات ہی کے درجہ میں ہیں۔ لیکن تاویل خواہ بعید ہی ہو، تکذیب کے مقابلہ میں اَہون ہے۔ لہٰذا یہ درحقیقت ایسے طفل مزاج عقل پرستوں پر اتمامِ حجت اور انکار و تکذیب کی راہ سے ان کو بچانے کے لئے ہیں، جو بچوں کی طرح مٹھائی و نقل کا نام لئے بغیر کسی اعلیٰ حقیقت کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے اور جن کی عقل، عقل کے نام سے اتنی مرعوب ہے کہ خود عقل کی نارسائی تک بھی رسائی نہیں پا سکے ہیں۔

ورنہ اصل بحث و توجہ کی بات ایک ہی ہے کہ سارے کارخانۂ فطرت کی اساس و بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مبدء ہے، یا اندر باہر انفس و آفاق میں جو کچھ بھی ہے اور ہوتا ہے، تمام تر بالذات و براہِ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیئت و قدرت کا ظہور ہے۔ فلسفہ اور فلسفیانہ عقل کے لئے ایک طرف تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے یا ہو رہا ہے وہ ایک ہی ہستی کی جلوہ فرمائی و کارفرمائی کے مظاہر ہیں اور فلسفۂ تصوریت کی رُو سے اجس کا جدید فلسفہ میں خصوصاً دور دورہ رہا ہے، یہ ہستی اسی نوعیت کی ہے جس کو ہم شاعر الذات نفس و روح یا ناقابلِ تصور سے تعبیر کرتے ہیں۔ باقی مادہ و طبیعت یا مادی و طبعی عوامل و قوانین کی ساری تعبیرات و اصطلاحات دفترِ بے معنی ہیں ؎

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

نئی بات جو سائنس اور سائنسدانوں کے نام سے مرعوب ذہنوں اور عقلوں کے لئے خصوصاً لائق توجہ ہے، یہ ہے کہ مادّہ کی بظاہر جس ٹھوس چٹان پر مادیت یا طبعی عوامل و قوانین کی پوری عمارت کھڑی تھی، وہ خود نئی طبیعیات ہی میں برف کی طرح پگھل رہی ہے اب ازلی وغیر فانی مادّہ اور ٹھوس سالمات پرانا افسانہ ہو چکے ہیں۔ قائم بالذات جوہر کی حیثیت سے مادّہ کو اب کوئی اساسی حقیقت نہیں تسلیم کیا جاتا۔ وہ اب عملاً برقی توانائی یا برقیات میں گم ہو کر رہ گیا ہے[1]۔ لیکن خود برق یا برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ یہی نہیں بلکہ مادّہ کو کسی معنی میں بھی موجود جاننے کے لئے عام انسانی ذہن و دماغ کے لئے کم از کم اتنا سہارا ناگزیر تھا کہ وہ کسی جگہ (یا مکان میں) موجود ہے۔ لیکن نظریۂ اضافیت نے اس آخری سہارے کو بھی چھین لیا۔

> مادّہ جو ہماری عام عقل و فہم کے لئے ایک موجود فی المکان اور قائم فی الزمان جوہر تھا اور کائنات نام تھا مادّہ کے ڈھیروں، ڈلوں یا ایسے مادّی جوہروں کا جو خاص خاص قوانین کے مطابق زمان و مکان میں اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔"
>
> "اب جو بڑا انقلاب سائنس کے نقطہ نظر سے برپا ہوا ہے وہ صحیح معنی میں اسی واقعہ کا نتیجہ ہے کہ مادّہ اور زمان و مکان سرے سے تین جداگانہ حقائق ہی قرار نہیں دئے جاتے[2]۔"

ایک عامی آدمی عریاں الفاظ میں اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ مادّہ نہ کسی جگہ ہے، نہ کسی وقت میں یعنی نہ کسی مکان میں، نہ کسی زمان میں۔ تو پھر "ہے" کے کیا معنی ہیں؟ اضافیت کے اس شاہکار کو پوری طرح سمجھنا سمجھانا تو اعلیٰ ریاضیات کے ماہرین ہی کا کام ہے۔ ہم

---

[1]، [2] ماڈرن بلیف، مقدمہ۔

عامیوں کو سچ پوچھیے تو ایسے مادہ کی نسبت جو زمان و مکان سے الگ یا مستقل بالذات ہو کر کسی جگہ اور وقت میں یا زمان و مکان کے مظروف کی حیثیت سے نہ پایا جاتا ہو بے ساختہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ "ریاضیات نے تحلیل کرتے کرتے ہماری خارجی (یا مادی) دنیا کو قریباً عدم تک پہنچا دیا ہے۔"[1] اور یہ تو بہر حال واضح ہو گیا ہے کہ کائنات کو کوئی مشین نہیں قرار دیا جا سکتا پرانی مادیت دیوالیہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ مادیت جو کائنات، زندگی اور ذہن سب کا محض ایک مادی تصور رکھتی تھی۔[2]

اسی طرح سائنس و ریاضی کے جھروکوں سے بھی فلسفیانہ تصوریت ہی جھانکنے لگی ہے حتیٰ کہ

"سائنسدانوں کو طبعی کائنات میں کسی اساسی خارجی یا معروضی حقیقت کی جستجو میں معلوم ہوا ہے کہ کوئی خارجی حقیقت اگر سرے سے ہو بھی، تو وہ کوئی ایسی نہایت ہی عجیب و غریب شے ہو گی جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آتی تھی، ایڈنگٹن نے نظریۂ اضافیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو طبیعات کی ایک دوسری جدید ترقی کوانٹم تھیوری تک پہنچ کر ہم نے خارجی حقیقت کی جستجو کے مقصد کو ترک کر دیا ہے اور طبعی کائنات کی ایسے عناصر میں تحلیل کرنا پڑی ہے، جو صراحۃً ذہنی Subjective ہیں۔ اگر خارجی دنیا کو جاننے میں ہمارے لیے محض اپنے ذہنی عنصر کو جدا کرنا مشکل ہے تو خود دان Self knowing شعور کے مسئلہ میں جہاں ذہن و خارج (یعنی جاننے والا اور جانا گیا) حقیقۃً ایک ہو جاتے ہیں، اس کو جدا یا متمائز کرنا کہیں زیادہ مشکل ہو گا۔"[3]

غرض فلسفہ کے بعد سائنس میں بھی ہوا کا رخ جس طرح تصوریت یعنی اس خیال کی طرف جا رہا ہے کہ ہماری کائنات اور اس کی نیرنگیاں بے شعور مادہ کی میکانکی کارستانیاں نہیں، بلکہ ذہن و شعور کی کارفرمائیاں ہیں اور خالص سائنسداں نہ سہی لیکن سائنسداں فلسفی کی حیثیت سے

---

[1] ماڈرن بلیف مقدمہ صفحہ ۱۵۔ [2] ایضاً۔ [3] ایضاً

سر جیمس جیانس، ماکس، پلانک، شرڈوونگز آئینسٹائن وغیرہ جیسے رجالِ سائنس کا تصوریت کی جانب رجحان بڑھتا جارہا ہے اور کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں جیسا کہ سر جیمس جیانس کا صاف اعتراف ہے کہ "میرا رجحان تصوریہ کے اسی نظریہ کی طرف ہے کہ اساسی و بنیادی حقیقت شعور ہے، اور مادی کائنات اس سے ماخوذ ہے"۔ (ماڈرن بلیف ص ۵۲۰)

مذاہب کا وجود اسی ذی شعور و ذی علم اساسی سرچشمۂ کائنات کے سوا کیا ہے اور جب ساری کائنات ہی کسی نہ کسی طرح اس کے علم و شعور سے ماخوذ یا اس کی مخلوق ہے تو معجزات کے مادی یا میکانکی عوامل و قوانین کی جستجو خود عقل کی رو سے کونسی عقلمندی کا کارنامہ[1] ہے، عقل و دانش کی بات تو بس وہی الٰہ آبادی عارف اکبر کی ہے کہ

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

یقینِ معجزہ کے شرائط غرض یقینِ معجزہ کی اولین شرط خدا اور غیب کا یقین ہے اس کے بعد اپنے علم و مذاق کے مطابق توجیہہ معجزات کی جس طرح یہ "پہلی صورت" ممکن ہے کہ وہ عام قوانین فطرت (خواہ نفسی یا مادی) ہی کے کسی مخفی عمل کا نتیجہ ہوں، اسی طرح مداخلت کی (خواہ براہ راست ہو یا بواسطہ حذف و اضافہ) "دوسری صورت" بھی قابل قبول ہے، انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹال جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب "اصول سائنس"[2] کے نام سے لکھی ہے جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ

"اوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گذری ہیں۔ ان سے ایک نتیجہ جو

---

[1] ان مباحث کی کامل و تشفی بخش انشاء اللہ فلسفۂ اسلام کے ذیل میں بشرط صحت و حیات ملے گی

[2] The Principle of Science (حاشیہ طبع ۱۹۱۳ء ص ۔۔۔)

نہایت صاف طور پر نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے۔" ..... جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے، وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے، اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے ہمارے لیے ناقابلِ تصور کہے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابلِ تصور نہیں ہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے۔"[1]

مگر جو شخص اس خالقِ کائنات قوت ہی کا قطعاً منکر ہو اور سرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو اور جو آرٹسٹ ہیگل (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست) کی طرح خود خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ کو معجزات (یعنی اوہام و خرافات) قرار دیتا ہو اور جس کے نزدیک "معجزات کا یقین جہالت و بربریت کی آخری نشانی ہو، جس کا فنا کر دینا ہی علم و تمدن کی فتح ہو گی"، تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ کسی غیبی قوت کا آفریدہ ہے، یا جس شخص سے وہ ظاہر ہوا ہے، اس کے عالمِ غیب کے ساتھ رابطہ و تعلق (نبوت) کی آیت یا نشانی ہے؟

یقین کی اوپر جو حقیقت بیان کی گئی ہے، اس کے لحاظ سے معجزہ پر بہ حیثیت آیت نبوت کے یقین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غیب پر ایمان ہو، جس کے بغیر یقین معجزہ کی خواہش کا پیدا ہونا ناممکن ہے، پھر بھی جس شخص کی نسبت کوئی معجزہ بیان کیا جاتا ہو، یا جس سے یہ ظاہر ہوا ہو، اس کی زندگی اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کی تفسیر اور ظاہری و باطنی کمالات کا بجائے خود ایک معجزہ ہو (یہ چیزیں خواہشِ یقین کے لیے مؤیدات کا کام دیں گی) اور سب سے آخری لیکن

---

[1] دیکھو ہیگل کی کتاب Wonders of Life (عجائبات حیات)، باب ۲ معجزات۔

سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ فرعون و ابوجہل کی طرح دل میں خصومت و عناد، خودی و خود بینی ذاتی اغراض یا ہوا و ہوس کے موانعِ یقین نہ موجود ہوں۔

جس طرح ان شرائط کی عدم موجودگی میں کوئی دلیل یقینِ معجزات پر آمادہ نہیں کر سکتی بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں کوئی دلیل یقینِ معجزات سے باز نہیں رکھ سکتی۔

میرے ایک دوست جن کا شمار کم از کم مسلمانوں میں تعلیمِ جدید کے مستثنیٰ افراد میں ہے ہے۔ آج سے چند برس پہلے مغربی عقل و حکمت کے شدید پرستار تھے اور وجودِ خدا کا ان سے اقرار کرانا اس لئے ناممکن تھا کہ وہ مِل کی منطق اور ہکسلے و ہیگل کی تحقیقات سے نہیں ثابت ہوا تھا۔ قرآن میں اُن کے نزدیک علم النفس کے بیسیوں دقائق مرعی تھے اور اس کا پیش کرنے والا پیمبر اسلامؐ، سکندر، سیزر، سقراط و نپولین وغیرہ قائدینِ عظام و مصلحینِ عالم کی صف اوّل میں اپنی جگہ رکھتا تھا۔ تاہم اگر آیاتِ قرآنی کو بہ حیثیت کلامِ الٰہی اُن کے سامنے تلاوت کیا جاتا یا پیغمبر اسلام کی مکارمِ اخلاق سے معمور زندگی کو آپؐ کی پیغمبری کے ثبوت میں بیان کیا جاتا تو وہ "جوابِ جاہلاں" کی باتمکین "خاموشی" یا زیادہ سے زیادہ "ایک خندۂ تحقیر" کی سزاوار تھی۔ ظاہر ہے کہ بدعقیدگی کے اس عالم میں روایاتِ معجزہ کی حقیقت اس سے زیادہ ٹھہر سکتی ہے کہ وہ محض اپنے رُواۃ کی خوش اعتقادیوں یا جاہلانہ عجائب پرستیوں کا مجموعہ ہیں۔

لیکن ادھر ان کی اس درجہ حیرت انگیز کایا پلٹ ہوئی ہے کہ عقلیاتِ مغرب کا سارا طومار ان کے نزدیک "صد کتاب و صد ورق در نار کن" سے زیادہ مستحق نہیں ہے۔ قرآن کریم "دقائقِ نفسیہ" کی جگہ "حقائقِ الٰہیہ" کا منبع بن گیا ہے۔ "سیرت نبویہؐ" کا ایک ایک حرف نبوت پر شاہدِ عدل ہے۔ جو زبان جیمس اور ونٹ کی نفسیاتی تحقیقات سے رطب

اللسان رہتی تھی اس کو انتہائی لذت اب صرف بزرگانِ دین کے مناقب، کشف وکرامات اور مسائلِ تصوف کے ذکر میں ملتی ہے۔ حتی کہ دورِ اوّل کے "ناصح احباب" کو اب خود اُن پر "خوش اعتقادی" کا گمان ہونے لگا ہے۔

اس قلبِ ماہیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انبیائے عظامؑ کا ذکر ہی کیا ملک کی موجودہ تحریک "ترکِ موالات" کے بانی کی ذرا غیر معمولی اخلاق سے آراستہ زندگی بھی ان کو روحانی کمالات ہی کا پرتو نظر آتی ہے۔ انتہا یہ کہ ان کی طرف جو طرح طرح کی کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں[1] ان میں ایک مشہور واقعہ بعض درختوں سے روئی جیسی ایک چیز کا نکلنا تھا۔ میرے یہ دوست بھی اس کو تائیدِ غیبی کی ایک نشانی سمجھنے میں شریک تھے۔ میں نے کہا کہ "کچھ لوگ اس روئی کو کسی کیڑے کی رطوبت بتلاتے ہیں"۔ کہا "اس سے کیا ہوتا ہے۔ خدا نے اسی وساطت سے تائید کی ہوگی"۔

شرائطِ یقین وغایتِ معجزات کے مقدماتِ بالا کو سامنے رکھ کر اب ذرا ریگستانِ عرب کے اس اُمّی انسان کی زندگی، دعوت اور تعلیمات پر ایک سرسری نظر کرو جس نے ساڑھے تیرہ صدی اُدھر کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اپنی نبوّت کا اعلان کیا تھا۔

اس قدسی صفات انسان کی امانت و دیانت نے ہم وطنوں کی طرف سے اس کے لئے امین کا لقب حاصل کیا تھا۔ اس کی راست گوئی دوست و دشمن سب کو یکساں تسلیم تھی۔ حضرت خدیجہؓ جن کو پچیس برس تک آپؐ کی زوجیت کا شرف حاصل رہا، وہ ایک موقع پر آپؐ کو تسلی دیتی ہیں کہ "ہرگز نہیں! خدا کی قسم! خدا آپؐ کو کبھی غمگین نہ کرے گا۔ آپؐ

---

[1] یہ تحریر گزشتہ تحریک ترکِ موالات کے شباب کے زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت طرح طرح کی یہ کرامتیں ملک میں پھیلی تھیں۔

صلۂ رحم کرتے ہیں۔ مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں۔ غریبوں کی اعانت کرتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔"

اس "اپنے پرائے کے غمخوار" کی دعوت صرف یہ تھی کہ لوگو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو تو نجات پاؤ گے۔ اس دعوت سے باز رکھنے میں روسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپؐ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حُسن کی دولت پیش کی۔ اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا جس کا جواب اولوالعزم من الرسل کی زبان سے فقط یہ ملا کہ "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلانِ حق سے باز نہ آؤں گا۔" نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی حق کامیاب ہوا۔ لیکن کیا اس کامیابی سے داعیِ حقؐ نے خود کوئی فائدہ حاصل کیا؟

مسجدِ نبویؐ کے صحن میں آپؐ کے سامنے مالِ غنیمت کے انبار لگ جاتے تھے مگر خود اس انبار کو تقسیم کرنے والے شاہِ کونینؐ کی زندگی یہ تھی کہ "آپؐ کھال کی چٹائی یا خالی زمین پر آرام فرماتے تھے۔" کاشانۂ نبوت گو انوارِ الٰہی کا مظہر تھا تاہم اس میں رات کو چراغ نہیں جلتا تھا۔ کئی کئی دن تک فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند خود لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے، اس کو چارہ دیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے۔ حضرت فاطمہؓ آپؐ کی محبوب ترین اولاد تھیں جن کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ چکی پیسنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ بار بار مشک میں پانی بھرنے سے سینہ پر گٹے پڑ گئے تھے۔ گھر میں جھاڑو دیتے

دیتے کپڑے چیکٹ ہو جاتے تھے۔ لیکن با این ہمہ جب انہوں نے آنحضرتؐ سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لئے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپؐ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقرا و یتامیٰ کا حق ہے۔"

اتنا ہی نہیں کہ آپؐ دنیاوی عیش و آرام سے دست بردار تھے بلکہ دشمنانِ دین طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے، گالیاں دیتے تھے (گو رحمۃ للعالمینؐ کا ہاتھ اُن کے حق میں بھی ہمیشہ صرف دعا ہی کے لئے اٹھتا تھا اور ان کے ساتھ نیکی ہی کا حکم فرماتے تھے) راہ میں کانٹے بچھا دیتے تھے، نماز پڑھنے میں جسمِ مبارک پر نجاست ڈالتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ بن معیط نے آپؐ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپؐ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن دعوتِ حق "نوعِ انسان کی ہدایت اور فلاح و بہبود کی تعلیمات کا کام بلاشائبہ تزلزل جاری تھا۔

کیوں؟ اس لئے کہ آپؐ کو اپنے فرستادۂ خدا ہونے کا اذعان، ہر وقت اس کی نصرت و معیت پر اعتماد اور بالآخر باطل کے زہوق اور حق کے غلبہ کا اسی طرح یقین تھا جس طرح تم کو رات کی تاریکی کے بعد طلوعِ صبح کا یقین ہوتا ہے۔ کفار کی دشمنی اور ایذا رسانی سے تنگ آکر ابو طالب سمجھاتے ہیں کہ "جانِ پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھا لو۔" آپؐ فرماتے ہیں کہ "عمِ محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے۔ حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا۔ عجم و عرب ایک دن اس کے ہاتھ ہو گا۔" کفارِ قریش بدنیتی (قتل) کے ساتھ آپؐ کے تعاقب میں نکلے ہیں۔ غارِ ثور جس میں آپؐ مخفی ہیں، اس کے قریب پہنچ گئے ہیں کہ (رفیقۃ فی الغار) حضرت ابو بکرؓ نے گھبرا کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔" آپؐ نے فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (غم

نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے)۔ ایک موقع پر آپؐ کسی درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما رہے تھے کہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا، چپکے سے آیا اور آپؐ کی تلوار درخت سے اتار کر نیام سے باہر کھینچ لی اور آپؐ کے سامنے آیا کہ دفعتہً آپؐ ہشیار ہو گئے۔ دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے جس نے پوچھا۔ "اے محمدؐ! اب تم کو کون بچا سکتا ہے"؟ ایک پُر اطمینان صدا آئی کہ اللہ۔

کیا تشنگانِ ایمان کے لئے خود یہ صدا معجزہ نہیں ہے؟ اور کیا جن لبوں سے یہ صدا نکلی تھی ان کو کوئی دیکھنے والا کاذب تصور کر سکتا تھا؟ اسی کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ پکار اٹھے لیس ھٰذا بوجہ کذاب (یہ جھوٹے کا منہ نہیں ہے)۔

یہ سمندر کے صرف چند قطرے تھے اور اگرچہ انسان کا ناقص قلم پیغمبرانہ سیرت کے تمام خط و خال کو کامل طور پر نمایاں نہیں کر سکتا تاہم "سیرۃ النبیؐ" کے گزشتہ دو حصوں میں جہاں سے یہ چند منتشر قطرات ماخوذ ہیں، انسانی ہاتھ سے جو تا تمام مرقع کھچ سکا ہے اُسی سے تم بڑی حد تک اندازہ کر سکتے ہو کہ کسی پیکرِ بشری کے اندر اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی اس "جامعیتِ کبریٰ" کا ظہور بجائے خود اتنا بڑا اعجاز ہے جس سے بڑھ کر کوئی معجزہ نہ طلب کیا جا سکتا ہے اور نہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایسی اعجازِ مجسم، جامع ہستی کے متعلق" جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدائے بینوا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجہ گردان بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیٔ دریا دل بھی، جس کی زبان ہمہ وقت ذکرِ الٰہی اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو، جس کے پاؤں رات رات بھر نماز میں کھڑے رہنے سے آماس کر آتے ہوں"۔ اگر کوئی ایسا واقعہ بیان کیا جائے جو خدا کی طرف سے تائیدِ غیبی کی نشانی یا آیت معلوم ہو تو

اس شخص کو اُس کے یقین و قبول میں کیا تامل ہو سکتا ہے جو خدا اور غیب پر ایمان رکھتا ہے۔

لیکن جو شخص ہیگل کی طرح خدا اور غیب ہی کا منکر ہو یا فرعون کی طرح خود اپنے کو خدا کہتا ہو (اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی) یا جس کے قلب کو ابوجہل و ابولہب کی طرح کفر و عناد کی تاریکی نے سیاہ کر رکھا ہو، اس کے سامنے بڑے سے بڑا معجزہ پیش کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ یہ جواب مل سکتا ہے کہ "سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ"

یہی راز تھا کہ سیرتِ نبویہؐ کے سارے دفتر میں بمشکل ایک آدھ ایسا واقعہ ملتا ہے کہ معجزات کی بنا پر لوگوں نے رسالت کی تصدیق کی ہو۔ بلکہ عہدِ رسالت کے ہزاروں ایمان لانے والے وہی ہیں جن کے دل میں ایمان کا مزہ تھا اور جن کے لئے "روئے و آواز پیغمبر" ہی اصل معجزہ تھا۔ گو آج ظاہری "روئے و آواز" ہم سے مستور ہے لیکن معنوی آواز قرآن اور حقیقی "روئے پیمبر" سیرتِ طیبہ ابدالآباد تک ذوقِ ایمان رکھنے والوں کے لئے معجز نمائی کرتی رہے گی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لُبِ لباب

گزشتہ مباحث کا لُبِ لباب یہ ہے کہ

(۱) معجزہ نام ہے پیمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے جامع انسان کے تعلق سے کسی ایسے واقعہ کے ظہور کا جس کی کم از کم بوقتِ ظہور عام علل و اسباب سے توجیہہ نہ ہو سکے۔

(۲) ایسے واقعات بذاتِ خود عقلاً ناممکن نہیں۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ "انتہائی حیرت انگیز" یا مستبعد واقعات کی ہوتی ہے۔ اس لئے بظاہر اُن کو قبول کرنے کے لئے بھی نہایت غیر معمولی شہادت کی ضرورت نظر آتی ہے۔

(۳) لیکن دراصل یہ استبعاد ایسا نہیں ہوتا جس کی کافی مثالیں عام زندگی میں بھی نہ ملتی ہوں اور جن کے قبول کے لئے کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔
لہٰذا یقینِ معجزات کے لئے بھی معمولی درجہ کی قابلِ اعتماد شہادت کافی ہوسکتی ہے۔

(۴) مگر یقین صرف شہادت وغیرہ خارجی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا دارومدار زیادہ تر یقین کی خواہش اور اس کے موانع و مؤیدات پر ہے جس کا تعلق بڑی حد تک خود یقین کرنے والے کے گزشتہ معتقدات و مزعومات سے ہوتا ہے۔

(۵) یقینِ معجزات کی خواہش کا پیدا ہونا موقوف ہے "ایمان بالغیب پر"۔

(۶) اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون و ابوجہل کی طرح عناد و تعصب کے موانع موجود نہیں ہیں، ساتھ ہی مدعیٔ نبوت کی زندگی اپنے احوال و اخلاق کے لحاظ سے بجائے خود اس کی نبوت کی مؤید ہے، تو معجزہ (بمعنی خارقِ عادت) کا کیا ذکر ہے خود پیمبر کی آواز و صورت ہی معجزہ ہے ؎

در دلِ ہر کس کہ دانش رامزہ است روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

آیات و دلائل

اور

قرآن مجید

انبیاءؑ اور آیات و دلائل گزشتہ صفحات میں جو کچھ پھیلایا گیا ہے وہ انسانی افکار و خیالات کی جہانتک دسترس ہے اس کی تشریح ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک ہدایت و ارشاد کا اصلی سرچشمہ قرآن مجید ہے اس لئے آیات و دلائل کی نسبت اخیر فیصلہ اسی کی عدالت میں ہونا چاہیئے۔ قرآن مجید میں اکثر انبیاءؑ کے سوانح و حالات کے ضمن میں اُن آیات اور معجزات کا بھی بیان ہے جو اُن کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات و دلائل انبیاءؑ کے سوانح کا ضروری جزو ہیں۔ خصوصاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سب سے زیادہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ نزولِ قرآن کے وقت ان ہی دونوں انبیاءؑ کی امتیں عرب میں موجود تھیں اور ان ہی کے سامنے اسلام اپنے دعووں کو پیش کر رہا تھا۔

قرآن مجید میں جن انبیاءؑ کا تذکرہ ہے ان میں سے کم و بیش حسبِ ذیل انبیاءؑ کے آیات و دلائل بیان ہوئے ہیں۔ حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت صالح، حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت زکریا، حضرت یونس، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ بعض ایسے انبیاءؑ بھی ہیں جن کی آیات و دلائل

کے ذکر سے قرآن خاموش ہے مثلاً حضرت اسحٰق، حضرت اسمٰعیل، حضرت ذوالکفل، حضرت الیسع علیہم السلام وغیرہ۔ لیکن اس خاموشی سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کو کسی قسم کی نشانی اور دلیل نہیں عطا ہوئی تھی۔ صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ما من الانبیآء نبیٍ الا اعطی من الایات ما مثلہ او من امن علیہ البشر۔	ہر نبی کو کچھ ایسی باتیں دی گئیں جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے۔

البتہ انبیائے کرامؑ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی آیات و دلائل ان ہی انبیاءؑ کو مرحمت ہوئے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا اور ضرورت بھی ان ہی کو تھی کہ ان کے عناد و انکار کا وہ ان کے ذریعہ سے جواب دے سکتے۔ باقی وہ انبیاءؑ جو اپنی جماعتوں میں صرف تجدید و اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ان کو اس قسم کے دلائل کی حاجت نہ تھی کہ ان کی جماعتوں نے ان کی دعوت کے مقابلہ میں عناد و انکار کا اظہار نہیں کیا تھا۔

قرآن مجید اور اصطلاحِ آیات و دلائل

قرآن مجید نے انبیاءؑ کے ان معجزات کو عموماً آیت یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى (القصص : ۳۶)	جب موسیٰؑ ان کے پاس ہماری آیات لے کر آئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو صرف مصنوعی جادو ہے۔

---

[1] کتاب الاعتصام باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت بجوامع الکلم۔ [2] کتاب الایمان باب وجوب الایمان برسالۃ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم الی جمیع الناس و نسخ الملل بملتہ۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ۔

تو ہم نے فرعون کی قوم پر طوفان، ٹڈی جوں، مینڈک اور خون کی کھلی ہوئی آیتیں بھیجیں۔

(الاعراف : ۱۳۳)

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا ہے:

اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ○

اگر تم کوئی آیت لے کر آئے ہو تو اب لاؤ اگر تم سچے ہو۔ موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ دفعتہً صاف سانپ بن گئی۔

(الاعراف : ۱۰۶ — ۱۰۷)

کفار معجزہ طلب کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ۔

آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔

(الانعام : ۱۰۹)

اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط

آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔

(العنکبوت : ۵۰)

کفار کہتے ہیں:

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ○

چاہیئے کہ وہ ہمارے پاس کوئی آیت لائیں جیسے پہلے پیغمبر بھیجے گئے۔

(الانبیاء : ۵)

حضرت صالح علیہ السلام اپنے معجزہ کی نسبت کہتے ہیں:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ۔

تو ہم نے فرعون کی قوم پر طوفان، ٹڈی جوں، مینڈک اور خون کی کھلی ہوئی آیتیں بھیجیں۔

(الاعراف : ۱۳۳)

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا ہے:

اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ○

اگر تم کوئی آیت لے کر آئے ہو تو اب لاؤ اگر تم سچے ہو۔ موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ دفعتہً صاف سانپ بن گئی۔

(الاعراف : ۱۰۶ — ۱۰۷)

کفار معجزہ طلب کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ۔

آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔

(الانعام : ۱۰۹)

اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔

(العنکبوت : ۵۰)

کفار کہتے ہیں:

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ○

چاہیئے کہ وہ ہمارے پاس کوئی آیت لائیں جیسے پہلے پیغمبر بھیجے گئے۔

(الانبیآء : ۵)

حضرت صالح علیہ السلام اپنے معجزہ کی نسبت کہتے ہیں:

وَيَا قَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً — اور اے لوگو! یہ خدا کی اونٹنی آیت ہے۔

(ھود : ۶۴)

لفظ آیت اور معجزہ کی حقیقت آیت کے معنی "نشانی" اور "علامت" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کئے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے اور پہچانتے ہو؟ صرف آیات و علامات سے کلّیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے، وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے، یہ انسان ہے، یہ درخت ہے، یہ سیب ہے، یہ انگور ہے۔ لیکن ہم کیونکر جانتے ہیں؟ اس طرح کہ ان چیزوں کی جو مخصوص نشانیاں ہیں وہ الگ الگ ہمارے ذہن میں محفوظ ہو گئی ہیں اور اب ان ہی کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے۔ ہم پہچانتے ہیں کہ یہ زید ہے، یہ عمرو ہے، یہ میرا عزیز ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میرا گھوڑا ہے۔ مگر یہ تمام شناختیں آیات و علامات ہی کی مدد سے ہیں۔ اگر دنیا میں ہر شئے کی مخصوص آیات و علامات مٹا دی جائیں تو ہم یقیناً کسی چیز کو نہ شناخت کر سکتے ہیں، نہ پہچان سکتے ہیں۔

یہی آیات و علامات کی جان پہچان اور شناخت ہے جو حیوان و انسان اور عقلمند و بے وقوف میں فرق پیدا کرتی ہے۔ جس میں ان آیات و علامات کی شناخت، تمیز اور یاد کی قوت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اس کی عقل و دانائی کا کمال زیادہ ہوگا۔ ہماری منطق کا تمامتر استدلال بجز آیات و علامات کے اور کیا ہے؟ ہم اپنے جس دعویٰ پر جو دلیل قائم کرنا چاہتے ہیں وہ ان ہی آیات و علامات کی مدد سے کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارے

تمام تجربے اور مشاہدے، بلکہ طبیعیات، کیمیائیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ اور جس قدر علوم بھی ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں، جن سے ہم براہِ راست جزئیات کا علم حاصل کرتے ہیں اور پھر ہم ان سے کلیات تیار کر لیتے ہیں۔

غرض ہمارا تمام تر فنِ استدلال دراصل ان ہی آیات و علامات پر موقوف ہے۔ اگر اشیا کی علامات و آیات محو کر دی جائیں تو ہم نہ کسی چیز کو پہچان سکیں گے اور نہ کسی دعویٰ پر کوئی دلیل قائم کر سکیں گے۔ ہم علت سے معلول پر اور معلول سے علت پر استدلال کرتے ہیں مگر ان ہی آثار و علامات کے ذریعہ سے۔ ہم کو تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ شے جب پیدا ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ آثار و آیات ظاہر ہوتے ہیں۔ اب کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ یہ شے پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اس کا فلاں نشان اور اثر بھی ضرور پیدا ہوا۔" یہ علت سے معلول پر استدلال ہے اور کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ فلاں نشان اور علامت ظاہر ہے اس لئے وہ شے بھی ہے۔" یہ معلوم سے علت پر استدلال ہے۔ کبھی ہم آگ کے وجود سے حرارت کے وجود پر اور کبھی حرارت کے وجود سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔

ہم کسی غیر آباد میدان میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ہم کو ایک شاندار عمارت نظر آتی ہے۔ اگرچہ ہم نے اس عمارت کے بنانے والوں کو نہیں دیکھا ہے مگر اس عمارت کو دیکھ کر ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی معمار کی صنعت ہے۔ ایک جنگل میں ایک جھونپڑے کے اندر ایک تنہا زخمی پڑا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے زخم صاف ہیں، مرہم پٹی ٹھیک ہے، اس کے آرام و آسائش کے تمام سامان قرینہ سے رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے گو اس کے

تیمار دار کو نہیں دیکھا مگر آس پاس کے علامات و آثار بتاتے ہیں کہ اس بیمار کا کوئی تیمار دار ہے اور وہ نہایت رحم و مہربانی سے اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ایک شخص آکر کہتا ہے "میں طبیب ہوں"۔ اس کے پاس جو مریض آتے ہیں وہ اس کے نسخہ سے شفا بھی پاتے ہیں۔ اب گو ہم نے اس کو طب کی تحصیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس کے آثار و علامات کو دیکھ کر اس کے دعویٰ کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہی ہمارا فنِ استدلال ہے اور اسی پر ہمارے تمام حصولی علوم کی بنیاد ہے۔

آیات اللہ | قرآن مجید میں آیت کا لفظ اس معنی میں اس کثرت سے آیا ہے کہ ہم یہاں ان کا استقصا بھی نہیں کر سکتے۔ صرف متفرق سورتوں سے چند آیات یہاں نقل کرتے ہیں جن سے مفہوم کی تشریح ہو جائے گی :-

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ	آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے
لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا	لئے نشانیاں ہیں اور تمہاری پیدائش میں
یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ	اور زمین میں جو چوپائے چلتے ہیں، ان میں
یُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ	ان کے لئے جو یقین کرتے ہیں نشانیاں ہیں
النَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	اور رات دن کے اُلٹ پھیر اور آسمان
مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ	سے جو خدا روزی برساتا ہے اور جس سے
بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ	زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور
اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ	ہواؤں کے پھرنے میں عقل والوں کے لئے
اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ	نشانیاں ہیں۔ یہ آیتیں ہیں جن کو ہم سچائی
فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ	کے ساتھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں، تو پھر خدا

يُؤْمِنُونَ ○

اور اس کی نشانیوں کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

(الجاثیۃ : ۳-۲)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○

بیشک آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے الٹ پھیر اور ان کشتیوں میں جو دریا کے اندر انسانوں کو فائدہ پہنچانے والے سامان لے کر چلتی ہیں اور خدا جو آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور زمین میں جو چوپائے اس نے پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے بیچ میں مسخر ہیں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

(البقرۃ : ۱۶۴)

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ ۫ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ

اور وہی خدا ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی نشوونما کو ظاہر کیا۔ پھر اس سے سبزہ پیدا کئے جس سے ہم تہ بہ تہ دانہ نکالتے ہیں اور کھجور جن کے خوشے نیچے لٹکتے ہوتے ہیں اور انگوروں کے باغوں کو اور زیتون

وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(الانعام : ۹۹)

اور انار کو اس نے پیدا کیا جو باہم ملے جلے ہوتے ہیں اور ان میل بھی ہوتے ہیں۔ ان کے پھلنے اور پکنے کو دیکھو ان چیزوں میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ○

(یونس : ۶۷)

اس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو اُس نے روشن بنایا۔ اس میں اُن کے لئے جو سُنتے ہیں نشانیاں ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے خود تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم کو ان کے پاس سکون اور قرار حاصل ہو اور تم دونوں کے لئے لطف و محبت پیدا کر دیا۔ اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں کا اور رنگوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ہے۔ اس میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں

لِقَوْمٍ يَسْمَعُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ
يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ
يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِيْ
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○
وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ
وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ

(الروم: ۲۱ - ۲۵)

میں رات اور دن کو تمہاری نیند ہے اور تمہارا
اس کی مہربانی (روزی) کی تلاش کرنا ہے۔
اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں نشانیاں ہیں۔
اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو
بجلی دکھاتا ہے جس میں (عذاب) کا خوف اور
(رحمت کی) امید دونوں ہیں اور آسمان سے
پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو
اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اس میں
عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں
میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اسکے حکم سے قائم ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَ
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ

(حٰمٓ السجدۃ: ۳۷)

اور اس کی نشانیوں میں سے رات
دن سورج اور چاند ہیں۔

یہ آیات اللہ یعنی خدا کی نشانیاں، خدا کے وجود اور اس کے صفاتِ کمالیہ کی علامات ہیں۔ جس طرح دیرانہ کی عمارت معمار کے وجود کو اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آرائش کا اہتمام تیماردار کے رحم و کرم کی صفات کو ظاہر کرتا ہے، اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے، ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہے اور زمین کے اندر و باہر ابر، بارش، دن رات، چاند سورج، درخت، میوے، پھل، غلّہ کی اقسام وغیرہ، زمین کے جانداروں کی زندگی کے

سامانِ آرام و آسائش اس خالق و صانع کے رحم و کرم، عطا و بخشش اور دیگر اوصافِ کمال کو نمایاں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خالق کو اپنی تمام مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق اور اعتنا ہے۔ کفر اُن ہی کے دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیاتِ الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے اور اُن کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے:

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ ○

اور یہ عاد کا قبیلہ ہے جس نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔

(ھود: ۵۹)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔

(الکھف: ۱۰۵)

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ

اور ان لوگوں میں نہ ہو جنہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔

(یونس: ۹۵)

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ

اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔

(الانعام، ۱۵۷)

جس طرح یہ آیاتِ الٰہی عام بندہ اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی خاص بندہ سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنی مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا رہتا ہے۔

(۱) انبیاءؑ قوموں کے تاریک ترین زمانوں میں نورِ الٰہی کی مشعل ہاتھ میں لے کر تنہا مجمعوں کے اندر آتے ہیں، لوگ اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور تیغ و خنجر سے مشعل

کے تھامنے والے دست و بازو کو زخمی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ شمعِ الٰہی بجھنے کے بجائے رفتہ رفتہ اپنے دائرہ نورانی کو وسیع کرتی جاتی ہے اور بالآخر سطحِ ارض کے کناروں تک پہنچ جاتی ہے:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ	وہ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے خدا کے نور
بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ	کو بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا روشن
وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ	کرنے والا ہے گو کافر اس سے خوش نہ
اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ	ہوں۔ اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور
الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ	سچائی کا مذہب دے کر بھیجا ہے تاکہ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○	وہ اس کو ہر مذہب پر غالب کر دے گو
(الصف : ۸-۹)	مشرک اس سے ناراض ہوں۔

(۲) باوجود تمام معاندانہ کوششوں اور مخالفانہ جدوجہد کے اس نورِ الٰہی کا پھیلتے جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس مشعل گیر دست و بازو میں خدا کی غیر مرئی قوت کام کر رہی ہے:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ	اور تم نے وہ (مٹھی بھر) کنکریاں نہیں
اللّٰهَ رَمٰى ۚ	پھینکیں بلکہ خدا نے پھینکیں۔
(الانفال : ۱۷)	

قدم قدم پر تائیداتِ الٰہی اس کا ساتھ دیتی ہیں:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا	ہم نے اس نصیحت کو اتارا ہے اور بیشک
لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر : ۹)	ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے۔

(۳) پیغمبر کے صحیفۂ زندگی کا صفحہ صفحہ ہر قسم کے اخلاقی داغ سے پاک ہوتا ہے۔ اس کی سچائی اور راستبازی عالم آشکارا اور دوست و دشمن سب کے نزدیک بے عیب ہوتی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی نسبت کافروں نے گواہی دی:

يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ	اے صالح! پہلے تم سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔

(ھود: ۶۲)

حضرت شعیب علیہ السلام کی مخالفت کے باوجود ان کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ بڑے عبادت گزار ہیں:

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ۔	اے شعیب! کیا یہ تمہاری عبادت گزاری تم کو کہتی ہے کہ اس کو چھوڑ دیں جس کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔

(ھود: ۸۷)

آنحضرتؐ اپنی شہادت میں خود اپنی زندگی کو پیش کرتے ہیں:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○	میں نے تمہارے درمیان مدت تک عمر گزاری ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

(یونس: ۱۶)

(۴) سب سے آخر یہ کہ تبلیغ و دعوت میں، دینِ الٰہی کی نصرت اور اشاعت میں، مخالفین کی شکست اور ہزیمت میں، حاملانِ دعوت کو مزید ایمان اور تسکین کے حصول میں عجیب و غریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو عرفِ عام میں معجزات کہتے ہیں۔

غرض یہی وہ امور ہیں جو خالقِ فطرت اور داعیٔ حق کے درمیان رابطۂ خاص اور علاقۂ

مخصوص کو نمایاں کرتے ہیں اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادۂ الٰہی ہے۔

آیات و دلائل کی دو قسمیں۔ ظاہری اور باطنی

تفصیلِ بالا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیات اور نشانات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری اور مادّی اور دوسرے باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادّی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ مثلاً مُردہ کا زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ اُبلنا۔ بیمار کو اچھا کرنا وغیرہ۔ باطنی اور روحانی آیات و دلائل مدعیٔ نبوّت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد، فلاح اور تائید ہے۔ اہلِ نظر اور حقیقت شناسوں کے لئے یہی باطنی آثار و آیاتِ نبوّت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لئے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

نبوّت کی باطنی نشانیاں واقعات کی روشنی میں

ہم نے نبوّت کی ظاہری اور باطنی دو نشانیاں قرار دی ہیں اور باطنی نشانیوں کو ظاہری علامات پر ترجیح دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ قرآن مجید بھی ان ہی کو نبوّت کی اصلی علامات قرار دیتا ہے۔ یہاں واقعات کی روشنی میں یہ واضح کرنا ہے کہ عہدِ نبوی میں بھی جو لوگ اہلِ نظر تھے وہ ان ہی علامات کی تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو بھی چھوڑ دو جنہوں نے بالآخر نبوّت کی تصدیق کی، اس عہد کے ان یہودیوں اور عیسائیوں کو دیکھو جنہوں نے گو کسی سبب سے علی الاعلان اس کی تصدیق کی جرأت نہیں کی مگر وہ اندرونی طور سے متاثر ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل سے بڑھ کر عرب میں علاماتِ الٰہی کا رازداں کوئی اور نہ تھا۔ سیکڑوں

یہودی مشنّا کانہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے، امتحانات لئے، تجربات کئے۔ مگر ان کا امتحان و تجربہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ وہ آپؐ کے اخلاق کی آزمائش کرتے تھے۔ صحفِ انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے تھے۔ آپؐ کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے آکر آپؐ سے خارقِ عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ تماشے بظاہر اور لوگ بھی دکھا سکتے ہیں اور یہ خوارقِ نبوّت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں۔ آنے والے نبی کی بشارتیں اور صفتیں توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحبِ خوارق ہونا اور ظاہری معجزات دکھانا اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی۔ بلکہ توراۃ میں اس کے اوصاف یہ بتائے گئے تھے کہ "وہ فاران سے طلوع ہوگا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا۔ اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی۔ وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگی مرد کے مانند ہلاک کرے گا۔ وہ عبادت گزار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا۔ مختون قوم (عرب) میں پیدا ہوگا۔" انجیل نے بتایا تھا کہ "وہ تسلّی کی روح ہوگا۔ وہ مسیحؑ کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا۔ خدا کی زبان اس کے منہ میں ہوگی۔"

سیکڑوں یہود و نصاریٰ آپؐ کی خدمت میں آئے اور انھوں نے آپؐ کی نبوّت کا امتحان لیا۔ مگر امتحان کے پرچہ میں مادّی معجزات کا سوال نہ تھا بلکہ عام علمی اور مذہبی باتوں کی نسبت استفسار تھا۔ قرآن مجید نے ان کے دو سوالوں کو دہرایا: یَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ[1] اور یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ[2]۔ پہلے سوال میں "ذی القرنین" کا قصہ پوچھا گیا ہے اور دوسرے سوال میں "روح" کی حقیقت دریافت

---

[1] الکہف: ۸۳۔ [2] بنی اسرائیل: ۸۵۔

کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کے متعدد اعتراضات اور سوالات مذکور ہیں۔ مگر ان میں سے ایک میں بھی یہ نہیں کہ ہم کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں کوئی خارقِ عادت تماشا دکھاؤ۔ بلکہ وہی سوالات کرتے تھے جس کو پیغمبر کے علم و عمل یا تعلیم و تزکیہ سے تعلق تھا۔ آگے چل کر ایک خاص باب میں ہم نے یہودیوں کے امتحانی سوالات جمع کر دئے ہیں۔ ان کو پڑھ کر تم بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ قرآن مجید میں ان کا ایک سوال بے شبہ ایسا مذکور ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی آنحضرتؐ سے کسی مادی معجزہ کی خواہش رکھتے تھے اور وہ یہ ہے :۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ	اہلِ کتاب تجھ سے فرمائش کرتے ہیں
عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ	کہ تو اُن پر آسمان سے کتاب اُتارے۔

(النسآء : ۱۵۳)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی معجزہ طلبی نہ تھی۔ بلکہ چونکہ توراۃ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کی چند لوحیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی تھیں اس لئے وہ اسی تخیل کے مطابق قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لئے اس کے نزول کو بھی اسی طرح چاہتے تھے۔

اب اس عہد کے عیسائیوں کو لو۔ قیصرِ روم کے دربار میں جب قاصدِ نبویؐ پہنچا تو ابوسفیان کو (جو اس وقت تک آنحضرتؐ کے دشمن تھے) بلوا کر قیصر نے آنحضرتؐ کے متعلق سوالات کئے۔ وہ حسب ذیل ہیں :۔

قیصر ۔ مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے ؟

ابوسفیان ۔ شریف ہے۔

قیصر۔ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحبِ اثر؟

ابوسفیان۔ کمزور لوگ ہیں۔

قیصر۔ اُس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان۔ بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر۔ کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟

ابوسفیان۔ نہیں۔

قیصر۔ وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان۔ ابھی تک تو نہیں، لیکن اب جو معاہدہ ہوا ہے دیکھیں وہ اس پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر۔ تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟

ابوسفیان۔ ہاں۔

قیصر۔ نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان۔ کبھی ہم غالب رہے کبھی وہ۔

قیصر۔ وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان۔ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ۔ نماز پڑھو پاکدامنی اختیار کرو۔ سچ بولو۔ صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے۔ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو وہ یقیناً پیغمبر ہے۔"

باوجود طولِ کلام کے ہم نے یہ تمام سوالات و جوابات یہاں نقل کر دئے ہیں۔ غور کرو یہ تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار و علامات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک سوال بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ مکہ کا مدعیٔ نبوت کوئی معجزہ بھی پیش کرتا ہے، حالانکہ اگر نبوت کی حقیقی علامت خوارقِ عادت ہوتے تو سب سے پہلے عیسائی قیصر کو یہی سوال پوچھنا چاہیئے تھا۔

حضرت جعفرؓ نجاشی کے دربار میں اسلام پر تقریر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں ایہا الملک ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بت پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے

سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو تکلیف نہ دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے۔[1]

نجران کے عیسائی علماء جب آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے تو انہوں نے قرآن کی آیتیں سنیں، مسلمانوں کی روحانی کیفیتوں کا مشاہدہ کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اسلام کا فیصلہ دریافت کیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق اُن سے مباہلہ کرنا چاہا۔ مگر انہوں نے منظور نہیں کیا اور آپس میں کہا کہ اگر یہ واقعی پیغمبر ہے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ بالآخر سالانہ خراج پر صلح کر لی۔ دیکھو انہوں نے اسلام کی تعلیمات کا ہر طرح امتحان کیا لیکن دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے ظاہری نشان نہیں مانگا۔

اب خاص عرب کے حقیقت شناس افراد کا مطالعہ کرو۔ آنحضرتؐ کی نبوت کی ان میں سے ہزاروں اشخاص نے تصدیق کی جن کے فضل و کمال، عقل و ہوش اور فہم و ذکا پر ان کے حالات و واقعات گواہ ہیں۔ مگر ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو باطنی علامات کے دیکھ لینے کے بعد ظاہری نشانیوں کا طلبگار رہا ہو۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ اسلام لائیں۔ چنانچہ آغازِ وحی ہی میں آنحضرتؐ نے جب حضرت خدیجہؓ سے اپنے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ فرمایا تو وہ ایمان لے آئیں۔ مگر کس اثر سے؟ اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب آپؐ نے بتقاضائے بشریت ان سے اپنے خوفِ جاں کا تذکرہ کیا تو انہوں نے جواب دیا:

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اوّل۔

و اللہ ما یخزیك اللہ ابدًا انك	خدا کی قسم خدا آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔
لتصل الرحم وتحمل الکل و	آپ صلۂ رحم کرتے ہیں، قرضداروں کا بوجھ
تکسب المعدوم وتقری الضیف	اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں مہمانوں
وتعین علی نوائب الحق۔	کو کھانا کھلاتے ہیں، حق کی مصیبتوں پر لوگوں
(بخاری بدء الوحی)	کی اعانت کرتے ہیں۔

حضرت ابوذرؓ کو جب آنحضرتؐ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ ذرا اس شخص کے پاس جا کر دیکھو جو دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے خبر آتی ہے۔ وہ مکہ آئے اور تحقیقِ حال کر کے واپس گئے اور حضرت ابوذرؓ سے جا کر کہا:

رایتہ یأمر بمکارم الاخلاق	میں نے اس کو دیکھا، وہ مکارمِ اخلاق کا
وکلامًا ما ھو بالشعر۔	حکم دیتا ہے اور ایک کلام پیش کرتا ہے
(مسلم مناقب ابی ذرؓ)	جو شعر نہیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے حقیقتِ حال کی تشریح ہوتی ہے اور جن کی تفصیل سے سیرۃ نبویؐ کی گزشتہ جلدیں بھری پڑی ہیں۔

قرآن مجید اور نبوّت کی باطنی علامات

یہ تمام بیانات درحقیقت قرآن مجید کی ان آیتوں کی تشریح ہیں جن میں نبوّت کی حقیقت اور اس کے اصلی آثار و علامات بتائے گئے ہیں:

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ	اے یہود و نصاریٰ! تمہارے پاس ہمارا
رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا	رسول آچکا جو تمہاری کتاب کی بہت سی
کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا	باتیں جن کو تم چھپاتے ہو صاف صاف بیان

عَنْ كَثِيْرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَهْدِيْ بِهِ
اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ
وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ
بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(المآئدۃ : ۱۵-۱۶)

کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔
اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور قرآن
آچکا خدا اس کے ذریعہ سے ان کو جو اس کی
خوشنودی کے پیرو ہیں، سلامتی کے راستے
دکھاتا ہے اور ان کو اپنے حکم سے وہ اندھیرے
سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھا
راستہ بتاتا ہے۔

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ
الْحِكْمَةَ ۗ

(الجمعۃ : ۲)

خود اُمیوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو
ان کو خدا کی آیتیں سناتا ہے ان کو پاک و
صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی اُن
کو تعلیم دیتا ہے۔

رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ ۚ

(آل عمران : ۱۶۴)

خود اُمیوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا
جو اُن کو خدا کی آیتیں سناتا ہے، اُن کو
پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت
کی اُن کو تعلیم دیتا ہے۔

اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ
الْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ

اس امی فرستادۂ الٰہی اور پیغامبر کی پیروی کرتے
ہیں جس کو وہ توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے ہیں
وہ اُن کو اچھے کام کا حکم دیتا ہے اور بُرے کام
سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو اُن کے لئے

الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ	حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے
وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ	اور ان رسم و رواج کے جو بوجھ اور بیڑیاں ان پر
الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ	پڑی ہوئی تھیں وہ ان سے دور کرتا ہے۔

(الاعراف : ۱۵۷)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو (اپنا) گواہ اور (نیکو
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى	کاروں کو) خوشخبری سنانے والا اور (بدکاروں کو)
اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝	ڈرانے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے
(الاحزاب : ۴۵-۴۶)	پکارنے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

الغرض نبوت کے اصلی آثار و علامات یہ ہیں کہ وہ آیاتِ الٰہی تلاوت کرتا ہے۔ زنگ آلود نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے۔ لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے۔ وہ قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان کے پاؤں کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالتا ہے۔ وہ خدا کا گواہ بن کر اس دنیا میں آتا ہے۔ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے۔ بدکاروں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدۂ عالم میں ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔

قریش آنحضرتؐ سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا	اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ	باتیں کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	کیوں نہیں آتی۔ ان سے پہلے لوگوں نے بھی

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ
قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○
اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ
نَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ
الْجَحِيْمِ ○

(البقرۃ: ۱۱۸ - ۱۱۹)

اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم
کے ہو گئے، ہم نے تو نشانیاں ان لوگوں کے لئے
جو یقین کرتے ہیں، کھول کر رکھدیں اے محمدؐ ہم نے
تجھ کو سچائی دے کر نیکو کاروں کو خوشخبری سنانے
والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور جن
کو اب بھی یہ نشانیاں باور نہ آئیں، ان دوزخیوں
کی تم سے باز پرس نہ ہوگی۔

کفار پیغمبر کی صداقت کی نشانی چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی روشنی تو اس کا سرتاپا وجود ہے اور اہل یقین کے لئے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ اس کی حقانیت، نیکو کاروں کو خوشخبری سنانا اور بدکاروں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا اور اس سے انقلابِ انسانی اور نتائجِ روحانی کا ظہور یہ خود اس کی صداقت کی کھلی نشانیاں ہیں:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ
مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ
اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ
الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ

(العنکبوت: ۵۰ - ۵۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے
پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں
اتریں، کہدے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں
اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں۔ ان کافروں کو
یہ نشانی کافی نہیں کہ تجھ پر ہم نے کتاب اتاری
ہے جو اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی خود یہ دعوتِ الٰہی اور پیغام ربانی آیت و نشانی ہے اور اہل بصیرت کے لئے

یہی معجزہ ہے :

اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ	کیا ان کافروں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں
عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ○	ہے کہ بنی اسرائیل کے عالم لوگ اس کو
(الشعراء : ۱۹۷)	جانتے ہیں۔

یعنی پیغمبر اسلامؐ کا معجزہ یہ ہے کہ ایک امّی ہو کر وہ ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی صداقت کو علمائے بنی اسرائیل جانتے اور سمجھتے ہیں۔ کیا یہ معجزہ جہلائے قریش کی تسلّی کے لئے کافی نہیں ہے کہ بڑے بڑے علماء اس کی سچائی کے دل سے معترف ہیں :

وَقَالُوْا لَوْلَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَۃٍ مِّنْ	اور وہ کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف
رَّبِّہٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِھِمْ بَیِّنَۃُ مَا	سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا
فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ○ وَلَوْ اَنَّآ	کیا ان کو اگلی کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی۔ اور
اَھْلَکْنٰھُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِہٖ	اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتے تو یہ
لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا	کہتے کہ اے ہمارے پروردگار کیوں تو نے ہمارے
رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ	پاس کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں
(طٰہٰ : ۱۳۳-۱۳۴)	کی پیروی کرتے۔

یعنی گزشتہ انبیاءؑ کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو صفات اور نشانیاں مذکور تھیں پیغمبر اسلامؐ ان کا مصداقِ کامل ہونا یہی سب سے بڑی نشانی ہے یا اس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کفّار بار بار یہی کہتے ہیں کہ معجزہ دکھاؤ۔ معجزے تو انہیں دکھائے جا چکے۔ کیا یہ نہیں معلوم کہ گزشتہ قومیں معجزات دیکھ کر بھی جب ایمان نہ لائیں تو ان کا

کیا حشر ہوا۔

کفّار کا سوال تھا:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ	کہ اس پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔

(الرّعد : ۷)

اس کے جواب میں خدا نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ○	(اے محمدؐ! تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم میں ایک ہادی گزرا ہے۔

(الرّعد : ۷)

مقصود یہ ہے کہ نبوّت کی حقیقت معجزہ نہیں بلکہ انذار اور ہدایت ہے۔

ظاہری آیات اور نشانیاں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انبیاءؑ ظاہری آیات اور مادّی نشانات سے خالی ہوتے ہیں۔ تمام انبیائے کرامؑ کی سیرتیں بیک زبان اِس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصّہ بھی ملتا ہے۔ قرآن مجید نے اکثر انبیاءؑ کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ مادّی اور ظاہری نشانات نبوّت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں۔ یہی سبب ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن مجید نے کفّار کی مادّی نشانیوں کی طلب میں آپؐ کی طرف سے یہ الفاظ کہے:

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○	میں تو صرف ایک انسان پیغمبر ہوں۔

(بنی اسرائیل : ۹۳)

ظاہری نشانات صرف معاندین طلب کرتے ہیں

لیکن نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار و علامات یعنی خارقِ عادت معجزات صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور جو تعصب و عناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ انبیائے کرامؑ پر ایمان لانے والوں کے حالات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ معجزات کی طلب نیکوکاروں نے نہیں کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ فرعون کے مقابلہ میں دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے نہیں بلکہ یہودیوں نے معجزہ طلب کیا۔ آنحضرتؐ سے ابوبکرؓ و عمرؓ نے نہیں بلکہ ابوجہل و ابولہب نے معجزہ مانگا۔ یہی حال دوسرے انبیاءؑ کا بھی ہے قرآن مجید نے اس حقیقت کی پوری تصریح کی ہے اور طلبِ معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ (البقرۃ: ۱۱۸)	اور جن کو کتاب الٰہی کا علم نہیں (یعنی کفارِ قریش) کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود باتیں نہیں کرتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟
وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ (الانعام: ۳۷)	اور کفار نے کہا کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ ۝ (الرعد: ۷)	اور کفار کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟
وَقَالُوْا لَوْلَآ يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ	اور کفار نے کہا کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی

رَبِّهٖ ؕ	طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس
(طٰہٰ: ۱۳۳)	کیوں نہیں لاتا۔

دیکھو کہ ہر آیت میں کفار ہی کا معجزہ طلب کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔

کفار کا معجزہ طلب کرنا نفیٔ معجزہ کی دلیل نہیں

کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا کہ اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار معجزہ کے لئے اصرار کیوں کرتے؛ لیکن یہ استدلال سرتاپا غلط ہے۔ ان کو نفسِ معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادّی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلبِ معجزہ پر مصر ہیں۔ چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کے اس طلبِ معجزہ کا ذکر ہے، یہ تصریح موجود ہے اور انہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان خوارق سے انہیں تسلّی نہ ہوگی۔ ان کو چاہیئے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلّی ان ہی سے ممکن ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا	اور جو نہیں جانتے، وہ کہتے ہیں کہ کیوں خدا
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ	ہم سے خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس
قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ	کوئی نشانی نہیں آتی۔ ان سے پہلے کے
تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا	لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ	کے دل ایک سے ہو گئے ہیں ہم نے نشانیاں
اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ	ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں کھول کر
وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝	رکھدی ہیں۔ اے پیغمبر ہم نے تجھ کو سچائی دے کر

نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو
ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور (جنکو یہ نشانیاں باور
نہ آئیں) ان دوزخیوں کی تم سے باز پرس نہ ہوگی۔

(البقرۃ : ۱۱۸-۱۱۹)

اس آیتِ کریمہ میں صاف موجود ہے کہ ہم نشانیاں کھول کر بتا چکے ہیں لیکن ان نشانیوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اہلِ یقین ہیں۔ اور جو ہر امر میں شک کرتے ہیں ان کا علاج صرف دوزخ ہے۔ دوسری آیت میں ہے :

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ
رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا
فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ○ وَلَوْ اَنَّآ
اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ
لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا
رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

(طٰہٰ : ۱۳۳-۱۳۴)

اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف
سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا۔
کیا ان کے پاس گزشتہ کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی۔
اگر ہم اس سے پہلے کسی عذاب سے انکو ہلاک
کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار کیوں
ہمارے پاس کوئی رسول تو نے نہیں بھیجا کہ ہم
تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔

اس آیت میں بھی معجزات ظاہر ہونے کے بعد مزید معجزات کی طلب پر گزشتہ قوموں کے واقعات کی طرف جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں، متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھ لو! دنیا میں اُن کا کیا حشر ہوا۔ جنہوں نے معجزوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں قبول کیا۔

معجزات تو بہر حال کسی نہ کسی آنی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر پیغمبر معجزہ ہی دکھاتا رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو اور پیغمبر کی زندگی صرف ایک تماشا گر کی

حیثیت اختیار کرے۔ اس لئے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ	اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار
مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ	کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔
اللّٰهِ ۫ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝	کہدے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ	میں صرف کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ کیا یہ
الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ	ان کو بس نہیں کرتا کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری
(العنکبوت: ۵۰-۵۱)	جو ان کو پڑھ کر سناتی جاتی ہے۔

معاندین کو معجزہ سے بھی تسلّی نہیں ہوتی نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حُسنِ ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر شے کے اندر شر، خُبث اور بدی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی اور واضح سے واضح بُرہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دُور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاءؑ کے مکارمِ اخلاق، حُسنِ عمل، حُسنِ تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سُن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرضِ شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ پیغمبروں سے خارقِ عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور چونکہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا اس لئے وہ کبھی کوئی خارقِ عادت امر پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی اور خود اسی

کے ہاتھوں سے اس کے دعووں کے تاروپود بکھر جائیں گے۔ لیکن قدرتِ الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارقِ عادت بھی پیش کر دیتی ہے۔ تاہم اُن کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خارقِ عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ شیطانی عمل اور سحر و جادو کی قوت سے پیدا ہوا ہے اور چونکہ بظاہر معجزہ اور سحر و شعبدہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اس لئے اُن کے بدگمان قلب کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔

حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے فرعون کو متعدد معجزے دکھلائے مگر ہر ایک کے جواب میں انہیں یہی سننا پڑا کہ "تم جادوگر ہو"

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ — یہ تو کھلا جادو ہے۔

(النمل : ۱۳)

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ۔ — یہ موسیٰؑ اور ہارونؑ یقیناً جادوگر ہیں۔

(طٰہٰ : ۶۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری پر ایمان لے آئے مگر فرعون یہی کہتا رہا:

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ — یہ موسیٰؑ تم سب کا بڑا جادوگر ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔

(طٰہٰ : ۷۱)

توراۃ میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون

کو جب کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو ہر معجزہ کے بعد فرعون کے دل کی سختی علیٰ حالہٖ باقی رہ جاتی تھی۔ چنانچہ توراۃ میں تقریباً ہر معجزہ کے بعد یہ مذکور ہے: "لیکن فرعون کا دل سخت رہا۔ اور اُس نے ان کی نہ سنی"[1] انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے زیادہ معجزات دکھائے۔ لیکن خود انجیل میں مذکور ہے کہ تقریباً ہر معجزہ کے بعد حاضرین کی دو جماعتیں ہو جاتی تھیں۔ ایک تو ان کی معتقد ہو جاتی تھی اور یقین کرتی تھی کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور دوسری کہتی تھی کہ یسوعؑ کے ساتھ شیطان رہتا ہے۔ "تب یہودیوں کے بیچ ان باتوں کے سبب اختلاف ہوا اور بہتوں نے ان میں سے کہا: اس کے ساتھ ایک دیوتا رہتا ہے اور وہ مجنون ہے۔ تم اس کی سنتے کیوں ہو؟ اوروں نے کہا: یہ باتیں اس کی ہیں جس میں دیو ہے۔ کیا دیو اندھے کی آنکھیں کھول سکتا ہے"[2] ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک گونگے کو اچھا کیا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ لیکن فریسی یہودیوں نے کہا: "یہ دیوؤں کے سردار کی مدد سے دیوؤں کو نکالتا ہے"[3] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معاندین کے جواب میں کہا: "تم کہتے ہو کہ میں دیوؤں کو بعل زبول (ایک دیوتا کا نام) کی مدد سے نکالتا ہوں"[4] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعدد دفعہ لوگوں سے کہا کہ "تم معجزات دیکھتے ہو مگر ایمان نہیں لاتے"[5]

"یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) نے یہ باتیں کہیں اور اپنے تئیں ان سے (فریسی یہودیوں سے) چھپایا۔ اگرچہ اُس نے اُن کی روبرو اِتنے معجزے دکھائے پر وہ اس پر ایمان نہ لائے"[5] "تب ان شہروں کو جن میں اس کے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے ملامت کرنے لگا۔

---

[1] توراۃ: کتاب الخروج [2] یوحنا کی انجیل باب ۱۰۔ ۱۹۔ [3] متی کی انجیل: باب ۹ ۳۴۔ [4] لوقا کی انجیل: ۱۱۔ ۱۸۔ [5] یوحنا کی انجیل: ۱۲۔ ۳۷۔

کیونکہ انہوں نے توبہ نہ کی تھی۔[1]

کفار قریش آنحضرتؐ سے معجزوں کے طالب ہوتے تھے۔ مگر جب معجزے دیکھتے تھے تو کاہن اور جادوگر کہنے لگتے تھے۔[2] عرب میں پیشین گوئی کاہن کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی پیشین گوئیوں کو دیکھ کر معاندین نے آپؐ کو کاہن کا خطاب دیا تھا۔ اس لئے قرآن مجید نے کہا:

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ	اے پیغمبر تو اپنے پروردگار کے فضل
(الطور: ۲۹)	سے کاہن نہیں ہے۔
وَّلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط	اور یہ کسی کاہن کی بات نہیں ہے۔
(الحاقہ: ۴۲)	

آنحضرتؐ کے معجزات اور خوارق کو وہ دیکھتے تھے تو ان کو جادو کا اثر سمجھتے تھے:

ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ	پھر پیٹھ پھیر کر چلا اور غرور کیا اور کہا کہ
اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝	یہ تو جادو ہے جو اگلے وقتوں سے چلا
(المدثر: ۲۳: ۲۴)	آتا ہے۔

کفار ایک دوسرے کو منع کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جایا کرو۔ کیونکہ وہ جادو کیا کرتے ہیں:

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ	یہ محمدؐ تو تمہاری ہی طرح آدمی ہیں
اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ	کیا تم جادو کے پاس آتے ہو

---

[1] متی کی انجیل ۱۱: ۱۰۔ [2] صحیح مسلم مناقب ابی ذرؓ

تُبْصِرُوْنَ ○ اور تم دیکھ رہے ہو۔

(الانبیاء: ۳)

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ حق کے منکرین کے پاس جب حق آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

(الاحقاف: ۷)

آنحضرتؐ نے جب معجزۂ شق القمر دکھایا تو کفار نے اس کو بھی جادو کہا:

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ نزدیک آگئی قیامت اور چاند پھٹ گیا۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○ اور اگر وہ کوئی بھی نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

(القمر: ۱-۲)

دوسرے معجزات کو دیکھ کر وہ یہی کہتے رہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جادوگر ہے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ○ کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک پر وحی اتاری کہ لوگوں کو ڈرا اور ان کو جو ایمان لائے بشارت دے کہ ان کے پروردگار کی بارگاہ میں اُس کی بڑی پایگاہ ہے۔ کافر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے۔

(یونس: ۲)

معاندین کو معجزہ سے بھی ایمان کی دولت نہیں ملتی

چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور یقین کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں، اس لئے

بڑی سے بڑی نشانی بھی شک وشبہ کے گرداب سے ان کو باہر نہیں نکال سکتی، وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ کبھی فریب اور قوت شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے۔ اس لئے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ حجت کے لئے ایک دفعہ معجزہ ان کو دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا۔ پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کو تسلی نہ ہوگی۔ چنانچہ سورۂ انعام کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراتب کو بیان کر دیا ہے

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ○

اور خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ان کے پاس نہیں آتی لیکن یہ کہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

(الانعام: ۴)

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ○

اے پیغمبر! اگر ہم تجھ پر ایسی کتاب بھی آسمان سے اتاریں جو اوراق میں لکھی ہو کہ وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھوئیں تو وہ جو کافر ہیں، یہی کہیں گے کہ یہ فقط ایک ساحرانہ تماشا ہے۔

(الانعام: ۷)

وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○

اور اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو وہ ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ وہ جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

(الانعام: ۲۵)

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ○ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ○

(الانعام: ۸-۹)

اور کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ کہدے کہ اگر فرشتہ اتارا جاتا تو ان کو پھر مہلت نہ دی جاسکتی اور بات پوری ہو جاتی۔ اگر ہم رسول کا ساتھی کسی فرشتہ کو بناتے تو اس کو بھی انسان ہی کی صورت میں بناتے تو پھر وہی شبہے ان کے دلوں میں ہم پیدا کرتے جواب یہ کر رہے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○

(الانعام: ۱۱۱)

اور اگر ہم ان کے پاس آسمان سے فرشتے بھی اتار کر بھیجیں اور مردے بھی ان سے باتیں کریں اور ہر چیز ان کے سامنے لا کھڑی کر دیں تو وہ ایمان نہ لائیں گے لیکن یہ کہ خدا کی مشیت ہو۔ لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

آنحضرتؐ کو فرطِ شفقت سے یہ خیال بار بار آتا تھا کہ یہ رؤسائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ رہنے پائیں۔ خدا نے فرمایا کہ ان کو حقیقت میں براہِ راست نبوت سے انکار نہیں بلکہ ان کو نبوت سے اس لئے انکار ہے کہ ان کو اولاً نفس خدا پر یقین نہیں یہ بظاہر نبوت کی نشانیوں کو طلب کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو خدا کی نشانیاں بھی تسلیم نہیں۔ ایسے لوگوں کی قسمت میں ایمان کی سعادت نہیں، ان کے لئے معجزے بیکار

ہیں۔ یہ سعادت انہی کو ملتی ہے جو حق کے طالب ہیں اور حق باتوں کو سنتے ہیں:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ
يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ
وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
يَجْحَدُوْنَ ○ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ
رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى
مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ
نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ
اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِئِ
الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ
عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ
اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ
سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۚ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى
الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○
اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ
وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ
يُرْجَعُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ

ہم جانتے ہیں کہ ان کافروں کی باتیں تجھ
کو غمگین کرتی ہیں لیکن تجھ کو غمگین نہ ہونا چاہیے
کیونکہ وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ دراصل
ان ظالموں کو خدا کی نشانیوں سے انکار
ہے۔ تجھ سے پہلے انبیاء بھی جھٹلائے
گئے تو انہوں نے اپنی تکذیب پر صبر کیا اور
ان کو بھی ایذا پہنچائی گئی یہاں تک کہ ان
کے پاس خدا کی نصرت آئی۔ خدا کی باتوں کو کوئی
بدلنے والا نہیں اور گزشتہ پیغمبروں کے واقعات تجھ
کو معلوم ہو چکے ہیں اور اگر ان کافروں کی روگردانی
تجھ پر گراں ہو تو اگر تجھ میں طاقت ہو تو زمین
میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈھ
کہ ان کو کوئی نشانی لا کر دے (ان نشانیوں
سے ان پر کوئی اثر نہ ہوگا، اگر خدا چاہتا تو ان کو
راہِ ہدایت پر متفق کر دیتا تو (غمگین ہو کر) جاہلوں
میں سے نہ بن۔ دعوتِ الٰہی کو وہی قبول کرتے
ہیں جو آواز پر کان دھرتے ہیں اور یہ (کافر جو
دل کے مُردے ہیں) ان کو خدا ہی اٹھائے گا

اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً
وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○
(الانعام: ۳۳ — ۳۷)

پھر اسی کی طرف لائے جائیں گے۔ یہ کہتے ہیں کہ
اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی
نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ کہدے کہ خدا نشانی
لانے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نادان ہیں۔

لیکن معجزہ دیکھنے پر بھی ان کے قلوب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس شک و شبہ کا منشا عناد ہے، حق طلبی نہیں۔ اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلے ہی دفعہ دیکھ کر وہ ایمان لے آتے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ
لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ
بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ
وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَاۗءَتْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ
وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ
الْمَلٰۗئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ
حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا
مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ
اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا

اور یہ کافر خدا کی بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر
کوئی نشانی اُن کے پاس آجائے گی تو وہ اس پر ایمان
لے آئیں گے۔ کہدے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے
پاس ہیں اور تمہیں کس نے بتایا کہ یہ نشانیاں دیکھ کر
ایمان لائیں گے۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے انشانی کے
بعد، ہم ان کے دلوں کو اصول یقین سے، اور ان
کی آنکھوں کو اپنے دیکھنے پر اعتبار کرنے سے، پھیر
دیتے ہیں جس طرح کہ یہ پہلے اس پر ایمان نہیں
لائے اور ہم ان کو اُن کی اسی سرکشی کی حالت
میں چھوڑ دیں گے کہ بھٹکتے رہیں۔ اگر ہم اُن کے
پاس فرشتے بھی اتار کر بھیجیں اور مردے بھی اٹھ
کر ان سے باتیں کریں اور ہر چیز ہم اُن کے
سامنے بھی کر دیں تو وہ ایمان لانے والے نہیں

شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ (الانعام : ۱۰۹-۱۱۲)

مگر جو چاہے اللہ، لیکن ان میں اکثر نادان ہیں۔ اور ہم نے اسی طرح ہر نبی کا معاند انسانوں اور جنوں سے بنایا ہے جو ایک دوسرے کو دھوکے کی نمائشی باتیں سکھایا کرتے ہیں (اسی عناد کے باعث وہ نشانیوں کو نہیں مانتے۔

اگر رفعِ حجت کے لئے ان کو معجزہ دکھایا بھی جاتا ہے تو حیلہ جوئی کر کے کہتے ہیں کہ گزشتہ انبیاءؑ کو جیسے معجزے دئے گئے جب تک وہی معجزے ہم کو نہ دئے جائیں ہم ایمان نہ لائیں گے :

فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ○ (الانبیآء : ۵)

چاہئے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جیسے پہلے لوگ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے

لیکن فرض کرو کہ وہی معجزات دکھائے بھی جائیں تو ان کی حیلہ جو طبیعت ان سے کب تسلی پائے گی۔ وہ فوراً یہ کہہ دیں گے جیسا کہ انہوں نے بارہا کہا ہے کہ یہ محض ساحرانہ کرشمہ ہے اور ہماری آنکھوں کو مسحور کر دیا گیا ہے :

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ○ لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ○

اور کافر کہتے ہیں کہ اے وہ جس پر نصیحت اتری ہے تجھ پر کوئی جن سوار ہے کیوں تو فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے آتا اگر تو سچا ہے۔ خدا کہتا ہے، ہم فرشتوں کو دنیا میں حق کے ساتھ اتارتے ہیں اگر فرشتے اتار دے جائیں تو پھر

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ
لَحَافِظُونَ ○ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ
قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ○ وَ
مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا
بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ
فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ○ لَا
يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ
الْأَوَّلِينَ ○ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم
بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ
يَعْرُجُونَ ○ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ
أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ○

(الحجر ، ۲ – ۱۵)

ان کافروں کو مہلت نہ دی جائے گی۔ اس
نصیحت کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے
نگہبان ہیں۔ ہم نے تجھ سے پہلی قوموں میں
بھی پیغمبر بھیجے۔ اور ان میں سے کسی کے پاس
کوئی پیغمبر نہ گیا لیکن انہوں نے اس سے تمسخر
کیا۔ اسی طرح ہم گنہگاروں کے دلوں میں
بٹھا دیتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے۔
یہ اگلوں سے رسم ہوتی آئی ہے اور اگر ہم
ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیں
اور وہ اس میں چڑھ بھی جائیں تو یہی کہتے
رہیں گے کہ ہماری آنکھوں کو متوالا بنا دیا
گیا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ ان معاندین کے شکوک و شبہات کا تو بر تو بادل معجزات اور آیات کی روشنی سے بھی نہیں چھٹتا۔ آنحضرتؐ نے جب پہلے پہل اسلام کی دعوت اُن کے سامنے پیش کی تو آپؐ کو انہوں نے "مجنوں" کا خطاب دیا۔ قرآن مجید نے اُن کی تردید کی:

مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ○

(القلم ، ۲)

تو اپنے پروردگار کی عنایت سے
مجنوں نہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے ان کے سامنے معجزات اور آیات پیش کیں کہ کہیں مجنوں

سے بھی یہ افعال صادر ہو سکتے ہیں تو انہوں نے آپؐ کو مجنون کے ساتھ "کاہن" اور "جادوگر" کہا:

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّ لَا مَجْنُوْنٍ ○	تو اپنے پروردگار کی عنایت سے نہ تو کاہن ہے اور نہ مجنوں۔

(الطور: ۲۹)

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ○	کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے۔

(یونس: ۲)

آپؐ نے اُن کے اس الزام کے جواب میں اپنی تعلیمات و تلقینات کو پیش فرمایا کہ کاہن و جادوگر علم و حکمت کا یہ خزانہ نہیں رکھتے۔ لیکن پُرعناد قلوب کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی اور کہا کہ علم و حکمت کے اسرار انھیں کوئی سکھاتا ہے:

ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے معجزات دیکھے۔ پھر بھی اپنے انکار و اعراض پر نہایت استقلال کے ساتھ قائم رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا۔ لیکن اس کا انکار ایمان سے تبدل نہ ہوا جیسا کہ توراۃ اور قرآن دونوں میں بہ تکرار بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ○ وَمَا نُرِيهِمْ مِنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَأَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ○ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ○

(الزُّخرف: ۴۷-۵۰)

جب موسیٰ ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آیا تو وہ ہنستے ہیں۔ اور ہم انہیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں لیکن یہ کہ وہ پہلی نشانی سے زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ اور ہم نے ان کو بڑے عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ رجوع کریں۔ اور انہوں نے موسیٰ سے کہا اے جادوگر! اپنے خدا سے ہمارے لئے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھ سے تیری دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے (کہ وہ ہم سے یہ عذاب دور کر دے) ہم راہِ راست کو قبول کئے لیتے ہیں۔ پس جب ہم نے ان سے عذاب ہٹا دیا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں۔

اس موقع پر ایک نکتہ خاص خیال کے لائق ہے۔ یہ حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے جو زمانۂ ماضی کا ایک واقعہ تھا جس کو تمام تر صیغۂ ماضی سے ادا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ان میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے صیغۂ مضارع کا استعمال کیا ہے جو واقعۂ حال و استقبال کے بیان کے لئے مقرر ہے۔

۱۔ "جب موسیٰؑ ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آئے تو وہ ہنستے ہیں"۔

۲۔ "اور ہم انہیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں لیکن وہ پہلی نشانی سے بڑی ہوتی ہے"۔

۳۔ "پہلے انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر موسیٰؑ کی دعا قبول ہوگئی تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ لیکن جب دعا قبول ہو کر اس کا اثر ہوا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں"۔

اس موقعہ پر صیغہ مضارع کے استعمال سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ گویہ واقعہ خاص فرعون کے ساتھ پیش آیا۔ مگر یہ مخصوص حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے فرعون کے ساتھ نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ کہ جب ان کے پیغمبر خدا کے احکام اور نشانیاں لے کر ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ صدائے خندۂ تحقیر بلند کرتے ہیں۔ لیکن خدا ان کو نشانیوں پر نشانیاں دکھاتا جاتا ہے۔ تاہم ان سے ان کی تسکین نہیں ہوتی اور دوسری کوئی نشانی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ نشانی ہم کو دکھا دی گئی تو ہم یقیناً ایمان لے آئیں گے۔ لیکن جب وہ نشانی بھی ان کو دکھا دی جاتی ہے تو ان کو اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی اور وہ آخر تک ایمان کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام کی امت نے حضرت صالح علیہ السلام سے ایک نشانی طلب کی۔ انہوں نے کہا یہ اونٹنی تمہاری نشانی ہے جو ایک دن میں ان کے چشمہ یا کنوئیں کا تمام پانی پی جاتی تھی اور دوسرے دن ان کے جانوروں کو پانی ملتا تھا۔ لیکن اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام چشمہ یا کنوئیں کا پانی پی جاتی ہے انہیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو

مار ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی پاداش میں وہ ہلاک کر دئے گئے۔ سورۂ شعراء میں ہے:

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ	اے صالحؑ! تم ہماری ہی طرح آدمی ہو اگر تم
بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○	اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔ صالحؑ
قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ	نے کہا یہ اونٹنی ہے۔ اس کیلئے پانی پینے
لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا	کی ایک باری ہے اور تمہارے لئے ایک
تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ	مقرر دن کا پانی پینا ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی
عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ فَعَقَرُوْهَا	برائی نہ کرو ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم
فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَهُمُ	کو آلے گا۔ تو انہوں نے اس کی کونچ کاٹ
الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ	ڈالی۔ پھر نادم ہوئے۔ تو عذاب نے انہیں آگھیرا
وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○	اس واقعہ میں بڑی نشانی ہے۔ صالحؑ کی قوم
(الشعراء آ ۱۵۴-۱۵۸)	کے لوگ اکثر مومن نہ تھے۔

عہدِ محمدیؐ کے فرعونوں اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں مگر انھیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ کفارِ قریش کے حال میں قرآن مجید کا بیان ہے:

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ	ان کے پاس خدا کی نشانیوں میں سے
رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ○	کوئی نشانی نہیں آتی لیکن وہ اس سے اعراض
فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۭ	کرتے ہیں۔ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے
فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا	اس کو جھٹلایا۔ تو عنقریب جس چیز
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○	کا مذاق اڑاتے ہیں اس کی حقیقت

(الانعام: ۴-۵) ان کو معلوم ہوگی۔

ایک موقع پر قرآن مجید نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق نبوت کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو معاندین قریش کہتے ہیں کہ ان نشانیوں سے ہم کو تسکین نہ ہوگی جب تک گزشتہ پیغمبروں کی طرح خود ہم کو بھی وہی نشانیاں نہ دی جائیں۔ یعنی نبوت کے تمام آثار و کیفیات خود ہم پر طاری نہ ہوں تاکہ ہم کو دھوکہ اور فریب کا شبہ نہ رہے۔ خدا نے کہا کہ یہ نبوت ہر ایک کا حصہ نہیں:

وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ	اور جب ان (کفار قریش) کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک نہ مانیں گے جب تک ہم کو بھی وہ کچھ نہ دیا جائے جو خدا کے پیغمبروں کو دیا گیا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغامبری کا منصب کس کو عطا کرے۔
(الانعام: ۱۲۴)	

اس لئے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے۔

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد بالآخر معاندین پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور پھر طلب معجزہ کے لئے ان کے پیہم اصرار، الحاح اور طلب کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور صرف عذاب الٰہی کی آخری نشانی ان کے لئے باقی رہ جاتی ہے۔ انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام انبیاءؑ سے زیادہ معجزات اور نشانیاں دکھائیں، تاہم فریسی یہودیوں کو معجزہ کی تشنگی باقی رہ گئی اور ہر ملاقات میں انہوں نے معجزہ کی نئی فرمائش کی:

"تب فریسی نکلے اور اس سے (حضرت عیسیٰؑ) حجت کر کے اس سے امتحان کے لئے کوئی آسمان سے نشان چاہا۔" (مرقس ۸ - ۱۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آہ سرد بھر کر فرمایا:

"اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا۔" (مرقس ۸ - ۱۲)

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک گونگے کو اچھا کیا۔ بعضوں نے کہا کہ

"یہ بعل زبول دیوتا کی مدد سے ایسے عجیب کام کرتا ہے اور اوروں نے آزمائش کے لئے اس سے ایک آسمانی نشان مانگا۔" (لوقا ۱۱ - ۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

"اس زمانہ کے لوگ بُرے ہیں۔ وہ نشان ڈھونڈھتے ہیں۔ پر کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا مگر یونس نبی کا نشان۔" (لوقا ۱۱ - ۲۹)

اللہ تعالیٰ نے معاندینِ قریش کے جواب میں قرآن مجید میں اسی نکتہ کا اظہار فرمایا:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ	اور ہم کو نشانیوں کے بھیجنے سے صرف
اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ	اس امر نے باز رکھا کہ پہلوں نے ان
(بنی اسرآئیل: ۵۹)	کو جھٹلایا۔

قرآن مجید میں چار پانچ مقام پر مذکور ہے کہ عہد محمدیؐ کے معاندین نے کہا:

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ	محمدؐ پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی
(الرعد، ۲۷)	کیوں نہیں اتاری جاتی۔

اس کے جواب میں ان کو نبوت کی اصل حقیقت انداز، تبشیر اور ہدایت کی طرف متوجہ کیا گیا اور خرقِ عادت کی کسی مزید نشانی کے دکھانے سے تغافل اور احتراز برتا گیا۔ عیسائی معترضین قرآن مجید کی ان آیتوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ دکھانے سے اس لئے انکار کیا کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں ملا تھا۔ اگر ان آیتوں سے یہ استنباط صحیح ہے تو انجیل کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں ان کا مطلب کیا ہوگا؛ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فریسیوں کو معجزہ دکھانے سے انکار کرنا بھی یہی نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ نعوذ باللہ ان کو کوئی معجزہ خدا کی طرف سے نہیں ملا تھا؟

معجزہ کے انکار یا تاخیر کے اسباب اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائناتِ روحانی کو بھی ایک نظام اور اصول کے ماتحت رکھا ہے۔ اس بنا پر ہم کو ضرورت ہے کہ اُن مصالح اور اسباب کا پتہ لگائیں جن کی بنا پر باوجود قدرت اور شدتِ ضرورت کے معجزات سے کلیتہً انکار کیا گیا ہے یا اُن کے ظہور میں تاخیر ہوئی ہے۔ قرآن مجید کے امعانِ مطالعہ سے ان اسباب کو ذیل کی صورتوں میں محدود کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) معجزات کے ذریعہ سے جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ ان کا ایمان محض جبری، تقلیدی اور بالواسطہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے دل میں انبیاءؑ کے محاسنِ تعلیم کا کوئی خاص ذوق نہیں پاتے۔ صرف معجزات کی قوت اور اعجوبگی ان کو متحیر اور مبہوت کر دیتی ہے۔ حالانکہ انبیاءؑ کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو شریعت کے رمز شناس اور اس کے اسرار و حکم سے ذوق آشنا ہوں۔

یہی حالت ہے جس کو قرآن مجید نے "شرحِ صدر" اور "انشراحِ قلب" سے تعبیر کیا ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ (الانعام : ۱۲۵)

جس کو خدا ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو قبولِ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کے لئے معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لئے آفتاب و ماہتاب، آسمان و زمین، دن اور رات غرض دنیا کا ایک ایک ذرّہ معجزہ ہوتا ہے اور خدا کے وجود، خدا کی وحدانیت اور پیغمبر کی نبوّت پر بلاواسطہ دلالت کرتا ہے۔ ان کے لئے صرف تفکّر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی گروہ ہے جس پر سب سے زیادہ انبیاءؑ کی نگاہِ انتخاب پڑتی ہے اور وہ ان کو صرف تفکّر و اعتبار کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس گروہ کے بالمقابل ایک کور باطن فرقہ اور بھی ہوتا ہے جس پر نظامِ فطرت کے دوسرے شواہد و آیات کی طرح معجزات کا بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا۔ انبیاءؑ کو ابتدائے بعثت میں ان ہی دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ فطرۃً ایک معجزات سے بے نیاز ہوتا ہے اور دوسرے پر معجزات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اس لئے اُن دونوں گروہوں کے لئے معجزات بیکار ہوتے ہیں اور اس بنا پر انبیاءؑ ان کے پیش کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اسی نکتہ کو خداوند تعالیٰ نے ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس : ۱۰۱)

کہہ کہ دیکھو آسمان و زمین میں کس قدر نشانیاں ہیں۔ اور نشانیاں اور ڈراوے تو اُس قوم کے لئے کچھ بھی مفید نہیں جو ایمان نہیں لانا چاہتی۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

اور کفّار کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف

عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ○

(الرعد : ۲۷)

سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اترتا۔ کہہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کو ہدایت کرتا ہے۔

(۲) بعض دفعہ معاندین ایسی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں جن کے بار کے متحمل قوتِ انسانی کے دوش و بازو نہیں ہو سکتے۔ خدا کا خود انسانوں کے سامنے آنا، خدا کا خود ہر انسان سے باتیں کرنا، فرشتوں کا نظر نہ آنا، آسمان سے کوئی مجسم کتاب اتارنا، بازیگر کی طرح پیغمبر کا آسمان پر چڑھنا، کفار کی طرف سے جب اس قسم کے معجزات طلب کئے جاتے ہیں تو انبیاءؑ کو ہمیشہ انکار کرنا پڑتا ہے اور اس انکار کا منشا خود منکرین کی فطرت ہے:

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ

(النسآء : ۱۵۳)

تم سے یہود کہتے ہیں کہ ان کے اوپر آسمان سے ایک کتاب اتار دو لیکن ان لوگوں نے تو موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا (یعنی) اُن لوگوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دو۔ اس ظلم کا جو انہوں نے اپنے اوپر کیا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک چمک نے ان کو دبا دیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

اور جن لوگوں کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کیوں خدا ہم سے باتیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس نہیں لاتا۔ اسی طرح ان سے

مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ	پہلے لوگوں نے بھی کہا، دونوں کے دل ایک سے ہیں۔

(البقرۃ : ۱۱۸)

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ○	کیوں نہیں فرشتوں کو ہمارے پاس لے آتے اگر تم سچے ہو۔ (خدا کہتا ہے) ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے لیکن حق کے ساتھ اگر وہ ان کافروں کے سامنے اتریں تو پھر ان کو مہلت نہ دی جا سکے گی۔

(الحجر : ۷-۸)

(۳) مادیت کی ترقی کے زمانہ میں تمام فضائل و محاسن کا مرکز صرف دولت، جائداد مال و اسباب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اخلاق و عادات، تمدن و معاشرت، رسم و رواج غرض تمام چیزوں میں امرا کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن انبیاءؑ ہمیشہ اپنی معاشرت، اپنی وضع، اپنے لباس غرض اپنی ایک ایک ادا سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ فضائل کا منبع صرف روح ہے اور زخارفِ دنیوی سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

اسی بنا پر جب منکرین انبیاءؑ سے اس قسم کے معجزات طلب کرتے ہیں جو امرا کے ساتھ مخصوص ہیں تو انبیاء کو عموماً ان کا انکار کرنا پڑتا ہے:

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ○ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ	اور ان لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر کیوں کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں اس پر ایک فرشتہ نہیں اترتا جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈرائے یا اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں

اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ	اتارا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ کیوں
وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا	نہیں ہے جس سے وہ کھائے اور ظالموں نے
رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝	کہا تم صرف ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے
(الفرقان : ۷-۸)	ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

(۴) آیت بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کفار کا عام خیال یہ تھا کہ خدا کی طرف سے جو قاصد بن کر آئے اس کو مرتبۂ بشریت سے بالاتر ہونا چاہیئے اور اس کو بے انتہا خدائی قدرتیں حاصل ہونی چاہئیں۔ اس بنا پر جب اس قسم کے معجزے طلب کیے جاتے ہیں جن سے اس ظنّ فاسد کی تائید ہوتی ہے تو انبیاءؑ ان سے انکار کرتے ہیں:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ	کہہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے
اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ	خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا
لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا	ہوں اور نہ میں نے یہ کہا کہ میں فرشتہ
يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ	ہوں۔ میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا
(الانعام: ۵۰)	ہوں۔

(۵) متحدیٰ بہ معجزات یعنی وہ معجزات جو کفار کے مطالبہ پر صادر ہوتے ہیں، اُن کی تاخیر کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ایسے معجزات پر ایمان نہ لانے کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور منکرین کا گروہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی مثالیں قوم نوح، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش تک کی تمام تاریخیں پیش کرتی ہیں اور قرآن مجید نے اس کو بتصریح بیان کر دیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اُمّت نے ان سے نشانی طلب

کی۔ خدا نے کہا نشانی تمہیں دکھائی جائے گی لیکن اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ	اور ہم نے نشانیاں بھیجنا اس لئے موقوف
اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَ	کیا کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اور ہم نے
اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً	ثمود کو اونٹنی کی نشانی دی سمجھانے کو
فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ	اور پھر اُس کا حق نہ مانا۔ اور نشانیاں
اِلَّا تَخْوِيْفًا ○	جو ہم بھیجتے ہیں تو ڈرانے کو۔

(بنی اسرآئیل، ۵۹)

لیکن جس طرح افراد کی موت وحیات کا ایک زمانہ مقرر ہے۔ اسی طرح قوموں کی ہلاکت وبربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ	ہر قوم کا ایک زمانہ مقرر ہے۔

(الاعراف، ۳۴) (یونس: ۴۹)

اس لئے اس قسم کے معجزات کے ظہور میں اس مدتِ معینہ تک کے لئے تاخیر کی جاتی ہے اور پیغمبر اور معاندین دونوں اس کے منتظر رہتے ہیں:

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر خدا کی
مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ	طرف سے کوئی نشان نہیں اترتا؟ کہہ کہ
فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ	غیب صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے تم
الْمُنْتَظِرِيْنَ ○	لوگ اس کے ظہور کا انتظار کرو میں تمہارے
(یونس: ۲۰)	ساتھ منتظر ہوں۔

یہی سبب ہے کہ جن انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا مظہرِ اتم بنایا ان کے ہاتھوں سے تحدّی اور مطالبہ کے معجزوں کے صدور میں تاخیر برتی جاتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انجیل کی آیتیں گزر چکی ہیں کہ یوں تو اُن سے بیسیوں معجزے سرزد ہوتے تھے۔ مگر تحدّی اور مطالبہ کے معجزہ سے انہوں نے بالعموم انکار کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ حواریین نے جب زیادتِ اطمینان اور ترقیِ ایمان کے لئے معجزہ کی فرمائش کی تو خدا نے جواب دیا۔

اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ	میں یہ آسمانی خوان تم پر اتار سکتا ہوں، لیکن
بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا	اس کے بعد اگر تم میں سے کسی نے انکار کیا تو
لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ○	میں اس کو ایسا سخت عذاب دوں گا کہ دنیا
(مائدہ : ۱۱۵)	میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔

غرض کائناتِ روحانی کا یہی اصول پیشِ نظر تھا جس کی وجہ سے آنحضرتؐ کفار کے مطالبہ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ آپؐ جانتے تھے کہ اُن کے مطالبہ اور تحدّی کے مطابق معجزہ آنے کے بعد ان کو پھر فرصت نہ دی جا سکے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے۔

چنانچہ معاندینِ قریش آنحضرتؐ سے یہ معجزہ طلب کرتے تھے کہ فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لے آؤ۔ خدا نے کہا کہ اگر وہ سامنے آئیں بھی تو انسانوں کی صورت میں آئیں گے اور تم کو پھر وہی شبہہ رہ جائے گا۔ علاوہ ازیں قانونِ الٰہی میں یہ آخری حجت ہے۔ اگر فرشتے اُتر آئے اور اس سے بھی تمہاری تسلّی نہ ہوئی تو پھر تم کو اس مطالبہ کے معجزہ کے بعد مہلت نہ مل سکے گی اور تم ہلاک و برباد کر دئے جاؤ گے:

لَوْ مَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ	کیوں تم فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ مَا نُنَزِّلُ	آتے اگر تم سچے ہو۔ خدا کہتا ہے فرشتوں
الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا	کو حق کے ساتھ اتارتے ہیں اگر وہ
اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ○	اتریں تو پھر تم کو اس وقت مہلت
(الحجر : ۷-۸)	نہ دی جا سکے گی۔

(۶) معاندین عموماً پیغمبروں کو جھوٹا جان کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس آخری معجزۂ عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو، وہ آخر کب آئے گا اور وہ جلد کیوں نہیں آتا؛ چونکہ اپنی نافہمی سے ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ معجزانہ عذاب ظاہر نہ ہوگا اس لئے وہ اس کا مطالبہ بار بار کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں پیغمبر کی سبکی ہو اور ہماری طرح اور لوگ بھی اس کو کاذب تسلیم کریں چنانچہ قرآن مجید میں بار بار ہر قرن کے کافروں کے اس مقولہ کو دہرایا گیا ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی امت نے کہا:

وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○	اور ہمارے خیال میں تم جھوٹے ہو۔ اگر
فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ	سچے ہو تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○	گرا دو۔
(الشعراء : ۱۸۶ - ۱۸۷)	

لیکن اس کے لئے خدا کے ہاں ایک قانون مقرر ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ	ہر قوم کا ایک وقت مقرر ہے تو جب اس
فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا	کا مقرر وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی
يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ	وہ دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔ کہدے اے
اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا	پیغمبر بھلا دیکھو تو اگر خدا کا عذاب راتوں

مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ○ رات یا دن کو آپہنچے تو یہ گنہگار جلدی کر کے کیا
أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ط کرلیں گے۔ کیا جب آنے والا واقعہ آجائیگا تب تم
آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ○ ایمان لاؤ گے۔ اب ایمان لاتے ہو! حالانکہ تم
(یونس : ۴۹-۵۱) تو اسی کی جلدی کر رہے تھے۔

عقیدۂ معجزات کی اصلاح قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں۔ وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روحِ نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں۔ اسلام دنیا میں دینِ الٰہی کی تکمیل اور گزشتہ مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لئے آیا تھا۔ ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دئے تھے جن انبیاءؑ اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر ہوئے ان میں الوہیت اور خدائی کا عنصر تسلیم کیا گیا اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصلی حقیقت جس پر دینِ الٰہی کی بنیاد ہے، متزلزل ہو گئی۔ اس لئے قرآن مجید نے نہایت وضاحت، نہایت صفائی اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید اور نبوت کی اصل حقیقت اس استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم کر دی کہ آئندہ فساد اور سوءِ عقیدہ کے سیل و طوفان سے اس کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہا۔

(۱) سب سے پہلے اُس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج امور ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبۂ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں جیسا کہ ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس

کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے :

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ○

(البقرۃ : ۱۱۸ — ۱۱۹)

اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں خدا خود ہم سے کیوں باتیں نہیں کرتا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہو گئے، ہم نے تو نشانیاں اُن لوگوں کے لئے کھول دی ہیں جو یقین کرتے ہیں، اے محمدؐ ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (جن کو اب بھی یہ نشانیاں نہ نظر آئیں) تو ان دوزخیوں کا حال تجھ سے نہ پوچھا جائے گا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ

(العنکبوت : ۵۰ — ۵۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کیطرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتی ہیں، کہدے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان اس کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ○	اتارا جاتا۔ (اے محمدؐ) تو ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کا ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے۔
(الرعد : ۷)	

(۲) قرآن مجید نے نہایت وضاحت اور تکرار کے ساتھ اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے کہ ہمارا پیغمبر بشر اور خالص بشر ہے۔ اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور اس لیئے وہ اپنی طرف سے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا :

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ	میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں (البتہ) مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

(الکہف : ۱۱۰) (حٰمٓ السجدۃ : ۶)

کفارِ قریش کا خیال تھا کہ پیغمبر کے ساتھ فرشتوں کا پرا ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی خود خدا اس کے سامنے آکر نمایاں ہو، اس کے لئے سونے چاندی کا محل ہو، عجیب و غریب اقسام کے باغ اس کے قبضہ میں ہوں، ہمارے سامنے وہ آسمان پر چڑھے اور وہاں سے ہمارے لئے کتاب اتار لائے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ	اور کافروں نے کہا ہم تم پر اسوقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہادو۔ یا تمہارے قبضہ میں کھجور اور انگور کا ایک باغ نہ ہو اور پھر تم اس کے بیچ میں نہریں نہ بہادو یا جیسا کہا کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرادو یا

بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ

(بنی اسرائیل : ۹۰-۹۳)

خدا اور فرشتوں کو ضامن بنا کر لے آؤ یا تمہارے لئے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا یقین اس وقت تک ہم کو نہ آئے گا جب تک وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ سکیں۔

ان سب کے جواب میں قرآن مجید آپؐ کو سکھاتا ہے:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

(بنی اسرائیل : ۹۳)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں کون ہوں مگر ایک آدمی پیغمبر۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ

(الانعام : ۵۰)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں سے کہدو کہ میں یہ تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف الہام کیا جاتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۭ

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدے کہ خود میرا نفع اور نقصان بھی میرے قبضۂ اختیار میں نہیں لیکن جو چاہے خدا! اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھ کو

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝	کوئی گزند نہ پہنچتا۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔
الاعراف : ۱۸۸	

غور کرو کہ زمین سے باغ کا اُگا دینا یا سونے کا محل کھڑا کر دینا یا چشمہ بہا دینا یا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب اتار دینا نہ خدا کی قدرت سے باہر تھا اور نہ اُس رسول کے ان معجزات سے مافوق مطالبہ تھا جس کے ہاتھ سے چشمے بہہ چکے تھے، جس کے اشارے سے درخت چل چکے تھے یا جو معراج میں ساتوں آسمان کی منزلیں طے کر چکا تھا۔ لیکن چونکہ اگر اُن کے مطالبہ پر یہ امور واقع ہو جاتے تو وہ اگر بدعقیدگی کو راہ دیتے تو وہ آپؐ کو جادوگر کہہ دیتے اور اگر خوش عقیدگی کا اظہار کرتے تو آپؐ کو نعوذ باللہ مافوق البشر تسلیم کر لیتے اور یہ دونوں باتیں اصولِ اسلام کے منافی ہوتیں۔ اس لئے سرے سے اُن کے اس جاہلانہ مطالبہ کو رد کر دیا گیا کہ چند لوگوں کے ایمان و عدمِ ایمان کی خاطر نفسِ پیغام و دعوت کے اصول کی بیخ کنی نہیں کی جا سکتی۔

(۳) عام لوگوں میں انبیاءؑ کی نسبت یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالمِ کائنات کے تصرف پر قادر ہیں، چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبضۂ قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دینِ حق کی دیوارِ کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن مجید نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ

حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں :

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ	کہدے (اے پیغمبر!) کہ نشانیاں تو خدا ہی
(الانعام : ۱۰۹)	کے پاس ہیں۔
قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط	کہدے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی
(العنکبوت : ۵۰)	کے پاس ہیں۔
قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً	کہدے اے پیغمبر! کہ خدا کو قدرت ہے کہ وہ نشان اتارے۔
(الانعام : ۳۷)	

سب سے زیادہ صاف اور صریح آیت یہ ہے :

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ	کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لائے۔
(الرعد : ۳۸)	

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات جس عبارت اور لب ولہجہ میں بیان ہوئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کردی گئی تھی۔ اس لئے وہ خاص اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے۔ قرآن مجید اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کو بیان کر دیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس عقیدۂ باطل کو بھی رد کرتا گیا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار سے نہیں۔ چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن کہتا ہے:

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۙ	میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی
اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ	لے کر آیا ہوں کہ میں مٹی سے پرندہ کی
کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ	صورت کا جانور بناتا ہوں اور اس میں پھونک
فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَ	مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ
اُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ	ہو جاتا ہے اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی
الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ	کو اچھا اور مُردہ کو زندہ کرتا ہوں خدا
(آل عمران ۱ ۴۹)	کے حکم سے۔

دوسرے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے احسانات جتاتے ہوئے خدا نے فرمایا:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ	(اور یاد کر) جب تو مٹی سے پرندہ کی طرح صورت
الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْھَا فَتَکُوْنُ	میرے حکم سے بناتا تھا، پھر اس میں پھونک
طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَہَ	مارتا تھا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جاتا
وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ	تھا اور تو اندھے کو اور کوڑھی کو میرے
الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ ۚ	حکم سے اچھا کرتا تھا اور جب مُردے کو
(المائدۃ: ۱۱۰)	میرے حکم سے زندہ کرتا تھا۔

یہ قرآن مجید کے اسی اظہارِ حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہ ہوئیں اور پیغمبر اسلامؐ میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی مسلمانوں

نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور تمام دنیا کے مذاہب میں توحیدِ کامل کی علمبرداری صرف اسلام کے دست و بازو کو سپرد ہوئی۔

مسئلہ اسباب و علل میں افراط و تفریط عقیدۂ معجزات کے اصلاحات ہی کی تحت میں مسئلہ اسباب و علل سے بھی تعرض کرنا ہے جس نے دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں دو فرقے پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک فرقہ وہ ہے جو دنیا میں صرف اسباب و علل کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے اور ان اختیارات کو ناقابلِ نسخ و تغیر مانتا ہے۔ اس کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انہی مادی علل و اسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور اُن میں کسی قسم کا ردّ و بدل اور نسخ و تغیر نہیں ہوتا اور اس لئے وہ خرقِ عادت کو ممتنع اور محال یقین کرتا ہے کیونکہ یہ اسباب و علل اور عالم کا یہ نظام کارِ سنتِ الٰہی ہے اور سنن الٰہی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا جیسا کہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ○	تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے۔
(الاحزاب : ۶۲)	
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ○	تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تغیر نہ پاؤ گے۔
(فاطر : ۴۳)	
لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط	اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں۔
(الروم : ۳۰)	

دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کو نظامِ خاص، قوانینِ فطرت اور اسباب و علل کا پابند ٹھہرانا اس کی شانِ قدرت کے منافی سمجھتا ہے اور وہ ان بیچ کے وسائط کے بغیر اس کو

فرمانروائے مطلق یقین کرتا ہے۔ یہ فریق اپنے دعویٰ پر حسبِ ذیل دلیلیں پیش کرتا ہے:۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝	وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
(البروج : ۱۶)	
كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝	اسی طرح خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا
(آل عمران : ۴۰)	ہے۔
وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝	اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا
(ابراھیم : ۲۷)	ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝	بے شک خدا جو چاہتا ہے کرتا
(الحج : ۱۸)	ہے۔
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝	لیکن خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
(البقرۃ : ۲۵۳)	
اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝	بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم
(المائدہ : ۱)	دیتا ہے
اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝	بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا
(الحج : ۱۴)	ہے۔

ان آیات کے علاوہ حسبِ ذیل آیت قرآن مجید میں کم و بیش تغیر کے ساتھ مقامات پر مذکور ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝	خدا ہر چیز پر قادر ہے

ن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے کی علت صرف خدا کی قدرت، مشیت اور ارادہ ہے اور اس لئے ہر قسم کے خرقِ عادت ممکن ہیں

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق افراط و تفریط کے دو کناروں پر ہیں اور انہوں نے قرآن مجید کی تمام آیتوں پر غور و تدبر کی نظر نہیں ڈالی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اشیاء کے خواص و طبائع اور عقلی مصالح و حکم کا انکار کیا ہے۔

قرآن مجید اسباب و مصالح کا قائل ہے

حالانکہ ان آیاتِ بالا کی بنا پر یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن اسباب و علل اور مصالح و حکم کا منکر ہے کتابِ الٰہی سے اپنی جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ اور اس کے حکیم ہونے کی نفی کرنا ہے۔ قرآن مجید نے جا بجا مخلوقاتِ الٰہی میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے۔ اگر یہ صحیفۂ قدرت اسباب و مصالح سے خالی ہوتا تو یہ دعوت بے سود تھی۔ قرآن ان عجائبِ قدرت کو آیات اللہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے اسرار و حکم پر غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے اور اسی دلیل سے وہ خدا کی قادر و حکیم ہستی کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔ اگر یہ چیزیں اسباب و مصالح سے خالی ہوتیں تو ان میں غور و فکر کرنا بے کار ہوتا۔ قرآن نے آسمان و زمین، چاند سورج، ہوا بادل، پھول پھل، جسم و جان ان میں سے ہر شے کو اللہ کی وسیع قدرت اور دقیق مصلحت کا اعلانِ عام قرار دیا ہے اور انسان کو بار بار ادھر متوجہ کیا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ	دن کے بدلنے میں عقل والوں کے
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۙ الَّذِیْنَ	لئے نشانیاں ہیں وہ جو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ

(آل عمران: ۱۹۰ — ۱۹۱)

اور لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا۔

خدا نے ان لوگوں کو جو اشیا کی پیدائش کو خالی از مصلحت جانتے ہیں، زجر فرمایا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○

(المؤمنون: ۱۱۵)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○

(الدخان: ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو اُن کے درمیان ہے ان کو محض کھیل کے لئے نہیں بنایا۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ

اور اسی خدا نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس سے ہر شے کی روئیدگی پیدا کی پھر ہم نے اس سے ہری کھیتی نکالی اور اس سے تو بر تو دانے پیدا کئے۔ اور چھوہاروں کے درخت سے اس کے پھولوں سے لٹکے ہوئے

دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ
الزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى
ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ

(الانعام : ۹۹)

خوشے اور انگور اور زیتون اور سیب کے باغ
جن کے میوے ایک ہی قسم کے اور مختلف
اقسام کے بھی پیدا کئے۔ جب وہ پھلتا
ہے تو اُس کے پھل اور اس کے پکنے
کو دیکھو۔

اگر ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ مصالح و احکام کے آثار پوشیدہ نہ رکھتا تو اُن میں نظر و فکر کی دعوت کیوں دیتا۔ متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مخلوقِ الٰہی کے "منافع" کی خاص تصریح فرمائی ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا
دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝
وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ
وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ
اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا
بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ
رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّ
الْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ
لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ
السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَاۗىِٕرٌ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ

اور خدا نے جانوروں کو پیدا کیا۔ ان کی اون میں
خوشگوار گرمی اور بہت سے فائدے ہیں۔ ان میں
سے بعض جانور تمہاری خوراک ہیں۔ اور تم کو ان
سے رونق ہے جب شام کو ان کو پھیر لاتے
ہو اور جب چراتے ہو۔ اور وہ تمہارے مال و
اسباب کو اس شہر تک اٹھائے چلتے ہیں
جہاں تم بغیر سخت تکلیف کے نہیں لے جا سکتے
تھے۔ بیشک تمہارا رب شفقت والا مہربان ہے۔
اور گھوڑے خچر اور گدھے بنائے کہ تم ان پر سوار
ہو اور رونق ہو اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔
خدا ہی پر ہے سیدھی راہ اور اس سے ہٹنے والے بھی

لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْٓ
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ
مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ
تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ
الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ
وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ
مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا
ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا
اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ
سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً
تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ
فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

ہیں اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو مقصود تک پہنچا
دیتا۔ اُسی نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اُتارا
کچھ اس میں سے پینے کے کام آتا ہے اور کچھ
سے درخت اُگتے ہیں جس میں تم اپنے جانور
چراتے ہو۔ اس پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی
اگاتا ہے اور زیتون چھوہارے، انگور اور ہر قسم
کے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں غور و فکر کرنے
والوں کے لئے بڑی نشانی ہے اور اسی خدا
نے رات اور دن اور سورج اور چاند تمہارے
کام میں لگائے اور تارے اس کے حکم سے
کام میں لگے ہیں۔ اس میں عقل والوں کے
لئے نشانیاں ہیں۔ اور جو بکھیرتا ہے تمہارے
لئے زمین میں کئی رنگ کے غلے اور دانے۔
اس میں ان کے لئے جو سوچتے ہیں نشانی ہے
اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا
ہے کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس
سے موتی اور مونگے نکالو جس کو زینت کا سامان
بنا کر پہنتے ہو اور تم دیکھو کہ کشتیاں اس دریا کو
پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں اور اس واسطے کہ تم

النحل : ۵ — ۱۴ کرو اس کی روزی کو اور شاید احسان مانو۔

غور کرو، اگر ان چیزوں میں مصالح و حکم نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ہم انسانوں کو ان چیزوں کی پیدائش پر شکر کا حکم کیوں دیتا۔

بعض اشیا کے مصالح اور اسباب کو خود قرآن مجید نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہاڑوں کی مصلحت یہ ظاہر کی ہے:

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (النحل : ۱۵) اور اس نے زمین میں بڑے بڑے پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے ہیں کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔

ستاروں کی پیدائش کی غرض بتائی۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ (النحل : ۱۶) اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں

رات کی پیدائش کی مصلحت یہ بتائی

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ (یونس : ۶۷) اور اسی نے رات بنائی کہ تم سکون حاصل کرو

چاند کے گھٹنے بڑھنے کی غایت یہ ظاہر کی:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ (البقرۃ : ۱۸۹) لوگ تجھ سے چاند کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ کہدے کہ وہ لوگوں کے لئے وقت اور زمانہ کا معیار ہیں۔

سایہ، آفتاب، رات، دن، ہوا اور پانی کے مصالح یہ تعلیم کئے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ	کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے سایہ کو
وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ	کس طرح پھیلا رکھا ہے اور اگر وہ چاہتا تو ایک
جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝	ہی جگہ ٹھہرا رہتا، پھر سورج کو سایہ کا رہنما بنایا
ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝	پھر اس سایہ کو ہم اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ
وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا	لیتے ہیں۔ اسی خدا نے رات کو تمہارا اوڑھنا اور
وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ	نیند کو آرام اور دن تمہاری جد وجہد کے لئے
نُشُوْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ	بنایا، اسی خدا نے اپنے ابر رحمت کے آگے
الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ ۚ	آگے ہواؤں کو خوشخبری سنانے والا بنایا، اور
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۝	ہم نے آسمان سے ستھرا اور نکھرا پانی اتارا کہ
لِّنُحْيِىَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ	اس سے مُردہ زمین کو زندہ کر دیں اور
مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا ۝	چوپایوں اور بہت سے انسانوں کو اس
(الفرقان : ۴۵ — ۴۹)	سے سیراب کریں۔

قرآن مجید نے اشیا کے اسباب وعلل ہونے کا بھی صاف اقرار کیا ہے مثلاً بارش کو کھیتی اور پھل پھول کے پیدا ہونے کا سبب بتایا ہے:

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ	اور آسمان سے پانی برسایا اور اس
بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ	پانی سے تمہاری روزی کے لئے پھل
(البقرۃ : ۲۲)	نکالے۔

تمام ذی روح چیزیں پانی سے زندہ ہیں

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ	اور خدا نے ہر چلنے والے کو پانی سے

(النور : ۴۵)

پیدا کیا۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط

(الانبیآء : ۳۰)

اور ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔

ہر قسم کی نباتات پانی سے اُگتی ہیں :

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ج فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ

(الانعام : ۹۹)

اسی نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی روئیدگی ظاہر کی۔

بادِ صرصر اور آندھی ہلاکت اور بربادی کا ذریعہ ہے :

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ

(حٰمٓ السجدۃ : ۱۶)

ہم نے عاد کی قوم پر بادِ صرصر بھیجی منحوس دنوں میں تاکہ ہم ان کو رسوائی کا عذاب چکھائیں۔

رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا

(الاحقاف : ۲۴-۲۵)

ایسی آندھی جس میں دردناک عذاب تھا جو خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے۔

اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝

(الذّٰریٰت : ۴۱-۴۲)

یاد کرو جب ہم نے فائدہ نہ پہنچانے والی آندھی ان پر بھیجی جو جس شے پر گزرتی تھی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی۔

آگ جلاتی ہے :

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ — آگ ان کے چہروں کو جھلسا دیتی ہے

(المؤمنون : ۱۰۴)

آگ لکڑی سے پیدا ہوتی ہے :

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا — جس نے ہرے درختوں سے آگ کو پیدا کیا

(یٰسٓ : ۸۰)

قرآن مجید اشیا کے طبعی خواص کا بھی منکر نہیں۔ شراب میں خواص ہیں :

قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا — کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے اور ان میں لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔

(البقرۃ : ۲۱۹)

اُون میں گرمی کی خاصیت ہے :

فِیْهَا دِفْءٌ — جانوروں کے اون میں خوش گوار گرمی ہے۔

(النحل : ۵)

پانی میں پیاس بجھانے اور درخت اُگانے کی خاصیت ہے :

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ — وہی خدا آسمان سے پانی برساتا ہے۔ اس سے پینا ہے اور اس سے درخت ہیں۔

(النحل : ۱۰)

شہد میں صحت بخشنے اور بیماری دور کرنے کی خاصیت ہے :

يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ	شہد کی مکھیوں کے پیٹ میں سے پینے
مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ	کی چیز نکلتی ہے جس کے کئی رنگ ہوتے
لِّلنَّاسِ ط	ہیں۔ اس میں لوگوں کے لئے شفا
النحل : ۶۹	ہے۔

لیکن علتِ حقیقی قدرت و مشیئت ہے غرض ان آیاتِ کریمہ سے یہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید اسباب و علل، مصالح و حکم اور طبائع و خواص کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اس جماعت کا ساتھ نہیں دیتا جو ان چیزوں کا انکار کرتی ہے اور یہ جانتی ہے کہ ان چیزوں کے تسلیم کرنے سے قدرت و مشیّتِ الٰہی کے عقیدہ کا ابطال لازم آتا ہے۔ حالانکہ یہ تو اس وقت لازم آتا ہے جب ان اسباب و علل اور طبائع و خواص کو خدا سے مستقل اور مستغنی تسلیم کیا جائے اور قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اشیا اسباب و علل سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں طبائع و خواص ہیں۔ لیکن یہ اسباب و علل اور طبائع و خواص خود خلّاق عالم کے پیدا کردہ اور مقرّر کردہ ہیں اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند رہتا ہے۔ لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبوراً اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیّر نہ کرسکتا ہو اور کبھی اپنے خاص حکم و ارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کرسکتا ہو۔ کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے اور خدا کی قدرت و عظمت میں فرق آجاتا ہے۔ اسی لئے ہر موقع پر قرآنِ مجید نے اپنی تعلیم میں اس نقطہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب و علل کے ساتھ ساتھ خدا کی مشیّت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے تاکہ انسانوں میں خدا کی معذوری، مجبوری اور عدمِ قدرت کا تصوّر نہ پیدا ہو اور نہ اس کی مشیّت و ارادہ

پر خود اس کی مشیئت و ارادہ کے سوا خارجی پابندیاں عائد ہوں۔ چنانچہ وہ تمام آیتیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیئت و ارادہ کے متعلق اور پر دوسرے فریق کی طرف سے پیش کی گئی ہیں وہ اسی موقع کی ہیں اور جن سے یہی تعلیم مقصود ہے۔

ہم نے اوپر اسباب و علل اور طبائع و خواص کے ثبوت میں جس قدر آیتیں لکھی ہیں غور کرو۔ ان سب میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ان مسبّبات کے اسباب و علل اور اشیا کے طبائع و خواص خود اس نے اپنی مشیّت و ارادہ اور اپنے حکم و امر سے بنائے ہیں اور ہر جگہ اس کی توضیح کر دی ہے تاکہ ظاہر بیں انسان ان ظاہری علل، اسباب اور طبائع و خواص کو دیکھ کر اشیا کی علتِ حقیقی کا انکار کر کے مبتلائے الحاد یا اسباب و خواص کو مستقلاً شریکِ تاثیر مان کر گرفتارِ شرک نہ ہو جائے۔ یہ انبیاءؑ کی تعلیم کا خاص طریقہ ہے اور قرآن نے اس نکتہ کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ انبیائے کرامؑ اور بزرگانِ خاص کو بھی عادتِ جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے خلاف باور کرنے میں جب استعجاب اور استبعاد ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ کیا ہے اور ان کے اس استعجاب اور استبعاد کو اپنی قدرت اور مشیئت کو یاد دلا کر رفع کیا ہے۔ حضرت سارہؓ کو پیرانہ سالی میں جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو راۃ اور قرآن دونوں میں ہے کہ ان کو اس کا سخت تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا:

يَا وَيْلَتَىٰٓ ءَأَلِدُ وَأَنَا۠ عَجُوزٌ وَهَٰذَا	اے خرابی! کیا میں جنوں گی اور میں
بَعْلِى شَيْخًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَىْءٌ	بڑھیا ہوں اور میرا یہ خاوند بوڑھا ہے
عَجِيبٌ ○ ھود ۷۲	یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

فرشتوں نے جواب میں کہا:

أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ (اے سارہ) کیا تم خدا کے کام سے تعجب کرتی ہو؟ (ھود : ۷۳)

اس قدر تنبیہ ان کے ایمان کی تازگی کے لئے کافی تھی۔

حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنی اور اپنی بیوی کی حالت کا قطعی علم تھا لیکن وہ اپنی بیوی کی ظاہری عدم استعداد اور اسباب و علل کے نہ موجود ہونے کی صورت میں بھی خدا کی قدرت اور مشیت کے مؤثرِ حقیقی ہونے پر یقینِ کامل رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی حالت میں انہوں نے ایک وارث کی دعا مانگی مگر جب ان کو اجابتِ دعا کی بشارت دی گئی تو تقاضائے بشریت سے کہ انسان ظاہری اسباب و علل کے دیکھنے کا عادی ہے، اس کمالِ ایمان کے باوجود ان کو یہ واقعہ مستبعد معلوم ہوا اور انہوں نے عرض کی:

رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ○ (مریم : ۸) اے میرے رب! کہاں سے میرے لڑکا ہوگا، میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو گیا ہوں، یہاں تک کہ بڑھاپے سے اکڑ گیا ہوں۔

خدا نے اس کے جواب میں صرف اسی قدر فرمایا:

قَالَ كَذَٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ○ کہا یوں ہی ہے تیرے رب نے کہا یہ مجھ پر آسان ہے (زکریا!) تجھ کو یاد نہیں، کہ میں نے تجھ کو پیدا کیا اور تو

(مریم : ۹) کچھ نہ تھا۔

حضرت مریم علیہا السلام کو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے بھی ظاہری علل واسباب کے خلاف ہونے پر حیرت ظاہر کی :

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ○

(مریم : ۲۰)

مریمؑ نے کہا، میرے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھ کو کسی آدمی نے چھوا بھی نہیں اور نہ میں کبھی بدکار تھی۔

فرشتہ نے جواب میں کہا :

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

(مریم : ۲۱)

بولا یوں ہی ہے، تیرے رب نے کہا وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو لوگوں کے لئے نشانی بنانا چاہتے ہیں اور اپنی طرف سے رحمت۔

قرآن میں سنّت اللہ کا مفہوم دو فریق جو خرقِ عادت اور خلافِ اسباب وعلل کے محال ہونے پر قرآن مجید کی ان آیتوں سے استدلال کرتا ہے جن میں "سنّت الٰہی" کے عدم تبدیل کا ذکر ہے۔ درحقیقت دانستہ یا نادانستہ مفہومِ قرآن کی تحریف کا مجرم ہے۔ قرآن مجید میں "سنّت الٰہی" کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاحِ خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ خیر وشر، حق وباطل، نور وظلمت اور ظلم وانصاف جب باہم ٹکرائے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند وموعظت اُن کے لئے مؤثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اُن قوموں پر اپنا عذاب

نازل کرتا ہے اور وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی کرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گھڑگھڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ سنتِ الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے اسی مفہوم میں آیا ہے۔ چنانچہ وہ تمام آیتیں ذیل میں لکھ دی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو شک و شبہ باقی نہ رہے۔

قریش داعیِ حق کو شہر مکہ سے نکالنے کی تیاری کرتے ہیں اور اس دعوت کو قبول کرنے سے علانیہ انکار کر دیتے ہیں۔ تو خدا فرماتا ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اور وہ (کفارِ قریش) تو تجھ کو اس شہر سے
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا	لگے تھے گھبرانے تاکہ وہ تجھ کو یہاں سے
لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○	نکال دیں۔ لیکن اگر ایسا ہو تو وہ تیرے
سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ	بعد کم ٹھہریں گے۔ یہ دستور پڑا ہوا
مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا	ہے اُن رسولوں کا جن کو ہم نے تجھ
تَحْوِيْلًا ○	سے پہلے بھیجا اور تو اللہ کے دستور کو
(بنی اسرآئیل: ۷۶-۷۷)	ٹلتے نہ پائے گا۔

مدینہ کے منافقین اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔ خدا فرماتا ہے:

اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا	وہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور
تَقْتِيْلًا ○ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ	مارے گئے۔ دستور پڑا ہوا ہے
خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ	اللہ کا ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے

اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ (الاحزاب : ۶۱-۶۲)

اور تو اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پائے گا۔

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے سورۂ فاطر کی حسب ذیل آیت سے بڑھ کر اور کون آیت ہو سکتی ہے؟

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ○ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (الفاطر : ۴۳-۴۴)

اور بدی کا داؤ پیچ خود داؤ پیچ کرنے والوں پر الٹ جاتا ہے تو کیا اب یہ کافر پہلی قوموں کے دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں۔ تو تم اللہ کے دستور کو ہرگز نہ بدلتے پاؤ گے اور نہ کبھی اللہ کے دستور کو ٹلتے پاؤ گے۔ کیا وہ زمین میں پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلی قوموں کا کیا انجام ہوا۔

حدیبیہ کے موقع پر کفارِ قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو تسکین دی جاتی ہے:

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ (الفتح : ۲۲-۲۳)

اور اگر یہ کافر سے لڑتے تو پیٹھ پھیر دیتے پھر وہ کوئی حامی نہ پاتے اور نہ مددگار۔ اللہ کا دستور پہلے سے چلا آتا ہے اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے۔

اب ان آیتوں کے پڑھ لینے کے بعد بھی سنۃ اللہ کے مفہوم کے سمجھنے میں کس کو غلطی ہو سکتی ہے؟

قرآن میں فطرۃ اللہ کا مفہوم قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے جس کو یہ فریق اپنے ثبوت میں پیش کرتا رہتا ہے:

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ (الروم، ۳۰)

خدا کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا۔ خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں۔

اس موقع پر اس آیت کو پیش کرنا قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں فطرۃ اللہ سے مقصود توحید ہے جس کو وہ دین فطری سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ اوپر کی پوری آیت اگر پیش نظر ہو تو یہ مفہوم خود بخود آئینہ ہو جاتا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الروم: ۳۰)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ۔ وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ خدا کے بنانے میں بدلنا نہیں یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

قرآن مجید کی اس اصطلاح کی تفسیر ایک صحیح حدیث سے پوری طرح ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ	کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہیں
فأبواہ یھودانہ او ینصرانہ او	ہوتا لیکن ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی
یمجسانہ کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ	اور مجوسی بنا دیتے ہیں جس طرح ہر جانور صحیح و
جمعاء ھل تحسون فیھا من	سالم بچہ پیدا کرتا ہے، کیا تم نے دیکھا کہ
جدعاء ثم یقول فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ	کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے اس کے
فَطَرَ النَّاسَ الخ	بعد آپ نے یہ آیت پڑھی خدا کی فطرت جس
(صحیح بخاری تفسیر سورہ روم)	پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا (آخر آیت تک)

معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے

الغرض اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نہ تو اسبابِ عادیہ کا منکر ہے اور نہ عالم کے نظامِ کار کو علل و مصالح سے خالی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ ان تمام اسباب و علل سے مافوق ایک اور قادر اور ذی ارادہ ہستی کو فرمانروائے کُل یقین کرتا ہے جس کی مشیّت اور ارادہ کی قوّت سے کائنات کی یہ مشین چل رہی ہے۔ معجزہ کا سبب اور علّت براہِ راست اس کی مشیّت اور ارادہ ہے۔ کبھی یہ مشیّت اور ارادہ عاداتِ جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً قوم نوح کے لئے طوفان آنا، قوم ہود کے لئے آتش فشاں کا پھوٹنا یا زلزلہ آنا، حضرت ایوب علیہ السلام کا چشمہ کے پانی سے صحیح و تندرست ہوجانا، قوم صالح کے لیے آندھی آنا، مکہ میں قحطِ عظیم کا رونما ہونا، غزوۂ خندق میں آندھی چلنا، یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عاداتِ جاریہ کے خلاف نہیں۔ لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکوکاروں کی نجات اور گنہگاروں کی ہلاکت ہوئی محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ ارادہ

وشیتِ الٰہی نے خاص ان قوموں کے لئے بطور نشانی کے ان کو پیدا کیا۔ اور کبھی یہ مشیّتِ الٰہی عاداتِ جاریہ اور اسبابِ ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا جاری ہونا، مردہ کا جی اٹھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، پتھر سے چشمہ کا اُبلنا، درختوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا، بے جان چیزوں میں آواز پیدا ہونا کہ ان چیزوں کی تشریح موجودہ علمِ اسباب وعلل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کو عاداتِ جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اُن کی علّت خدا کی مشیّت اور ارادہ کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اسی لئے انبیاءؑ نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ اُن سے ظاہر ہوتا ہے وہ صرف خدا کی قدرت، مشیّت اور اِذن سے ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ظاہری علل واسباب کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیوں کر بن سکتے ہیں۔ کفّار ان کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے اس لئے خدائی نشان ہونے کا ثبوت کیونکر بہم پہنچ سکتا ہے۔

معجزہ کی باعتبار خرقِ عادت کے چار قسمیں

اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ معجزات اور نشانیاں کسی نہ کسی حیثیت سے خارقِ عادت ہوں چنانچہ

(۱) کبھی نفسِ واقعہ خارقِ عادت ہوتا ہے مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے چشمہ کا اُبلنا، مردہ کا زندہ کرنا وغیرہ۔

(۲) کبھی یہ ہوتا ہے کہ نفسِ واقعہ خلافِ عادت نہیں ہوتا مگر اس کا اس وقتِ خاص پر رونما ہونا خرقِ عادت بن جاتا ہے مثلاً طوفان آنا، زلزلہ آنا، کفّار کا باوجود کثرتِ تعداد کے بے یار و مددگار اہلِ حق سے خوف کھانا وغیرہ۔ تمام

تائیداتِ الٰہی اس قسم میں داخل ہیں۔

(۳) ایک صورت یہ ہے کہ نفسِ واقعہ اور اس کے ظہور کا وقت خاص تو عادات جاریہ کے خلاف نہیں ہوتا مگر اس کا طریقۂ ظہور خلافِ عادت ہوتا ہے مثلاً انبیاءؑ کی دعاؤں سے پانی کا برسنا، بیمار کا اچھا ہونا، آفتوں کا ٹل جانا کہ نہ تو پانی کا برسنا یا بیمار کا اچھا ہو جانا، یا کسی آئی ہوئی آفت کا ٹل جانا خلافِ عادت ہے اور نہ اس کے ظہور کا کوئی خاص وقت ہے۔ لیکن جس طریقہ سے اور جن اسباب و علل سے یہ معجزات ظاہر ہوئے اور خارقِ عادت ہیں۔ استجابتِ دعا اسی قسم میں داخل ہے۔

(۴) کبھی نہ تو واقعہ خارقِ عادت ہوتا ہے اور نہ اس کا طریقۂ ظہور خارقِ عادت ہوتا ہے بلکہ اس کا قبل از وقت علم خارقِ عادت ہوتا ہے۔ مثلاً انبیاءؑ کی پیشین گوئیاں۔ ایک دفعہ زور سے آندھی چلی۔ آنحضرتؐ مدینہ سے باہر تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ آندھی ایک منافق کی موت کے لئے چلی ہے۔ چنانچہ جب لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدینہ میں ایک منافق اس آندھی سے مر گیا۔ اس معجزہ میں نہ تو آندھی کا چلنا خرقِ عادت ہے نہ آدمی کا آندھی کے صدمہ سے مرجانا خلافِ اسباب ہے بلکہ واقعہ کا قبل از وقت علم خرقِ عادت ہے۔

اہلِ ایمان پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

انبیاءؑ کی زندگی علم و عمل دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور اُن کے تمام ارشادات و تعلیمات سے صرف ان ہی دونوں کی ترقی اور تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے انبیاءؑ کے بعض معجزات کا اثر صرف علم و یقین پر پڑتا ہے۔ ان سے کوئی عملی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ ہاتھ کا چمک اٹھنا، عصا کا سانپ بن جانا، چاند کا شق ہو جانا اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں، لیکن اس

کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے نے انکار کیا۔ لیکن انبیاءؑ کے بہت سے معجزات ایسے ہوتے ہیں جن سے نہایت عظیم الشان علمی نتائج ظاہر ہوتے ہیں مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنو اسرائیل کو کوئی علمی فائدہ نہ پہنچ سکا لیکن اس کے ذریعہ سے پانی کا جو چشمہ اُبلا وہ ان کے لئے حیات بخش ثابت ہوا۔ پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان سے علم و یقین کو ترقی ہوتی ہے اور دوسری قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصر الٰہی کہا ہے پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں لیکن تائید اور نصرِ الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔

آغازِ نبوت میں چونکہ انبیاءؑ صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں اور کفار کی طرف سے ان ہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے اور ان ہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے اس لئے اوّل اوّل انبیاءؑ سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے جن کا اثر صرف علم و یقین پر پڑ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی قسم کے دو معجزے دے کر فرعون کے پاس بھیجا اور اسی بنا پر آنحضرتؐ نے کفارِ قریش کو معجزۂ شق القمر دکھایا۔ لیکن اس کے بعد انبیاءؑ کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے۔ یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن، خلوصِ نیت اور شدتِ ایمان کی بنا پر کسی معجزہ کا خواستگار نہیں ہوتا تاہم تائیدِ الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے اور ہر موقع پر اس کی حفاظت و حمایت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تائیداتِ الٰہیہ کا ظہور اکثر بغیر طلب و سوال کے ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے آنحضرتؐ سے کسی معجزہ کا سوال نہیں کیا لیکن آپؐ کے اکثر معجزات کا ظہور ان ہی کے درمیان ہوا۔ بالخصوص غزوات میں اکثر تائیدِ الٰہی نے مسلمانوں کی مدد کی ہے۔ غزوۂ

بدر و حنین میں فرشتوں کا آسمان سے نازل ہونا، تھوڑے سے زادِ راہ کا تمام فوج کے لئے کافی ہونا، آپؐ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، یہ اور اس قسم کے بہت سے معجزات غزوات ہی کے زمانہ میں آپؐ سے ظہور پذیر ہوئے اور ان سے تمام مسلمانوں نے ایسی حالت میں فائدہ اٹھایا جب کہ تمام دنیوی اسباب و وسائل منقطع ہو چکے تھے۔

اسی کا نام قرآن مجید کی زبان میں نصر (مدد) اور تائید ہے اور یہ ہر نبی کو آخر وقت میں عطا کی جاتی ہے اور عین اس وقت جب بظاہر اسباب مایوسیوں کے تمام مناظر پیش ہوتے ہیں اور تائیدِ حق کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا دفعۃً نصرتِ الٰہی توقع کے خلاف، گرد و پیش کے واقعات کے خلاف، بجلی کی طرح نا امیدیوں کے بادل سے چمک اٹھتی ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم کو خیال ہے کہ تم جنت میں چلے
وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا	جاؤ گے اور ابھی تم پر وہ حالت گزری
مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ	نہیں جو تم سے پہلوں پر گزری۔ ان
وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ	پر مصیبت اور تکلیف آئی اور اس قدر
الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ	جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے
مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ	ساتھ مسلمان (گھبرا کر) کہہ اٹھے کہ
اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝	خدا کی نصرت کہاں ہے ہاں خدا کی
البقرۃ : ۲۱۴	نصرت نزدیک ہے۔
حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ	یہانتک کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور
ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ	خیال کرنے لگے کہ اُن سے نصرت کا وعدہ جھوٹا

نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ (یوسف : ۱۱۰)

نہیں کیا گیا کہ ہماری نصرت آگئی۔ پھر ہم نے جن کو چاہا وہ بچا دیے گئے، اور پھیری نہیں جاتی ہماری آفت گنہگار قوم سے۔

خدا کا یہ قطعی وعدہ ہے کہ وہ حق پرستوں کو ہمیشہ آخر کار نصرت عطا کرے گا۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الروم : ۴۷) اور ایمان داروں کی مدد ہم پر فرض ہے

یہ نصرت مسلمانوں کو ہر قدم پر تسلی کا پیغام سناتی تھی۔ بدر ہو کہ اُحد، خندق ہو کہ حُنین ہر جگہ وہی ان کی دستگیر تھی:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ (التوبہ : ۲۵) خدا نے بہت سے موقعوں پر تمہاری نصرت کی

لیکن سب سے بڑی نصرت بدر کی تھی جب تین سو بے برگ و ساز نہتوں نے قریش کی ایک ہزار مسلح فوج کو کامل شکست دیدی:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ (آل عمران : ۱۲۳) اور خدا نے یقیناً بدر میں تمہاری مدد کی جب تمہارے پاس کوئی قوت نہ تھی۔

لیکن عام معجزات اور نصرتِ الٰہی میں یہ فرق ہے کہ جو معجزات بطور حجت اور برہان کے پیش کئے جاتے ہیں، وہ صرف انبیاءؑ کی روحانی طاقت کا فیض ہوتے ہیں یعنی ان کا یہ فیض سبب ہوتا ہے ارادۂ الٰہی کے ظہور کا۔ لیکن نُصرتِ الٰہی میں پیغمبر کی روحانی طاقت کے ساتھ مومنین کے کمالِ ایمان، شدتِ یقین، تزکیۂ نفس اور استعدادِ قلب کی شرکت بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت نے جب سخت فاقہ کی حالت میں نزولِ مائدہ (خوانِ آسمانی) کی درخواست کی تو انہوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی:

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	یاد کرو جب حواریوں نے کہا اے مریمؑ
هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا	کے بیٹے عیسیٰؑ کیا آپ کا پروردگار ہم پر
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا	آسمان سے ایک خوان اتار سکتا ہے۔
اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○	عیسیٰؑ نے کہا خدا سے تقویٰ کرو اگر
۱ المائدۃ : ۱۱۲	تم کو یقین ہے۔

میدانِ جنگ میں آنحضرتؐ صحابہؓ کو نزولِ ملائکہ کی بشارت سناتے ہیں تو ساتھ ساتھ صبر اور تقویٰ کی بھی تعلیم دیتے ہیں:

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ	یاد کرو اے پیغمبرؐ! جب تو مسلمانوں سے کہہ رہا
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ	تھا کہ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○ بَلٰٓى اِنْ	تین ہزار فرشتے اتار کر تم کو مدد دے
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ	(خدا کہتا ہے) ہاں! اگر تم مستقل رہو
فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ	اور تقویٰ کرو اور وہ فوراً آجائیں تو
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ	خدا پانچ ہزار سوار فرشتوں کے
مُسَوِّمِيْنَ ○	ذریعہ سے تمہاری مدد کرے گا۔
۱ آل عمران : ۱۲۴ - ۱۲۵	

یہی وہ معجزات تھے جن کی نسبت صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ان کو برکت سمجھا کرتے تھے۔

کفار کے لئے نتائج کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

جس طرح مومنین پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح کفار پر نتائج کی حیثیت

سے بھی ان کی دو قسمیں ہیں۔ آیتِ ہدایت اور آیتِ ہلاک۔ انبیاءؑ کفار کو پہلے ہدایت کی نشانیاں دکھاتے ہیں اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب مادۂ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہ جاتا یعنی اس کثیف مادہ سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیف الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیتِ ہلاک آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب، لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے اور سطحِ خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عنایت ہوئے تھے مگر وہ اس لئے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے۔ جب ایک مدت کے بعد اہلِ مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شقِ بحر کی آیتِ ہلاک عنایت ہوئی اور رودِ احمر کی لہریں فرعون کو اس کے سارے ساز و سامان اور امرائے دربار کے ساتھ ہمیشہ کے لئے نگل گئیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو آیتِ طوفان، حضرت صالح علیہ السلام کو آیتِ ناقہ، حضرت لوط علیہ السلام کو بربادی سدوم کی نشانی، حضرت شعیب علیہ السلام کو آیتِ صاعقۂ بحر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آیتِ رفع اور آنحضرتؐ کو معجزۂ بَطْشَةُ الْكُبْرٰى (بدر) جو دیا گیا تھا وہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا۔ ان میں سے ہر معجزہ اور نشانی کے ظہور کے بعد یا خود اسی معجزہ اور نشانی کے ذریعہ سے معاندین کی ہلاکت، استیصال اور بربادی ہوئی اور اسی کو قرآن مجید نے سُنَّةُ اللّٰه (خدا کا دستور) اور سُنَّةُ الْاَوَّلِيْن (پہلوں کا دستور) کہا ہے کہ ہر پیغمبر کی قوم میں یہ اسی طرح ہوتا چلا

آیا ہے :

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ	اور بدی کا داؤ پیچ کرنے والوں پر الٹ
فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۖ	جاتا ہے۔ تو کیا اب یہ کافر اگلی قوموں کے
۔ فاطر : ۴۳۔	دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں
أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۝	یہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے
سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ	گئے۔ یہ اللہ کا دستور پڑا ہوا ہے
۔ الاحزاب : ۶۱ — ۶۲	اگلی قوموں میں۔

اس معجزۂ عذاب کے ظاہر ہونے میں عموماً ایک وقت معین تک تاخیر کی جاتی ہے جس کے اسباب حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) یہ معجزۂ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیاتِ ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین اور کافرین ایک دوسرے سے چھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک طویل زمانہ تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد نا امید ہو کر انہوں نے آخری معجزہ کی دعا مانگی :

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ	اے میرے پروردگار زمین پر کافروں
الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ	میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر
يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا	تو ان کو چھوڑے گا تو وہ تیرے بندوں
فَاجِرًا كَفَّارًا ۝	کو گمراہ کریں گے اور وہ نہ جنیں گے

(نوح : ۲۶-۲۷) لیکن فاجر اور کافر کو۔

اس کے بعد طوفان آیا اور قوم نوحؑ کو بہالے گیا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون سے پوری مایوسی ہو گئی تو انہوں نے دعا کی:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○

(یونس، ۸۸)

اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور دولت عطا کی ہے۔ اے ہمارے رب (وہ اس سے یہ کام لیتے ہیں کہ وہ) لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں، خداوندا اُن کی دولت کو مٹیٹ دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے، جب تک وہ تیرے دردناک عذاب کو نہ دیکھیں گے ایمان نہ لائیں گے۔

اس موقع پر اسی قسم کی دعائیں دیگر انبیاءؑ نے بھی کی ہیں۔

(۲) اس منزل پر پہنچ کر پیغمبر کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ۔ (میں خدا کی طرف ہجرت کرتا ہوں) حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت صالح

علیہم السلام سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن و کافر الگ نہیں ہو جاتے، معجزۂ عذاب نہیں بھیجا جاتا۔ حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر سوار ہو کر علیحدہ نہ ہو لئے طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک کلدانیوں کے ملک (عراق) سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے ان پر عذاب نہ آیا۔ اسی طرح حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر جب تک الگ نہ ہو گئے۔ ہلاکت کا عذاب نہیں آیا اور جب انہوں نے ہجرت کر لی تو یہ معجزۂ عذاب مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوا اور مومنین کو نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوئی۔

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ان واقعات کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ دستور اور قانون فرمایا ہے جس میں تغیر اور تبدل ناممکن ہے جیسا کہ اس سے پہلے "قرآن مجید میں سنۃ اللہ کے مفہوم" کے ضمن میں آیاتِ قرآنی کے حوالہ سے اس کی پوری تفصیل گزر چکی ہے۔ سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ اس اصول کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ	کیا یہ کافر گزشتہ قوموں کی طرح واقعۂ
الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ	ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں، کہدے کہ انتظار
فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝	کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا
ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	ہوں، پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات
كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ	دیتے ہیں اور ایسے ہی ایمان لانے
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	والوں کو۔ ہم پر فرض ہے ہم نجات

(یونس : ۱۰۲-۱۰۳) دیں گے ایمان والوں کو۔

آنحضرتؐ اور معجزۂ ہدایت ہدایت کی غرض سے آنحضرتؐ سے جو معجزات اور نشانیاں صادر ہوتی رہتی تھیں ان کا بڑا حصہ غیر معمولی قوتِ تاثیر، استجابتِ دعا، تائید و نصرت اور پیشین گوئی کا تھا۔ اسی غیر معمولی قوتِ تاثیر کا نتیجہ تھا کہ قریش لوگوں کو آپؐ کے پاس جانے سے روکتے تھے۔ سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔ قرآن مجید کی یہ آیت کفار کے اس باطنی اعتراف کا آئینہ ہے :

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○

اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں شور و غل کرو۔ شاید تم غالب آؤ۔

(حٰمٓ السجدۃ : ۲۶)

قرآن کے اثر کا ان پر یہ رعب چھایا ہوا تھا کہ وہ لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہ دیکھتے تھے کہ شور و غل اور ہنگامہ کر کے لوگوں کو سننے نہ دیں۔ آنحضرتؐ کی استجابتِ دعا کا بھی کفار کو بدرجہ اتم یقین تھا۔ ایک دفعہ صحنِ حرم میں جب ابوجہل وغیرہ روسائے قریش آنحضرتؐ کی نماز میں خلل انداز ہوئے اور آپؐ نے ان پر بد دعا کی تو بخاری و مسلم میں یہ تصریح ہے کہ وہ اس کو سن کر کانپ[1] اٹھے۔ ایک دفعہ جب مکہ میں قحطِ عظیم پڑا تو ابوسفیان نے آپؐ کے پاس آکر کہا کہ "محمدؐ! تمہاری قوم ہلاک ہو گئی۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ اس بلا کو ان سے دور کرے"۔ چنانچہ آپؐ نے دعا کی اور وہ بلا دور ہوئی۔[2] اسی طرح آپؐ کی پیشین گوئی کی صداقت کا بھی ان کو دل سے اعتراف تھا۔ یاد

---

[1] صحیح بخاری، آخر کتاب الوضوء و مسلم باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔

[2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان۔

ہو گا کہ غزوۂ بدر سے پہلے جب امیہ کو حضرت سعد انصاریؓ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے اس کے مارے جانے کی پیشین گوئی کی ہے تو وہ گھبرا اٹھا اور اس کی بیوی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے شوہر کا دامن تھام لیا کہ "محمدؐ کی پیشین گوئی تمہیں یاد نہیں[1]"۔ فتح روم کی مشہور پیشین گوئی جس دن پوری ہوئی بہت سے لوگ اس نشانِ صداقت سے ہدایت پاکر مسلمان ہو گئے[2]۔

آنحضرتؐ کی تائید و نصرت کے عجائبات بھی قریش کی نظروں سے گزر چکے تھے۔ وہ بار بار آپؐ پر حملے کی تیاریاں کرتے تھے اور ناکام رہتے تھے۔ ایک دفعہ ابوجہل نے یہ ناپاک ارادہ کیا اور اس نیت سے آگے بڑھا تو فوراً ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ ساتھیوں نے واقعہ پوچھا تو بتایا کہ "مجھے یہ نظر آیا کہ میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی خندق ہے اور چند پردار ہستیاں کھڑی ہیں[3]"۔

الغرض ہدایت کے متعدد نشانات تھے جو مکہ میں کفار کو اس غرض سے دکھائے گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر ان کے قلوب میں قبولِ حق کی صلاحیت پیدا ہو۔

شقِ قمر آخری نشان ہدایت تھا ہدایت کی ان نشانیوں میں کفار مکہ کے لئے سب سے آخری[4] اور فیصلہ کن نشان شقِ قمر تھا جس کے بعد آیاتِ ہلاکت کا آغاز ہونے

---

[1] صحیح بخاری جلد اول کتاب المغازی [2] ترمذی تفسیر سورۂ روم۔ [3] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ۔ [4] ہم نے قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصولِ الٰہی کے مطابق اولاً ایسا سمجھا تھا کہ شقِ قمر کا معجزہ ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا ہو گا۔ لیکن سیر و مغازی اور کتب احادیث کا مطبوعہ ذخیرہ اس دعویٰ کے ثبوت اور انکار دونوں سے خاموش تھا۔ اسی اثنا میں حاکم کی مستدرک کی دوسری جلد حیدر آباد سے چھپ کر پہنچی۔ اس میں سورۂ قمر کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

والا تھا۔ احادیث میں ہے کہ کفارِ مکہ آپؐ سے معجزہ کے طالب تھے تو آپؐ نے اُن کو شقِ قمر کا معجزہ دکھایا۔ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا۔ لیکن معاندین کو اس عظیم الشان اور واضح تر معجزہ سے بھی ہدایت نہ ملی۔ بعضوں نے کہا محمدؐ نے جادو کیا ہے۔ کسی نے کہا ایسی عجیب عجیب باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○	قیامت کا وقت قریب آگیا اور چاند شق
وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا	ہوگیا اور اگر یہ کافر کوئی نشانی دیکھیں تو اس
سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○	سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو
(القمر، ۱-۲)	تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

اب خداوند ذوالجلال کے رحم و کرم نے دوسری شان اختیار کی یعنی اس کے قہر و غضب نے ان غیر صلاحیت پذیر ہستیوں سے سطحِ ارضی کو پاک کر دینے کا تہیہ کر لیا اور وہ سنّتِ الٰہی جو تمام گزشتہ اُمتوں کے ساتھ جاری رہی تھی یعنی یہ کہ معجزوں کے دیکھنے کے بعد ایمان نہ لانے پر کفار کی ہلاکت اور بربادی فرض محتم ہو جاتی ہے، وہ قریش کے حق میں بھی جاری ہوئی۔

گزشتہ دستورِ الٰہی کی تفصیل کے مطابق اس ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے

(بقیہ صفحہ) سے جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں، یہ تصریح ملی کہ یہ نشان قبل مخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ حاکم کی یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک میں اس کی تصدیق کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ روایت عبدالرزاق میں بھی موجود ہے (مستدرک جلد دوم)

کے لئے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

(۱) مومنین کی جماعت کے ساتھ آنحضرتؐ کی شہرِ مکہ سے ہجرت۔

(۲) ہجرت سے پہلے ہدایت کی کسی آخری کھلی نشانی کا ظاہر ہونا۔

چنانچہ ہجرت سے پہلے شقِ قمر کا نشان ظاہر ہوا اور اس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا اسلام نہ لائے تو آنحضرتؐ کو مکہ سے ہجرت کا حکم ملا اور ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آگیا۔ صحابہؓ میں اسرارِ نبوت کے جو محرم تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم اور مسند ابنِ حنبل میں ہے کہ جب آنحضرتؐ مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا اِنَّا لِلّٰہِ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا۔ اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے، چنانچہ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ والی قتال کی آیت نازل ہوئی۔[1]

آنحضرتؐ اور معجزۂ ہلاک آنحضرتؐ نے مکہ میں قریش کو تقریباً تیرہ برس تک دعوت دی اور تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی، اور آیاتِ ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھائے۔ بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی اُن کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا۔ اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلۂ قریش میں سے وہ افرادِ صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے، انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبولِ حق کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے تھے یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ اور اس لئے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے

---

[1] نسائی کتاب الجہاد اور ترمذی تفسیر آیت بالا (الحج: ۳۹) میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ س۔

ارضِ حرم کو پاک کیا جائے۔

آنحضرتؐ مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں بھی کوئی حق کا سننے والا نہ تھا۔ بازار اور راستہ میں شریروں نے آپ کو پتھر مارے۔ یہاں تک کہ قدمِ مبارک خون آلود ہو گئے۔ آپؐ مکہ واپس آرہے تھے کہ فرشتۂ جبال نے آپؐ کو ندا دی کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے۔ رحمتِ عالمؐ اب بھی مایوس نہ ہوئے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ ابھی وہ معجزۂ ہلاک ظاہر نہ ہو۔ شاید کہ ان کی نسل سے کوئی توحید کا پرستار پیدا ہو۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے دریافت کیا۔ یارسول اللہ! اُحد کے علاوہ آپؐ پر سب سے زیادہ سخت دن کون تھا؟ آپؐ نے فرمایا وہ دن جب میں نے طائف کے سردار عبد یالیل کے سامنے اپنے کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا۔ میں مغموم واپس آرہا تھا کہ فرشتۂ جبال نظر آیا اور اس کے بعد آپؐ نے کفار کی ہلاکت کے لئے فرشتۂ جبال کی اجازت طلبی اور اپنا جواب بیان کیا۔[1] آنحضرتؐ اس دن کو ایامِ مصائب کی تاریخ میں سب سے زیادہ سخت فرماتے ہیں۔ بظاہر ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ نے طائف کی تکلیف کو سخت ترین دن فرمایا۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت کی گھڑیاں آپؐ پر آئی ہیں بلکہ اس لحاظ سے آپؐ اس کو سخت ترین دن قرار دیتے ہیں کہ یہ قریش کی فرصت اور مہلت کی اخیر گھڑی تھی اور اب معجزۂ ہلاک ان کے سر پر تھا اور رحمتِ عالمؐ کو اس کا صدمہ تھا۔ تاہم قریش کو اب آخری عذاب کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ نادان استہزا کرتے تھے جیسا کہ دوسری قومیں بھی اپنے اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی کرتی آئی ہیں۔

---

[1] مسلم باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین کتاب بدء الشق۔

کفارِ قریش آنحضرتؐ کی خدمت میں جاکر کہتے تھے کہ جس عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا؟ اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت کی یہ آخری نشانی بھی دکھادو:

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا ۖ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ○

(یونس، ۲۰)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اترتا اے پیغمبر! کہدے کہ غیب کی بات خدا کے پاس ہے تم اس کے ظہور کا انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ○

(بنی اسرآئیل: ۹۲)

یا جیسا تم کہا کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر گرادو یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔

لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○ (الحجر، ۷)

اگر تم سچے ہو تو کیوں نہیں ہمارے پاس فرشتوں کو لے آتے ہو۔

خدا نے جواب میں کہا:

وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ○

(الحجر: ۸)

جب فرشتے آجائیں گے تو پھر انہیں مہلت نہ دی جائے گی۔

کفارِ قریش کو معجزۂ عذاب کے دیکھنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشین گوئی سراسر جھوٹ ہے۔ خدا نے کہا جب تک پیغمبر کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں یعنی تمام افرادِ

صالحہ الگ نہ ہو جائیں گے عذاب نہیں آئے گا :

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ○

(الرعد : ۶)

اور کفار جلدی چاہتے ہیں تجھ سے بھلائی سے پہلے برائی حالانکہ ان سے پہلے گزشتہ قوموں میں اس قسم کے واقعات گزر چکے ہیں اور تیرا رب لوگوں کو گنہگاری کے باوجود ان کو معاف کرتا ہے اور تیرا رب بڑے عذاب والا بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے معجزہ کو ذکر کر کے کہتا ہے :

لَا يُؤْمِنُونَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ○ فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○ فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ ○ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ○ أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِينَ ○ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ○ مَا أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ○ وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ○

(الشعراء : ۲۰۱ – ۲۰۸)

وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک دکھ کا عذاب نہ دیکھ لیں گے۔ پھر یہ عذاب اچانک ان پر اس طرح آجائے گا کہ ان کو خبر نہیں ہونے پائے گی تو اس وقت کہیں گے کہ ہم کو مہلت بھی کچھ مل سکتی ہے؟ کیا یہ کفار ہمارا عذاب جلد مانگتے ہیں؟ بھلا دیکھ تو اگر ہم نے ان کو چند سال فائدہ اٹھانے کا موقع دے بھی دیا، پھر ان پر وہ عذاب آگیا جس کا وعدہ تھا تو کیا ان کی یہ دولت ان کے کچھ کام آئے گی۔ ہم نے کسی آبادی کو ہلاک نہیں کیا۔ لیکن اس

کو ڈر سنانے والے پہلے موجود تھے۔

یعنی اس اصول کی بنا پر کہ قوموں کی ہلاکت سے پہلے ان کے اندر ایک ڈر سنانے والا مامور ہوا کرتا ہے، قریش میں بھی ایک ڈر سنانے والا آیا۔ اگر وہ اس کی نہ سنیں گے تو پچھلی قوموں کی طرح وہ بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ قریش کو مختلف قوموں کے حالات سنا کر کہتا ہے:

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ	تو کتنی بستیاں ہم نے برباد کیں اور وہ
هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى	گنہگار تھیں، اور اب وہ اپنی چھتوں پر
عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ	ڈھئی پڑی ہیں اور کتنے کنوئیں بے کار
مَّشِيْدٍ ۝ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي	پڑے ہیں اور کتنے اونچے اونچے محل
الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ	خراب اور ویران ہیں۔ کیا یہ کافر زمین میں
يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ	چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے پاس دل
بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ	ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے
تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝	سنتے۔ کیونکہ آنکھیں کچھ اندھی نہیں ہوتی ہیں
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ	جبکہ ان کو یہ عبرت ناک مناظر سجھائی نہ
يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا	دیتے ہوں۔ مگر وہ دل اندھے ہوتے ہیں
عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا	جو سینوں میں ہیں۔ اور یہ کافر تجھ سے جلدی
تَعُدُّوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ	مانگتے ہیں عذاب اور اللہ ہرگز اپنا وعدہ
اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ	نہ ٹالے گا اور تیرے رب کے نزدیک ایک
اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ قُلْ	دن تمہارے ہزار برس کے برابر ہے اور کتنی

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○

(الحج : ۴۵-۴۹)

بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اور وہ گنہگار تھیں پھر ان کو پکڑا اور میری طرف پھر آنا ہے۔ کہدے اے لوگو! میں تو صاف صاف تم کو ڈر سنانے والا ہوں۔

قرآن نے رؤسائے قریش کی طرف اشارہ کرکے پوچھا :

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ○

(فاطر : ۴۳)

کیا وہ پہلی قوموں کے دستور کا انتظار کر رہے ہیں۔

چنانچہ گزشتہ قوموں کے قانون کے پورے ہونے کے دن آگئے۔ یعنی رسولؐ اور مومنین کو گنہگار قوم کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت ملی۔ کیونکہ جیسا پہلے گزر چکا ہے جب تک رسول اپنی قوم سے ہجرت نہیں کرتا عذاب و ہلاکت کا نشان ظاہر نہیں ہوتا۔ چنانچہ کفارِ قریش کو جو اس نشان کے دیکھنے کے لئے بیتاب تھے، پہلے ہی یہ جتا دیا گیا تھا :

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلَافَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ○

(بنی اسرائیل : ۷۶-۷۷)

اور اگر وہ اس زمین سے تجھ کو گھبرانے لگے ہیں تاکہ یہاں سے تجھ کو نکال دیں تو یاد رہے کہ تیرے چلے جانے کے بعد وہ بہت کم پھر ٹھہر سکیں گے۔ تجھ سے پہلے جو رسول گزرے ہیں۔ ان کی یہ سنت ہے اور خدا کی سنت کو تم ہٹا نہ پاؤ گے۔

ایک دفعہ آنحضرتؐ صحنِ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش ادھر اُدھر بیٹھے ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کہ کون مذبح جاکر وہاں سے اونٹ کی اوجھری اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب آنحضرتؐ سجدہ میں گئے تو وہ نجاست آپؐ کی پشتِ مبارک پر ڈال دی۔ آنحضرتؐ اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو اس موقع پر موجود تھے، کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کر سکتا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جاکر حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں۔ وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپؐ نے سر اٹھایا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ سرورِ عالمؐ رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوتے ہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ آپؐ کے جسمِ مبارک کو تکلیف پہنچی بلکہ اس لئے کہ وہ نماز (یعنی مشاہدۂ جمالِ الٰہی) میں جو اس دنیا میں آپؐ کی محبوب ترین چیز تھی، خلل انداز ہوئے۔

قرآن نے کہا:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا	کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک
اِذَا صَلّٰى ۝	بندۂ الٰہی کو نماز سے روکتا

(العلق، ۹-۱۰) ہے۔

یہ روسائے قریش کی مہلت کا اخیر لمحہ تھا۔ آنحضرتؐ نے بلند آواز میں بددعا کی اور اس آخری معجزۂ ہلاک کی درخواست کی۔ مگر پھر بھی رحمتِ عالمؐ کی شفقت دیکھئے کہ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرح پوری قوم کی تباہی و بربادی

کی دعا نہیں مانگی بلکہ صرف قریش کے رئیسوں کے حق میں بد دعا کی اور ان میں سے بھی صرف سات رئیسوں کے نام لئے اور فرمایا "خداوندا! قریش کے سرداروں کو لے۔ خداوند! ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عتبہ بن معیط، امیہ بن خلف، ولید بن عقبہ اور اُبی ابن خلف کو پکڑ۔" یہ بد دعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔[1]

اب سنتِ الٰہی کے مطابق معراج کے ساتھ ہجرت کی دُعا آپؐ کو بتائی گئی:[2]

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ	خداوند! مجھ کو خوبی سے کہیں پہنچا
اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ	اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس
لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ○	سے مجھے ایک مدد کرنے والی طاقت
(بنی اسرآئیل، ۸)	عطا کر۔

یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ	حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل
اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○	مٹنے ہی کو ہے:
(بنی اسرائیل، ۸۱)	

انبیاءؑ کی سنت کے مطابق آنحضرتؐ نے اپنے متبعین کے ساتھ ہجرت فرمائی اور جس دن کا انتظار تھا وہ آگیا۔ قرآن نے کہا کہ رؤسائے قریش پر آیتِ عذاب کے نازل ہونے کے لئے ہجرت کا انتظار تھا، وہ ہو چکی اور اب کوئی مزید انتظار نہیں:

وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا	اور جب (اے پیغمبر) منکرین داؤ کر رہے

---

[1] صحیح بخاری اور مسلم باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔ [2] ترمذی تفسیر آیت مذکور (بنی اسرائیل) اور مستدرک حاکم (باب الہجرۃ) میں تصریح ہے کہ یہ دعائے ہجرت ہے۔

لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ

(الانفال : ۳۱-۳۴)

تھے تیری جان لینے کا کہ وہ تجھ کو قید کر دیں یا مار ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ داؤ کرتے ہیں اور خدا بھی داؤ کرتا ہے اور خدا داؤ کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں۔ ہاں ہم نے سنا اگر چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں یہ تو فقط اگلوں کی کہانیاں ہیں۔ اور جب وہ کہتے ہیں کہ اے خدا! اگر یہ قرآن حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش کر یا کوئی اور بڑا عذاب ہم پر لا۔ اور خدا ان پر (ہجرت سے پہلے) کیوں کر عذاب کرتا جب کہ تو ان میں تھا۔ اور خدا ان پر عذاب کرنے والا نہیں ہے درانحالیکہ وہ مغفرت چاہتے ہوں۔ اور خدا ان پر عذاب کیوں نازل نہ کرے گا جب وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کی تولیت کے مستحق نہیں۔ اس کے مستحق صرف پرہیزگار ہیں۔

غزوۂ بدر معجزہ ہلاک تھا جس طرح دوسری قوموں کے لئے مختلف معجزاتِ عذاب

آئے اسی طرح جس قوم میں آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تھے اس کے لئے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا۔ ہجرت سے قبل آنحضرتؐ کی بددعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ بعض رؤسائے قریش نے خدمتِ نبویؐ میں آکر کہا کہ محمدؐ! تم رحمت و شفقت اور صلۂ رحم کی دعوت دیتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے؟ آنحضرتؐ نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی۔ مگر پھر قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہوگیا تو ان کے لئے معجزۂ عذاب کے سوا کوئی اور طریقۂ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ (بڑی پکڑ) اُن کے لئے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلانِ عام سُنا دیا جس میں پہلے اس قحط کی پھر اُن کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی تھی۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ	اس دن کی راہ دیکھ جب آسمان صاف
مُّبِينٍ ۝ يَغْشَى النَّاسَ ۖ هَٰذَا	دھواں کرلاوے جو لوگوں کو گھیر لے۔ اِس
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ	وقت کہا جائے گا یہ ہے دکھ کی مار۔ تب
عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝ أَنَّىٰ	گڑگڑائیں گے۔ کہ خداوندا ہم سے عذاب دُور
لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ	کردے ہم ایمان لاتے ہیں۔ کہاں ہے اُنکے
رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ	لئے سمجھنا حالانکہ ان کے پاس کھول
وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ إِنَّا	کر سنانے والا رسول آچکا تو اُس سے پیٹھ پھیری
كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ	اور کہا کہ سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔ اچھا ہم تھوڑے
عَائِدُونَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ	دنوں کے لئے عذاب دور کر دیتے ہیں۔ تم

آئے اسی طرح جس قوم میں آنحضرتؐ مبعوث ہوئے تھے اس کے لئے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا۔ ہجرت سے قبل آنحضرتؐ کی بددعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ بعض رؤسائے قریش نے خدمتِ نبویؐ میں آکر کہا کہ "محمدؐ! تم رحمت و شفقت اور صلۂ رحم کی دعوت دیتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے"؟ آنحضرتؐ نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی۔ مگر پھر قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہوگیا تو ان کے لئے معجزۂ عذاب کے سوا کوئی اور طریقۂ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۃ کبریٰ (بڑی پکڑ) ان کے لئے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلانِ عام سنا دیا جس میں پہلے اس قحط کی پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی تھی۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ
مُّبِيْنٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ
عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝ اَنّٰى
لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ
وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ اِنَّا
كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ
عَآئِدُوْنَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ

اس دن کی راہ دیکھ جب آسمان صاف
دھواں کر لاوے جو لوگوں کو گھیر لے۔ اس
وقت کہا جائے گا یہ ہے دکھ کی مار۔ تب
گڑگڑائیں گے۔ کہ خداوندا ہم سے عذاب دور
کر دے ہم ایمان لاتے ہیں۔ کہاں ہے انکے
لئے سمجھنا حالانکہ ان کے پاس کھول
کر سنانے والا رسول آچکا تو اس سے پیٹھ پھیری
اور کہا کہ سکھایا ہوا دیوانہ ہے۔ اچھا ہم تھوڑے
دنوں کے لئے عذاب دور کر دیتے ہیں۔ تم

الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ○ وَلَقَدْ	پھر وہی کرنے والے ہو۔ انتظار کرو اس دن کا جب
فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ	ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے۔ ہم بدلہ لینے والے ہیں۔
(الدخان، ۱۰-۱۷)	اور ان سے پہلے ہم فرعون کی قوم کو آزما چکے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں پورے واقعہ کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اور آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ بطشِ اکبر اُن رؤسائے قریش کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لئے غرقِ بحر کی حیثیت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا ہے کہ یہ آیتیں قریش کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ قریش نے جب نافرمانی کی تو آنحضرتؐ نے خدا سے دعا کی کہ "اے خدا! ان پر حضرت یوسفؑ کے سات برس والے قحط کی طرح قحط نازل کر" چنانچہ مکہ میں سخت قحط پڑا یہاں تک کہ بھوک سے آسمان اور قریش کی آنکھوں کے درمیان دھواں سا اُڑتا نظر آتا تھا۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے سامنے آکر دعا کی درخواست کی۔ چنانچہ آپؐ نے دعا کی اور بارش ہوئی خدا نے کہا کہ وہ پھر اپنی حالت پر آجائیں گے یعنی ایمان قبول نہ کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تب اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے بَطْشَةُ الْكُبْرٰى (بڑی پکڑ) کا دن مقرر فرمایا یعنی بدر[1]

یاد ہوگا کہ صحنِ حرم میں رؤسائے قریش جو نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، آپؐ نے ان کا نام لے لے کر ہر ایک کے حق میں بد دعا کی تھی۔ اس سے پہلے کہ غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آئے ہجرت کے بعد ہی آپؐ نے ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا۔ بدر سے پہلے حضرت سعد انصاریؓ عمرہ کو گئے تھے۔ ابوجہل نے ان کو روکا۔ امیہ نے بیچ میں دخل دینا چاہا۔ حضرت سعدؓ نے کہا "امیہ تم دخل نہ دو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ تم انکے ہاتھوں

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۃ دخان۔

سے مارے جاؤ گے"۔ یہ سن کر امیہ ڈر گیا۔ چنانچہ جب بدر کا موقع پیش آیا تو اس نے جانے میں پس وپیش کی۔ لوگوں کے طعن سے اس نے جانا چاہا تو اس کی بیوی نے دامن تھام لیا اور کہا "کیا تم کو اپنے یثربی دوست کی بات یاد نہیں"[1]؟

جب غزوۂ بدر کے لئے آپؐ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ پہلی جلد میں تفصیل گزر چکی ہے، مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں۔ ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گزر کر مکہ کو جا رہا تھا۔ دوسرا رؤسائے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لئے نکلا تھا۔ خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک اُن کے ہاتھ لگے گی۔ عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ اُن کے ہاتھ آئے گا۔ لیکن حضور انورؐ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح وشکست کا نہیں بلکہ اس بَطْشَةُ الْكُبْرٰى کا دن ہے جس کا بارگاہِ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔ رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے ہیں تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پتہ لگایا جائے۔ چنانچہ مسلمان مخبر اِدھر اُدھر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے۔ اس نے جواب دیا کہ "قریش کے قافلہ کا تو مجھے علم نہیں البتہ ان کا لشکر ادھر پڑا ہے"۔ یہ سُن کر مسلمانوں نے اس کو مارا کہ یہ ہم سے صحیح حال چھپاتا ہے۔ مار کھانے پر اس نے کہا "اچھا ٹھہرو قافلہ کا حال بتاتا ہوں"۔ جب لوگ اس کو چھوڑ دیتے تو وہ پھر یہی کہتا کہ "مجھ کو قافلہ کی خبر نہیں البتہ یہ جانتا ہوں کہ ادھر قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے"۔ آنحضرتؐ نماز میں مصروف تھے۔ اس سے فراغت ہوئی تو فرمایا "جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ کہتا ہے تو تم مارتے ہو"۔ اس کے بعد آپؐ

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی۔

نے فرمایا کہ "یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابوجہل کا مقتل ہے۔ یہ عتبہ کا ہے۔ یہ اُبی کا ہے۔ وغیرہ"۔ راوی کہتا ہے کہ آپؐ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا ایک سرمو وہاں سے اس نے تجاوز نہیں کیا۔ جنگ میں وہ وہیں مرا پڑا ملا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو صحنِ حرم کی بددعا کے دن موجود تھے، وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپؐ نے بددعا کی تھی کُل کے کُل بدر کے میدان میں ڈھیر ہو گئے[1] اور بَطْشَةُ الْكُبْرٰى کے انتقام کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

سورۂ انفال جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا مدت سے انتظار تھا:

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۙ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○

(الانفال: ۷-۸)

اور خدا چاہتا ہے کہ حق کو اپنی باتوں سے مستحکم کر دے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دے اگرچہ گنہگار اس کو پسند نہ کریں۔

وسطِ سورہ میں فرمایا:

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ

(الانفال: ۵۲)

یہ ویسا ہی ہوا جیسا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے کا کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے اُن کے گناہوں کے سبب سے ان کو ہلاک کر دیا۔

---

[1] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔

یہ فیصلہ کا دن تھا :

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ	اور جو ہم نے اپنے بندہ پر فیصلہ کے
الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ط	دن اتارا جس دن دونوں لشکر آمنے
(الانفال : ۴۱)	سامنے بھڑے ۔

اور یہ سب اس لئے ہوا کہ

لِیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا لا	تاکہ خدا اس کام کو پورا کر دے جو پہلے
(الانفال ، ۴۲)	مقرر کیا جا چکا تھا ۔

نکتہ : بدر کے میدان میں جب تین سو بے سروسامان مسلمان ایک ہزار لوہے میں غرق فوج سے مقابل تھے ، آنحضرتؐ نے بھی اُسی قسم کی بد دعا مانگی جیسی حضرت نوح علیہ السّلام نے طوفان سے اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے غرق سے پہلے اپنی اپنی قوم کے لئے مانگی تھی ۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے کہا " خداوندا ! اب زمین پر کوئی کافر بسنے والا نہ چھوڑ کہ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی اور نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا " حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے کہا " خداوندا ! ان کے دِل سخت کر دے کہ جب تک عذاب نہ دیکھ لیں گے ایمان نہ لائیں گے " لیکن اس موقع پر آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ " خداوندا ! اپنا وعدہ پورا کر ۔ اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو پھر کوئی تیرا نام لینے والا نہ رہے گا ۔ "

حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السّلام نے براہِ راست اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی ۔ لیکن رحمتِ عالمؐ نے اب بھی دعا مانگی تو صرف اہلِ توحید کی فتح و نصرت کی ، دشمنوں کی تباہی و بربادی کی نہیں ۔

حاکم نے مستدرک میں بہ روایت صحیحہ نقل کیا ہے کہ بدر کے قیدی جب گرفتار ہوکر آئے اور آپؐ نے اُن کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا اور مختلف صاحبوں نے مختلف رائیں پیش کیں تو آپؐ نے فرمایا "یہ کفارِ قریش اپنے ان ہی بھائیوں کی طرح ہیں، جو اُن سے پہلے تھے (یعنی گزشتہ انبیاءؑ کی امتوں میں) نوح علیہ السّلام نے دعا کی کہ "خداوندا! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی آباد گھر والا باقی نہ رکھ" موسیٰ علیہ السّلام نے کہا "ہمارے پروردگار! ان کی دولت کو میٹ دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔ ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا "جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو خدا غفور و رحیم ہے"۔ عیسیٰ علیہ السّلام نے کہا "(الٰہی) اگر تو ان (نافرمانوں) پر عذاب بھیجے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو غالب اور دانا ہے"۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے قریش کو خطاب کر کے فرمایا کہ "تم لوگ وہ قوم ہو جس میں فریب اور دغا سے قتل کر دینے کا رواج ہے۔ تو تم میں سے کوئی زرِ فدیہ یا اپنا سر دیئے بغیر لوٹ کر نہ جا سکے گا"۔

اس روایت سے ہمارے اصولِ مذکورہ کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے یعنی یہ کہ

(۱) بدر قریش کے لئے ایسا ہی عذابِ ہلاکت کا دن تھا جیسا گزشتہ قوموں پر ہلاکت کے دن آیا کئے ہیں؛

(۲) آنحضرتؐ نے اس موقع پر دو قسم کے انبیاءؑ کے نام اور ان کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے، ایک وہ جنہوں نے سخت گیری کا پہلو اختیار کیا مثلاً حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السّلام نے۔ دوسرے وہ جنہوں نے نرمی کا اظہار کیا مثلاً حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ

علیہما السلام نے۔ آنحضرتؐ نے ان دونوں میں سے بیچ کی راہ اختیار کی۔

سحر اور معجزہ کا فرق اور ساحر اور پیغمبر میں امتیاز

گذشتہ صفحات میں انبیاءؑ کے جو خصائص و امتیازات اور علامات و آثار بتائے گئے ہیں۔ ان سے خود سحر و معجزہ کا فرق اور ساحر و پیغمبر کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ سحر و شعبدہ صرف دل لگی کے آنی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے اصلاح و فساد، تعمیر اور تخریب، ترقی اور تنزلی کے اسباب و سامان ہوتے ہیں۔ ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے متحیر کر دے۔ لیکن پیغمبر کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح، قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ پیغمبر بشیر، نذیر، مزکی، ہادی، سراج منیر اور شاہد عالم ہوتا ہے۔ ساحر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشا گری کے سوا کوئی اور ممتاز بات اس کے اندر نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں سحر کے متعلق جس قدر بیانات ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور تخیل اور نظر بندی سے زیادہ اس کو وقعت نہیں دیتا۔ ہاروت و ماروت کے قصہ میں سحر کے زور و قوت کا منتہا یہ بیان کیا ہے:

مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ	سحر کا وہ فن سیکھتے ہیں جس سے خاوند اور
زَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ	اس کی بیوی میں تفریق کر دیتے ہیں اور یہ کسی
مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ	کو حکم الٰہی کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے اور
مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ	یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی
(البقرۃ: ۱۰۲)	ہے اور نفع نہیں پہنچاتی۔

غرض سحر و جادو کوئی مؤثرِ حقیقی شے نہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خیال سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں:

فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ	پھر ناگاہ مصر کے جادوگروں کی رسیاں اور
اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○	لاٹھیاں ان کے جادو کے اثر سے موسیٰؑ کے
(طٰہٰ : ۶۶)	خیال میں معلوم ہونے لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔

حکم ہوا کہ موسیٰؑ تم بھی اپنا عصا ئے اعجاز ڈال دو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حق نے باطل پر فتح پائی:

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ○	ہم نے کہا موسیٰ! ڈرو نہیں تم ہی سربلند
وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا	رہو گے۔ تمہارے داہنے ہاتھ میں جو ہے
صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ	تم اس کو ڈال دو۔ وہ ان کی صنعت کاری
وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ○	کو نگل جائے گا بیشک جادوگروں نے
(طٰہٰ : ۶۸-۶۹)	جو صنعت کی تھی وہ جادوگر کا فریب تھا اور
	جادوگر جدھر سے بھی آئے وہ فلاح نہیں پا سکتا۔

ساحر اور نبی میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق و امتیاز بتایا وہ یہی ہے کہ نبی فلاح پاتا ہے اور جادوگر فلاح نہیں پاتا۔ نبی کے تمام اعمال، مساعی، جد و جہد اور معجزات کا مرکز و محور فلاح اور خیر ہوتا ہے اور جادوگر کا مقصد صرف فریب، دھوکا اور شر ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ایک اور آیت میں اسی مفہوم کو دہرایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے جادوگروں سے کہتے ہیں:

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	جو تم لائے ہو وہ جادو ہے۔ اللہ اس کو

سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○

باطل کر دے گا۔ بیشک اللہ شریروں کے کام کو نہیں سنوارتا۔

(یونس : ۸۱)

یعنی سحر و جادو ایک آنی تماشا ہوتا ہے اور اعجاز کا اثر دائمی ہوتا ہے اور اس کے نتائج دنیا میں نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کو دیکھ کر کہا کہ یہ سب جادو کے کرشمے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ○

کیا یہ جادو ہے؟ اور جادو کرنے والے تو فلاح نہیں پاتے۔

(یونس : ۷۷)

غرض "فلاح" اور "عدمِ فلاح" سحر اور اعجاز کے درمیان سب سے بڑا فرق ہے۔

کفار آنحضرتؐ کی نسبت کہتے تھے کہ یہ شیطان کی قوت سے یہ کلام پیش کرتے ہیں اور ان کے کلام کا سرچشمہ شیطان کی تعلیم ہے۔ خدا نے اس کے جواب میں کہا کہ اس حقیقت کا امتیاز کہ اس کا منبع اور سرچشمہ خیر ہے یا شر اور یہ شیطان کی قوت کا نتیجہ ہے یا ملکوتی طاقت اس کا مظہر ہے، نہایت آسان ہے اور خود مدعی کی زندگی اور اس کے اخلاق و اعمال اس کے شاہدِ عدل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کے مطابق کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ان دونوں قوتوں کے درمیان تفریق کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ خدا نے کہا۔ ہم بتائیں شیطان کس پر اترتے ہیں:

عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ يُّلْقُوْنَ

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر

السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۝ (الشعراء : ۲۲۲-۲۲۳)

لاڈالتے ہیں وہ سُنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

یعنی نبی اور متنبّی کا فرق خود اس کی اخلاقی زندگی سے ہے۔ علاوہ ازیں افترا پرداز اور شریر کے کام کو مستقل اور دائمی زندگی عطا نہیں ہوتی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (النحل : ۱۱۶-۱۱۷)

جو لوگ کہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے۔ چند روزہ کامیابی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

معجزات اور نشانات سے کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے

معجزات، دلائل، آیات اور آثار کو ہدایت کن لوگوں سے عطا ہوتی ہے؟ قرآن مجید نے ان کے اوصاف و شرائط بیان کئے ہیں:

(۱) سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کو خدا پر ایمان ہو۔ اگر اس کو سرے سے خدا پر ایمان نہیں تو اس کو معجزہ سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ اس کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ پہلے کائنات کے اسرار و عجائب کو دیکھ کر ایک قادرِ مطلق ہستی کے وجود پر یقین کرلے۔ اس کے بعد معجزات اور نشانیوں کے ذریعہ سے اس کو نبوّت کے باب میں ہدایت نصیب ہوگی:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

کہہ (اے پیغمبر! کہ) غور سے دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈراوے اُن لوگوں

(یونس : ۱۶) کے جو ایمان نہیں رکھتے۔

(۲) دوسری چیز جو آیات اور نشانیوں سے عبرت پذیر نہیں ہونے دیتی وہ خودی اور تکبر ہے۔ معاندین چونکہ عموماً دولت مند رؤسا اور مدعیانِ عقل و خرد ہوتے ہیں اس لئے ان کا جذبۂ انانیت اور ترفع ان کو داعیانِ حق کے عَلَم کے نیچے کھڑے ہونے سے باز رکھتا ہے۔ اس بنا پر آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس جذبہ سے پاک ہوں۔ معاندین نے ہمیشہ انبیاءؑ کو کہا۔ اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ۔ (یہ پیغمبر تو ہماری طرح ایک آدمی ہے۔ کیا ہم اس کی پس روی قبول کرلیں)۔ مصر کے بادشاہ اور سرداروں نے اسی جذبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور ان کو گوناگوں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ہدایت نہیں ملی:

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ	پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارونؑ
هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ	کو نشانیاں اور کھلی قوت دے کر فرعون
مُّبِيْنٍ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ	اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو انہوں
فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۚ	نے غرور کیا اور وہ مغرور لوگ تھے تو انہوں
فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ	نے کہا کیا ہم اپنی ہی طرح کے آدمیوں
قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝	پر ایمان لائیں درانحالیکہ ان کی قوم
(المؤمنون: ۴۵-۴۷)	ہماری رعایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے منکروں اور خود پسندوں کی نسبت اپنا یہ فیصلہ سنادیا:۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ج (الاعراف : ۱۴۶)

ہم ان لوگوں کو اپنی نشانیوں کے سمجھنے سے پھیر دیں گے جو زمین میں ناحق تکبّر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ تمام نشانیوں کو دیکھ بھی چکیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔

قریش کے معاندین جو اپنی قوم کے رؤسا، اکابر اور اہلِ دولت تھے وہ بھی ان نشانیوں سے اسی لئے ہدایت نہ پا سکے کہ ان کو ایک غریب و مفلس اور بے یار و مددگار انسان کی پیروی گوارا نہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر نبوّت ہوتی بھی تو مکّہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی کو ملتی:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ (الزخرف : ۳۱)

اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن طائف اور مکّہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔

سب سے آخری چیز جو ان آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کی صلاحیت اور استعداد پیدا کرتی ہے وہ دل کا قبولِ حق کی طرف میلان ہے۔ بڑے سے بڑے اور خوارق اور عجیب سے عجیب معجزات اُن لوگوں کے نزدیک سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جن کے دل انابت اور رجوع الی الحق کی استعداد سے خالی ہیں:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری۔ کہدے کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا

اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝	ہے اور اسی کو اپنی طرف راہ دکھاتا
(الرّعد : ۲۷)	ہے جو خدا کی طرف اپنے کو رجوع کرتا ہے۔

اگر قبولیت اور اصلاح کی یہ استعداد نہ ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی باطل پرستی سے زیادہ نہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گمراہی اور شقاوت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ مشرک جو کسی مذہبِ حق کو نہیں مانتے اور علم سے بے بہرہ ہیں ان کا یہی حال ہے:

وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ	اور اے پیغمبر، اگر تو اُن کے پاس کوئی
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا	نشانی لائے تو وہ جو منکر ہیں کہیں گے
مُبْطِلُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ	کہ تم فریبی ہو۔ اسی طرح اللہ ان
عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	لوگوں کے دلوں پر مُہر کر دیتا ہے جو
(الرّوم : ۵۸ - ۵۹)	علم نہیں رکھتے۔

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کے طلبِ ثبوت میں یہ کہتے ہیں کہ اُس وقت تک ہم اِن کو پیغمبر حق تسلیم نہ کریں گے جب تک اُسی قسم کے معجزے وہ نہ دکھائیں جیسے اُن پیغمبروں نے لوگوں کو دکھائے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ فرض کرو کہ صرف ان ہی جیسے معجزوں سے پیغمبری کی سچائی تسلیم کی جا سکتی ہے تو اُن پیغمبروں نے تو وہی معجزے دکھائے تھے۔ پھر ان کو دیکھ کر اُن کے زمانہ کے کُل منکرین کیوں ایمان نہ لے آئے اور آخر تک وہ ان کو جادوگر ہی کیوں سمجھتے رہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا	تو جب ہماری طرف سے سچائی ان کے
قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ	پاس آئی تو انہوں نے کہا کیوں نہیں
مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ	(محمدؐ کو) ویسی ہی چیز دی گئی جیسی موسیٰؑ کو

مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۖ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ○

(القصص ۱ ۴۸)

دی گئی تھی، کیا موسیٰؑ کو جو چیز دی گئی تھی اس کا انکار منکرین پہلے نہیں کر چکے؟ انہوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہیں جو باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں ہم ان سب کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

صداقت کی نشانی صرف ہدایت ہے قرآن مجید نے اس کے بعد ہی کہا کہ صداقت کی نشانی ہدایت اور رہنمائی ہے کہ مدعی جو پیغام اور جو احکام پیش کرتا ہے وہ انسانوں کو فلاح، نجات اور رُشد کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور جو اُن سے انکار کرتے ہیں وہ ظالم اور خودسر ہیں۔ ان کو ہدایت کی سعادت نہیں ملتی:

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

(القصص: ۴۹ - ۵۰)

کہدے اے پیغمبر! کہ اگر تورات اور قرآن دونوں کتابیں جھوٹی ہیں اور تم سچے ہو تو ہدایت میں اُن سے بڑھ کر کوئی کتابِ الٰہی لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں۔ تو اگر وہ تمہارے اعلان کے مطابق نہ کر دکھائیں تو جان لے کہ یہ صرف اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو ہدایتِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے۔ اللہ خودسر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

آیات و دلائل نبویؐ
کی
تفصیل

"معجزہ" کے ہر پہلو پر کُلّی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد اب موقع آیا ہے کہ آنحضرتؐ کے تمام مافوقِ فہمِ بشری سوانح و واقعات کی تفصیل کی جائے۔ یہ سوانح و واقعات دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو حقیقت میں لوازمِ نبوّت ہیں اور کم و بیش ہر پیغمبر کو وہ ایک ہی طرح پیش آئے ہیں۔ ہم نے ان کا نام خصائص النبوۃ رکھا ہے۔ دوسری قسم میں وہ جزئی واقعات داخل ہیں جو ہر پیغمبر سے اس کے حالاتِ زمانہ کے مطابق مختلف صورتوں میں صادر ہوئے ہیں اور جن کو اصطلاحِ عام میں معجزات کہتے ہیں۔

ہم نے ان معجزات کو اُن کے استناد اور ماخذ کی حیثیت سے تین مختلف ابواب میں منقسم کر دیا ہے۔ پہلے میں وہ معجزانہ واقعات ہیں جو بنصِ صریح یا اشارۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ دوسرا باب ان معجزات کا قرار دیا ہے جو صحیح اور مستند روایات سے ثابت ہیں اور تیسرے باب میں ان معجزات پر بحث کی ہے جن کو گو بعض محدثین اور ارباب سیر نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے مگر محدثانہ اصول کی بنا پر وہ تمام تر کمزور اور غیر مستند ہیں۔ اس کے بعد کتبِ سابقہ کی وہ پیشین گوئیاں درج ہیں جو آنحضرتؐ کی آمد کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں اور سب سے آخر میں خصائصِ محمدیؐ کا باب ہے۔ اس تفصیل

کے مطابق آئندہ اوراق کی ترتیب کی حسبِ ذیل صورت ہوگی :۔

۱۔ خصائص النبوۃ ۔

۲۔ وہ آیات و دلائل جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ۔

۳۔ صحیح اور مستند روایتوں سے جو آیات و دلائل ثابت ہیں ۔

۴۔ غیر مستند روایتیں اور ان پر تنقید ۔

۵۔ کتبِ سابقہ کی بشارتیں ۔

۶۔ خصائصِ محمدیؐ ۔



خصائص النبوۃ

دنیا میں ہر جنس اور ہر نوع کی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے وہ اپنے غیر سے ممتاز ہوتی ہے۔ وہ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے اُس جنس اور نوع کی کوئی فرد خالی نہیں ہوتی۔ اسی طرح نبوّت کی بھی کچھ نہ کچھ خصوصیتیں ہیں جو اس کے لئے بمنزلۂ لوازمِ حقیقت کے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں جس قدر پیغمبر کسی نہ کسی قوم اور کسی نہ کسی زمانہ میں آئے ہیں وہ اُن خصوصیات سے ہمیشہ ممتاز ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خدا نے کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے کلام وارشاد سے مفتخر اور اپنے اِحکام سے مطّلع فرمایا ہے۔ ان کے ادراک و احساس کی قوتوں کو اس قدر بلند کیا کہ عام انسانوں کو جو چیزیں نظر نہیں آتیں ان کو نظر آئی ہیں۔ عام بشر جن آوازوں کو نہیں سُن سکتے وہ ان کو سُنائی دی ہیں۔ ملائکۂ الٰہی خدا کے قاصد بن کر ان کے پاس آئے ہیں۔ صداقت کے لحاظ سے ان کے خواب اور بیداری کا ایک ہی عالم رہا ہے۔ کیونکہ گو ان کی آنکھیں سوتی ہیں[1] لیکن ان کے دل نہیں سوتے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے کوئی نہ کوئی نشانی بھی عطا فرمائی ہے[2]۔

آنحضرت ؐ چونکہ افضل الرسل اور خاتم النبیین تھے اس لئے ان خصوصیات میں سے ہر خصوصیت کا وافر حصہ آپؐ کو عنایت ہوا تھا۔ اسی لئے مکالمۂ الٰہی، نزولِ

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب صفۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وکتاب توحید باب وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا

[2] صحیح بخاری باب الاعتصام۔

ملائکہ، مشاہدۂ خواب و بیداری وغیرہ خصائصِ نبوت کے واقعات آپؐ کی سیرت میں دوسرے انبیاءؑ کی سیرتوں سے بیشتر اور کامل تر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اُن کے اشارات اور احادیث صحیحہ میں اُن کی تفصیلات مذکور ہیں۔ مختلف انبیاءؑ میں ان خصائص کا کم و بیش ہونا بھی قرآن مجید کا فیصلہ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	ان پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے
عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ	فضیلت بخشی ہے۔ ان میں سے بعض سے
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا	خدا نے باتیں کیں اور بعضوں کے رتبے بلند
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ	کئے اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو ہم نے کھلی
اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ	نشانیاں دیں اور روح القدس کے ذریعہ
(البقرۃ: ۲۵۳)	سے اس کی تائید کی۔

دیکھئے کہ مکالمۂ الٰہی، رفعِ درجات، عطائے نشان، تائید بروحِ القدس یہ چاروں باتیں ایسی ہیں جن سے خدا کا کوئی فرستادہ محروم نہ تھا۔ تاہم چونکہ ان میں سے ہر چیز تمام پیغمبروں میں یکساں نہ تھی بلکہ بعض کو اُن میں سے کسی چیز کا حصہ وافر دیا گیا تھا اور بعض کو کوئی دوسری چیز زیادہ ملی تھی اس لئے ہر پیغمبر کی طرف اس خاص چیز کی نسبت مخصوص طور سے کی گئی ہے جس کا ان کی قسمت میں بڑا حصہ آیا تھا۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ نبوت کے ان خصائص سے کوئی پیغمبر محروم بھی تھا۔

ان خصائص میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ زور وحی اور نزولِ ملائکہ پر دیا ہے۔ ہر جگہ رسول اور نبی کی گویا تعریف ہی یہی کی ہے کہ ایک ایسا انسان جس کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے منتخب کیا ہو اور اس پر اپنی وحی نازل کی ہو۔ چنانچہ سورۂ نحل اور

سورۂ انبیا میں تمام پیغمبروں کا مشترک وصف یہ بتایا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا	اور ہم نے اپنا قاصد بنا کر تم سے پہلے کسی پیغمبر
رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ	کو نہیں بھیجا لیکن وہ وہ انسان تھے جن کی
(یوسف : ۱۰۹)	طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی ۔

نزولِ ملائکہ کی نسبت بھی خدا نے یہ فرمایا کہ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو اس لئے اتارتا ہے تاکہ وہ اس کی بات کو اُن تک پہنچا دیں :

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ	خدا اپنی بات کی روح دے کر اپنے بندوں
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ	میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو نازل
(النحل : ۲)	کرتا ہے ۔

ان کے علاوہ رویت و مشاہدۂ غیب اور سیر ملکوت کے احوال و مشاہد کا بھی اکثر انبیاءؑ کے سوانح زندگی میں ان کے درجوں اور رتبوں کے مطابق پیش آنا اسفار و کتبِ الٰہی سے ثابت ہے جیسا کہ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے ناظرین پر روشن ہوگا ۔

مکالمۂ الٰہی

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (الشوریٰ:۵۱)

(اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے دوبدو کلام کرے۔ لیکن وحی کے ذریعے یا پردہ کی آڑ سے)۔

پیغمبروں کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت مکالمۂ الٰہی ہے۔ قرآن مجید میں بار بار پیغمبروں کے ساتھ مخاطبۂ ربانی اور مکالمۂ الٰہی کی تصریح ہے اور مجموعہ توراۃ میں ہر پیغمبر کے متعلق اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

خدا انبیاءؑ سے کلام کیوں کر کرتا ہے؟ قرآن مجید کی ایک آیت میں اس کی حسبِ ذیل تصریح ہے:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	دوبدو کلام کرے۔ لیکن وحی کے ذریعہ سے یا
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	پردہ کی آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے
مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○	اور اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے
(الشوریٰ : ۵۱)	پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں مکالمۂ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ کلام بالوحی، کلام پسِ پردہ اور کلام بذریعۂ قاصد و فرشتہ۔ ان ہر سہ اقسام میں سے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے مشرف کیا گیا ہے۔ بعض پیغمبروں کو خصوصیت کے ساتھ کلام پس پردہ کے شرف سے

ممتاز کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان کے فضائل میں کلامِ الٰہی کی فضیلت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کہ ان کی شان میں

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ (النسآء : ۱۶۴) — خدا نے موسیٰؑ سے باتیں کیں

کی تصریح ہے۔ ان کو وادیٔ سینا کے ایک درخت سے خدا کی آواز سنائی دی۔ سورۂ بقرہ میں اس خاص طریقۂ کلام کے دائرہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے۔ چنانچہ پیغمبروں کے وصف میں خدا نے فرمایا :

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ۝ (البقرۃ : ۲۵۳) — ان پیغمبروں میں سے بعض سے خدا نے باتیں کیں۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ تصریح نہیں کہ کن پیغمبروں کو خدا تعالیٰ نے اس مخصوص طریقہ کلام سے مشرف کیا۔ اس لئے اس شرفِ خاص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دوسرے انبیاءؑ بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ کو مکالمۂ الٰہی کے تینوں مذکورہ طریقوں سے خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بلکہ واقعۂ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے جہاں حبیب و محبوب کے درمیان قاصد و پیامبر سرے سے بیگانہ تھے۔ جہاں زمان و مکان اور جلوۂ و نگاہ کی شرکت بھی مُخِلِّ تنہائی تھی۔ جہاں نہ کوہِ سینا تھا، نہ برقِ طور و دشتِ ایمن تھا، نہ نخلِ وادی، صوتِ سرمدی سامعہ نواز تھی اور حقیقتِ محمدیؐ گوشِ سامع فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى[1] (پھر اس نے اپنے بندہ سے چپ چاپ باتیں کیں جو باتیں کیں)

[1] النجم : ۱۰۔

وَحیُ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم:۳،۴)

(وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس کو بھیجی جاتی ہے۔)

گو مکالمۂ الٰہی کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے ایک وحی بھی ہے لیکن اسلام کے محاورہ میں وحی کا مفہوم اس قدر وسیع کر دیا گیا ہے کہ مکالمۂ الٰہی کی تمام صورتیں اس کے تحت داخل ہو گئی ہیں۔ وحی کے معنی لغت میں حسبِ ذیل ہیں:۔

الوحی الاشارۃ و الکتابۃ و	وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا،
الرسالۃ و الالھام و الکلام	دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا
الخفی وکل ما القیتہ الیٰ غیرك۔	اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال
(لسان العرب)	میں ڈالو۔

لکھنا۔ عجاج کا شعر ہے ؎

حَتّٰی نحاھم جُدنا و النا حی

لقدر کان وحاہ الو احی

خط اور کتاب۔ لبید کہتے ہیں ؎

فمدافع الریان عری رسمہ خلقا کما ضمن الوحیّ سلامھا

توریان پہاڑ کے نالوں کے آثار پرانے ہو کر ایسے دھندلے ہو گئے جیسے پتھر میں لکھی ہوئی عبارت۔

حکم دینا۔ حجاج کہتا ہے ؎

وحی لھا القرار فاستقرت　　وشدّ ھا بالراسیات الثّبت

زمین کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئی　　اور اُسے جمے ہوئے پہاڑوں سے جکڑ دیا۔

چھپا کر بات کرنا۔ ابو ذویب کا شعر ہے ؎

فقال لھا وقد اوحت الیہ　　الا للہ امك ما تعیف

اس مرد نے کہا جب عورت نے اس سے پوشیدہ طریقہ پر گفتگو کی کہ تیری ماں کا کیا کہنا وہ کیا فالِ بد لیتی ہے۔

اشارہ کرنا ؎

یوحی الیہ بانقاض ونقنقة

وہ مرغ اس مرغی کی طرف کڑکڑا کے اشارہ کرتا ہے

آواز۔ ابو زبید ؏

مرتبحز الجوف بوحیٍ اعجمٍ

گھوڑے کے پیٹ سے نہ سمجھنے والی آواز آتی ہے

لیکن اہلِ لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی "دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں"۔ کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے کہ وحیت الیہ بالکلام واوحیہ الیہ ھو ان تکلمہ بکلام تخفیہ من غیرہ۔ (یعنی کسی سے اس طرح بات کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ) ابو اسحاق لغوی کہتا ہے۔ واصل الوحی فی اللغة کلھا اعلام فی خفاء (وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں "چھپا کر اطلاع دینے" کے ہیں)۔

قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے :-

۱- فطری حکم :

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ	تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں
(النحل : ۶۸)	کو "وحی" کیا ۔
بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا ۝	اس لئے کہ تیرے پروردگار نے (زمین)
(الزلزال : ۵)	کو وحی کیا"

عجاج کے اس شعر میں بھی یہی معنی ہیں ؎

وحی لها القرار فاستقرت وشدها بالراسیات الثبت

خدا نے زمین کو ساکن رہنے کی "وحی" کی تو وہ ساکن ہے اور اس کو مضبوط پہاڑوں سے باندھ دیا ہے ۔

۲- دل میں بات ڈال دینا :

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَی الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ	اور جب میں نے حواریوں کو "وحی"
اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۚ	کیا کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان
(المائدۃ : ۱۱۱)	لاؤ ۔
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ	اور ہم نے موسیٰؑ کی ماں کو "وحی"
اَرْضِعِيْهِ ۚ	کیا کہ اس بچہ کو دودھ پلاؤ ۔
(القصص : ۷)	

۳۔ چپکے بات کرنا :

یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ	یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی بات "وحی کرتے ہیں"۔

(الانعام : ۱۱۲)

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِهِمْ	اور یہ شیطان لوگ اپنے دوستوں کو "وحی کرتے ہیں"۔

(الانعام : ۱۲۱)

وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ "منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا"۔ یا اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر پوشیدہ ادا ہوں کہ دوسرے اُن کو نہ سُن سکیں۔ اس لئے اشارہ کرنا، لکھنا، دل میں ڈال دینا، حکمِ فطری، خط اور کتابت اور جانوروں کا اپنی حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا، سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔ بہرحال اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا لفظ جس مذہبی معنی میں مستعمل ہے وہ درحقیقت لغوی معنی کے بہت قریب ہے۔ چنانچہ خود شعرائے جاہلیت نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

آنحضرتؐ کے مکالمۂ الٰہی اور وحی کا آغاز رویا اور خواب سے ہوا۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے :

اول ما بدئ بہٖ رسول اللہ	آنحضرتؐ کے ساتھ وحی کا آغاز

صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحۃ فی النوم فکان لا یری رویا الا جاءت مثل فلق الصبح۔

اچھے خواب سے ہوا۔ آپؐ جو خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔

صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں حدیث ہے کہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپؐ پر وحی کیونکر آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت عنہ ما قال واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول۔

کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح میرے پاس آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے اور پھر یہ حالت دُور ہو جاتی ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں اور کبھی وہ فرشتہ (جبریلؑ) میرے لئے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اس کو میں محفوظ کر لیتا ہوں۔

صلصلۃ الجرس یعنی "گھنٹہ کی آواز کی طرح آواز کا آنا" اس کی تشریح متکلمین اور اربابِ باطن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ لیکن ہم اس کا صاف اور صریح مطلب وہ سمجھتے ہیں جو عوام ہاتفِ غیب یا منادیٔ غیب کے لفظ سے سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ آواز سنائی دے لیکن کوئی صورت نظر نہ آئے۔ بانگِ جرس کے ساتھ اس کی تشبیہ محض اس بات میں ہے کہ جس طرح دور سے جرس کی آواز سنائی دیتی،

ہے اور اس کے متعیّنہ اشاروں سے انسان کچھ سمجھ جاتا ہے، حالانکہ جرس یا اُس کے بجانے والے کی شکل آنکھوں سے اوجھل یا بہت دور ہوتی ہے، اسی طرح پیغمبر کبھی کبھی دور سے منادیٔ غیب کی آواز سُنتا ہے لیکن کوئی مجسّم شکل اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ اسی کے بالمقابل آپؐ نے وحی کی دوسری صورت یہ بیان فرمائی کہ بولنے والا فرشتہ مجسّم ہوکر سامنے آتا ہے اور وہ باتیں کرتا ہے۔

حدیثوں میں طریقۂ وحی کی اور صورت بھی آئی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ان روح القدس نفث فی روعی — روح القدس نے میرے دل میں پھونکا۔

اور کہیں یہ صیغۂ مجہول کے ساتھ آیا ہے:

نفث فی روعی۔ — میرے دل میں پھونکا گیا۔

حافظ ابنِ قیّم نے ان ہی حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر وحی کی حسبِ ذیل قسمیں قرار دی ہیں:-

۱۔ رویائے صادقہ — سچ خواب دیکھنا۔

۲۔ نفث فی الروع یا القاءٌ فی القلب — دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا۔

۳۔ صلصلۃ الجرس — گھنٹہ کی طرح آواز آنا۔

۴۔ تمثّل — فرشتہ کا کسی شکل میں متشکّل ہوکر نظر آنا۔

۵۔ فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا۔

۶۔ وہ طریقِ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا۔

۷۔ بلاواسطہ مکالمہ۔

صحیح بخاری بدء الوحی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تیسری صورت مجھ پر بہت سخت

ہوتی ہے اور پھر وہ شدت جاتی رہتی ہے۔ آپؐ پر وحی آتی تھی تو آپؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "وحی اُترنے کی حالت میں مَیں نے آپؐ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبینِ مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی"[1] ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ "وحی کی حالت میں آپؐ پر شدت کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ہوئی اور وحی کے بوجھ سے جاڑوں میں آپؐ کی پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے[2] ڈھلکنے لگے"۔ صحابہؓ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسمِ مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا۔ سواری کے اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے۔[3] حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ پر وحی آئی اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔[4] یعلی بن امیہؓ ایک صحابی تھے۔ ان کو بڑا شوق تھا کہ ایک دفعہ نزولِ وحی کے عالم میں وہ آپؐ کی زیارت کرتے۔ اتفاق سے حج کے سفر میں ان کو یہ سعادت نصیب ہو گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا ہے اور آپؐ خراٹے لے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ حالت رفع ہو گئی۔[5]

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو بے چینی ہوتی، چہرہ کا رنگ بدل جاتا۔ آپؐ سر جھکا لیتے۔ صحابہؓ جو آپؐ کے ساتھ بیٹھے ہوتے وہ بھی سر نیچے کر لیتے۔ وحی کے بعد آپؐ سر اٹھاتے۔[6]

---

[1] بخاری، بدُ الوحی۔ [2] بخاری واقعۂ افک۔ [3] مسند ابنِ حنبل بسند عائشہؓ و مستدرک حاکم تفسیر سورۂ مزمّل۔
[4] صحیح بخاری و جامع ترمذی تفسیر سورہ نساء۔ [5] صحیح بخاری کتاب الحج، باب کیف نزل الوحی۔ [6] صحیح مسلم باب عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

فرشتہ کی زبانی سب سے پہلی وحی غارِ حرا میں آئی۔ اس وقت عمر شریف چالیس برس کی تھی اور اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کی ابتدائی آیتیں اس مکتب کا اوّلین درس تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وحی کا سلسلہ رُکا رہا۔ آپؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ ابنِ اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں:

وَالضُّحٰی ۝ وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝ — قسم ہے دن کی جبکہ وہ پوری روشنی پر ہو اور

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی ۝ — قسم ہے رات کی جبکہ وہ سنسان ہو جائے کہ

(الضحیٰ: ۱-۳) — تیرے پروردگار نے نہ تجھ کو چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے اس نے اپنی محبت اٹھائی۔

لیکن صحیح بخاری تفسیر سورۂ والضحیٰ اور باب کیف نزل الوحی میں ہے کہ اس سورہ کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ آپؐ بیمار تھے۔ چند روز راتوں کو اُٹھ کر عبادتِ الٰہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت نے طعن سے کہا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ دو تین روز سے تیرے پاس نہیں آیا ہے"۔ اس پر یہ سورۂ نازل ہوا۔ اسی موقع پر دوسری روایت ہے کہ اس عورت نے کہا "میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے رفیق نے تم سے ملنے میں تاخیر کی ہے"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس کے بعد کسی اور زمانہ میں نازل ہوا ہے۔

تمام محدثین[1] کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی یعنی سلسلۂ وحی کے رک جانے

---

[1] اس کے برخلاف صرف حضرت جابرؓ کی حدیث ہے (بخاری باب بدء الوحی و باب کیف نزل الوحی) کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے سنا کہ سب سے پہلی وحی میں سورۂ مدثر کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ مگر اجماع عام یہ ہے کہ یہ حضرت جابرؓ کا وہم ہے۔ وہ آیتیں فترۂ وحی کے بعد سب سے پہلے اتریں۔

(فترہ) کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثّر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ آپؐ حرا سے واپس آرہے تھے کہ راہ میں ایک آواز سنائی دی۔ آپؐ نے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر آیا۔ آپؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تو کہا مجھے کمل اوڑھاؤ اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

(المدثر : ۱-۳)

اے گلیم پوش! اُٹھ اور لوگوں کو خدا سے ڈرا۔ اپنے رب کی کبریائی بیان کر۔

اس کے بعد مسلسل وحی نازل ہونی شروع ہوگئی[1] اور اس کا تار اس وقت تک نہ ٹوٹا جب تک حیاتِ طیبہ کا ظاہری سلسلہ منقطع نہ ہوگیا یعنی چالیس برس کے سن سے لے کر تریسٹھ سال کے سن تک کل تئیس برس نزولِ وحی کے ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ کے آخرِ عمر میں وحی کی کثرت ہوگئی تھی[2] محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تھی، اطرافِ ملک سے وفود کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے۔ اس لئے مخاطبہ الٰہی کی ترقّی بھی اس کے ساتھ ضروری تھی۔

صحابۂ کرامؓ وفاتِ نبویؐ کے بعد جب ان ایامِ سعادت کو یاد کرتے تھے جب مدینہ کی گلیاں روح الامین کی گزرگاہ اور مدینہ کے در و دیوار وحی کے مطلعِ انوار تھے، تو ان کی آنکھیں (اشک) آلود ہوجاتی تھیں۔ آنحضرتؐ کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی و تفسیر سورہ مدثر [2] صحیح بخاری کیف نزل الوحی۔

ایک بوڑھی صحابیہؓ تھیں، ان کی ملاقات کو تشریف لے جاتے تھے۔ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ سبب دریافت کیا تو کہا آہ! کہ آنحضرتؐ وفات پا گئے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ سن کر ان صاحبوں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔[1]

قرآن مجید نے وحی کی حقیقت کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ نبوت کی مرادف ہو گئی ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب میں نبوت کی حقیقت یا تو سراسر مفقود ہے اور یا یہ کہ اس کو انسانیت و بشریت کے پرتو سے اس قدر منزہ سمجھا ہے کہ اس کو الوہیت کا ہم رتبہ قرار دے دیا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے آنحضرتؐ کو کئی دفعہ اس اعلان کی تاکید کی ہے کہ

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف: ۱۱۰) (حٰمٓ السجدۃ: ۶)

کہدو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں (فرق یہ ہے) کہ میرے پاس وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

آنحضرتؐ جو کچھ خدا کی طرف سے لوگوں کو سناتے تھے وہ چیز آپؐ کے نفس و ارادہ سے نہیں اٹھتی تھی بلکہ خدا کی طرف سے اُن کے اندر آتی تھی:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳-۴)

وہ خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، بلکہ وہ وحی ہے جو اس کو بھیجی جاتی ہے۔

البتہ اس کا مورد اور مہبط آپؐ کا پاک اور منزہ قلب تھا:

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

اُسی نے اِس کو تمہارے قلب پر خدا

---

[1] صحیح مسلم فضائل حضرت ام ایمنؓ۔

(البقرۃ : ۹۷) کے حکم سے اتارا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ (الشعراء : ۱۹۳-۱۹۴) روح الامین نے اس کو تیرے قلب پر اتارا ہے۔

اور یہی مجموعۂ وحی آپؐ کی نبوت کا بڑا معجزہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ "دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا لیکن اس کو ایسی چیز دی گئی جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے۔ لیکن مجھے جو چیز دی گئی وہ وحی ہے جو مجھ پر اتاری گئی"[1]

سرمایۂ وحی کی جو دولت اسلام کو ہاتھ آئی، وہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں میں اب تک محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گنجِ گرانمایہ حدیث صحیحہ کے اوراق میں مخزون ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اتنا ہی اور"[2] یعنی وہ احکام و مواعظ جن کو جان نثاروں نے حرزِ جان بنا کر رکھا اور دوسروں کو سپرد کیا۔ یعلی بن امیہؓ صحابی حجۃ الوداع کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جعرانہ میں آپؐ تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑوں میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی۔ آنحضرتؐ نے کسی قدر انتظار کیا۔ آپؐ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ جب وہ کیفیت زائل ہوئی تو آپؐ نے دریافت کیا کہ وہ آدمی کہاں گیا۔ لوگ اس کو سامنے لائے۔ آپؐ نے فرمایا جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو اتار ڈالو، پھر حسبِ معمول عمرہ ادا کرو"[3]

---

[1] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی و صحیح مسلم کتاب الایمان۔ [2] ابو داؤد کتاب السنۃ۔
[3] صحیح بخاری باب نزول القرآن۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا ہے کہ کوئی انسان اُس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ اپنی روزی پوری نہ کرے تو لوگو خدا سے ڈرو اور روزی کی تلاش میں صحیح طریقہ کو کام میں لاؤ۔ رزق میں تاخیر تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ گناہ کے ذریعوں سے روزی تلاش کرو کیونکہ جو خدا کے پاس ہے وہ اس کی بندگی ہی سے مل سکتا ہے"[1] حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "مجھ سے جبریلؑ نے کہا کہ آپؐ کی امت میں جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہیں کیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا"[2]

اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے" یا "خدا نے مجھ سے یہ کہا ہے"۔ لیکن وہ قرآن مجید کے اجزا نہیں ہیں۔ اسی لئے فقہا نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں۔ وحی متلو یعنی وہ وحی جو تلاوت کی جاتی ہے یعنی قرآن اور وحی غیر متلو جو تلاوت نہیں کی جاتی۔ مثلاً وہ احکام و نصائح جو بروایتِ صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ پہلی وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تواترِ روایت سے ثابت ہے اور وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے۔

دوسری قسم تواتر سے بہت کم مروی ہے اور وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے خدا کا ارشاد ہے۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد دوم۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز و باب بدء الخلق۔

نزول ملائکہ

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (الحج: ۷۵)

(خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغام بر منتخب کرتا ہے)

لفظ ملائکہ "کا واحد "مَلَاک" ہے جو عربی کے قاعدہ سے "ملک" ہوگیا ہے۔ یہ الوکۃ سے مشتق ہے جس کے معنی "پیغام" کے ہیں۔ اس لئے ملائکہ کے معنی پیغام رساں اور قاصد کے ہیں۔

ملائکۂ الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان قاصد ہیں۔ قرآن مجید نے متعدد مقام پر ان کو رُسُل اور رُسُل اللہ یعنی قاصدانِ الٰہی کہا ہے:

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا	خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغام بر
(الحج: ۷۵)	منتخب کرتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ خدا کے حکم سے عالم کی مشین کے پرزوں کو ہلاتے اور چلاتے ہیں اور اسی لئے خدا نے ان کو مدبّراتِ امر[1] کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ ان کی مخصوص صفت یہ ہے کہ خدا کے سراپا مطیع ہیں اور اس کے کسی امر یا اشارہ سے کبھی روگردانی نہیں کرتے:

عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا	اس پر سخت اور مضبوط فرشتے ہیں اللہ

---

[1] النازعات: ۵۔

يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○ (التحریم: ۶)

ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس سے روگردانی نہیں کر سکتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

انبیاءؑ کی تمام سیرتیں فرشتوں کی آمد، اُن کی بشارت اور نصرت سے معمور ہیں۔ تورات اور انجیل و قرآن ہر کتابِ الٰہی اُن کے کارناموں کی شاہد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی بارگاہ میں انہوں نے سجدہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان خانہ میں یہ بھیجے گئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی حفاظت اور ان کی قوم کی بربادی پر یہ مامور ہوئے۔ حضرت ہاجرہؑ کو بیابان میں یہ نظر آئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خیمہ میں ان کا دنگل ہوا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے مناظرۂ جبر و اختیار میں حَکَم یہ قرار پائے۔ حضرت زکریا علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کو بشارت انہوں نے دی۔ آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں بھی یہ مختلف فرائض پر مامور ہوئے۔ یہ آپؐ کی خدمت میں احکامِ الٰہی کے قاصد تھے۔ دشمنوں سے وجودِ اقدس کی محافظت ان کے سپرد تھی۔ کمزور اور ناتواں مسلمانوں کی دستگیری ان کا فرض تھا۔

ملائکہ کے سرخیل جبریلؑ ہیں اور وہی خدا اور پیغمبروں کے درمیان سفارت پر مامور ہیں اور یہی آنحضرتؐ کی خدمت میں بھی آکر سفارت کا فرض انجام دیتے تھے اور خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔

نزول جبریلؑ "جبریل" عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی "مردِ خدا" کے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحِ شریعت میں اس فرشتہ کا نام ہے جو خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے۔ توراۃ اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے مستعمل ہوا

ہے۔ چنانچہ دانیال (۸ - ۱۶ - ۱۹ - ۲۱) میں اس کی پیغامبری کا بیان ہے۔ اسی طرح انجیل (لوقا - ۱ - ۱۹ - ۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت اور حضرت مریم کے پاس حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بشارت لے کر آیا تھا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو آنحضرتؐ اور خدا کے درمیانی وحی کا ایلچی تھا وہ یہی جبریلؑ تھا:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرۃ: ۹۷)	جو جبریلؑ کا دشمن ہو وہ ہو کیوں کہ (اے پیغمبر) اُس نے خدا کے حکم سے تیرے دل پر اِس کو نازل کیا ہے۔

اور کہیں اسی کو الروح الامین (امانت دار روح) سے تعبیر کیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ (الشعرآء ۱۹۳-۱۹۴)	امانت دار روح اس کو لے کر تیرے دل پر اُتری تاکہ تو لوگوں کو خدا کے خوف سے ڈرانے والوں میں ہو۔

سورۂ نحل میں اس کو روح القدس (پاکی کی روح) کہا گیا ہے:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (النحل: ۱۰۲)	کہدو کہ اِس کو روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اُتارا ہے۔

رسول (فرستادہ) کا لفظ بھی اس کی شان میں استعمال کیا گیا ہے:

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ (الحاقۃ: ۴۰)	یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے۔

سورۂ تکویر میں اس "رسول" کی متعدد صفات کا بھی ذکر ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ	یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے جو
قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ	قوت والا ہے اور تخت والے خدا کے حضور میں
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝	اس کا اعتبار ہے۔ اس کی سب اطاعت کرتے
(التکویر: ۱۹-۲۱)	ہیں اور وہ امانت والا ہے۔

سورۂ نجم میں اس کی کچھ اور صفات بھی مذکور ہیں:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ	اس پیغمبر کو بڑی قوتوں والے اور بڑی
فَاسْتَوٰى	طاقت والے نے تعلیم دی۔

(النجم: ۵-۶)

آغازِ وحی کے واقعہ میں آنحضرتؐ نے جبریل کے لئے اَلْمَلَكُ کا لفظ فرمایا ہے اور ورقہ نے اس کو "ناموس" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ مَلَكٌ کی اصل جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے، ملأك ہے جو الوکہ سے نکلا ہے اور جس کے معنی پیغام کے ہیں۔ اس لئے مَلَكٌ کے معنی پیغامبر کے ہوئے۔ اور لفظ ناموس کے معنی محرمِ اسرار اور رازداں کے ہیں۔ بہرحال یہ تمام مختلف الفاظ اور عنوانات ایک ہی مفہوم و معنی کو ادا کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں جبریلؑ کا نام تین مقام پر آیا ہے۔ دو جگہ سورۂ بقرہ میں اور ایک جگہ سورۂ تحریم میں۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ وحیٔ محمدیؐ کے پیامبر اور قرآن کے حامل ہیں۔ صرف ایک ہی موقع پر قرآن مجید نے اِس نام سے اُن کو یاد کیا ہے اور وہ اس آیت میں:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ	جو جبریلؑ کا دشمن ہو وہ ہو کیونکہ (اے پیغمبر)
نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ	اس نے تو تیرے قلب پر خدا کے حکم سے
(البقرۃ : ۹۷)	اس کو اتارا ہے۔

دوسری آیتوں میں قرآن مجید نے حاملِ قرآن فرشتہ کی تعبیر (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) روح الامین، روح القدس اور رَسُوْلٌ کَرِیْمٌ کے الفاظ سے کی ہے۔ لیکن احادیث اور روایات میں ان الفاظ کے بجائے جبریلؑ ہی کا لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے۔

ایک پیامبر کی حیثیت سے آنحضرتؐ کی خدمت میں جبریلؑ کی سب سے پہلی آمد اس وقت ہوئی ہے جب آپؐ غارِ حرا میں معتکف تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ واقعہ ان الفاظ میں ادا ہوا ہے :-

آنحضرتؐ کی وحی کا آغاز خواب میں رویائے صالحہ سے ہوا۔ آپؐ جو رویا دیکھتے تھے وہ سپیدۂ سحر کی طرح (سچا ہو کر) نمودار ہوتا تھا۔ پھر (طبیعتِ مبارک میں) تخلیہ پسندیدہ کیا گیا۔ غارِ حرا میں جا کر آپؐ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے جاتے تھے۔ جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور پھر نیا سامان لے کر غارِ حرا میں چلے جاتے۔ یہاں تک کہ حق آپؐ کے سامنے آگیا اور وہ فرشتہ آپؐ کے سامنے آگیا اور اس نے کہا "پڑھ"۔ آپؐ نے فرمایا "میں پڑھا نہیں ہوں"۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اُس نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ "پڑھ"۔ میں نے پھر وہی جواب دیا۔ اس نے مجھے اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا اور چھوڑ دیا اور کہا کہ "پڑھ"۔ میں نے پھر کہا کہ "میں پڑھا نہیں ہوں"۔

اس نے تیسری دفعہ دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا :

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ	اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ۔ جس
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ	نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ	کیا۔ پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ
بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ	ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے سکھایا
یَعْلَمْ ۝	اور انسان کو وہ کچھ تعلیم کی جو نہیں
(العلق: ۱-۵)	جانتا تھا۔

آنحضرتؐ ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے۔ قلبِ مبارک پر لرزہ تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا "مجھے کمل اوڑھاؤ۔ مجھے کمل اوڑھاؤ"۔ لوگوں نے آپؐ کو کمل اوڑھایا۔ جب آپؐ کو سکون ہوا تو حضرت خدیجہؓ سے تمام ماجرا بیان کرکے فرمایا کہ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "ہرگز آپؐ کی جان کو خطرہ نہیں۔ خدا آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپؐ قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں۔ لوگوں کے بوجھ کو آپؐ خود اٹھاتے ہیں۔ فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں۔ مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ انصاف کی خاطر آپؐ لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں"۔ پھر آپؐ کو لے کر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی یا عربی لکھنا جانتے تھے (شاید توراۃ سے مراد ہو) اور انجیل کو عبرانی یا عربی میں لکھتے تھے[1] اور بہت بڈھے تھے اور آنکھوں

---

[1] دونوں روایتیں ہیں۔ ایک میں ہے کہ عبرانی میں لکھتے تھے اور دوسری میں ہے کہ عربی میں لکھتے تھے۔

کی روشنی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "اے ابن عم! اپنے بھتیجے کا ماجرا سنیے۔" ورقہ نے کہا "اے میرے بھتیجے! ہاں بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو"۔ آنحضرتؐ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (محرم اسرار) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اتارا گیا تھا۔ اے کاشکہ میں اِس وقت جوان ہوتا۔ اے کاشکہ میں اُس وقت زندہ ہوتا جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دے گی۔" آپؐ نے پوچھا "کیا میری قوم مجھ کو نکال دے گی؟" اُس نے جواب دیا۔ "ہاں جو کچھ تم لے کر آئے ہو اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو۔ اور اگر اس زمانہ تک میں زندہ رہا تو تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔" اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ورقہ نے وفات پائی۔[1]

اس کے بعد جبریلؑ کی آمد رُکی رہی اور آپؐ بدستور غارِ حرا میں جاتے رہے۔ اسی اثنار میں ایک دن آپؐ غارِ حرا سے نکل کر اور پہاڑی سے نیچے اتر کر جب میدان میں پہنچے تو غیب سے ایک آواز آئی۔ آپؐ نے فرمایا "میں نے آگے پیچھے، دائیں بائیں دیکھا پھر نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف کی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو پہلے غارِ حرا میں نظر آیا تھا آسمان اور زمین کے بیچ میں تخت پر بیٹھا ہے۔ میں مرعوب ہو کر گھر واپس آیا۔"

اس کے بعد حضرت جبریلؑ کی پے در پے آمد شروع ہوئی۔

جبریلؑ جب وحی لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آتے تو آپؐ جلد جلد اپنی زبان سے ان کے الفاظ کو ادا کرنے لگتے۔ اس پر حکم ہوا۔[2]

---

[1] صحیح بخاری، بدء الوحی و کتاب التعبیر و تفسیر سورۂ مدثر میں یہ پورا واقعہ مفصل مذکور ہے۔ میں نے ان تینوں روایتوں کو تسلسل کے لئے یکجا کر دیا ہے۔ چونکہ استاد مرحوم نے جلد اوّل میں ان تفصیلات کو قلم انداز کر دیا تھا اس لئے یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ [2] صحیح بخاری، باب بدء الوحی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ (القیٰمۃ : ۱۶-۱۷)	وحی کے الفاظ کے ساتھ اپنی زبان کو عجلت طلبی کے لئے جنبش نہ دو اس کی حفاظت اور قرأت کا فرض ہم پر ہے۔

اس کے بعد جب جبریلؑ نازل ہوتے تو آپؐ خاموشی سے سُنتے اور ان کے چلے جانے کے بعد آپؐ اس کو پڑھتے۔

بارگاہِ نبویؐ میں جبریلؑ کے آنے کا کوئی وقت متعین نہ تھا۔ صبح و شام، روز و شب صلح و جنگ ہر وقت فیضانِ الٰہی کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نصف شب کو سوتے تھے کہ اٹھ کر بقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے۔ صبح کو آپؐ نے فرمایا "رات جبریلؑ نے مجھے پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع جاکر لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگوں[1]"۔ غزوۂ بدر میں آپؐ نے فرمایا کہ "دیکھو یہ جبریلؑ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں[2]"۔ غزوۂ خندق سے جب مسلمانوں کی فوج لے کر آنحضرتؐ واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبریلؑ نے سامنے آکر کہا کہ آپؐ نے ہتھیار کھول دیئے۔ حالانکہ ہم اب تک مسلح ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا صلہ دینا ہے[3]"۔ بایں ہمہ سب سے زیادہ جبریلؑ کی آمد آپؐ کے پاس ماہِ رمضان میں ہوتی تھی جس میں وہ ہر روز آکر آپؐ سے قرآن مجید سُنتے تھے اور خود آپؐ کو سُناتے تھے[4]۔

جبریلؑ اُس وقت بھی آتے تھے جب آپؐ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوتے تھے۔ لیکن جو کچھ آپؐ دیکھتے اور سُنتے تھے وہ عموماً اوروں کو دکھائی اور سُنائی نہیں دیتا تھا، ایک

---

[1] نسائی، باب الاستغفار للمومنین۔ [2] صحیح بخاری، غزوہ بدر۔ [3] صحیح بخاری، غزوہ خندق۔
[4] صحیح بخاری، باب بدء الوحی۔

دفعہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "اے عائشہؓ! جبریلؑ تم پر سلام بھیجتے ہیں"۔ انہوں نے کہا "یا رسول اللہؐ! آپؐ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی"[1] تورات میں انبیائے بنی اسرائیلؑ کے قصوں میں اس فرشتۂ غیب کے تجسّم اور تشکّل کے بکثرت واقعات مذکور ہیں۔ انجیل میں ہے کہ روح القدس کبوتر کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرتؐ لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آکر آپؐ کے پاس بیٹھا اور سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، خدا سے ملنے پر، اور اس کے پیغمبروں پر، اور قبر سے پھر جی اٹھنے پر تم یقین رکھو"۔ اس نے پھر پوچھا کہ "اسلام کیا ہے"؟ جواب دیا یہ کہ "تم خدا کی اطاعت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور نماز پڑھو، زکوٰۃ مفروضہ دو، روزے رکھو"۔ اس نے کہا "اور احسان کیا ہے"؟ ارشاد ہوا۔ "احسان یہ ہے کہ تم خدا کو اس طرح پوجو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔ اس نے پھر سوال کیا کہ "قیامت کب آئے گی"؟ آپؐ نے فرمایا "مجیب اس باب میں سائل سے زیادہ واقف نہیں البتہ میں تمہیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں۔ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں۔ قیامت کا علم اُن پانچ باتوں میں ہے جن کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا"۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی:-

---

[1] صحیح بخاری، باب بدء الخلق۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج قیامت کا علم خدا ہی کو ہے۔

(لقمٰن ۳۴)

وہ شخص اس کے بعد اٹھ کر چلا تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ذرا اس کو واپس بلا لو۔ لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ آپؐ نے فرمایا: "یہ جبریلؑ تھے۔ جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔"[1]

صحابہ میں دحیہؓ نام ایک صحابی بہت حسین تھے۔ جبریلؑ اکثر ان ہی کی صورت مجسم ہو کر آیا کرتے اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آجاتے تھے۔ حضرت امِ سلمہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ دحیہؓ آپؐ کے سامنے بیٹھے آپؐ سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ بھی شک نہ ہوا کہ یہ دحیہؓ نہیں ہیں۔ اتنے میں مسجد نبویؐ میں میں نے آپؐ کے خطبہ کی آواز سُنی کہ آپؐ فرما رہے تھے کہ ابھی میرے پاس جبریلؑ آئے۔ امِ سلمہؓ کہتی ہیں تب میں سمجھی کہ وہ اصل میں دحیہؓ نہیں بلکہ جبریلؑ امین تھے۔[2]

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جبریلؑ کو آنحضرتؐ نے ان کی اصلی شکل میں دو دفعہ ملاحظہ فرمایا۔[3] ایک دفعہ تو معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور دوسری دفعہ ایک اور مقام پر وہ آسمان کے کناروں میں نظر آئے۔ سورۂ نجم کی یہ آیتیں اسی کے متعلق ہیں:

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ	بڑی قوتوں والے طاقتور نے اسکو سکھایا
فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ	پھر وہ برابر ہوا۔ پھر وہ بہت اوپر آسمان کے
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ	کنارہ تھا۔ پھر قریب ہوا۔ پھر لٹک آیا تو

---

[1] صحیح بخاری باب الایمان [2] صحیح بخاری کیف نزل الوحی [3] صحیح بخاری، تفسیر سورۂ والنجم و صحیح مسلم، معراج۔

قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى
عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ
الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ
عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً
اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝

(النجم: ۵-۱۴)

دو کمانوں کے بقدر تھا یا اس سے بھی قریب تر۔
تو خدا نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ دل نے
جھوٹ نہیں کہا جو دیکھا۔ کیا تم لوگ اس سے
اس کے مشاہدہ پر جھگڑتے ہو حالانکہ اُس نے
اس کو دوسری دفعہ اترتے دیکھا سدرہ المنتہیٰ
کے پاس۔

سورۂ تکویر کی حسبِ ذیل آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار آپؐ کو مجنوں اسی لئے کہتے تھے کہ آپؐ اس غیر مشاہد ہستی کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتے تھے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ
مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝
وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَ
لَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝

(التکویر: ۱۹-۲۳)

ایک بزرگ پیغام رساں کی بات ہے۔ قوت
والا جو عرش والے خدا کے پاس معتبر
ہے۔ وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔
وہ امانت دار ہے۔ تمہارا ساتھی (یعنی پیغمبر) مجنوں
نہیں ہے۔ یقیناً اس کو آسمان کے
کھلے کنارہ میں دیکھا۔

وہ ذوق وشوق جو حضورؐ کو اس قاصدِ الٰہی کی آمد کے ساتھ تھا وہ اس آرزو کی شکل میں ظاہر ہوا کہ آپؐ نے جبریلؑ سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آیا کرتے۔ جواب ملا[1]:

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ

ہم تو تیرے پروردگار کے حکم اور

---

[1] صحیح بخاری، تفسیر آیہ وما نتنزل۔ الخ

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا	اجازت سے اترتے ہیں ہمارے آگے
وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ	اور پیچھے اور درمیان سب کا علم اسی کو
رَبُّكَ نَسِيًّا ۝	ہے اور تیرا رب بھول چوک سے پاک
(مریم : ۶۴)	ہے۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شب کو میں نکلا تو دیکھا کہ آنحضرتؐ تنہا چاندنی میں ٹہل رہے ہیں۔ میں سمجھا کہ شاید آپؐ اس وقت تنہائی چاہتے ہیں اور کسی اور کا یہاں ہونا پسند نہ فرمائیں گے۔ چنانچہ اسی خیال سے میں سایہ میں ہو گیا۔ لیکن آپؐ کی نگاہ پڑ گئی۔ پوچھا کون ہے؟ عرض کیا "آپؐ پر قربان۔ میں ہوں ابوذرؓ"۔ آپؐ نے ساتھ لے لیا اور تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے۔ پھر فرمایا "جو آج دولت مند ہیں وہی کل قیامت میں غریب ہوں گے لیکن وہ شخص کہ جس کو خدا نے جو دولت دی ہو وہ اس کو داہنے، بائیں، آگے، پیچھے پھینک دے اور اس میں نیکی کے کام کرے"۔ ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر تک ساتھ ٹہلتا رہا۔ اس کے بعد ایک خاص جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرے رہو اور یہ کہہ کر آپؐ پہاڑ کی طرف گئے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے دور سے آواز سُنی تو میں ڈرا۔ لیکن چونکہ آپؐ نے حکم دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے نہ ٹلوں اس لئے ٹھہرا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپؐ سامنے سے نظر آئے اور زبانِ مبارک سے یہ فرما رہے تھے کہ "اگرچہ چوری کرے اور زنا کرے"۔ میں نے کہا "یا رسول اللہؐ! آپؐ پر قربان ہوں۔ آپؐ پہاڑی کی اوٹ میں کس سے باتیں کر رہے تھے"؟ فرمایا کیا تم نے آواز سُنی؟ عرض کی "ہاں"۔ فرمایا "جبریلؑ تھے۔ پہاڑی کے بیچ میں مجھے نظر آئے اور کہا کہ اپنی اُمت کو خوشخبری سُنا دیجئے کہ جو اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا

شریک نہ بنایا ہو وہ جنّت میں داخل ہوگا۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا۔ یا جبریلؑ! کیا اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو؟ جواب دیا۔ ہاں۔ میں نے پھر کہا۔ اگرچہ زنا و چوری ہی کیوں نہ کی ہو۔ وہی جواب دیا کہ "ہاں"۔ میں نے پھر کہا کہ اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو تیسری دفعہ بھی جواب وہی تھا۔[1]

فرشتہ میکائیلؑ کا نزول جبریلؑ کے علاوہ دوسرے ملائکہ کا بھی آنحضرتؐ کی خدمت میں آنا ثابت ہے۔ قرآن مجید میں جبریلؑ کے علاوہ ایک دو اور فرشتوں کے بھی نام آئے ہیں۔ جن میں سے ایک میکائیلؑ ہیں۔ یہودیوں نے قرآن کے ماننے سے اس لئے اپنا انکار ظاہر کیا تھا کہ یہ جبریلؑ کی وساطت سے نازل ہوتا ہے۔ خدا نے اس کے جواب میں کہا:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ	جو خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس
وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ	کے پیغمبروں کا اور جبریلؑ اور میکائیل
اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○	کا دشمن ہو تو خدا ان کافروں کا دشمن
(البقرۃ: ۹۸)	ہے۔

یہودیوں کے اعتقاد میں یہ عرش الٰہی کے چار مخصوص فرشتوں میں سے ایک کا نام تھا۔ یہ خاص طور پر اسرائیل اور اس کے خاندان کا محافظ سمجھا جاتا تھا اور لڑائیوں میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔[2] عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہی فرشتہ تھا جو کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے ہمکلام ہوا تھا۔[3]

میکائیلؑ بھی آنحضرتؐ کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے ہیں۔ معراج کے موقع

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔ [2] دانیال: ۱۰-۱۳ و ۱۲۔ [3] اعمال۔ ۷-۳۸۔

پر جو دو فرشتے آئے تھے وہ جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے۔ اسی طرح غزوۂ اُحد میں جو دو فرشتے دشمنوں سے آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے وہ بھی، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت کے ابتدائی تین سالوں میں میکائیلؑ ہی آپؐ کے ساتھ تھے۔

عام ملائکہ کا نزول جبریلؑ اور میکائیلؑ کے ناموں کی تخصیص کے علاوہ دوسرے عام فرشتوں کا بلا تعیینِ نام آپؐ کی خدمت میں آنا بھی صحیح روایتوں سے ثابت ہے۔ اور ان ہی کی روحانی تائیدات کا اثر تھا کہ آپؐ کا دل ہر وقت سکینتِ الٰہی سے معمور رہتا تھا۔ آنحضرتؐ کے دوشِ مبارک پر جب نبوت کا بارِ گراں رکھا گیا تو یقیناً آپؐ کو نظر آتا ہوگا کہ ایک طرف بظاہر ایک بے دست و پا انسان ہے جس کے قبضہ میں نہ سونے چاندی کے خزانے ہیں اور نہ اس کے عَلَم کے نیچے خود اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا سپاہی ہے۔ اور دوسری طرف ایک دنیا ہے جس کے ہاتھوں میں دنیاوی دولت کے خزانے اُبل رہے ہیں اور جس کے پرچم کے زیرِ سایہ ہزاروں اور لاکھوں کا ٹڈی دل ہر وقت حق کے مٹانے کو آمادۂ پیکار ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب فرشتوں کو حکم پہنچا کہ میرے پیغمبر کو اپنی بشارتوں اور خوشخبریوں سے مطمئن کرو:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى	بے شک خدا اور اس کے فرشتے اس
النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا	پیغمبر پر رحمت بھیجتے ہیں اے مسلمانو!
عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝	تم بھی اس پر درود و سلام
(الاحزاب: ۵۶)	بھیجو۔

رئیسِ قریش اپنی قوت و طاقت پر نازاں ہو کر اعلان کرتا ہے کہ روسائے قریش

ہمارے ساتھ ہیں۔ پیغمبر کی طرف سے خدا منادی فرماتا ہے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ (العلق: ۱۷-۱۸)

وہ اپنی مجلس کے لوگوں کو بلائے۔ ہم بھی اپنے فرشتوں کو آوازیں گے۔

اس وقت جب منافقین آپؐ کی بزمِ خاص میں نفاق ڈالنا اور گھر میں خانہ جنگی کے سامان بہم پہنچانا چاہتے ہیں، بعض ازواج سے آپؐ آزردہ ہیں تو ارشاد ہوتا ہے:

فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ۝ (التحریم: ۴)

تو خدا پیغمبر کا والی و ناصر ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور اس کے بعد فرشتے اس کے مددگار ہیں۔

ایک بار ابوجہل نے کفار سے پوچھا کہ "کیا محمدؐ کبھی تمہارے سامنے سربسجود ہوتے ہیں؟" سبھوں نے کہا "ہاں"۔ اس نے کہا "لات و عزیٰ کی قسم! اگر میں ان کو سجدہ کرتے دیکھوں گا تو ان کی گردن توڑ ڈالوں گا اور ان کی پیشانی کو زمین میں رگڑ دوں گا"۔ چنانچہ ایک دفعہ جب آپؐ مصروفِ نماز تھے وہ اسی نیت سے آپؐ کی طرف بڑھا۔ لیکن فوراً سہم کر سیدھے پلٹ گیا۔ کفار نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ "میرے اور محمدؐ کے

اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے[1]۔

سفر طائف سے جب آپؐ ناکام واپس آرہے تھے تو حسبِ اقتضائے بشریٰ آپؐ دل شکستہ تھے۔ جب آپؐ قرن الثعالب میں پہنچے اور سر اٹھایا تو دیکھا کہ ابر کا ایک لکہ سایہ فگن ہے۔ اس میں آپؐ کو ایک فرشتہ نظر آیا جس نے پکار کر کہا "یا محمدؐ! میں پہاڑوں پر مؤکل (ملک الجبال) ہوں۔ آپؐ کے پروردگار نے آپؐ کی اور آپؐ کی قوم کی گفتگو سُنی مجھے بھیجا ہے کہ اگر آپؐ حکم دیں تو میں پہاڑوں کے نیچے ان کو کچل ڈالوں"۔ فرمایا کہ "شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو"[2]۔

اسلام کی تاریخ میں ابتلاء و امتحان کا سب سے زیادہ سخت اور سب سے پہلا موقع غزوۂ بدر میں پیش آیا۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو انیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھی لیکن اس شرذمۂ قلیلہ کے مقابلہ کے لئے کفار کا ٹڈی دل امڈا ہوا چلا آتا تھا۔ آنحضرتؐ نے جب اس منظر کو دیکھا تو قبلہ رو ہو کر درگاہِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دفعتہً ایک ہزار فرشتوں کی روحانی فوج مسلمانوں کی صفِ جنگ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ قرآن مجید میں ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ	جب تم خدا سے فریاد کر رہے تھے تو
لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ	خدا نے تمہاری فریاد کو سُنا اور کہا کہ
مُرْدِفِينَ ○	میں ایک ہزار ہمرکاب سواروں سے
(الانفال: ۹)	تمہاری مدد کرتا ہوں۔

اس فوج نے جس طرح مسلمانوں کی مدد کی اس کی کیفیت حضرت عبداللہ بن عباسؓ

---

[1] صحیح مسلم، باب قولہ تعالیٰ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ [2] صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ و صحیح مسلم، غزوۂ احد۔

نے اس طرح بیان کی ہے کہ" ایک مسلمان ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اس نے کافر کے اوپر سے کوڑے کی آواز سُنی اور سوار کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ" آگے بڑھ اے حیزوم"۔ یہ کہنا تھا کہ کافر چت زمین پر گر پڑا۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کی ناک میں سوراخ ہو گیا تھا جس میں نکیل لگی ہوتی تھی اور تمام چہرہ پھٹ گیا تھا اور اس میں نیلی بدھیاں پڑ گئی تھیں۔ ان صحابیؓ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں اس واقعہ کو بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا" سچ کہتے ہو۔ یہ تیسرے آسمان کی مدد ہے"[1]

غزوۂ اُحد میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ مسلمانوں کو یہ دیکھ کر اضطراب ہوا لیکن آنحضرتؐ نے تسلی دی کہ" اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی پر نہ جاؤ۔ خدا اپنے ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا"۔ خدا نے کہا کہ" ہاں بے شک اگر مسلمان جرارت و ہمت اور صبر سے کام لیں گے تو میں پانچ ہزار فرشتوں کی فوج ان کی مدد کو اتاروں گا"۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بہ تفصیل بیان کیا ہے:

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ	(اے پیغمبرؐ) جب تم مسلمانوں سے کہتے تھے
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ	کہ کیا تم کو یہ بس نہیں کرتا کہ خدا تین ہزار فرشتوں
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى اِنْ	سے تمہاری مدد کرے گا۔ ہاں بے شک اگر
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ	تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور تمہارے دشمن
فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ	بڑے زوروں سے بڑھ کر آئیں تو وہ پانچ ہزار
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ	بہادر فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

---

[1] صحیح مسلم، جلد سوم، کتاب الجہاد، باب امداد الملائکہ۔

مُسَوِّمِيْنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران : ۱۲۴ - ۱۲۶)

خدا نے اس وعدہ کو تمہارے لئے ایک خوشخبری بنایا اور تاکہ تمہارے دلوں میں طمانیت پیدا ہو مدد تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے صبر کا سررشتہ چھوٹ گیا اس لئے خدا کے وعدۂ نصرت سے وہ محروم رہ گئے۔ مگر آنحضرتؐ کے وجودِ اقدس کی حفاظت کے لئے دو فرشتے ساتھ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ احد میں دو سفید پوش آدمیوں کو دیکھا جو آپؐ کی طرف سے سخت جانبازی کے ساتھ لڑ رہے تھے اور میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔[1] صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ دونوں فرشتے جبریلؑ و میکائیلؑ تھے۔[2]

غزوہ اُحد کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا۔ اس غزوہ میں بھی مسلمانوں کی بے چارگی اور بے سروسامانی کا وہی عالم تھا۔ اسلامی فوج کی رسد کی یہ کیفیت تھی کہ خود مقدس سپہ سالارؐ اپنے سپاہیوں کے ساتھ کئی وقت کا بھوکا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ روحانی فوج نازل کی جو بھوک اور پیاس سے بے نیاز ہے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا احسان جتایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا

اے ایمان والو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب کفار نے تم کو آکر گھیر لیا تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور اس فوج

---

[1] صحیح بخاری، جلد دوم، باب غزوۂ احد [2] صحیح مسلم، جلد دوم، کتاب الفضائل باب قتال جبریلؑ و میکائیلؑ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	کو بھیجا جس کو تم نے نہیں دیکھا
بَصِيْرًا ۝	اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا
(الاحزاب : ۹)	تھا۔

یہ غیر مرئی فوج روحانی سپاہیوں کے دستے تھے۔

حضرت ابوذرؓ سے جو قدیم الاسلام صحابی تھے، روایت ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ آپؐ کو پہلے پہل کیونکر معلوم ہوا کہ آپؐ پیغمبر ہیں؟ فرمایا میں ایک دفعہ جارہا تھا کہ آسمان سے دو فرشتے اترے۔ ایک آسمان کی طرف گیا اور ایک زمین پر آیا۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ "کیا یہ وہی ہے"؟ دوسرے نے کہا "ہاں یہ وہی ہے"۔ پھر اس نے کہا ان کو ایک آدمی سے تولو تو میرا پلہ بھاری رہا۔ پھر دس سے، پھر سو سے، پھر ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں تولا گیا۔ تب بھی میرا ہی پلہ بھاری رہا۔ دوسرے فرشتے نے کہا کہ اگر ان کی تمام اُمت کو بھی ایک پلہ میں رکھو۔ اور ان کو دوسرے میں تب بھی ان ہی کا پلہ جھکتا رہے گا۔[1]

یہ حقیقت میں آنحضرتؐ کی فضیلتِ بشری کی تمثیل تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مکہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ ایک شب عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میرا ہاتھ پکڑ کر مکہ کے باہر میدان میں لے گئے اور ایک جگہ خط کھینچ کر فرمایا کہ "یہاں ٹھہرو اور اگر تم کو کچھ لوگ نظر آئیں تو اُن سے بولنا نہیں۔ وہ بھی تم سے نہیں بولیں گے"۔

---

[1] یہ حدیث سنن دارمی، باب کان اوّل شان النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ اس کا سلسلہ سند یہ ہے۔ اخبرنا عبداللہ بن عمران حدثنا ابو داؤد حدثنا جعفر بن عثمان القرشی عن عثمان بن عروۃ بن الزبیر عن ابیہ عن ابی ذر غفاری رضؓ۔ تیسرے راوی جعفر بن عثمان القرشی کا صحیح نام جعفر بن عبداللہ بن عثمان القرشی ہے اور جو محدثین میں معتبر نہیں۔

یہ کہہ کر آپؐ ایک طرف تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں مجھے وہ لوگ نظر آئے جو زطّی قوم کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ نہ وہ برہنہ تھے اور نہ اُن کے کپڑے نظر آتے تھے وہ میری طرف آکر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے جاتے تھے اور خط سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ آدھی رات کے بعد آپؐ واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ "تم دیکھتے ہو کہ آج شب میں سویا نہیں، یہ کہہ کر میرے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ اتنے میں کچھ لوگ اُجلے اُجلے کپڑے پہنے، جن کے حسن و جمال کا حال خدا ہی جانے کہ کیا تھا، پاس آکر بیٹھ گئے۔ کچھ آپؐ کے سرہانے بیٹھے اور کچھ آپؐ کے پاؤں کے پاس آکر بیٹھے۔ دونوں نے مل کر آنحضرتؐ کی نبوّت و رسالت کی ایک تمثیل بیان کی اور کہا کہ یہ وہ پیغمبر ہے جس کی آنکھیں گویا سوتی ہیں مگر دل ہشیار رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ آپؐ بیدار ہوئے تو فرمایا ان لوگوں نے جو باتیں کیں وہ میں نے سنیں، تم جانتے ہو کہ یہ کون تھے؟ عرض کی خدا اور خدا کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: "یہ فرشتے تھے ان کی تمثیل کی تفسیر یہ ہے"[1]

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نمازِ عشا پڑھ کر آپؐ چلے تو میں آپؐ کے پیچھے ہولیا۔ فرمایا "کون! حذیفہ؟" عرض کی "جی ہاں"۔ فرمایا "آج وہ فرشتہ مجھ پر اُترا جو آج تک زمین پر نہیں اُترا تھا۔ اُس نے خدا سے اذن مانگا کہ وہ میرے پاس آکر مجھے یہ بشارت سنائے کہ فاطمہؓ جنّتی بی بیوں کی اور حسنؓ اور حسینؓ جنّتی جوانوں کے سردار ہیں"[2]

---

[1] ترمذی: ابواب الامثال۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب صحیح کہا ہے۔ [2] ترمذی: مناقب حسنینؓ، حدیث حسن غریب۔

عالمِ رویا

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۚ (الفتح: ۲۷)

(بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا)

رؤیا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے۔ علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں۔ جب وہ سو جاتا ہے اور اس کے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے۔ مگر چونکہ عموماً انسان عمیق اور پُرسکون نیند سوتا ہے اس لئے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالتِ خواب کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی تو اس کو اپنی گذشتہ سیرِ دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔

یہ تو فلسفۂ قدیمہ کا "فرسودہ خیال" تھا۔ اب جدید عہدِ ترقی میں سائیکالوجی اور نفسیات کے علماء کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالمِ بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات اور ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں، عالمِ خواب میں جب ہمارے تعقّل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے تو اُن کو اُبھرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں۔ بہر حال یہ شاید اس رؤیا کی توجیہ ہو گی جن کو "خوابِ پریشاں" یا "اوہامِ دماغی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔

عرفائے روح اس خوابِ پریشاں یا اوہامِ دماغی کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن رؤیا کی حقیقت ان کے نزدیک کچھ اور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح سے عبارت ہے۔ روح جب تک جسم کے اندر ہے اس کی جلوہ نمائی کے دو رُخ ہیں۔ جسمانی و روحانی۔ اپنے جسمانی دروازہ سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادّہ کی سطح پر رنگا رنگ کے نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ یہ اس کے وہ تعلّقات اور دلچسپیاں ہیں جو اس کے اس جسمانی و مادّی عالم کے ساتھ قائم ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے جہاں سے وہ روحانیّت کے عالم کی سیر کر سکتی ہے۔ جس قدر اس کا تعلّق اُنس، دل بستگی، شیفتگی اور مشغولیّت عالمِ جسم سے زیادہ ہوگی اسی قدر دوسرے عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے تعلّقی زیادہ ہوگی۔ حالتِ خواب میں روح کی ظاہری جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہیں اس لئے اس کو دوسری کھڑکی کی طرف جھانکنے کی فرصت مل جاتی ہے اور پھر روح کو جس قدر تعلّقاتِ خارجی سے بیگانگی زیادہ ہوتی ہے شہرستانِ ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے تمثیلی مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیّت زیادہ صحیح اور سچّی ہوتی ہے۔ جو روحیں کہ اس عالمِ جسمانی کی بند شوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار و مقیّد نہیں ان کے لئے عالمِ بیداری بھی اقلیمِ روح کی گلگشت سے مانع نہیں۔ اسی کا نام مشاہدہ اور مکاشفہ ہے۔

انبیاءؑ کے مقدس قالبوں میں جو ارواحِ طیّبات ہیں وہ عالمِ ظاہری کی گرفتاریوں کے بعد بھی جس حد تک آزاد اور بے تعلّق رہتی ہیں، وہ عام حدِّ انسانی سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔ اسی لئے عالمِ مشاہدہ اور عالمِ رؤیا دونوں میں حقائق و اسرار کی بستیاں اُن کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ بیداری تو بیداری وہ سوتے بھی ہیں تو بیدار رہتے ہیں۔ ان کے جسم سوتے ہیں لیکن ان کی روحیں ہمیشہ جاگتی رہتی ہیں:

تنام اعینهم ولا تنام قلوبهم
(صحیح بخاری باب الانبیاء)

پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن ان کے دل ہمیشہ بیدار رہتے ہیں۔

غافل انسان ادھر التفات نہیں کرتا ورنہ درحقیقت نیند اور خواب کا معاملہ ایک سرِّ ملکوتی اور ایک رازِ الٰہی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ○
(الروم : ۲۳)

خدا کی نشانیوں میں سے (اے انسانو!) راتوں میں اور دنوں میں تمھاری نیند ہے۔ (اور پھر بیدار ہو کر اپنے کاروبار میں تمھارا مصروف ہونا) اور اس کی دولت کو تلاش کرنا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں، بڑی بصیرتیں ہیں۔

موت اور نیند دونوں کم و بیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم سے روح کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے اور نیند میں عارضی۔ موت میں تمام تعلقاتِ ظاہری کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور نیند میں کچھ نہ کچھ گرہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے اسی روزانہ پیش آنے والے حیرت افزا واقعۂ قدرت کی طرف ہم کو اس آیت میں متوجہ کیا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا ان کو نیند میں ان کی مصروفیتِ دنیاوی کا وقت پورا کر دیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا فرمان جلدی ہو چکتا ہے ان کو اپنے پاس روک لیتا ہے اور دوسروں کو

ایک وقتِ مقررہ تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔
اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (الزمر : ۴۲)

حضرت امام ربانی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"توفی نوم ازاں قبیل است کہ شخصے از وطنِ مالوفِ خود بہ شوق و رغبت از برائے سیر و تماشا بیرون آید تا فرح و سرور حاصل کند و خرم و شاداں بہ وطن خود باز رجوع نماید۔ و سیر گاہِ او عالمِ مثال است کہ متضمنِ عجائب ملک و ملکوت است۔" (مکتوب ۱۰۰ دیکم، جلد سوم)

عربی زبان میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں، ایک حُلم جس کی جمع احلام آتی ہے اس کے معنی "خواب و خیال" کے ہیں یعنی محض وہم و تخیل۔ دوسرا رؤیا۔ یہ اس خواب کو کہتے ہیں جس میں حقیقت بینی اور رمز شناسی ہو۔ ان دونوں لفظوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ پہلے میں وسوسۂ شیطانی کا دخل ہوتا ہے اور دوسرا اس سے پاک ہے۔ فرق سورۂ یوسف کی ان آیتوں میں صاف نظر آئے گا۔ عزیزِ مصر نے خواب دیکھا ہے۔ اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھتا ہے۔ اہلِ دربار کہتے ہیں کہ یہ محض خواب و خیال اور وہم ہے:

يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ○ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ○ (یوسف : ۴۳-۴۴)

اے درباریو! میرے اس خواب کے بارے میں مجھے رائے دو اگر خواب کی تم تعبیر بیان کر سکتے ہو۔ انھوں نے کہا یہ تو محض اوہام و خیالات کا مجموعہ ہے۔ ان اوہام اور خیالات کی تعبیر سے ہم واقف نہیں۔

گو عالم رؤیا کا نظارہ ہر اس ہستی کو کبھی کبھی پیش آتا ہے جو روح سے وابستہ ہے اور

جس میں کالے گورے، مومن و کافر، شقی و سعید اور نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں۔ لیکن جس طرح ایک نہایت نازک اور باریک یا کسی دور سے آنے والی چیز کو بہت سی آنکھیں دیکھ سکتی اور دیکھتی ہیں لیکن ان میں حقیقت اور صحت کے قریب اسی کی رویت ہوتی ہے جس کی بینائی تیز، آلاتِ باصرہ صحیح اور فہم و استنباط کی قوتِ لطیف ہوتی ہے اسی طرح عالمِ رؤیا کے مشاہدات کی حقیقی اور صحیح رویت بھی ان ہی کے لئے ہے جن کی روح و دل کی بینائی تیز اور بصیرت کی آنکھیں روشن اور ادراک و عرفان کے حواس لطیف ہوں اور جن کے نفس کے آئینہ میں صلاح و تقویٰ کا صیقل زیادہ ہو:

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔	اور جو یہاں اندھے ہیں وہ وہاں بھی اندھے ہوں گے۔

(بنی اسرائیل : ۷۲)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝	خدا سے تقویٰ کرو اور وہ تم کو علم بخشتا ہے اور خدا کو ہر چیز کا علم ہے۔

(البقرۃ : ۲۸۲)

اسی لئے دنیا کے تمام مذاہب نے رؤیا کو خاص اہمیت دی ہے۔ اسلام اور شارعِ اسلام نے جس طرح دین کے اور شعبوں کی تکمیل کی ہے اس حقیقت کو بھی نہایت واضح اور روشن کر دیا ہے۔ قرآن مجید کی آیت ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝	جو ایمان لائے اور وہ متقی ہیں ان کے لئے
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	اس دنیا میں بشارت ہے اور آخرت میں
وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ	بھی۔ خدا کی باتوں میں تبدیلی نہیں۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ یہی بڑی کامیابی ہے۔

(یونس : ۶۳-۶۴)

جب یہ آیت اتری تو صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ! اس دنیا میں بشارت کیا ہے"؟ فرمایا کہ "وہ رؤیائے صالحہ ہے جو ایک مرد مسلم دیکھتا ہے[1]"۔ آپؐ نے فرمایا کہ نبوّت اور رسالت ختم ہوگئی۔ لیکن صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور وہ مُبشّرات (خوشخبریاں) ہیں۔ لوگوں نے عرض کی "یارسول اللہؐ! مُبشّرات کیا ہیں"؟ فرمایا "مسلم کی رؤیائے صالحہ۔ یہ نبوّت کے اجزا میں سے ایک جز ہے[2]"۔ بخاری، مسلم[3] اور ترمذی کی متعدّد روایتوں میں مختلف صحابیوںؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مومن کی رؤیائے صالحہ نبوّت کے چھیالیس حصّوں میں سے ایک حصّہ ہے"۔ اس سے زیادہ رؤیا کی اہمیّت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نبوّت کا ایک حصّہ ہے؟ لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ وہ کونسی رؤیا ہے۔ ابھی ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ عربی میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں۔ حُلم (خواب پریشاں یا خیالاتِ نفسانی) اور رؤیا۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

الرّویا من اللہ والحلم من الشیطان[4] — رؤیا خدا کی طرف سے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے۔

آغازِ مضمون میں علمائے نفس اور عرفائے روح کی تشریحات کی تفصیل ہو چکی ہے۔ ذیل کی حدیث سے یہ حقیقت بہت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اصدقکم رویا اصدقکم حدیثا (تم میں سے سب سے سچّا خواب دیکھنے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ سچ بولتا ہے)۔ حقیقت میں انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہے۔ جس

---

[1] ترمذی، کتاب الرویا۔ [2] ترمذی، کتاب الرویا۔ [3] ان کتابوں میں کتاب التعبیر اور کتاب الرویا دیکھو۔

[4] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی۔

کی زبان سچ بولے گی اس کی روح بھی یقیناً سچ دیکھے گی۔ علمائے نفسیات حدیث کے اس ایک فقرہ کی گرہ کشائی پورے ایک باب میں کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا "خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک رؤیائے صالحہ یہ خدا کی طرف سے خوشخبری ہوتی ہے۔ دوسرا غم پیدا کرنے والا خواب یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ تیسرا وہ خواب ہوتا ہے جو انسان کی اپنے دل کی باتیں اور خیالات ہوتے ہیں[1]" اس تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے نفس اور عرفائے روح جس خواب اور رؤیا کی تشریح کرتے ہیں وہ اپنی اپنی حقیقت کی رُو سے بالکل الگ ہیں۔ اس عالم رؤیا کے تحت میں جس قسم سے بحث ہے وہ صرف پہلی قسم ہے۔

عام انسانوں اور انبیاءؑ کی رؤیا میں وہی نسبت ہے جو ان دونوں کی ذات میں ہے جب عام انسانوں کی آنکھیں سوتی ہیں تو کم و بیش ان کے دل بھی سوتے رہتے ہیں۔ لیکن انبیائے کرامؑ کی آنکھیں جب سوتی ہیں تو بھی اُن کے دل بیدار رہتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ نے بڑی دیر تک تہجد کی نماز پڑھی لیکن ابھی وتر نہیں پڑھے تھے کہ لیٹ گئے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہؐ! آپؐ بے وتر پڑھے سوتے ہیں۔ فرمایا "اے عائشہؓ! میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا[2]" معراج کے ذکر میں ہے کہ "آپؐ اس حالت میں تھے کہ آپؐ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن دل بیدار تھا۔ اور انبیاءؑ کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں تو سوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار رہتے ہیں[3]"

ان ہی حدیثوں کو پیشِ نظر رکھ کر جمہور علمائے اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ انبیائے کرامؑ کی رؤیا بھی اسی قدر قطعی اور یقینی ہے جس قدر آپؐ کے عام احکامِ وحی اور مخاطباتِ الٰہی حضرت ابراہیم علیہ السلام

---

[1] صحیح مسلم و ترمذی، کتاب الرویا۔ [2] صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل۔ [3] صحیح بخاری و مسلم باب الاسراء

نے جو خواب اپنے پہلوٹے بیٹے کی قربانی کے متعلق دیکھا اس کے حکمِ الٰہی ہونے میں انھیں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں ہوا اور انھوں نے اس کی تعمیل ویسی ہی ضروری سمجھی جیسی اس حکم کی جو عالمِ بیداری میں انھیں خدا کی طرف سے ملتا۔ دوسرے پیغمبروں کے حالات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ اُن کو اپنی رؤیا کی صحت و صداقت اور واجب العمل ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہ تھا۔ خود آنحضرتؐ کی سوانحِ مبارک میں یہ احوال بہ کثرت پیش آئے ہیں اور اس عالم میں جو احکام اور علوم آپؐ کو دیے گئے ہیں وہ بھی اسی طرح قطعی ہیں جس طرح وہ احکام اور علوم جو وحی کے دوسرے طریقوں سے آپؐ کو مرحمت ہوئے۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ رویا الانبیاء وحی (انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے[1])۔

اوپر اشارہ گذر چکا ہے کہ بعض علمائے اسلام اور اصحابِ کشف و عرفان عالمِ غیب اور عالمِ ملکوت اور اس عالمِ شہادت اور عالمِ جسمانیات کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جس کا نام انھوں نے عالمِ برزخ (درمیانی مقام)، اور عالمِ مثال رکھا ہے۔ چنانچہ علماء میں امام خطابی، امام غزالی، علامہ سیوطی، شاہ ولی اللہ صاحب اور صوفیہ میں حضرت امام ربانی اور تمام حضراتِ مجددیہ اس عالم کے قائل ہیں۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا ایک خاص باب باندھا ہے جس میں متعدد احادیث سے اور علامہ سیوطی اور امام غزالی کی تحریروں سے اس عالم کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ عالمِ مثال ان کے نزدیک گویا ایک صاف پانی کی غیر محدود نہر یا شیشہ ہے جس میں عالمِ شہادت کی وہ چیزیں جو جاندار یا مجسم نہیں ہیں، مثلاً صفات، اعراض، نیکی و بدی، ایمان و علم وغیرہ وہاں اپنی مناسب اور موزوں شکلوں میں جاندار مجسم ہو کر نظر آتی ہیں۔ نیکی ایک حسین و جمیل کی شکل میں، بدی ایک کریہہ المنظر صورت میں، ایمان آفتاب بن کر، علم دریا کے رنگ میں

---

[1] ترمذی، مناقب عمر فاروقؓ۔

جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی طرح عالمِ غیب کی چیزیں، جنّت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ اسی نہر و آئینہ میں منعکس ہو کر اس عالمِ شہادت کے لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ اور جس طرح تصویر کی شبیہہ، اور نہر و آئینہ کے عکس میں اور اصل جسمانی شکلوں میں کامل مشابہت اور مماثلت ہوتی ہے اسی طرح عالمِ غیب کی اشیاء اور عالمِ مثال کی شبیہوں اور تصویروں میں پوری مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔

بہر حال اس عالم کا مستقل وجود ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ میں ایسے واقعات، حالات، مشاہدات اور کیفیات مذکور ہیں جن کی تشریح اس عالم میں بخوبی کی جا سکتی ہے۔ انجیل اور قرآن مجید دونوں میں ہے کہ جبریلؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت لے کر

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○	مریم کے سامنے ایک پورے انسان
(مریم: ۱۷)	کی مثال بن کر آئے۔

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ نماز کی حالت میں آپؐ کے سامنے جنّت اور دوزخ کی صورتیں جلوہ گر کی گئیں۔ اس موقع پر مختلف صحابیوںؓ نے اس مفہوم کو حسبِ ذیل مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

انه صورت لی الجنة والنار حتّٰی	میرے لئے جنّت اور دوزخ مصوّر کی گئی
رایتهما دون الحائط۔	یا میرے سامنے جنّت اور دوزخ کی صورت
(صحیح بخاری باب التعوذ من الفتن)	پیش کی گئی، یہاں تک کہ میں نے ان کو اس
	دیوار کے پاس دیکھا۔
لقد رایت الان منذ صلیت	میں نے ابھی جب تم کو نماز پڑھا رہا تھا جنّت
بکم الصلوة الجنة و النار	اور دوزخ کو اس دیوار کے رُخ میں مثّل دیکھا
ممثلتین فی قبلة هذا الجدار	یا میرے سامنے جنّت اور دوزخ کی مثال

(صحیح بخاری باب رفع البصر فی الصلوٰۃ) پیش کی گئی۔

انی رأیت الجنۃ اریت النار۔ میں نے جنّت کو دیکھا اور دوزخ مجھے دکھائی

(صحیح بخاری باب الکسوف) گئی۔

فعرضت علی الجنۃ وعرضت مجھ پر جنّت اور دوزخ پیش کی گئی۔

علی النار۔

(صحیح مسلم باب الکسوف)

لقد جئ بالنار ثم جئ بالجنۃ۔ میرے پاس جنّت اور دوزخ لائی

(صحیح مسلم باب الکسوف) گئی۔

اطلعت فی الجنۃ واطلعت فی میں جنّت اور دوزخ میں جا نکلا

النار۔

(صحیح بخاری باب صفۃ الجنۃ)

ایک ہی مفہوم کو مختلف راویوں نے ان مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ الفاظ کی احتیاط بھی جس قدر امام بخاری کے ہاں ہے کسی اور کے ہاں نہیں۔ اس لئے امام بخاری کے الفاظ تصویر اور تمثیل یا صورت اور مثال یا امام مسلم کے الفاظ لایا جانا اور پیش کیا جانا پر ذرا تامّل درکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان اس درجہ ادائے مطلب میں قاصر ہے کہ وہ اپنے الفاظ سے عالمِ محسوس کی کیفیتوں کی بھی پردہ دری نہیں کر سکتی۔ پھر اس سے یہ توقع کس قدر بے جا ہے کہ غیر محسوس عالم کی کیفیتوں کو وہ کبھی الفاظ کا جامہ پہنا سکتی ہے۔ جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ صحیح، مستند اور محفوظ ذریعہ سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ دوسروں تک پہنچا دیں۔

وحیٔ نبوّتی کا آغاز رؤیائے صالحہ سے ہوا۔ آپؐ کو چیزیں رؤیا میں دکھائی جاتی تھیں اور وہ

پسیدۂ صبح کی طرح ٹھیک ٹھیک پوری اترتی تھیں[1]۔

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد صحابہؓ کی طرف منھ کرکے آپؐ جائے نماز پر بیٹھے رہتے اور اُن سے دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ لوگ بیان کرتے۔ اگر وہ رؤیائے صالحہ ہوتی تو آپؐ اس کی تعبیر کرتے۔ اگر وہ خواب وخیال ہوتا تو کہہ دیتے کہ یہ محض خواب وخیال ہے۔ اسی اثنا میں اس شب میں اگر خود آنحضرتؐ کو کوئی رؤیا دکھایا گیا ہوتا تو آپؐ اس کو سُناتے[2]۔

آنحضرتؐ کے جس قدر رؤیا احادیث میں مذکور ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو تمثیلی رنگ میں دکھائے گئے ہیں اور آنحضرتؐ نے ان کی تعبیر وتشریح خود اپنی زبانِ مبارک سے کردی ہے۔ دوسرے وہ رؤیا ہیں جو بعینہٖ واقعہ اور حقیقت ہیں اور اسی لئے آنحضرتؐ نے ان کو بیان کرتے وقت ان کی تاویل وتشریح نہیں کی۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس میں بعض اوقات دنیا کے متعلق پیش گوئی اور اخبارِ غیب ہے دوسرے وہ جس میں احوالِ آخرت اور اسرارِ غیب کا اظہار ہے۔ ذیل میں ہم ہر قسم کے واقعات کو الگ الگ عنوانوں کے تحت بیان کرتے ہیں۔

رویائے تمثیلی ابھی آپؐ مکۂ معظمہ میں تھے۔ اسلام پر سختی اور مصیبت کے دن تھے۔ صدائے حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کم تھی کہ آپؐ کو عالم رؤیا میں دکھایا گیا کہ آپؐ اپنی جماعت کے ساتھ عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ابن طاب کی تر وتازہ کھجوریں لاکر آپؐ کو اور آپؐ کے رفقا کو دی گئی ہیں۔ آپؐ نے اس کی تعبیر یہ کی کہ دنیا میں مسلمانوں کو ترقی اور آخرت میں عاقبت بخیر ہوگی اور ان کا مذہب پھلے اور پھولے گا[3]۔

ابھی آپؐ نے ہجرت نہیں کی تھی لیکن ہجرت کا زمانہ قریب تھا کہ آپؐ کو ہجرت اور

---

[1] صحیح بخاری: بدء الوحی کتاب التعبیر وغیرہ وصحیح مسلم: بدء الوحی۔ [2] صحیح بخاری ومسلم وترمذی: کتاب الرویا وکتاب التعبیر۔

[3] صحیح مسلم: کتاب الرویا وصحیح بخاری: کتاب التعبیر۔

ہجرت کے بعد کے تمام اہم واقعات رؤیا میں دکھائے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ "میری ہجرت کی سرزمین چھوہاروں کا باغستان ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر یثرب نکلا۔" اسی خواب میں نظر آیا کہ "میرے ہاتھ میں تلوار ہے میں نے اس کو ہلایا تو وہ ٹوٹ گئی۔" یہ اُحد کی شکست کی طرف اشارہ تھا۔ "پھر میں نے اس کو ہلایا تو وہ ایک نہایت عمدہ تلوار ہو گئی۔" یہ اس واقعہ کی تمثیل تھی کہ اُحد کے بعد اللہ تعالیٰ فتح و کامیابی اور مسلمانوں کا اجتماع نصیب کرے گا۔ "میں نے اسی خواب میں گائے کو ذبح ہوتے دیکھا۔" یہ وہ مسلمان ہیں جو اُحد میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد بھلائی دیکھی۔ یہ وہ بھلائی ہے جو اسلام کو نصیب ہوئی۔[1]

مسلمانوں نے جب مدینہ کو ہجرت کی ہے تو یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی۔ وبا بھی پھیلی تھی۔ مہاجرین میں اضطراب سا تھا۔ آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ ایک کالی سیاہ عورت جس کے سر کے بال اُلجھے اور پریشان ہیں، وہ مدینہ سے نکل کر جحفہ کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی تعبیر یہ ارشاد فرمائی کہ مدینہ کی وبا جحفہ میں منتقل کر دی گئی۔[2] چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور مدینہ منورہ اس سے پاک ہو گیا۔

ایک دفعہ رؤیا میں آپؐ کو دکھایا گیا کہ آپؐ کے دونوں ہاتھوں میں سونے کا ایک ایک کنگن ہے۔ اس سے آپؐ کو تکلیف ہوئی۔ حکم ہوا کہ ان کو پھونک دو۔ آپؐ نے پھونکا تو دونوں کنگن ہاتھوں سے علیحدہ ہو کر اڑ گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "میں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ یہ نبوت کے دو جھوٹے مدعی ہیں (مسیلمہ اور اسود عنسی) جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔"[3]

آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے سامنے دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا۔ آپؐ نے اس کو اس قدر سیر ہو کر پیا کہ انگلیوں سے دودھ بہنے لگا۔ پیالہ کا بچا ہوا دودھ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو عطا فرمایا۔ آپؐ نے لوگوں سے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الرویا۔ [2] صحیح بخاری و ترمذی، کتاب الرویا۔ [3] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی، کتاب الرویا والتعبیر۔

جب یہ خواب بیان کیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! اس کی تعبیر آپ نے کیا کی"؟ فرمایا[1] "علم"۔ اسی طرح آپ نے ایک دفعہ فرمایا "آج شب کو جب میں سویا تھا میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے۔ ان میں سے کسی کے بدن پر کرتہ سینہ تک تھا، کسی کا اس سے نیچے تک۔ عمرؓ جب سامنے آئے تو ان کے جسم پر کرتہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے دامن زمین پر لوٹ رہے تھے"۔ سننے والوں نے پوچھا "یارسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر کی"؟ فرمایا[2] "دین"!

ایک شب میں آپ کو ذاتِ محمدیؐ پر ختمِ نبوت اور تکمیلِ دین کی تمثیل دکھائی گئی۔ آنکھیں خواب آلودہ تھیں لیکن قلبِ اقدس بیدار تھا۔ کچھ فرشتے اتر کر آپ کے پاس آکر بیٹھے اور آپس میں ایک دوسرے سے بولے کہ اس پیغمبر کی کوئی تمثیل بیان کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آقا ہو۔ اس نے ایک محل تیار کیا اور اس میں دسترخوان بچھایا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ اب جس نے اس کی بات کو قبول کیا وہ آیا اور کھا پی کر سیر ہوا۔ اور جو نہیں آیا اس کو اس نے سزا دی۔ بیدار ہو کر آپ نے عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ وہ آقا تو خدا ہے۔ جنت اس کا محل ہے۔ جس نے اُس کی دعوت کو قبول کیا وہ جنت میں داخل ہُوا اور جس نے انکار کیا اُس کو اُس نے عذاب دیا[3]۔

ایک دفعہ آپ کو یہ دکھایا گیا کہ آپ ایک کنوئیں کے اندارے پر کھڑے ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے دیکھا کہ میں حوضِ کوثر پر کھڑا ہوں۔ اردگرد لوگوں کا جماؤ ہے۔ آپ ڈول سے پانی کھینچ کھینچ کر ان کو پلا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ابوبکرؓ آئے اور انھوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لے کر مجھے سبکدوش کر دیا اور پھر وہ پانی کھینچ کھینچ کر پلانے لگے۔ مگر خدا ان پر رحم کرے ذرا کھینچنے میں کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد عمرؓ آئے تو ڈول بڑھ کر بڑا

---

[1] صحیح بخاری: کتاب التعبیر و مناقب عمرؓ و جامع ترمذی: ابواب الرویا۔ [2] صحیح بخاری: کتاب التعبیر و مناقب عمرؓ و جامع ترمذی ابواب الرویا۔ [3] جامع ترمذی: ابواب الامثال۔

ہو گیا اور عمرؓ نے اس قوت اور تیزی سے پانی کھینچا کہ حوض کناروں کناروں تک پُر ہو گیا اور لوگ پی کر سیر ہو گئے[1]۔ یہ خواب اتنا واضح تھا کہ آنحضرتؐ نے اس کی تعبیر کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کون نہیں سمجھا کہ ڈول اور پانی کھینچنے سے مراد خلافت اور خدمتِ خلق کی بجا آوری ہے۔

حضرت عمرؓ ان چند سعید لوگوں میں ہیں جن کو اسی دنیا میں جنت کی بشارت دی جا چکی تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "رات میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں۔ سامنے ایک محل ہے۔ ایک عورت اس میں بیٹھی وضو کر رہی ہے۔ میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے؟ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ یہ عمرؓ کا مسکن ہے۔ میں نے چاہا کہ اندر جاؤں مگر عمرؓ کی غیرت یاد آئی تو الٹا پھر گیا۔" حضرت عمرؓ سُن کر رو پڑے اور کہا "یارسول اللہؐ! میں آپؐ سے غیرت کرتا؟"[2] ایک دفعہ آپؐ نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ "اے بلالؓ! تم کون سا ایسا نیک عمل کرتے ہو کہ میں جب جنت میں گیا تو تمھارے جوتوں کے چاپ کی آواز سنی۔" عرض کیا "یارسول اللہؐ! ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب نیا وضو کرتا ہوں دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں[3]۔"

ورقہ بن نوفل کا نام آغازِ وحی کے ضمن میں ابھی گذر چکا ہے۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار تھے اور اسلام سے پہلے سچے عیسائی ہو گئے تھے۔ جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی اور آپؐ سے نزولِ جبریلؑ کا حال سُنا تو انھوں نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی اور کہا کہ "اگر زندہ رہا تو اس وقت جب آپؐ کی قوم آپؐ کو شہر بدر کرے گی میں آپؐ کی پوری مدد کروں گا۔" حضرت خدیجہؓ نے پوچھا کہ "یارسول اللہؐ! ورقہ جنت میں گئے یا دوزخ میں؟ انھوں نے تو آپؐ کی تصدیق کی تھی لیکن آپؐ کے ظہور سے پہلے مر گئے۔" فرمایا "مجھے وہ خواب میں دکھائے گئے کہ وہ سپید کپڑے پہنے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم، ترمذی کتاب التعبیر، کتاب الرویا مناقبِ عمرؓ۔ [2] صحیح بخاری و مسلم، ترمذی کتاب التعبیر و کتاب الرویا مناقبِ عمرؓ۔ [3] بخاری و مسلم؛ مناقب بلالؓ و ترمذی، مناقب عمرؓ۔

اگر وہ دوزخ میں ہوتے تو ان کے جسم پر یہ لباس نہ ہوتا۔[1]"

ایک شب کو جب آپؐ مصروفِ نماز تھے جمالِ الٰہی بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔ صحیحین کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صبح کی نماز کے لئے آپؐ دیر سے برآمد ہوئے۔ نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہیں۔ پھر فرمایا کہ آج شب کو جب میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی میرے لئے مقدر تھیں تو نماز ہی کے اندر میں اونگھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جمالِ الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے۔ خطاب ہوا "یا محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟" عرض کی "نہیں۔ اے میرے رب میں نہیں جانتا۔" اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں۔ سوال ہوا "یا محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟" عرض کی "ہاں اے میرے رب! اُن اعمال کی نسبت گفتگو کر رہے ہیں جو گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔" پوچھا "وہ کیا ہیں؟" عرض کی "نماز باجماعت کی شرکت کے لئے قدم اُٹھانا، نماز کے بعد مسجد میں ٹھہر جانا اور ناگواری کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا۔ جو ایسا کرے گا اس کی زندگی اور موت دونوں بخیر ہوں گی۔ وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہو جائے گا جیسا اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔" پھر سوال ہوا کہ "یا محمدؐ! درجات کیا ہیں؟" گذارش کی "کھانا کھلانا، نرمی سے باتیں کرنا، جب دنیا سوتی ہو تو اُٹھ کر نماز پڑھنا۔" پھر حکم ہوا کہ "اے محمدؐ! مجھ سے مانگو۔" میں نے عرض کی "خداوندا! میں نیک کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے بچنے اور غریبوں سے محبت کرنے کی توفیق چاہتا ہوں۔ میری مغفرت کر۔ مجھ پر رحم فرما۔ جب کسی قوم کو تو آزمانا چاہے مجھے بے آزمائے اٹھا لینا۔ میں تیری محبت کا اور تجھ سے جو محبت

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الرویا، بحوالہ ترمذی کتاب الرویا و مسند احمد۔

رکھے اس کی محبت کا اور جو عمل مجھ کو تیری محبت کے قریب کردے اس کی محبت کا خواستگار ہوں۔"
اس کے بعد آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ "یہ جو کچھ تھا حق تھا اور اس دعا کو پڑھا کرو۔"

آثارِ قیامت کے بعض واقعات بھی اسی عالم میں آپؐ پر پیش کئے گئے۔ آپؐ نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک دن فرمایا کہ "رات مجھے ایک رؤیا دکھایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ اسی اثنا میں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کا رنگ گندم گوں تھا، بہتر سے بہتر گندم گوں آدمی جو تم نے دیکھا ہو۔ اس کے گیسو پڑے ہوئے تھے، بہتر سے بہتر گیسو جو تم نے دیکھے ہوں۔ کنگھی سے بال درست کئے ہوئے تھے اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ طواف کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ جواب ملا کہ مسیح بن مریمؑ! میں ادھر دیکھنے کو مڑا تو ان کے پیچھے ایک اور آدمی نظر آیا۔ سُرخ رنگ، موٹا، بھدا، بالوں میں بہت گھونگھر پڑے ہوئے، ایک آنکھ سے کانا۔ آنکھ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کہ ابھرا ہوا انگور ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ معلوم ہوا دجال۔[۱]"

اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ سونے سے جاگ اُٹھے۔ چہرۂ مبارک سُرخ تھا اور زبان پر یہ کلمات تھے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ افسوس ہے عرب پر! برائی نزدیک آگئی۔ یاجوج ماجوج کی دیوار میں آج اتنا سوراخ ہوگیا۔[۲]

حضرت جبریلؑ اور دوسرے فرشتے جس طرح آپؐ کے عام مشاہدہ میں آتے تھے اسی طرح اس عالم رؤیا میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا کہ آج شب کو میں نے خواب میں دو شخص دیکھے جو مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ "دوزخ کی آگ کو جو

---

[۱] بہ روایت جامع ترمذی تفسیر سورۂ ص و مسند ابن حنبل بر مسند معاذ جلد پنجم۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن و صحیح کہا ہے۔

[۲] صحیح بخاری: کتاب التعبیر و صحیح مسلم: باب الاسرا۔ [۳] صحیح بخاری: کتاب الفتن، صحیح مسلم: باب اشراط الساعۃ۔

جلاتا ہے وہ مالک دارو غۂ دوزخ ہے۔ میں جبریلؑ ہوں اور یہ میکائیل ہیں۔[1]"

نظارۂ جمالِ الٰہی کے بعد اس عالم کا سب سے بڑا مشاہدہ وہ تھا جس میں آپؐ کو دوزخ کے مُہیب و ہولناک مناظر اور بہشت کی بعض دلکش اور مسرت افزا جلوہ آرائیاں دکھائی گئیں۔ حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد آپؐ ہم لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے اور پھر دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ بہر حال حسبِ معمول آج بھی آپؐ نے دریافت فرمایا۔ ہم نے عرض کی "نہیں یا رسول اللہؐ"۔ ارشاد ہوا کہ آج شب کو مجھے رؤیا میں یہ نظر آیا کہ دو آنے والے میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھے اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک مقدّس سرزمین میں لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی پڑا ہے۔ دوسرا شخص ایک بڑا پتھر ہاتھ میں لئے اس کے پاس کھڑا ہے۔ وہ زور سے پتھر اس کے سر پر مارتا ہے جس سے اس کا سر چور چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے۔ وہ دوڑ کر پتھر اٹھاتا ہے تو اس کا سر پھر درست ہو جاتا ہے۔ وہ پھر آکر اسی طرح مارتا ہے اور سر کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا سبحان اللہ یہ کیا ہے؟ میرے ساتھیوں نے کہا آگے چلو آگے چلو! میں آگے چلا تو دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہے۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں ایک لوہے کا انکڑا ہے۔ وہ ایک طرف اس کے منہ میں انکڑا ڈال کر کھینچتا ہے تو باچھیں پھٹ کر گدّی سے مل جاتی ہیں۔ پھر آنکھ میں، پھر نتھنے میں انکڑا ڈال کر کھینچتا ہے اور چیر ڈالتا ہے۔ اِدھر سے فرصت کر کے دوسری جانب جاتا ہے اور اُدھر کے بھی جبڑے اور آنکھ اور نتھنے کو اسی انکڑے سے پیچھے تک چیر ڈالتا ہے۔ اسی اثنا میں پہلی طرف کے سب زخم بھر آتے ہیں اور پھر آکر وہ ان کو چیرتا ہے تو دوسری طرف کے بھر جاتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ یہ کیا ہے۔ جواب ملا آگے چلو آگے چلو۔ میں اور آگے بڑھا۔ دیکھا کہ ایک تنور ہے اس میں آگ روشن ہے۔ کچھ مرد و عورت

---

[1] بخاری، کتاب بدء الخلق۔

اس میں تنگے ڈالے گئے ہیں۔ جب نیچے سے آگ کا شعلہ اٹھتا ہے تو چیختے ہیں، چلاّتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ آگ دب جاتی ہے اور پھر بلند ہوتی ہے اور پھر وہ چیختے ہیں اور چلاّتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ یہ کیا ہے؟ انھوں نے پھر آگے بڑھنے کو کہا۔ اب آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک خون کی سرخ ندی ہے۔ اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور کنارہ پر ایک شخص پتھر لئے کھڑا ہے۔ وہ آدمی چاہتا ہے کہ تیر کر کنارے لگ جائے مگر جب وہ قریب آتا ہے، وہ شخص پتھر اس زور سے تاک کر مارتا ہے کہ وہ اس کے منھ میں جا کر لگتا ہے اور حلق سے نیچے اتر جاتا ہے۔ وہ آدمی ہٹ کر پھر جہاں تھا وہیں پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ کنارہ پر آنے کا قصد کرتا ہے کہ پھر اسی طرح پتھر آکر اس پر پڑتا ہے۔ میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا آگے چلو آگے چلو۔ میں اور آگے چلا تو ایک شخص نظر آیا۔ کریہہ منظر سے کریہہ منظر آدمی جو تم نے دیکھا ہو وہ اس سے بھی زیادہ کریہہ منظر تھا۔ آگ اس کے سامنے دہک رہی تھی اور اس کو وہ اور دہکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف پھر رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پھر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انھوں نے آگے بڑھنے کو کہا۔ میں آگے بڑھا تو ایک ہرا بھرا گنجان باغ نظر آیا جس میں نوبہار کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ باغ کے بیچ میں ایک نہایت ہی خوبصورت عمارت دکھائی دی کہ میں نے ویسی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس میں بچے، بوڑھے، جوان، عورت، مرد ہر طرف نظر آئے۔ آگے بڑھا تو ایک اور عمارت جو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت تھی، نظر آئی۔ اس میں بھی کچھ لوگ مختلف سن و سال کے دکھائی دئے۔ ایک باغ میں ایک درخت کے پاس ایک دراز قد انسان دیکھا جس کا سر اتنا اونچا تھا کہ آسمان تک پہنچ گیا تھا اور مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ اس انسان کے چاروں طرف اتنے بچے نظر آئے کہ میں نے اتنے نہیں دیکھے تھے۔ میں نے اپنے ہمراہیوں سے پھر سوال کیا مگر انھوں نے اور آگے بڑھایا تو ایک بہت بڑے باغ کے قریب جس سے زیادہ بڑا اور زیادہ خوب صورت باغ میں

نے کبھی نہیں دیکھا تھا، پہنچا۔ اندر گیا تو ایک شہر نظر آیا جس کی چار دیواری ایک ایک سونے اور ایک ایک چاندی کی اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر دروازہ کھلوایا۔ دروازہ کھلا اور ہم اس کے اندر داخل ہوئے تو وہاں ہم کو ایسے لوگ نظر آئے جن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوب صورت تھا اور آدھا دھڑ نہایت بدصورت۔ میرے ہمراہیوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اس نہر میں غوطے لگاؤ۔ ناگاہ ایک نہایت صاف شفاف نہر نظر پڑی۔ وہ گئے اور جا کر اس میں غوطے لگائے۔ غوطے لگا کر باہر آئے، تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور وہ نہایت خوبصورت ہو گئے۔ ساتھیوں نے کہا یہ شہر جنّتِ عدن ہے اور آپؐ کی منزل وہ ہے۔ میری نگاہ اُوپر اٹھی تو ایک محل سپید بادل کی طرح دکھائی دیا۔ میں نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے، مجھے وہاں جانے دو۔ انھوں نے جواب دیا کہ ابھی نہیں مگر آپؐ وہاں یقیناً جائیں گے۔ پھر میں نے کہا آج رات کو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، بتاؤ یہ کیا تھیں؟ انھوں نے کہا اب ہم آپؐ کو سب بتا دیں گے۔ پہلا آدمی جس کا سر پتھر سے توڑا جا رہا تھا وہ تھا جو قرآن پڑھ کر پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے اور فرض نماز سے غافل ہو کر سو جاتا ہے۔ وہ شخص جس کی آنکھ، ناک اور مُنھ چیرا جا رہا تھا وہ تھا جو جھوٹ بولتا ہے۔ تنور میں جو عورت مرد ننگے بدن نظر آئے وہ زنا کار ہیں۔ خون کے دریا میں جو غوطے لگا رہا تھا اور پتھر نگل رہا تھا وہ سود خور ہے (کہ وہ لوگوں کا خون چوس کر حرام کھاتا تھا)۔ کریہہ منظر شخص جو آگ دہکا رہا تھا دوزخ کا داروغہ مالک تھا۔ باغ میں جو دراز قد انسان اور اس کے چاروں طرف بچے نظر آتے تھے وہ ابراہیم علیہ السّلام تھے۔ اور یہ بچے وہ کمسن تھے جو دینِ فطرت پر مرے۔ یہاں پر حاضرینِ مسجد میں سے ایک مسلمان نے آنحضرتؐ کو ٹوک کر کہا "یا رسُول اللہؐ! اور مشرکین کے بچے؟" فرمایا "اور وہ بھی" (کیونکہ وہ ہوش میں آنے سے پہلے دینِ فطرت ہی پر مرے) پھر

سلسلۂ گفتگو آگے بڑھایا اور فرمایا" فرشتوں نے بتایا کہ پہلی عمارت جس میں ہر عمر کے لوگ تھے، عام اہلِ ایمان کا مسکن ہے۔ دوسری عمارت جو اس سے بہتر تھی اور جس میں ہر سن و سال کے کچھ آدمی ملے وہ شہیدوں کا مقام ہے اور یہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوب صورت اور آدھا بدصورت تھا وہ تھے جنہوں نے نیک اعمال کے ساتھ برے اعمال بھی کئے ہیں۔ خدا نے ان سے درگذر کیا۔[1]"

---

[1] صحیح بخاری: کتاب التعبیر و کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین۔

مُشاہدات و مسموعات

عالمِ بیداری

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ○ (النجم : ۱۲)

(پیغمبر جو کچھ دیکھتا ہے کیا اس پر تم اس سے جھگڑتے ہو)

انبیاءؑ کے حواس یا عام اصنافِ انسانی کے حواس سے زیادہ لطیف ہوتے ہیں یا ہمارے حواس کے ماسوا اُن کے کچھ اور بھی حواس ہوتے ہیں جن سے عام انسان اسی طرح بیگانہ ہیں جس طرح مادرزاد نابینا ایک تیز نگاہ نوجوان کی قوتِ بینائی اور لطف نظر سے ناآشنا ہے۔

مشاہداتِ نبویؐ عام مادّی واقعات نہیں جن کی روایت صحابہ کرامؓ خود اپنے علم یا رویت یا سماعت سے کر سکتے بلکہ وہ ان واقعات سے اسی قدر جان سکتے تھے جن کو آنحضرتؐ نے اپنی زبانِ مبارک سے کبھی کبھی ظاہر فرمایا۔ اس لئے روایاتِ حدیث میں مشاہداتِ نبویؐ کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے اور نہ عام اُمّت کے عملِ دین کے لئے ان کیفیاتِ مافوق کا علم ضروری ہے۔ بہرحال لفظ و عبارت کے حدود میں جہاں تک ممکن ہے ہم ان کے احاطہ کی کوشش کرتے ہیں۔

مشاہداتِ نبویؐ کی فہرست میں سب سے پہلی چیز روح القدس یا روح الامین یا جبریلؑ نام فرشتہ کی رویت ہے جو سب سے پہلے غارِ حرا میں نظر آیا اور اس کے بعد کچھ زمانہ تک وہ آپؐ کی نگاہ سے اوجھل رہا[1] اور آنحضرتؐ کو اس کی وجہ سے تکلیف رہی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابنِ عباسؓ

---

[1] صحیح بخاری و مسلم : باب بدء الوحی۔

سے روایت ہے کہ مکہ میں آپؐ کے چند سال ایسے گذرے کہ آپؐ کو صرف غیب کی آوازیں سنائی اور روشنی دکھائی دیتی تھی اور کوئی چیز آپؐ کو نظر نہیں آتی تھی[1]۔ غالباً یہی فترۃ الوحی کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ ختم ہوگیا تو آپؐ نے ایک دن آواز سنی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو آسمان و زمین کے بیچ میں ایک کرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہوا نظر آیا[2]۔ مگر عموماً وہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا۔ صحیح روایتوں میں ہے کہ جبریلؑ صرف دو مرتبہ اپنی اصلی صورت میں آپؐ کو نظر آئے۔ آپؐ نے اس وقت دیکھا کہ اُن کے جسم میں چھ سو پر ہیں اور ان کے دونوں بازوؤں نے افق کو گھیر لیا ہے[3]۔ جبریلؑ کے علاوہ دوسرے فرشتگانِ الٰہی بھی بارگاہِ نبوت میں آیا کرتے تھے جس کی تفصیل نزولِ ملائکہ کے عنوان میں گذر چکی۔

فرشتوں کے مقابل دوسری ہستی شیطان کی ہے۔ یہ وہ قوتِ شر ہے جس سے کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سب سے پہلے اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی اور خدا نے یہ نتیجہ ظاہر کیا کہ

لَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ○ (طٰہٰ: ۱۱۵)

ہم نے آدمؑ میں استقلال نہیں پایا۔

سفرِ ایوبؑ اور قرآن میں ہے کہ اس سے حضرت ایوب علیہ السلام کی بھی آزمائش ہوئی اور وہ اس امتحان میں پورے اترے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی شیطان سے آزمائے گئے اور انھوں نے کامیابی سے اس میدان کو سر کیا۔ حدیثِ صحیح میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ پوچھنے والے نے پوچھا "یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ کے ساتھ بھی ہے؟" فرمایا "ہاں لٰکِنَّهُ اَسْلَمَ لیکن وہ مسلمان ہوگیا ہے یا مطیع ہوگیا ہے،

---

[1] صحیح مسلم: باب کم اقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ۔ [2] صحیح مسلم: بدء الوحی۔ [3] صحیح بخاری: بدء الخلق و تفسیر والنجم و صحیح مسلم: باب الاسراء۔

ایک دفعہ کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ شیطان مجھے چھیڑنے لگا اور میری نماز توڑنے لگا تو خدا نے مجھے اس پر غلبہ عطا کیا۔[1]

جنت و دوزخ کو اور عالم کی چیزیں ہیں لیکن نگاہوں سے پردہ اُٹھ جائے تو سامنے آجائیں۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں ایک دفعہ سورج گرہن ہوا۔ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ نماز کو کھڑے ہوئے اور بہت دیر تک قرأۃ، رکوع اور سجود میں مصروف رہے۔ اسی اثنا میں صحابہؓ نے دیکھا کہ آپؐ نے ایک بار ہاتھ آگے کو بڑھایا پھر دیکھا کہ آپؐ کسی قدر پیچھے ہٹے۔ نماز کے بعد لوگوں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ اس وقت میرے سامنے وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں۔ جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ جنت اور دوزخ کی تمثل اسی دیوار کے پاس دکھائی گئی۔ میں نے بہشت کو دیکھا کہ انگور کے خوشے لٹک رہے ہیں۔ چاہا کہ توڑ لوں اگر میں توڑ سکتا تو تم تا قیامت اس کو کھا سکتے۔ پھر میں نے دوزخ کو دیکھا جس سے زیادہ کوئی بھیانک چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں کو پایا۔ لوگوں نے سوال کیا کہ "یا رسول اللہؐ! یہ کیوں؟" فرمایا کہ "اپنے خاوندوں کی ناشکری کے سبب۔ اگر ایک عورت پر تم عمر بھر احسان کرو اور صرف ایک دفعہ وہ تمہارے کسی فعل سے آزردہ ہو جائے تو وہ کہے گی کہ میں نے کبھی تمہارا اچھا برتاؤ نہیں دیکھا۔" میں نے اس دوزخ میں اُس چور کو دیکھا جو حاجیوں کا اسباب چُرایا کرتا تھا۔ میں نے اس میں ایک یہودی عورت کو دیکھا جس پر اس لئے عذاب ہو رہا تھا کہ اُس نے ایک بلّی کو باندھ دیا تھا۔ اس کو نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزیں کھائے۔ آخر اسی بھوک سے اُس نے جان دے دی۔[2]

---

[1] صحیح بخاری: بدء الخلق، باب صفۃ ابلیس۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم: باب صلوٰۃ الکسوف و صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ، باب رفع البصر و باب التعوذ من الفتن۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں جنت میں جا نکلا تو دیکھا یہاں کے باشندوں میں بڑی تعداد اُن کی ہے جو دنیا میں غریب تھے اور دوزخ میں جا کر دیکھا تو ان میں بڑی تعداد عورتوں کی پائی۔"[1]

عمر کے آخیر سال میں آپؐ شہدائے اُحد کے مقبرے میں تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آکر آپؐ نے ایک خطبہ دیا۔ اسی درمیان میں آپؐ نے فرمایا "میں اپنے حوض (کوثر) کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور مجھ کو زمین کے خزانہ کی کنجیاں حوالہ کی گئیں۔ اے لوگو! مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے۔ لیکن ڈرتا اس سے ہوں کہ اس دنیا کی دولت میں پڑکر آپس میں رشک و حسد نہ کرنے لگو۔"[2]

منبرِ مبارک مسجدِ نبویؐ میں تھا اور اسی سے متصل ازواجِ مطہراتؓ کے حجرے بھی تھے۔ جن میں سے ایک میں جسدِ اقدس سپردِ خاک ہے۔ آپؐ نے فرمایا "میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض پر رکھا ہے۔"[3]

محدثین نے اس حقیقت کو مختلف تاویلوں سے ظاہر کرنا چاہا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کی صحیح تشریح یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو ایسا مشاہدہ کرایا گیا۔

معمول تھا کہ تہجد کی نماز کے لئے جب آپؐ بیدار ہوتے تو اُمہات المومنینؓ کو بھی جگا دیتے۔ اُم المومنین اُم سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ ایک شب خواب سے بیدار ہوئے تو فرمایا سبحان اللہ! آج شب کو کیا کیا دولت کے خزانے اور کیا کیا فتنے نازل ہوئے ہیں۔ ان حجرے میں رہنے والیوں (ازواج مطہراتؓ) کو کون جگائے۔ اے افسوس دنیا میں کتنی عورتیں سامانِ آرائش سے

---

[1] صحیح بخاری: باب صفۃ الجنۃ۔ [2] صحیح بخاری: کتاب الجنائز و باب من یحذر من زہرۃ الدنیا۔ [3] صحیح بخاری: کتاب الحوض و باب فضل ما بین القبر و المنبر۔

آراستہ ہیں مگر آخرت میں وہ ننگی ہوں گی[1]" (کہ دنیا میں وہ جامۂ عمل سے برہنہ تھیں)۔

اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک ٹیلے پر چڑھے، پھر فرمایا "اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم دیکھ رہے ہو"؟ لوگوں نے عرض کی "نہیں یارسول اللہؐ!" فرمایا "میں تمھارے گھروں کے درمیان فتنوں کو بارش کی طرح برستے دیکھ رہا ہوں[2]"۔ (یہ غالباً حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد کے واقعات کا مشاہدہ تھا)۔

آنحضرتؐ کو ہر حال میں اپنی اُمّت کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام کناروں کو میری نگاہوں کے سامنے کر دیا۔ میں نے اُن کے مغرب و مشرق کو دیکھا۔ میری اُمّت کی سلطنت ان تمام کناروں تک پہنچ جائے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ مجھے سُرخ و سپید (سونا چاندی) کے دونوں خزانے دیئے گئے۔ میں نے خدا کے حضور میں دعا کی کہ "بارِالٰہا! میری اُمّت کو کسی عالمگیر قحط سے برباد نہ کرنا اور نہ ان پر ان کے سوا کسی غیر دشمن کو مسلّط کرنا"۔ حکم ہوا کہ "میرے دربار میں فیصلہ کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ میں نے تمھاری یہ دعا قبول کی۔ تو اب میری اُمّت کو کوئی دوسرا تباہ نہ کرے گا بلکہ وہ خود ایک دوسرے کو تباہ کریں گے[3]"۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس مشاہدۂ اقدس کی تفسیر ہے۔

گذشتہ انبیائے کرامؑ کی تمثیلیں اکثر آپؐ کو دکھائی گئی ہیں اور معراج اور عالم رؤیا کے علاوہ بیداری کے عالم میں بھی یہ مشاہدے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ سفر میں (غالباً سفرِ حج) جاتے ہوئے وادی ازرق سے گذرے، آپؐ نے دریافت فرمایا "یہ کون سی وادی ہے"؟ لوگوں نے کہا یہ وادیٔ ازرق ہے۔ فرمایا "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام گھاٹی سے اُتر رہے ہیں اور ان کی زبان پر تلبیہ (صدائے حج) جاری ہے"۔

---

[1] صحیح بخاری: کتاب التہجد۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم: باب الفتن۔ [3] صحیح مسلم: باب الفتن۔

اس کے بعد ہرشا کی گھاٹی آئی۔ فرمایا "یہ کونسی گھاٹی ہے؟" لوگوں نے بتایا کہ یہ ہرشا کی گھاٹی ہے۔ فرمایا "گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ متی کے بیٹے یونس علیہ السلام سُرخ اونٹنی پر سوار ہیں۔ کمبل کا جبہ پہنے ہیں۔ اونٹنی کی نکیل کھجور کی چھال کی ہے اور وہ لبیک اللّٰھم لبیک کہتے جا رہے ہیں[1]۔"

معراج کے واقعہ میں یاد ہوگا کہ جب کفار نے بیت المقدس کا نقشہ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ دفعۃً اللہ تعالیٰ نے اس کو میری نگاہوں کے سامنے کر دیا۔ وہ ایک ایک چیز کو پوچھتے جاتے تھے اور میں جواب دیتا جاتا تھا[2]۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپؐ قبرستان سے گذر رہے تھے۔ فرمایا کہ ان دو قبروں پر عذاب ہو رہا ہے۔ یہ عذاب کسی گناہِ کبیرہ کی پاداش میں نہیں ہے۔ ایک کو اس بات پر سزا دی جا رہی ہے کہ وہ طہارت کے وقت پردہ نہیں کرتا تھا یا یہ کہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ دوسرے کے عذاب کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگوں کی چُغلی کھایا کرتا تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک درخت کی سبز ٹہنی کو دو ٹکڑے کر کے دونوں پر کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ شاید ان کی تسبیح و تہلیل سے اُن کی سزاؤں میں تخفیف ہو[3]۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ دوپہر کو گھر سے نکلے تو آپؐ کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ فرمایا کہ "یہ یہود پر اُن کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔" یہ بخاری کی روایت ہے[4]۔ طبرانی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "یہود کو ان کی قبروں میں جو عذاب دیئے جا رہے ہیں ان کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں[5]۔" ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف ایک آدمی مارا گیا تھا۔ لوگوں نے کہا وہ شہید ہوا۔ آپؐ نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ

---

[1] صحیح مسلم: باب الاسراء۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم: باب الاسراء۔ [3] صحیح بخاری: کتاب الجنائز۔ [4] صحیح بخاری: کتاب الجنائز۔ [5] قسطلانی شرح حدیث مذکور۔

اس نے مالِ غنیمت میں سے ایک عبا چرائی تھی"۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ جنت میں صرف اہل ایمان[1] جائیں گے۔

عمرو بن عامر خزاعی عرب میں پہلا شخص ہے جس نے جانوروں کو دیوتاؤں کے نام نذر کرنے کی بدعت پیدا کی۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "آپؐ نے فرمایا کہ "میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے شعلے ایک دوسرے کو توڑ رہے ہیں اور اس میں عمرو بن عامر کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے[2]۔"

صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ ایک دفعہ بنی بخار کے نخلستان میں جا نکلے۔ آپؐ ایک خچر پر سوار تھے اور جان نثار ساتھ ساتھ تھے کہ دفعتہً خچر اس زور سے بھڑکا کہ قریب تھا کہ آپؐ گر پڑیں۔ پاس پانچ چھ قبریں تھیں۔ دریافت فرمایا کہ ان قبروں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک نے کہا "ہاں یارسول اللہؐ! میں جانتا ہوں"۔ فرمایا "یہ لوگ کب مرے ہیں؟" عرض کیا کہ یہ لوگ شرک کی حالت میں مرے ہیں۔ فرمایا "ان لوگوں کی ان کی قبروں میں آزمائش ہو رہی ہیں۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ تم مُردوں سے ڈر کر ایک دوسرے کو دفن کرنے میں ڈرنے لگو گے تو میں خدا سے دُعا کرتا کہ تم کو بھی عذابِ قبر کی وہ آواز سنائے جو میں سن رہا ہوں[3]۔"

ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ کسی طرف کو تشریف لئے جا رہے تھے اتنے میں ایک سخت بدبو پھیلی۔ فرمایا "جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے؟ یہ اُن لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں[4]۔" حاکم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت بلالؓ آنحضرتؐ کے ساتھ کسی طرف کو جا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "اے بلالؓ! جو میں سن رہا ہوں تم سُن رہے ہو؟" عرض کی "نہیں یارسول اللہؐ" فرمایا

---

[1] جامع ترمذی: باب ماجاء فی الغلول۔ [2] مسند ابن حنبل بسند جابر بن عبداللہؓ۔ [3] مسند ابن حنبل بسند جابر بن عبداللہؓ۔ [4] مسند ابن حنبل بسند جابر بن عبداللہؓ۔

کہ تم نہیں سنتے کہ مردوں پر عذاب کیا جارہا ہے۔ مستدرک[1] حاکم، کتاب الزہد امام احمد، بزار اور بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ حضرت زید بن ارقمؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پینے کی کوئی چیز مانگی تو لوگ شہد اور پانی لے آئے۔ حضرت ابوبکرؓ یہ دیکھ کر رونے لگے۔ لوگوں نے گریہ کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "ایک دن میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر تھا تو دیکھا کہ آپؐ ہاتھ سے کوئی چیز ہٹا رہے ہیں اور مجھے کوئی چیز ہٹانے کی نظر نہیں آتی تھی تو میں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہؐ! آپؐ کس چیز کو ہٹا رہے ہیں؟ فرمایا یہ دنیا ہے جو میرے سامنے متمثل ہو کر آئی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ "میرے پاس سے چلی جا" تو اس نے کہا "اگر آپؐ مجھ سے بچ گئے تو آپؐ کے بعد کے لوگ مجھ سے نہیں بچ سکتے۔"

---

[1] مستدرک جلد چہارم۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ بخاری وغیرہ نے اس کے ایک راوی (عبدالصمد) کو متروک کہا ہے۔

اسراء یا معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (بنی اسرآئیل: ۱)

(پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندہ کو لے گیا)

اسراء کے معنی "رات کو چلانے یا لے جانے کے ہیں"۔ چونکہ آنحضرتؐ کا یہ حیرت انگیز معجزانہ سفر رات کو ہوا تھا اس لئے اس کو اسراء کہتے ہیں اور قرآن مجید نے اسی لفظ سے اس کو تعبیر کیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندہ کو لے گیا)۔

معراج "عروج" سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ چونکہ احادیث میں آپؐ سے لفظ عُرِجَ بِی (مجھ کو اوپر چڑھایا گیا) مروی ہے اس لئے اس کا نام معراج پڑا۔

انبیاءؑ اور سیر ملکوت انبیاءؑ کے روحانی حالات اور واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُولُوالعزم پیغمبروں کو آغازِ نبوّت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ منصبِ رفیع حاصل ہوتا ہے اور اس وقت شرائطِ رویت کے تمام مادّی پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دئے جاتے ہیں۔ اسبابِ سماعت کے دنیاوی قوانین ان کے لئے منسوخ کر دئے جاتے ہیں۔ قیودِ زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں۔ آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے سامنے آتے ہیں اور وہ اس کے بعد نور کا حلّہ بہشتی

پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیضِ ربّانی سے معمور اور غرقِ دریائے نور ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض مقربانِ خاص کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریمِ خلوت گاہ قدس میں بار پا کر قَابَ قَوْسَيْنِ (دو کمانوں کے فاصلہ) سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمانِ خاص لے کر اِسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آ جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب نبوّت عطا ہوئی ہے تو ارشاد ہوتا ہے وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] (اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں) یہ سیرِ ملکوت یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی کا مشاہدہ کیا ہے؟ یہی اسراء اور معراج ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق توراۃ میں مذکور ہے:

"یعقوب بئر سبع سے نکلا اور حاران کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ایک مقام پر جا کر لیٹا کیونکہ سورج ڈوب گیا تھا۔ اور اسی مقام سے کچھ پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ لئے اور وہیں سو رہا۔ وہاں خواب دیکھا کہ زمین سے آسمان تک ایک زینہ لگا ہوا ہے جس پر سے خدا کے فرشتے چڑھ اور اُتر رہے ہیں اور خدا اُس پر کھڑا ہے۔ اور اُس نے کہا میں ہوں خداوند! تیرے باپ ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ کا خدا۔ جس زمین پر تو سویا ہے وہ تجھ کو اور تیری نسل کو دوں گا۔"

(تکوین: ۲۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جلوۂ حق کا پرتو نظر آیا۔ وہی ان کی معراج ہے۔ دیگر انبیائے بنی اسرائیلؑ کے مشاہداتِ ربّانی اور سیاحتِ روحانی کی تفصیل سے تورات کے صفحات معمور ہیں۔ عیسائیوں کے مجموعۂ انجیل میں یوحنا علیہ السلام رسول کا مکاشفہ بہ تفصیل مذکور ہے جس میں ان کو خواب

---

[1] الانعام: ۷۵۔

کے اندر بہت سے روحانی مناظر دکھائے گئے ہیں اور قیامت کے واقعات تمثیلی رنگ میں ان کے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ پورا مکاشفہ جس کو ہم سفرنامۂ ملکوت کہہ سکتے ہیں بائیس بابوں میں ختم ہوا ہے اور اُن میں آثارِ قیامت، جزا و سزا اور جنت و دوزخ وغیرہ کے متعلق اکثر ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید کے بالکل مطابق ہیں اور ان کو تمام مسلمان پسند کرتے ہیں۔ مجوس اپنے پیغمبر زردشت کے متعلق بھی معراج کا ایک طویل افسانہ سناتے ہیں جس میں زیادہ تر آنحضرتؐ کے واقعاتِ معراج کے نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پیروانِ بودھ بھی نخلِ حکمت کے سایہ میں بودھ کے مشاہدۂ ربانی کا ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔

بہرحال اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ سے یہ سیرِ ملکوت انبیاءؑ، مقربانِ الٰہی اور مدّعیانِ قربِ الٰہی کے سوانح کا جزو رہی ہے۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے منصب اور رتبہ کے مطابق اس عالم کے مشاہدہ کا فیض حاصل کیا ہے۔ اسلام نے اس خزانہ کو یہاں تک عام کیا ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے دن میں پانچ دفعہ اس دربار کے کسی نہ کسی گوشہ تک رسائی ممکن کر دی ہے کہ الصلوٰۃ معراج المومنین۔

معراجِ نبویؐ لیکن حضورؐ چونکہ سرورِ انبیاءؑ اور سیّدِ اولادِ آدم تھے اس لئے اس حظیرۂ قدس اور بارگاہِ لامکان میں آپؐ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی جہاں تک کسی فرزندِ آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربانِ بارگاہ کی حدِ نظر سے باہر رہا تھا۔

معراجِ نبویؐ کا وقت و تاریخ اور تعدادِ وقوع اس امر میں اختلاف ہے کہ معراج کب اور کس تاریخ کو واقع ہوئی اور ایک دفعہ ہوئی یا مختلف اوقات میں۔ صحیح و مستند روایات کے مطابق اور جمہور علماء کی رائے کے موافق معراج صرف ایک دفعہ واقع ہوئی۔ جو لوگ تعدّد کے

قائل ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں میں جزئیاتِ معراج کے بیان میں اختلاف ہے اس لئے انھوں نے رفعِ اختلاف کے لئے متعدد دفعہ معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے[1] تاکہ ہر مختلف فیہ واقعہ ایک ایک جداگانہ معراج پر منطبق کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک فرضِ محض ہے جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ مستند اور صحیح روایات ہمارے سامنے ہیں اور ان میں تعددِ معراج کا اشارہ تک نہیں ہے۔ ایک ایسے اہم مافوق مشاہدۂ بشری اور طویل واقعہ کے متعلق جو اس وقت واقع ہوا جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور جس قدر تھی وہ بھی پراگندہ حال اور منتشر الخیال تھی، اور ایک ایسے واقعہ کے متعلق جس کے رُواۃ اکثر وہ لوگ ہیں جو اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے، یا بہت چھوٹے تھے یا مدنی لوگ ہیں جن کو قبلِ ہجرت کے واقعات کی ذاتی اور بلاواسطہ واقفیت نہ تھی، اگر جزئیات میں معمولی اختلاف یا بعض واقعات کی ترتیب میں تقدم و تاخر واقع ہوا ہے تو ان کی تطبیق کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں، خود ہمارے سامنے روزانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ ان کی جزئیات کی تفصیل اگر مختلف راویوں سے سنیں یا مختلف اوقات میں ہم خود بیان کریں تو ترتیبِ واقعات اور دیگر جزئی امور میں بیسیوں اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ بایں ہمہ اصل معاملہ اور اس کے اہم اجزا کے وقوع میں شک و شبہہ نہ ہوگا۔

بعض اربابِ سیر نے دو دفعہ معراج کا ہونا ظاہر کیا ہے جن میں وہ ایک کو اسراء اور دوسرے کو معراج کہتے ہیں کہ قرآن میں اسرا اور احادیث میں معراج کا نام آیا ہے۔ انھوں نے اس کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ قرآن مجید کے پندرہویں پارہ میں اسرا کا جو بیان ہے اس میں صرف مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر مذکور ہے اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوا، حالانکہ معراج میں تو آسمان تک کا سفر ہوا ہے اور عجیب و غریب واقعات پیش

---

[1] امام سہیلی نے روض الانف شرح سیرۃ ابنِ ہشام میں اسی استدلال کی بنا پر تعدد کا میلان ظاہر کیا ہے۔

آئے ہیں اور بعض روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا۔ بہرحال یہ بھی استنباط اور قیاس سے آگے نہیں بڑھتا۔ قرآن مجید کے الفاظ خواب و بیداری دونوں کے متحمل ہیں۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج ایک ہی دفعہ واقع ہوئی ہے۔ علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے کہ "یہی جمہور محدثین متکلمین اور فقہا کی رائے ہے اور روایاتِ صحیحہ کا تواتر بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہیے"[1] حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں تعددِ معراج کے قول کو بالکل لغو اور بے سند اور خلافِ سیاقِ احادیث ٹھہرایا ہے۔

معراج کے وقت اور زمانہ کی تعیین میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جبکہ تاریخ اور سنہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی اور عرب میں عموماً اسلام سے پہلے کسی خاص سنہ کا رواج نہ تھا۔ تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا۔ خود قرآن مجید میں ہے اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (یعنی لے گیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے وقت) اور تمام روایات بھی اس پر متفق اللفظ ہیں۔ لیکن صحیح دن اور تاریخ کا پتہ لگانا نہایت مشکل ہے۔ محدثین کے ہاں کسی سے بھی بروایتِ صحیحہ اس کی تصریح موجود نہیں ہے۔ اربابِ سیر نے بعض صحابہؓ، تابعین اور تبعِ تابعین سے کچھ روایتیں کی ہیں لیکن ان کی تصریحات مختلف ہیں۔ تاہم اتنی بات پر بلا اختلاف سب کا اتفاق ہے کہ یہ بعثت اور آغازِ وحی[2] کے بعد اور ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جو مکہ معظمہ میں پیش آیا۔

مہینہ کی تعیین کے متعلق اربابِ سیر کے پانچ اقوال ہیں۔ کوئی ربیع الاول کہتا ہے کسی نے ربیع الآخر کی روایت کی ہے، بعض رجب کی تعیین کرتے ہیں، بعض رمضان یا شوال کہتے ہیں۔

---

[1] شرح مواہب: جلد اول۔ [2] صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں معراج کے بیان میں شریک نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ "قبل آغازِ وحی کے ہوا" اس سے مطلب محض فرشتوں کا آنا ہے نفسِ معراج نہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔

یہ آخری روایت سدّی کی ہے جس کو ابنِ جریرؒ طبری اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ اس کی روایت ہے کہ "معراج ہجرت سے سترہ مہینے پیشتر واقع ہوئی"۔ ہجرت اوائل ربیع الاوّل میں ہوئی ہے۔ اس بنا پر سترہ مہینے پیشتر آخر رمضان ہوگا یا آغازِ شوّال۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ سدّی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ واقدی سے ابنِ سعد نے دو روایتیں کی ہیں[1]۔ ایک یہ کہ "سنیچر کی شب تھی۔ سترہ تاریخ تھی، رمضان کا مہینہ تھا، ہجرت (ربیع الاول ۱۳ھ) سے اٹھارہ مہینے پیشتر کا یہ واقعہ ہے"۔ دوسری یہ ہے کہ "یہ ہجرت سے ایک سال پہلے سترہ ربیع الاول کا واقعہ ہے"۔ واقدی نے ان روایات میں کسی قدر تصریح کے ساتھ دن، تاریخ اور وقت بتا دیا ہے۔ لیکن ہمارے علمائے رجال کی عدالت میں اُن کی شہادت کوئی بڑی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ان روایتوں میں بھی جس روایت میں وقت و روز و تاریخ کی جس قدر تفصیل زیادہ ہے اسی قدر وہ زیادہ نامعتبر ہے کیونکہ اس کی سند ناتمام ہے۔ دوسرے مہینوں کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں۔ ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۶۷ھ) اور علّامہ ابنِ عبدالبر (المتوفی ۴۶۳ھ) نے رجب کی تعیین کی ہے اور متاخرین میں امام رافعی اور امام نووی نے (روضہ میں) اسی کو تیقّن کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ اور محدّث عبدالغنی مقدسی نے بھی اسی مہینہ کو اختیار کیا ہے بلکہ ستائیس تاریخ کی بھی تصریح کر دی ہے۔ اور علّامہ زرقانی نے لکھا ہے کہ "لوگوں کا اسی پر عمل ہے اور بعضوں کی رائے ہے کہ یہی قوی ترین روایت ہے۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ جب کسی بات میں سلف کا اختلاف ہو اور کسی رائے کی ترجیح پر کوئی دلیل قائم نہ ہو تو بظنِ غالب وہ قول صحیح ہوگا جس پر عمل درآمد ہو اور جو لوگوں میں مقبول ہو[2]"۔

اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ متاخرین کی نقول، قیاسات، استنباطات اور مجادلات سے جو دس سے زیادہ مختلف اقوال پر مشتمل ہیں، قطع نظر کر لیا جائے اور دیکھا جائے کہ قدیم راویوں کی

---

[1] ابنِ سعد جلد اول۔ [2] یہ تمام تفصیل زرقانی جلد اوّل میں مذکور ہے۔

اصل تصریحات کیا کیا ہیں اور کثرتِ روایت اور گمانِ صحت کا راجح پہلو کس کی جانب ہے۔ چنانچہ یہ تصریحات حسبِ ذیل ہیں:۔

نام راوی	روایت	کیفیتِ سند
ابنِ سعد۔ بواسطۂ واقدی از حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص و اُمّ سلمہ و عائشہ و ابن عباس و اُمّ ہانی رضی اللہ عنہم	۱۷ ربیع الاوّل ہجرت سے ایک سال قبل۔	ابنِ سعد نے یہ روایت متعدّد مسلسل طریقوں سے صحابہ رضؓ سے نقل کی ہے
۲۔ موسیٰ بن عقبہ۔ بواسطۂ زہری	ہجرت سے ایک سال قبل	موسیٰ بن عقبہ کی سیرۃ معتبرترین کتبِ سیرۃ ہے۔
۳۔ زہری۔ بواسطۂ سعید ابن مسیّب	ہجرت سے ایک سال قبل	-
۴۔ عروہ بن زبیر از حضرت عائشہ رضؓ	ہجرت سے ایک سال قبل	-
۵۔ قتادہ	ہجرت سے ایک سال قبل	یہ تابعی ہیں۔
۶۔ مقاتل	ہجرت سے ایک سال قبل	-
۷۔ ابن جریج	ہجرت سے ایک سال قبل	-
۸۔ ابراہیم بن اسحٰق الحربی	۲۷ ربیع الآخر ہجرت سے ایک سال پہلے۔	-

نام راوی	روایت	کیفیت سند
۹۔ مسلم بن قتیبہ	ہجرت سے ۱۸ ماہ پیشتر	یہ مؤرخ ہیں۔
۱۰۔ عمرو بن شعیب از حضرت عمرو بن العاص رضؓ	۷ ربیع الاول۔ ہجرت سے ایک سال پہلے۔	۔
۱۱۔ سُدّیؒ	ہجرت سے، ایا ۱۶ مہینے پیشتر	سُدّی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

متاخرین نے امام زُہری کے انتساب سے دو اور مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک ہجرت سے پانچ سال قبل اور دوسرا بعثت سے پانچ سال بعد۔ پہلے قول[۲] کے ناقل علامہ ابنِ حجر ہیں اور ان کا بیان ہے کہ قاضی عیاض، امام قرطبی اور امام نووی شارحین صحیح مسلم اسی کے مؤید ہیں۔ لیکن امام نووی کی شرح صحیح مسلم اور قسطلانی کی سیرۃ مواہب لدنیہ میں دوسرا قول منقول ہے۔ زرقانی نے (جلد اوّل فصل معراج میں) اس اختلاف پر حیرت ظاہر کی ہے۔ افسوس ہے کہ قلمی نسخے موجود نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اختلاف کتابت کی غلطی اور مسامحت سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح اسد الغابہ ابنِ اثیر میں سُدّی کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ کہتا ہے کہ معراج ہجرت سے چھ مہینے (ستۃ اشہر) پہلے ہوئی"۔ "چھ درحقیقت ۱۶ ہے"۔ "ستۃ اشہر" کے بجائے "ستۃ عشر شہرا" چاہیئے جیسا کہ

---

[۱] یہ تمام روایات مختلف ماخذوں سے جمع کی گئی ہیں۔ اول ابنِ سعد میں ہے۔ دوم چہارم، یازدہم تفسیر ابنِ کثیر (سورۂ اسرا) میں ہے۔ ہشتم تفسیر ابنِ جریر میں ہے۔ پنجم و ششم تفسیر ابنِ حبان (اسرا) میں ہے۔ بقیہ اقوال و روایات کے لئے فتح الباری، زرقانی، شرح شفائے عیاض، استیعاب ابنِ عبدالبر، اسد الغابہ ابنِ اثیر اور روض الانف (ذکر معراج) دیکھئے۔

[۲] فتح الباری جلد ہفتم۔

حافظ ابنِ کثیر نے اس سے (تفسیر اسراء) نقل کیا ہے اور جو اس کی ۱۷ مہینے والی روایت کے قریب قریب ہے جو طبری و بیہقی میں ہے۔ چھٹی صدی میں علامہ ابنِ اثیر نے کسی قیاس یا استنباط تاریخی کی بنا پر ہجرت سے تین سال پہلے معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے، کسی اور نے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے اور نہ کہیں سیرت کی امہات کتب میں یہ تاریخ مذکور ہے بجز اس قیاس کے کہ ابنِ اسحاق نے اپنی سیرت میں واقعۂ معراج کو ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات سے پہلے نقل کیا ہے۔ اور یہ دونوں حادثے ہجرت سے تین سال پہلے پیش آئے تھے۔ اس سے اشارۃً یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ابنِ اسحاق کا خیال تھا کہ معراج ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی۔

ہم نے مقدمہ کی پوری روداد ناظرین کے سامنے رکھ دی ہے جس سے معلوم ہوا ہوگا کہ قدیم راویوں کا بڑا حصہ ایک سال قبلِ ہجرت کا زمانہ متعین کرتا ہے۔ ایک دو بزرگ سات یا آٹھ مہینے کی مدت اور بڑھا دیتے ہیں۔ متاخرین میں سے بعض اصحاب نے جو قیاسِ تاریخی سے تین سال یا پانچ سال قبلِ ہجرت کا زمانہ متعین کرنا چاہا ہے اس کا مبنیٰ یہ ہے کہ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نماز پنجگانہ کی فرضیت سے پہلے وفات پا چکی تھیں۔ نماز پنجگانہ بالاتفاق معراج میں فرض ہوئی۔ پھر بخاری ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی اور دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے کہ ہجرت سے پانچ سال پہلے انتقال کیا۔ ان مقدمات کو یکجا کر کے انہوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے (بقول ابنِ اثیر) یا پانچ سال پہلے (بقول قاضی عیاض وغیرہ) پیش آیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال اُس وقت درست ہو سکتا تھا جب یہ ثابت ہوتا کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور حضرت خدیجہؓ کی وفات دونوں ایک ساتھ ہوئیں، یا کم از کم یہ کہ پہلا

واقعہ دوسرے واقعہ کے چند روز بعد پیش آیا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے معراج (فرضیتِ نماز پنجگانہ) سے پہلے وفات پائی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ایک مہینہ پہلے یا سال بھر پہلے یا چند سال پہلے، اس لئے ان قیاسات سے معراج کی تاریخ متعیّن نہیں ہو سکتی۔

بہر حال ابتدائی راویوں کی کثیر جماعت جن میں بعض نہایت معتبر اور ثقہ ہیں، اسی جانب ہے کہ یہ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱ھ سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ امام بخاری نے جامع صحیح میں گو کوئی تاریخ نہیں بیان کی ہے لیکن ترتیب میں وقائع قبلِ ہجرت کے سب سے آخر میں اور بیعتِ عقبہ اور ہجرت سے متصلاً پہلے واقعۂ معراج کو جگہ دی ہے۔ اور ابنِ سعد نے بھی سیرت میں واقعۂ معراج کا یہی موقع ترتیب میں رکھا ہے۔ اس سے حدیث اور سیرت کے ان دو اماموں کا یہی منشاء ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش، معراج کا زمانہ متعیّن کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حائل نہ تھا۔ بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔

مہینہ کی تعیین مشکل ہے۔ جو لوگ ہجرت یعنی ربیع الاوّل ۱ھ سے ایک سال پہلے کہتے ہیں ان کے حساب سے اگر یہ ربیع الاوّل اِدھر شامل کر لیا جائے تو اُدھر معراج کا مہینہ ربیع الآخر پڑے گا۔ اور اگر شامل نہ کیا جائے تو ربیع الاوّل رہے گا اور اگر عام و مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کی جائے تو ہجرت سے ایک سال سات مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہو گا۔

معراج کی صحیح روایتیں واقعۂ معراج چونکہ نہایت اہم، ہماری مادّی کائنات سے ماورا اور

قیاس، استنباط اور عقلِ انسانی کی سرحد سے بالاتر ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس باب میں صحیح وخالص روایتوں کی پیروی کی جائے۔ احادیث وسیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو کثیر التعداد صحابیوںؓ نے بیان کیا ہے۔ علامہ زرقانی نے پینتالیس صحابیوںؓ کو نام بنام گنایا ہے اور حدیث وسیر وتفسیر کی جن جن کتابوں میں ان کی روایتیں مذکور ہیں، ان کی تصریح کی ہے۔ علامہ ابنِ کثیر نے تفسیر (بنی اسرائیل) میں ان میں سے اکثر روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان میں صحیح، مرفوع، قوی، ضعیف، موقوف، مرسل، منکر سبھی قسم کی روایتیں ہیں۔ صحاح ستہ میں معراج کا واقعہ مستقلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ضمناً اور مختصراً یہ واقعات مختلف ابواب میں کہیں کہیں آ گئے ہیں۔ امام بخاری اور مسلم نے اس واقعہ کو حضرت ابوذرؓ، حضرت مالک بن صعصعہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سات اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے۔ ان میں چار پچھلے صحابیوں نے صرف چند متفرق جزئیات بیان کئے ہیں۔

صحیحین میں واقعۂ معراج کا مسلسل اور مفصل بیان حضرت ابوذرؓ، حضرت مالک ابن صعصعہؓ اور حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے۔ حضرت انسؓ نے تین طرق سے روایت کی ہے۔ ایک طریقہ میں (صحیح مسلم، باب الاسراء اور صحیح بخاری، کتاب التوحید) اخیر راوی وہی ہیں۔ لیکن اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ انہوں نے خود آنحضرتؐ سے سنا یا کسی صحابیؓ نے ان سے بیان کیا۔ دوسرے طریقہ میں (صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ و باب المعراج اور صحیح مسلم، باب الاسراء) یہ تصریح ہے کہ انہوں نے حضرت مالک بن صعصعہؓ سے سنا اور تیسرے طریقہ (صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ و کتاب الانبیاء) میں یہ صراحت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوذرؓ سے بھی سنا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ نے متعدد اکابر صحابہ سے معراج کا واقعہ سنا تھا اور اسی لئے ان کا بیان سب سے

زیادہ جامع اور مفصّل ہے۔ تابعین میں سے متعدّد بزرگوں نے حضرت انسؓ سے اس روایت کو صحیحین میں نقل کیا ہے مثلاً ثابت البنانی، ابنِ شہاب زُہری، قتادہ اور شریک بن عبداللہ بن ابی نمر۔ ان میں محفوظ تر بیان ثابت کا ہے۔ شریک کی روایت متعدّد امور میں ثقات کی روایت کی مخالف ہے اور اسی لئے امام مسلم نے صحیح مسلم، باب الاسراء میں اس کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ ان کی روایت میں تقدّم و تاخر اور زیادت و نقص ہے۔"

حضرت مالک بن صعصعہؓ اور حضرت ابوذرؓ نے یہ تصریح کی ہے کہ انہوں نے معراج کے واقعہ کو لفظ بلفظ اور حرف بحرف آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے سنا ہے۔ گو یہ دونوں بزرگوار جلیل القدر صحابی ہیں لیکن حضرت ابوذرؓ میں ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ سابقینِ اسلام میں ہیں اور وقوعِ معراج سے پہلے ہی مکّہ میں آکر اسلام لا چکے تھے۔ حضرت مالک بن صعصعہؓ انصاری ہیں۔ اس بنا پر معراج کی تمام روایتوں میں حضرت ابوذرؓ کی روایت کو ہم سب سے مقدّم سمجھتے ہیں۔

معراج کا واقعہ الغرض جب اسلام کی سخت اور پُرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا اور ہجرت کے بعد سے اطمینان و سکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا تو وہ شبِ مبارک آئی اور اس شبِ مبارک میں وہ ساعتِ ہمایوں آئی جو دیوانِ قضا میں سرورِ عالمؐ کی سیرِ ملکوت کے لئے مقرر تھی اور جس میں پیشگاہِ ربّانی سے احکامِ خاص کا اجرا اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا۔ رضوانِ جنّت کو حکم ہوا کہ آج مہمان سرائے غیب کو نئے ساز و برگ سے آراستہ کیا جائے کہ شاہدِ عالمؐ آج یہاں مہمان بن کر آئے گا۔ روح الامینؑ کو فرمان پہنچا کہ وہ سواری جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام ہے اور جو خطۂ لاہوت کے مسافروں کے لئے مخصوص ہے، حرمِ ابراہیمؑ (کعبہ) میں لے کر حاضر ہو۔ کارکنانِ عناصر کو حکم ہوا کہ مملکتِ آب و خاک کے تمام مادّی احکام و قوانین تھوڑی دیر کے لئے معطّل کر دئے جائیں اور زمان و مکان، سفر و اقامت، رویت و سماعت،

تخاطب و کلام کی تمام طبعی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔

صحیحین میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ مکہ میں تھے کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور جبریلؑ نازل ہوئے۔ انھوں نے پہلے آپؐ کا سینۂ مبارک چاک کیا۔ پھر اس کو آبِ زمزم سے دھویا۔ اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے بھر لائے اور ان کو سینۂ مبارک میں ڈال کر بند کر دیا۔ پھر آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے۔ جب آپؐ آسمان پر پہنچے تو جبریلؑ نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ "کھولو"۔ اس نے کہا کہ "کون؟" انھوں نے جواب دیا "جبریلؑ"۔ اس نے پوچھا کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ انھوں نے کہا "ہاں میرے ساتھ محمدؐ ہیں"۔ اُس نے سوال کیا "کیا وہ بُلائے گئے ہیں؟" انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ بہرحال آپؐ جب پہلے آسمان پر چڑھے تو آپؐ کو ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا جس کے دائیں بائیں بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ جب وہ دائیں جانب دیکھتا تھا تو ہنستا تھا اور جب بائیں جانب نگاہ جاتی تھی تو روتا تھا۔ آنحضرتؐ کو دیکھ کر اُس نے کہا "مرحبا اے نبیٔ صالح اور اے فرزندِ صالح"۔ آنحضرتؐ نے جبریلؑ سے پوچھا "یہ کون ہیں؟" انھوں نے کہا "یہ آدمؑ ہیں اور ان کے دائیں بائیں کی پرچھائیاں ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ دائیں جانب والے جنّتی اور بائیں جانب والے دوزخی ہیں۔ اس لئے وہ دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں"۔ اس کے بعد آپؐ دوسرے آسمان پر پہنچے تو اسی قسم کا سوال و جواب ہوا اور ہر آسمان پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام اور چھٹے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔ (حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے مجھ سے پیغمبروں کے منازل کی تعیین نہیں بیان کی) بہرحال حضرت جبریلؑ آپؐ کو ادریس علیہ السلام کے پاس سے لے کر گذرے۔ انھوں نے آپؐ کو دیکھ کر کہا "مرحبا اے نبیٔ صالح اور برادرِ صالح"۔ آپؐ نے نام پوچھا، حضرت جبریلؑ نے نام بتایا۔ پھر یہی واقعہ حضرت موسیٰ، حضرت عیسےٰ اور

حضرت ابراہیم علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نبی صالح اور برادرِ صالح کہہ کر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبیٔ صالح اور فرزندِ صالح کہہ کر آپؐ کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد حضرت جبریلؑ آپؐ کو اور اوپر لے گئے اور آپؐ اُس مقام پر پہنچے جہاں قلمِ (قدرت) کے چلنے کی آواز آتی تھی۔ اس موقع پر خداوند تعالیٰ نے آپؐ کی اُمت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی۔ آنحضرتؐ اس عطیۂ ربانی کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انھوں نے پوچھا کہ "خدا نے آپؐ کی اُمت پر کیا فرض ہے"؟ آپؐ نے فرمایا "پچاس وقت کی نماز"۔ انھوں نے کہا "خدا کے پاس دوبارہ جائیے کہ آپؐ کی اُمت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی"۔ آنحضرتؐ گئے اور خدا نے ایک حصّہ کم کر دیا۔ آپؐ واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ "دوبارہ خدا کے پاس جائیے۔ آپؐ کی اُمت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی"۔ آپؐ گئے تو خدا نے ایک حصّہ کی پھر تخفیف کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا کہ "آپؐ کی اُمت میں اس کی بھی قوّت نہیں"۔ آپؐ پھر گئے تو خدا نے اس تعداد کو گھٹا کر پانچ وقت کر دیا اور ارشاد ہوا کہ "گو نمازیں پانچ وقت کی ہوں گی لیکن ثواب اُن ہی پچاس وقتوں کا ملے گا کیونکہ میرے حکم میں تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تخفیف مزید کی غرض سے آنحضرتؐ کو پھر خدا کے پاس مراجعت کا مشورہ دیا لیکن آپؐ نے فرمایا کہ "اب تو مجھے شرم آتی ہے"۔ اس کے بعد آپؐ کو سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کرائی گئی جو ایسے مختلف رنگوں سے ڈھکا ہوا تھا جن کو آپؐ جان نہ سکے۔ پھر آپؐ کو حضرت جبریلؑ جنّت میں لے گئے وہاں آپؐ کو موتی کی عمارتیں نظر آئیں اور آپؐ نے دیکھا کہ اس کی مٹّی مشک کی ہے[1]۔

کتبِ حدیث میں واقعۂ معراج کے متعلق یہ مقدّم ترین اور معتبر ترین روایت ہے۔ اس کے بعد حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت کا درجہ ہے۔ اس روایت میں بہت سی باتیں پہلی روایت

---

[1] بخاری جلد اول باب کیف فرضیت الصلوٰۃ فی الاسراء۔

سے زائد ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں اس کی تصریح نہیں کہ آپؐ اس وقت بیدار تھے یا خواب میں تھے۔ اس میں یہ ہے کہ آپؐ خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھے۔ پہلی روایت میں ہے کہ "آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے" اور اس میں ہے کہ "آپ حطیم یا حجر[1] میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت جبریلؑ آئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں براق کا ذکر نہیں اور اس روایت میں ہے کہ "آپؐ براق پر سوار ہو کر گئے"۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں منازلِ انبیاءؑ نہیں بیان کی گئی ہیں لیکن اس روایت میں نام بنام تصریح ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاتِ نماز کی تعداد تین مرتبہ میں گھٹائی گئی[2]۔ لیکن اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ اس غرض سے خدا کے پاس پانچ بار گئے۔ ان دونوں روایتوں میں درحقیقت اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت مجمل ہے اور حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت میں واقعات کی کسی قدر تفصیل ہے۔ تاہم یہ دوسری روایت بھی معراج کے تمام واقعات و سوانح کو محیط نہیں ہے۔ اب ذیل میں ہم صحیحین کی تمام روایتوں کو ملا کر معراج کی سوانح و مشاہدات کا ایک جامع بیان لکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اصل کعبہ کی جو عمارت بنوائی تھی وہ سیلاب سے کئی دفعہ گر چکی تھی اور پھر بنی تھی۔ اسی طرح قریش کے زمانہ میں جب آنحضرتؐ ہنوز پیغمبر نہیں ہوئے تھے، سیلاب سے گر گئی۔ قریش نے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہا تو سرمایہ کی کمی کے باعث ایک طرف اندر کی تھوڑی سی زمین چھوڑ کر دیوار کے طول کو کم کر دیا۔ اسی طرح کعبہ کی تھوڑی سی زمین چار دیواری سے باہر رہ گئی اور اب تک اسی طرح ہے۔ اس زمین کا نام حجر اور حطیم ہے۔ قریش کے نوجوان اور رؤسا اکثر

---

[1] حطیم اور حجر ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ یہ وہ مختصر سی جگہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل تعمیر کردہ کعبہ میں سے قریش کے بنائے کعبہ کی چار دیواری سے باہر رہ گئی ہے اور اندر داخل نہ ہو سکی ہے۔ [2] بخاری: باب الانبیاء و باب المعراج۔

یہاں رات کو سویا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ بھی کبھی کبھی یہاں آرام فرمایا کرتے تھے۔ نبوت سے پہلے بھی آپؐ کو حالتِ رؤیا میں فرشتے نظر آتے تھے۔[1] جس شب کو معراج ہوئی آپؐ اُسی مقام[2] پر استراحت فرما رہے تھے۔ بیداری اور خواب کی ایک درمیانی حالت تھی کہ آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر کی

---

[1] بخاری کتاب التوحید و باب صفۃ صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] اس شب کو جس مقام پر آپؐ استراحت فرماتے تھے اور جہاں معراج کا واقعہ پیش آیا اس کی تعیین میں اختلاف بیان کیا جاتا ہے۔ صحیحین میں حضرت مالکؓ اور حضرت انسؓ کی جو روایتیں ہیں ان میں بہ تصریح تمام یہ مذکور ہے کہ آپؐ مسجدِ حرام (کعبہ) میں تھے اور اسی کے ایک بیرونی گوشہ میں جس کا نام حجر اور حطیم ہے، آپؐ سو رہے تھے۔ یہ تو صحیحین کا بیان ہے۔ بعض نیچے درجہ کی روایتوں میں ہے کہ امّ ہانیؓ کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ کو میرے ہی گھر میں معراج ہوئی۔ اُمّ ہانیؓ کا گھر شعبِ ابی طالب میں تھا۔ یہ روایت مشہور دروغ گو کلبی کی ہے۔ اس میں علاوہ رجہ لغو (غریب و منکر) باتیں مذکور ہیں۔ مسند ابو یعلی میں امّ ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ عشاء کی نماز پڑھ کر ہم لوگوں کے ساتھ میرے ہی مکان میں سوئے۔ شب کو میری آنکھ کھلی تو آپؐ کو نہ پایا۔ رؤسائے قریش کی دشمنی کے باعث دل میں عجیب عجیب بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ نیند نہ آئی۔ صبح اٹھ کر آنحضرتؐ نے معراج کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ میں رؤسائے قریش سے کہنے جاتا ہوں۔ میں نے آپؐ کا دامن پکڑ لیا کہ خدا کے لئے ان سے یہ نہ کہئے۔ وہ تکذیب کریں گے اور آپؐ کی جان پر حملہ کریں گے۔ لیکن آپؐ نے نہ مانا اور دامن جھٹک کر چلے گئے۔ ان روایتوں میں علاوہ اور لغویات کے عشا اور صبح کی نماز و جماعت کی تصریح کس قدر غلط ہے کہ یہ نمازِ پنجگانہ تو عین شبِ معراج میں فرض ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایتوں کا صحیحین کے مقابلہ میں کیا رتبہ اور اعتبار ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کی شب آپؐ خانۂ کعبہ میں تھے۔ البتہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوذرؓ کی روایت میں ہے کہ "میں مکہ میں تھا کہ میرے گھر کی چھت کھلی اور جبریلؑ آئے"۔ ہمارے نزدیک اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ آپ آرام تو خانۂ کعبہ ہی میں فرما رہے تھے، لیکن مشاہدہ آپؐ کو یہ کرایا گیا کہ آپؐ اپنے گھر میں ہیں اور اس کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے۔

چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے۔ ان کے ساتھ چند اور فرشتے بھی تھے۔ پہلے وہ آپؐ کو چاہِ زمزم کے پاس لے گئے اور وہاں آپؐ کے سینۂ مبارک کو چاک کیا اور قلبِ اطہر کو نکال کر آبِ زمزم سے دھویا۔ اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے معمور لایا گیا۔ جبریلؑ نے اس طشت سے ایمان و حکمت کے خزانہ کو لے کر آپؐ کے سینہ میں رکھ کر اس کو برابر کر دیا۔

اس کے بعد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا سپید رنگ کا ایک لنبا جانور براق نامی لایا گیا۔ جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اس کا ہر قدم وہاں پڑتا تھا جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی[1]۔ آپؐ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے اور براق کو اُس قلابہ میں باندھ کر جس میں انبیاءؑ اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے، آپؐ نے مسجدِ اقصیٰ کے اندر قدم رکھا اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ یہاں سے نکلے تو جبریلؑ نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپؐ کے سامنے پیش کیے۔ آپؐ نے دودھ کا پیالا اُٹھا لیا۔ جبریلؑ نے کہا آپؐ نے فطرت کو پسند فرمایا۔ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپؐ کی اُمت گمراہ ہو جاتی۔ بعد ازیں جبریلؑ آنحضرتؐ کو لے کر آسمان پر چڑھے۔ پہلا آسمان آیا تو جبریلؑ نے دربان کو آواز دی۔ اس نے کہا "کون ہے؟" جبریلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا "تمہارے ساتھ اور کون ہے"؟ جواب دیا "محمدؐ ہیں"۔ پھر دریافت کیا "کیا وہ بلائے گئے ہیں؟" کہا "ہاں"۔ یہ سُن کر فرشتہ نے دروازہ کھول دیا اور مرحبا خوش آمدید کہا اور کہا کہ "اس خبر کو سُن کر آسمان والے خوش ہوں گے۔ خدا اہلِ زمین کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے جب تک وہ آسمان

---

[1] مسند احمد میں بروایت انسؓ اور ترمذی اور ابنِ جریر طبری میں ہے کہ جب آپؐ نے براق پر سوار ہونے کا قصد کیا تو اس نے شوخی کی۔ جبریلؑ نے کہا کیوں شوخی کرتا ہے۔ تیری پشت پر آج تک محمدؐ سے زیادہ خدا کے نزدیک برگزیدہ کوئی دوسرا سوار نہیں ہوا یہ سُن کر براق پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ابنِ جریر کی روایت کی نسبت حافظ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ اس کے بعض الفاظ میں نکارت و غرابت ہے۔ ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ غریب ہے۔ غریب لا نعرفہ الا من حدیثہ۔

والوں کو اس کا علم نہ بخشے وہ جان نہیں سکتے۔" اب آپؐ پہلے آسمان میں داخل ہوئے تو ایک شخص نظر آیا جس کی داہنی اور بائیں طرف بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ جب وہ داہنی طرف دیکھتا تو ہنستا، اور جب بائیں طرف دیکھتا تو رو دیتا تھا۔ وہ آپؐ کو دیکھ کر بولا "مرحبا اے نبیؐ صالح و اے فرزندِ صالح"۔ آپؐ نے جبریلؑ سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ جبریلؑ نے بتایا کہ یہ آپؐ کے باپ آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کی داہنی اور بائیں طرف جو پرچھائیاں ہیں یہ ان کی اولادوں کی روحیں ہیں۔ داہنی طرف والے اہلِ جنت ہیں اور بائیں طرف والے دوزخی ہیں۔ اس لئے جب اُدھر دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور اِدھر دیکھ کر آزردہ ہوتے ہیں۔ اِسی آسمان میں آپؐ کو آمنے سامنے دو نہریں نظر آئیں۔ پوچھنے پر جبریلؑ نے بتایا کہ یہ نیل اور فرات کی سوتیں ہیں۔ چلتے پھرتے آپؐ کو ایک اور نہر نظر آئی، جس پر لولو و زبرجد کا ایک محل تعمیر تھا اور اس کی زمین مشکِ اذفر کی تھی۔ جبرئیل نے کہا یہ نہرِ کوثر ہے، جس کو پروردگار نے مخصوص آپؐ کے لئے رکھا ہے۔"

"اسی طرح ہر آسمان پر گذرتے گئے اور ہر آسمان کے دربان اور جبرئیل سے اسی قسم کی گفتگو ہوتی گئی اور ہر ایک میں کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے میں حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو دونوں خالہ زاد بھائی تھے، ملاقات ہوئی۔ تیسرے میں حضرت یوسف علیہ السلام ملے جن کو حُسن کا ایک حصہ عطا ہوا تھا۔ چوتھے میں حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جن کی نسبت خدا نے قرآن میں فرمایا ہے، "وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا" (ہم نے اس کو ایک بلند مقام تک اُٹھایا ہے) اور پانچویں میں حضرت ہارون علیہ السلام سے ملے اور ہر ایک نے "اے پیغمبرِ صالح اور اے برادرِ صالح" کہہ کر خیر مقدم کیا۔ چھٹے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے کہا "مرحبا اے پیغمبرِ صالح اور اے برادرِ صالح!" جب آپؐ آگے بڑھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رو پڑے۔ آواز آئی کہ "اے موسیٰؑ! اس گریہ کا کیا سبب ہے؟" موسیٰؑ نے عرض کیا "خداوندا! میرے

بعد تو نے اس نوجوان کو مبعوث کیا ہے۔ اس کی اُمّت کے لوگ میری اُمّت سے زیادہ بہشت میں جائیں گے۔" ساتویں آسمان میں داخل ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "مرحبا اے پیغمبرِ صالح اور اے فرزندِ صالح" کہہ کر خیر مقدم کیا۔ جبرئیلؑ نے بتایا کہ "یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ ہیں"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیتِ معمور (آباد گھر) سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے جس میں ہر روز ستّر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں۔ آپؐ کو جنّت کی سیر کرائی گئی جس کے گنبد موتی کے تھے اور زمین مشک کی تھی[1]۔ اُس مقام تک پہنچے جہاں قلمِ قدرت کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ آگے بڑھ کر آپؐ سدرۃ المنتہیٰ (انتہا کی بیری کا درخت) تک پہنچے۔ اس درخت پر شانِ ربّانی (امر اللہ) کا پرتو تھا جس نے آکر جب اس کو چھالیا، تو اس کی ہیئت بدل گئی اور اس میں حُسن کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کو کوئی زبان بیان نہیں کر سکتی اور اس میں رنگ برنگ کے ایسے انوار کی تجلّی نظر آئی جن کو الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں نیچے زمین پر اترتی ہیں اور زمین سے چڑھ کر اوپر وہاں جاتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر حضرت جبرئیلؑ اپنی اصلی کمالی صورت میں آپؐ

---

[1] کتبِ روایت کی غیر محتاط کتابوں میں مثلاً ابنِ ابی حاتم (تفسیر) ابنِ جریر طبری (تفسیر بنی اسرائیل)، بیہقی (دلائل النبوۃ) میں جنّت و دوزخ کے بہت سے عجیب و غریب مناظر و مشاہدات اور پیغمبروں اور فرشتوں کی تعجب انگیز ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی تفصیل ہے۔ ان روایتوں کے ناقل ابو ہارون العبدی، ابو جعفر رازی اور خالد بن یزید ہیں۔ ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید تو مشہور دروغ گو ہیں۔ ابو جعفر رازی کو گو بعضوں نے ثقہ کہا ہے لیکن اکثروں کے نزدیک وہ ضعیف اور راوئ منکرات ہیں۔ اور ان کی تنہا روایت قبول نہیں کی جاتی۔ نیز ان روایتوں میں بہت سی لغو و منکر باتیں مذکور ہیں جن کو محدثین تسلیم نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں یہ مناظر و مشاہدات جیسا کہ صحیح بخاری (باب الرویا) میں ہے کہ معراج کے سوا ایک اور موقع پر آنحضرتؐ کو دکھائے گئے تھے، سرے سے یہ معراج کے مشاہدات ہی نہیں۔

کے سامنے نمودار ہوئے۔ پھر شاہدِ مستورِ ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوت گاہ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی۔

اس وقت آپؐ کو بارگاہِ الٰہی سے تین عطیے مرحمت ہوئے۔ سورۂ بقر کی آخری آیتیں جن میں اسلام کے عقائد و ایمان کی تکمیل اور اُس کے دورِ مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے۔ رحمتِ خاص نے مژدہ سنایا کہ اُمتِ محمدیؐ میں سے ہر ایک جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو، کرمِ مغفرت سے سرفراز ہوگا اور ندا آئی "اُمت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی"۔ آپؐ ان عطیوں کو لے کر واپس پھرے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے دریافت کیا کہ بارگاہِ خاص سے کیا احکام عطا ہوئے؟ فرمایا "اُمت پر پچاس وقت کی نماز"۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا "میں نے بنی اسرائیل کا خوب تجربہ کیا ہے۔ آپؐ کی اُمت سے یہ بار نہ اُٹھ سکے گا۔ آپؐ واپس جائیے اور عرض کیجیے"۔ آپؐ نے مراجعت کی اور عرض پرداز ہوئے کہ "بارالٰہا میری امت نہایت کمزور اور اس کے قویٰ نہایت ضعیف ہیں"۔ حکم ہوا کہ "دس وقت کی نمازیں معاف ہوئیں"۔ لوٹے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر ٹوکا اور دوبارہ عرض کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر دس اور معاف ہوئیں۔ اسی طرح آپؐ چند بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے بارگاہِ الٰہی میں عرض پرداز ہوتے رہے یہاں تک کہ شب و روز میں صرف پانچ وقت کی نمازیں رہ گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر یہی مشورہ دیا کہ اب بھی مزید تخفیف کی درخواست کیجیے۔ فرمایا "اب مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے"۔ ندا آئی کہ "اے محمدؐ میرے حکم میں تبدیلی نہیں۔ نمازیں پانچ ہوں گی لیکن ہر نیکی کا بدلہ دہ گونہ بخشوں گا۔ یہ پانچ بھی پچاس ہوں گی۔ میں نے اپنے بندوں پر تخفیف کر دی اور اپنا فیصلہ نافذ کر دیا"۔

اب آسمان سے اتر کر آنحضرتؐ زمین پر تشریف لائے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

دیکھا کہ یہاں انبیاءؑ کا مجمع ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام نماز میں مصروف ہیں۔ آپؐ نے ان میں سے چند پیغمبروں کی شکل وصورت بھی بیان کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرمایا کہ ان کا لمبا قد اور گندمی رنگ تھا اور الجھے ہوئے گھونگر والے بال تھے۔ ازدشنوہ کے قبیلہ کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قد میانہ اور رنگ سُرخ سپید تھا۔ سر کے بال سیدھے اور لمبے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی رضؓ (صحابی) سے ان کی صورت ملتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صورت تمہارے پیغمبر (خود آنحضرتؐ) کی سی تھی"۔ بہرحال اسی اثناء میں نماز (غالباً صبح کی نماز) کا وقت آگیا۔ سرورِ انبیاءؐ منصبِ امامت سے سرفراز ہوئے۔ نماز سے فراغت ہوئی، تو ندا آئی کہ اے محمدؐ دوزخ کا داروغہ حاضر ہے۔ سلام کرو۔ آپؐ نے مڑکر دیکھا تو داروغۂ دوزخ نے سلام کیا۔

بخاری میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ شبِ معراج میں دجّال بھی آپؐ کو دکھایا گیا۔[۲]

---

[۱] مسند احمد اور سیرت ابنِ اسحاق کی بعض روایتوں میں ہے کہ آسمان پر جانے سے پہلے ہی بیت المقدس میں انبیاءؑ نے آپؐ کی اقتداء میں یہ نماز پڑھی تھی۔ صحیح بخاری میں اس کا ذکر نہیں۔ صحیح مسلم میں وقت کی تصریح نہیں مگر قرینہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واپسی کا واقعہ ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اسی کو صحیح لکھا ہے۔ (تفسیر سورۂ اسراء) اور ہم نے اسی کی تقلید کی ہے۔ ترمذی (تفسیر سورۂ اسراء) اور مسند ابنِ حنبل میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آنحضرتؐ نے مسجد اقصیٰ میں آتے جاتے سرے سے نماز ہی نہیں پڑھی۔ مگر صحیح مسلم کے مقابلہ میں اس کو کون تسلیم کرے گا۔

[۲] صحیح بخاری: باب بدء الخلق۔

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد آپؐ مسجدِ حرام (کعبہ) میں صبح کو بیدار ہوئے۔

کفّار کی تکذیب خانۂ کعبہ کے آس پاس رؤسائے قریش کی نشست رہتی تھی۔ آپؐ بھی وہیں مقامِ حجر میں تشریف فرما تھے۔ صبح کو آپؐ نے اُن سے اس واقعہ کو بیان کیا تو ان کو سخت اچنبھا ہوا۔ جو زیادہ کور باطن تھے انہوں نے آپؐ کو (نعوذ باللہ) جھٹلایا۔ بعضوں نے مختلف سوالات کئے۔ ان میں اکثر شام کے تاجر تھے اور انہوں نے بیت المقدس کو بارہا دیکھا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ آنحضرتؐ بیت المقدس نہیں گئے ہیں اس لئے آخر میں خاتمۂ دلائل کے طور پر سب نے کہا کہ "اے محمدؐ تم کہتے ہو کہ صرف ایک شب میں تم خانۂ کعبہ سے بیت المقدس گئے اور واپس آئے۔ اگر یہ سچ ہے تو بتاؤ بیت المقدس کی کیا ہیئت ہے"؟ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ "میرے ذہن میں عمارت کا صحیح نقشہ نہ تھا۔ بہت بیقراری ہوئی کہ ناگاہ نظر کے سامنے پوری عمارت جلوہ گر کر دی گئی۔ وہ سوال کرتے جاتے تھے اور میں اس کو دیکھ کر جواب دیتا جاتا تھا۔"

اتنا واقعہ تو صحیحین میں مذکور ہے لیکن واقدی، ابنِ اسحاق، ابنِ جریر طبری، ابنِ ابی حاتم، بیہقی اور حاکم میں جن کا مرتبہ کتبِ روایات میں بلند نہیں ہے، اس واقعہ پر لوگوں نے عجیب و غریب حاشیے لگائے ہیں۔ حضرت امّ ہانیؓ سے روایت ہے کہ "صبح اٹھ کر آنحضرتؐ نے گھر والوں سے شب کا واقعہ بیان کر کے باہر جانا چاہا کہ اور لوگوں سے بیان کریں تو میں نے دامن تھام لیا کہ اس کا قصد نہ کیجئے۔ کفّار صریح جھٹلائیں گے۔" ایک روایت میں ہے کہ "رات کو جب آپؐ کے اعزّہ نے آپؐ کو بستر پر نہ پایا تو اُن کو قریش کا خوف ہوا کہ انہوں نے تو آپؐ کو گزند نہیں پہنچائی

لہ معراج کے یہ تمام واقعات صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ، کتاب التوحید، کتاب الانبیاء، کتاب المعراج، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور باب بدء الخلق میں اور صحیح مسلم باب المعراج اور اس کے بعد کے متفرق ابواب متعلقۂ معراج میں حرفاً حرفاً مذکور ہیں۔ ہم نے ان واقعات کے لکھنے میں صرف ترتیب و ترجمہ کا فرض ادا کیا ہے۔

اور پہاڑوں اور غاروں میں آپؐ کو ڈھونڈنے لگے۔" ایک اور روایت میں ہے کہ "معراج کی واپسی میں قریش کے ایک تجارتی قافلہ سے آپؐ کی ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ کچھ واقعات پیش آئے۔ جب لوگوں نے جھٹلایا، تو آپؐ نے فرمایا کہ "اچھا تمہارا قافلہ کل پرسوں تک آجائے گا اس سے پوچھ لینا۔" چنانچہ وہ آیا اور اس نے تصدیق کی۔ ان ہی روایتوں کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ "کچھ کفار دوڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے کہ آج محمدؐ کعبہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات کو وہ بیت المقدس گئے اور آئے۔" حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ "کیا واقعی آپؐ یہ فرما رہے ہیں؟" لوگوں نے کہا "ہاں۔" حضرت ابوبکرؓ نے کہا "میں تو آپؐ کو سچا جانتا ہوں اور اس پر ایمان لاتا ہوں۔" کفار نے کہا "تم کھلم کھلا ایسی خلافِ عقل بات کیونکر صحیح سمجھتے ہو؟" جواب دیا "میں تو اس سے بھی زیادہ خلافِ عقل بات پر یقین رکھتا ہوں۔ میں تو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہر روز آپؐ کی خدمت میں آسمان سے فرشتے آتے ہیں۔" اسی دن سے حضرت ابوبکرؓ کا لقب صدیق ہوگیا۔

لیکن یہ تمام قصے سرتاپا لغو اور باطل ہیں۔ ابنِ اسحٰق اور ابنِ سعد نے تو سرے سے ان واقعات کی اسناد ہی نہیں لکھی ہیں۔ ابنِ جریر طبری، بیہقی، ابنِ ابی حاتم، ابویعلی، ابنِ عساکر اور حاکم نے ان کی سندیں ذکر کی ہیں۔ ان کے رُواۃ ابوجعفر رازی، ابوہارون عبدی اور خالد بن یزید بن ابی مالک ہیں جن میں پہلے صاحب گو بجائے خود ثقہ ہیں مگر بے سروپا حدیثوں کے بیان کرنے میں بیباک ہیں۔ بقیہ دو مشہور دروغ گو، کاذب اور قصہ خواں ہیں۔

ان ہی لغو قصوں کا اختتامی جزو یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ نے لوگوں سے معراج کا واقعہ بیان کیا تو بہت سے مسلمانوں کے ایمان بھی متزلزل ہوگئے اور مرتد ہوگئے (فارتد کثیر ممن اسلم)۔ یہ قصہ غالباً قرآن مجید کی اس آیت کی غلط توضیح میں گھڑا گیا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيٓ أَرَيْنَٰكَ — ہم نے یہ دکھاوا جو تجھ کو دکھایا ہے

اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ — اس کو لوگوں کی آزمایش ہی کے

بنی اسرائیل ۶۰ — لئے کیا ہے۔

ابنِ سعد اور واقدی نے اس قصہ کو یوں ہی بے سند بیان کیا ہے۔ طبری، ابن ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ کے معتمد ارکان وہی اصحابِ ثلثہ ہیں جن کے اوصافِ گرامی ابھی اوپر گذر چکے ہیں۔ ابن جریر نے اس آیت کے تحت میں جو روایتیں درج کی ہیں ان میں سے حسن، قتادہ اور ابن زید سے یہ واقعۂ ارتداد مذکور ہے۔ لیکن ان کا سلسلہ ان سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس واقعہ کے انکار کی سب سے پُرزور دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اس وقت تک مکہ میں جو اصحاب اسلام لائے تھے وہ گنے چنے لوگ تھے جو ہم کو نام بنام معلوم ہیں۔ ان میں سے کسی کی پیشانی پر ارتداد کا داغ نہیں۔ واقعہ کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کافروں میں بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اس سے پہلے آپؐ کے سخت مخالف نہ ہوں اور اگر آپؐ کو پیغمبر نہ جانتے ہوں مگر آپؐ کو مفتری اور کاذب بھی نہ کہتے ہوں۔ لیکن اس واقعۂ معراج کے بعد سے انہوں نے بھی آپؐ کے ساتھ اس نیکی اور حُسنِ ظن کے خیال کو اٹھا دیا ہو۔ قرآن مجید نے اس کو فِتْنَةٌ لِّلنَّاسِ (لوگوں کے لئے آزمائش) کہا ہے فِتْنَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یعنی مومنوں اور مسلمانوں کے لئے آزمائش) نہیں کہا ہے۔ اور اگر ان کے لئے بھی آزمائش ہو تو اس آیت سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورے نہیں اترے۔

کیا آپؐ نے معراج میں خدا کو دیکھا معراج کے مشاہداتِ شئون و صفات کی جلوہ انگیزی اور آیات اللہ کی نیرنگی تو آپؐ نے دیکھی۔ لیکن کیا ذاتِ الٰہی بھی حجابِ حجاب سے باہر آکر منصۂ حقیقت پر رونما ہوئی؟ یعنی دیدارِ الٰہی سے بھی آپؐ مشرف ہوئے؟ بعض روایتوں میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے شریک بن عبداللہ نے جو معراج

کی روایت کی ہے، اُس کے آخر میں ہے:

حتی جآء سدرۃ المنتھی ودنا	آنحضرتؐ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو
الجبار رب العزۃ فتدلی حتی	عزت والا جبار (خدا) یہاں تک قریب
کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ۔	ہوا اور جھک آیا کہ اس کے اور آپ کے درمیان
(بخاری کتاب التوحید)	دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

محدثین نے شریک کی اس روایت کے اس حصہ پر سخت اعتراضات کئے ہیں اور سب سے پہلے امام مسلم نے اس کی نسبت بے احتیاطی کا الزام قائم کیا ہے۔ صحیح مسلم باب المعراج میں شریک کی اس سند کو اور کسی قدر متن لکھ کر ناتمام چھوڑ دیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے۔ فقدم فیہ واخر وزاد و نقص (شریک نے اس روایت میں واقعات کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور گھٹا بڑھا دیا ہے)۔ امام خطابی نے لکھا ہے کہ "صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو بظاہر اس قدر قابلِ اعتراض ہو جس قدر یہ حدیث ہے"۔ اس کے بعد اس حدیث کی تاویل بیان کر کے لکھا ہے:

فانہ کثیر التفرد بمناکیر الالفاظ	شریک ایسے منکر الفاظ خود تنہا بکثرت
التی لا یتابعہ علیھا سائر	روایت کرتے ہیں جن کی تائید ان کے
الرواۃ	دیگر ہم درس راوی نہیں کرتے۔

اور حضرت انسؓ سے واقعۂ معراج کو اور بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہے مگر شریک کے سوا کسی اور نے ان الفاظ کی روایت نہیں کی ہے۔ امام بیہقی نے بھی یہی کہا ہے اور یہی حافظ ابنِ کثیر کی بھی تحقیق ہے[1]۔ علامہ ابن حزم نے بھی اس کے متعلق قریب قریب یہی رائے

---

[1] بیہقی اور ابنِ کثیر کا قول تفسیر ابنِ کثیر سورۂ اسراء میں ہے۔

ظاہر کی ہے[1]۔ بعض علمائے رجال نے بھی شریک کی نسبت اچھی رائیں نہیں ظاہر کی ہیں۔ نسائی اور ابن جارود کا قول ہے کہ "وہ قوی نہیں"۔ یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ "اُس سے حدیث نہ بیان کی جائے"۔ البتہ ابن سعد اور ابوداؤد نے ان کے وثوق کی شہادت دی ہے۔ اس لئے محدثین کا فیصلہ اُن کے حق میں یہ ہے کہ "جب وہ تنہا کسی بات کو بیان کریں تو اُن کی وہ بات شاذ اور منکر قرار دی جائے گی"۔ چنانچہ اس روایت میں یہ فقرہ بھی اسی قسم کا ہے۔

اصل یہ ہے کہ شریک کی یہ روایت سورۂ والنجم کی اِن آیتوں کی تعبیر پر مبنی ہے :-

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ	(محمد کو) پُرزور اور طاقتور نے تعلیم دی۔ وہ
فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ ۝	آسمان کے بلند تر افق پر تھا۔ پھر قریب ہوا
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ	اور جھک آیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر
قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰۤى اِلٰى	یا اس سے بھی قریب تر ہو گیا۔ پھر اس کے بندے
عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ ۝ مَا كَذَبَ	کی طرف جو کچھ وحی کرنا تھی کی۔ دل نے جو کچھ
الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى	دیکھا غلط نہیں دیکھا۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے کیا
مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝	تم لوگ اس سے اس کے متعلق آپس میں شک
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا	کرتے ہو۔ حالانکہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک جس
جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ	کے پاس جنت الماویٰ ہے اس نے دوسری
مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا	مرتبہ یقیناً اور بیشک اترتے ہوئے دیکھا جبکہ
طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ	سدرۃ کو چھا لیا تھا جس نے چھا لیا تھا نگاہ
الْكُبْرٰى ۝	نہ جھپکی نہ بہکی اور اس نے اپنے پروردگار
(النجم . ۵ - ۱۸)	کی عظیم الشان نشانیاں دیکھیں۔

[1] امام خطابی اور ابن حزم کے اقوال ابن حجر نے فتح الباری جلد سیزدہم میں نقل کئے ہیں۔

.. یہی آیتیں ہیں جن کی بنا پر صحابہؓ میں اختلاف پیدا ہو لیا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ آپؐ کو خود خدا نظر آیا اور اکثر صحابہؓ یہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا۔ ترمذی (تفسیر سورۂ نجم) میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس خود خدا کو دیکھا تھا۔ ترمذی ہی میں ہے کہ ایک مقام پر کعب احبار (نومسلم یہودی عالم) سے حضرت ابنِ عباسؓ کی ملاقات ہوئی۔ کعب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور اپنے دیدار کی موسیٰ اور محمد علیہما السلام میں تقسیم کردی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو دفعہ شرفِ کلام حاصل ہوا اور آپؐ دو دفعہ خدا کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ مسروقؒ حضرت عائشہؓ کے ایک شاگرد نے یہ گفتگو ان سے جاکر نقل کی۔ وہ نہایت برہم ہوئیں اور قرآن مجید کی آیتوں سے انہوں نے اس خیال کی تردید کی کہ خدا خود فرماتا ہے[1] لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں)۔ حضرت ابنِ عباسؓ کے شاگرد عکرمہ نے حضرت ابنِ عباسؓ کے سامنے اس آیت کو پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "ہاں صحیح ہے۔ مگر اس وقت جب خدا اپنے اصلی نور میں نمایاں ہو۔ آنحضرتؐ نے خدا کو دو دفعہ دیکھا تھا۔[2]"

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ آپؐ نے خدا کو بھی دیکھا ہے؟" فرمایا "وہ تو نور ہے۔ میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں"؛ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "میں نے صرف ایک نور دیکھا۔[3]"

اکابر صحابہؓ میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کا مذہب

---

[1] الانعام: ۱۰۳۔ [2] یہ تمام روایتیں ترمذی تفسیر سورۂ والنجم میں ہیں اور ترمذی نے ان کو حسن کہا ہے۔ [3] مسلم، جلد اوّل باب الاسراء و ترمذی: تفسیر سورۂ والنجم۔

یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے خدا کو نہیں بلکہ جبریلؑ کو دیکھا تھا اور انہی نے آپؐ کی طرف وحی کی تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت جبریلؑ کو اس حالت میں دیکھا کہ اُن کے چھ سو پر تھے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔ تمام صحابہؓ میں حضرت عائشہؓ کو اس مسئلہ پر سخت اصرار تھا۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت مسروقؒ نے حضرت عائشہؓ سے ایک بار پوچھا کہ "مادرِ من! کیا آنحضرتؐ نے اپنے خدا کو دیکھا تھا؟" بولیں "یہ سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق اگر کوئی شخص روایت کرے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔ جس نے روایت کی کہ آنحضرتؐ نے خدا کو دیکھا تھا اس نے جھوٹ کہا۔ خدا خود کہتا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○	خدا کو نگاہیں نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

(الانعام: ۱۰۳)

پھر فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	اور کسی آدمی میں یہ قوت نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے لیکن یہ کہ بذریعۂ وحی کے یا پردے کی آڑ سے۔

(الشوریٰ: ۵۱)

ان آیتوں کو پڑھ کر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آنحضرتؐ نے خدا کو نہیں دیکھا البتہ حضرت جبریلؑ کو ان کی اصلی صورت میں دو بار دیکھا۔ امام نووی شارح صحیح مسلم نے لکھا ہے[1] کہ "حضرت

---

[1] شرح صحیح مسلم نووی۔

عائشہؓ کا یہ قول حجت نہیں ہو سکتا کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کی آیات سے صرف عقلی استدلال کیا ہے۔ آنحضرتؐ سے کوئی مرفوع روایت نہیں بیان کی کہ آپؐ نے خدا کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن خود صحیح مسلم میں جس کی شرح میں امام نووی نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے، اُسی مقام پر حضرت مسروقؒ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ انہوں نے کہا "اے ابو عائشہؓ! تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی نے ایک کو بھی کہا تو اُس نے خدا پر بہتان باندھا۔" میں نے پوچھا وہ کیا باتیں ہیں؟ فرمایا "جس شخص نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا اُس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی۔" میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر سیدھا اُٹھ بیٹھا اور کہا کہ اے اُمّ المومنین! جلدی نہ کیجئے۔ کیا خدا خود نہیں فرماتا:

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ○ — اور اس نے اس کو افق المبین پر دیکھا۔

(التکویر: ۲۳)

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ — اور اس نے اس کو دوسری مرتبہ اترتے ہوئے دیکھا۔

(النجم: ۱۳)

بولیں "سب سے پہلے خود میں نے اس کے متعلق آنحضرتؐ سے سوال کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا یہ جبریلؑ تھے۔ میں نے ان دو مرتبوں کے سوا اُن کو اصلی صورت میں کبھی نہیں دیکھا۔"[1] اس سے زیادہ مستند مرفوع روایت کیا ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے حضرت ابنِ عباسؓ نے (جن سے روایتیں ہیں کہ آنحضرتؐ نے خدا کو دیکھا) کبھی اپنی روایت میں یہ تصریح نہیں کی ہے کہ انھوں نے خود آنحضرتؐ سے اس کو سُنا ہے۔ حافظ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ صحابہؓ میں سے کوئی حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر کا مخالف نہیں ہے۔[2] بلکہ اصل یہ ہے کہ

---

[1] صحیح مسلم: جلد اول، باب ذکر سدرۃ المنتہیٰ۔ [2] ابنِ کثیر: تفسیر سورۂ بنی اسرائیل۔

بقول ابنِ حجر حضرت ابن عباسؓ کے خیال کی تشریح میں بعض راویوں سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ کا یہ منشا نہیں کہ آنحضرتؐ نے ان ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھا بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے دل کی آنکھوں سے جلوۂ ربانی کا مشاہدہ کیا۔ صحیح مسلم اور جامع ترمذیؒ میں ان کے یہ الفاظ ہیں رأی بقلبه رأی بفواده (دل کی آنکھوں سے دیکھا چشمِ قلب سے مشاہدہ کیا) مَردویہ نے اس سے بھی زیادہ ان کے تصریحی الفاظ نقل کئے ہیں:

لَمْ یرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آنحضرتؐ نے اپنی آنکھ سے نہیں
وسلم بعینه انما رآہ بقلبه۔	دیکھا بلکہ اپنے قلب سے دیکھا۔

(فتح الباری جلد ہشتم)

اس تشریح کے بعد اس باب میں کوئی نزاع باقی نہیں رہ جاتا۔ رہی یہ بات کہ دل کا دیکھنا اور قلب کا مشاہدہ کیا ہے؟ تو اس رمز کو وہی سمجھے جس کے دل میں نورِ بصیرت اور جس کے دل میں مشاہدہ کی طاقت ہو۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی، خواب تھا یا بیداری

ہمارے متکلّمین اور شرّاحِ حدیث نے اس باب میں بے سود مباحث کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ فیصلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ متکلّمانہ اعتراضات، فلسفیانہ خدشات اور عقلی محالات اور نیز عامیانہ ظواہر پرستی اور جمہور کے خیالات کی بے جا حمایت کے وسوسوں سے خالی الذہن ہو کر صحیح روایتوں کے اصل الفاظ پر غور کیا جائے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل (معراج) کی اس آیت کی نسبت

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيٓ أَرَيْنَٰكَ	ہم نے جو رؤیا (دکھاوا) تجھ کو دکھایا اس کو
إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ	ہم نے لوگوں کے لئے صرف آزمائش بنایا

لہ صحیح مسلم: متعلقات اسراء و ترمذی تفسیر والنجم۔

(بنی اسرائیل : ۶۰) ہے۔

بخاری میں حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ معراج کے متعلق ہے۔ رویاء عربی زبان میں "دکھاوا" کو کہتے ہیں۔ یعنی "جو دیکھنے میں آئے" اور عام طور سے اس کے معنی "خواب" کے ہیں۔ اس لئے جو فریق معراج کو خواب بتاتا ہے وہ اس آیت کو اپنے دعوٰی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن صحیح بخاری میں حضرت ابنِ عباسؓ کی اس روایت میں یہ اُن کی تصریح ہے کہ اس آیت میں رُؤیا کے معنی مشاہدۂ چشم کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ واقعۂ معراج خواب نہ تھا بلکہ آنکھوں کا مشاہدہ تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں :۔

عن ابن عباس فی قولہ تعالٰی	ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں کہ ہم نے
" وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ	جو رؤیا تجھ کو دکھایا اس کو نہیں بنایا لیکن
إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ " قال ھی رؤیا	لوگوں کے لئے آزمائش، کہتے ہیں کہ یہ
عین اریھا رسول اللہ صلی اللہ	آنکھ کا مشاہدہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم لما اسری بہ الی	علیہ کو دکھایا گیا جب آپؐ کو رات کے
بیت المقدس۔	وقت بیت المقدس لے جایا گیا۔

(بخاری باب الاسراء)

اس پر یہ لغوی بحث چھڑ گئی کہ رُؤیا لغت میں "آنکھ کے دیکھنے" کو نہیں کہتے۔ مگر ذرا غور کیجئے کہ حضرت ابنِ عباسؓ سے بڑھ کر لغتِ عرب کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے۔ جب وہ رویائے عین کہتے ہیں تو کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں راعی اور متنبّی بعض عرب شعراء نے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کو بھی "رؤیا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے :

راعی کہتا ہے ع	فکبّر للرؤیا وحش فرادہ

متنبّی کا مصرع ہے ع ورؤیاك احلی فی العیون من الغمض ۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند ابنِ حنبل اور حدیث کی دیگر معتبر کتابوں میں جن میں معراج کے مسلسل اور تفصیلی واقعات درج ہیں، ان سب کو ایک ساتھ پیش نظر رکھنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صحیحین کی دو روایتوں کے سوا باقی روایتوں میں خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم اور مسند ابنِ حنبل میں حضرت ابوذرؓ کی جو صحیح ترین روایت ہے اور حضرت انسؓ کی وہ روایت جو ثابت البنانی کے ذریعہ سے ہے، خواب کے ذکر سے قطعاً خالی ہے۔ اس لئے حسبِ محاورۂ عام اس کو بیداری کے معنی میں سمجھنا قطعی ہے۔ لیکن حضرت انسؓ کی اس روایت میں جو شریک کے واسطہ سے ہے، یہ مذکور ہے کہ یہ واقعہ آنکھوں کے خواب اور دل کی بیداری کی حالت میں پیش آیا۔ بخاری میں یہ حدیث کتاب التوحید اور باب صفۃ النبی اللہ علیہ وسلم دو مقامات میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

سمعت انس بن مالكؓ يقول	انس بن مالکؓ کو میں نے اس شب کا
ليلة اسرى برسول الله صلى الله	واقعہ جب آپؐ کو کعبہ کی مسجد سے لے جایا
عليه وسلم من مسجد الكعبة	گیا (معراج) بیان کرتے ہوئے سُنا کہ اس
انه جاءه ثلثة نفر قبل ان	سے پہلے کہ آپؐ کی طرف وحی بھیجی جائے،
يوحى اليه وهو نائم فى المسجد	آپؐ کے پاس تین شخص آئے اور آپؐ اس
الحرام فقال اولهم ايهم هو	وقت مسجدِ حرام میں سوئے ہوئے تھے۔ پہلے
فقال اوسطهم هو خيرهم فقال اخرهم	نے کہا وہ کون ہے! بیچ والے نے کہا
خذوا خيرهم فكانت تلك	ان (سونے والوں) میں جو سب سے بہتر ہے۔
الليلة فلم يرهم حتى اتوه	پچھلے نے کہا ان میں جو سب سے بہتر ہے

لیلۃ اخری فیما یری قلبہ و تنام عینہ و لا ینام قلبہ وکذلک الانبیاء تنام اعینہم و لا تنام قلوبہم

(صحیح البخاری کتاب التوحید)

اس کو لے لو۔ یہ رات ہو گئی۔ پھر آپؐ نے اُن کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ ایک اور رات کو وہ[1] آئے۔ اس حالت میں کہ آپؐ کا دل دیکھتا تھا اور آپؐ کی آنکھ سوتی تھی لیکن آپؐ کا دل نہیں سوتا تھا۔ اور اسی طرح پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔

سمعت انس بن مالکؓ یحدثنا عن لیلۃ اسری بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم من مسجد الکعبۃ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحیٰ الیہ وھو نائم فی المسجد الحرام فقال اولھم ایھم ھو فقال اوسطھم ھو خیرھم و قال اٰخرھم خذوا خیرھم۔ فکانت تلک۔ فلم یرھم حتی جاءوا لیلۃ اُخری فیما یری قلبہ و النبی صلی اللہ علیہ وسلم نائمۃ

انس بن مالکؓ ہم لوگوں سے آپؐ کی شبِ معراج کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ آپؐ پر وحی آئے آپؐ مسجدِ حرام میں سو رہے تھے۔ آپؐ کے پاس تین آدمی آئے۔ پہلے نے کہا وہ کون ہے؟ بیچ والے نے کہا وہ ان میں سب سے بہتر ہے۔ پچھلے نے کہا جو اُن میں سب سے بہتر ہو اس کو لے لو۔ یہ تو ہو گیا۔ پھر آپؐ نے ان کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ وہ ایک اور رات آئے اس حالت میں کہ آپؐ کا دل دیکھتا تھا اور آپؐ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن آپؐ کا دل نہیں سوتا

---

[1] ان دونوں راتوں میں کم از کم بارہ برس کا فصل ہو گا کیونکہ پہلی رات آغازِ وحی سے پہلے کی تھی اور دوسری رات جو شبِ معراج تھی، نبوت کے بارہویں سال تھی۔

لیلۃ اخری فیما یری قلبہ و تنام عینہ و لا ینام قلبہ وکذلك الانبیاء تنام اعینہم و لا تنام قلوبہم

(صحیح البخاری کتاب التوحید)

اس کو لے لو۔ یہ رات ہو گئی۔ پھر آپؐ نے اُن کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ ایک اور رات کو وہ[1] آئے۔ اس حالت میں کہ آپؐ کا دل دیکھتا تھا اور آپؐ کی آنکھ سوتی تھی لیکن آپؐ کا دل نہیں سوتا تھا۔ اور اسی طرح پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔

سمعت انس بن مالکؓ یحدثنا عن لیلۃ اسری بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم من مسجد الکعبۃ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحیٰ الیہ وھو نائم فی المسجد الحرام فقال اولھم ایھم ھو فقال اوسطھم ھو خیرھم و قال اٰخرھم خذوا خیرھم۔ فکانت تلك۔ فلم یرھم حتی جاءوا لیلۃ اُخری فیما یری قلبہ و النبی صلی اللہ علیہ وسلم نائمۃ

انس بن مالکؓ ہم لوگوں سے آپؐ کی شبِ معراج کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ آپؐ پر وحی آئے آپؐ مسجدِ حرام میں سو رہے تھے۔ آپؐ کے پاس تین آدمی آئے۔ پہلے نے کہا وہ کون ہے؟ بیچ والے نے کہا وہ ان میں سب سے بہتر ہے۔ پچھلے نے کہا جو اُن میں سب سے بہتر ہو اس کو لے لو۔ یہ تو ہو گیا۔ پھر آپؐ نے ان کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ وہ ایک اور رات آئے اس حالت میں کہ آپؐ کا دل دیکھتا تھا اور آپؐ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن آپؐ کا دل نہیں سوتا

---

[1] ان دونوں راتوں میں کم از کم بارہ برس کا فصل ہو گا کیونکہ پہلی رات آغازِ وحی سے پہلے کی تھی اور دوسری رات جو شبِ معراج تھی، نبوت کے بارہویں سال تھی۔

عیناہ ولا ینام قلبہ کذٰلک	تھا۔ انبیاءؑ کا یہی حال ہوتا ہے کہ اُن
الانبیاء تنام اعینہم ولا تنام	کی آنکھیں سوتی ہیں اور ان کے دل نہیں
قلوبھم فتولاہ جبریلؑ ثم	سوتے۔ پھر جبریلؑ نے آپؐ کو اپنے
عرج بہ الی السمآء۔	اہتمام میں لیا پھر وہ آپؐ کو لے کر
(صحیح البخاری باب صفۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم)	آسمان پر چڑھے۔

بخاری نے اس باب میں اس حدیث کو یہیں تک لکھا ہے۔ لیکن کتاب التوحید میں اس کے بعد معراج کے تمام واقعات بیان کرکے آخر میں حضرت انسؓ کا یہ فقرہ روایت کیا ہے:

فاستیقظ وھو فی المسجد الحرام	پھر آپؐ بیدار ہوئے تو مسجدِ حرام میں تھے۔

صحیح مسلم میں یہ روایت نہایت مختصر ہے۔ سند کے بعد صرف اس قدر لکھ کر کہ "آپؐ مسجدِ حرام میں سوتے تھے" اس کو ختم کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ "شریک نے اس روایت میں واقعات کو گھٹا بڑھا اور آگے پیچھے کر دیا ہے"۔ اسی لئے ائمہ نے جیسا کہ قاضی عیاض نے شفا میں اور امام نووی نے شرحِ مسلم میں لکھا ہے، کہ شریک کی اس روایت میں بہت سے اوہام ہیں اور اسی لئے اس کو انہوں نے رد کر دیا ہے۔ دوسری روایت صحیحین میں وہ ہے جس میں حضرت مالک بن صعصعہ انصاریؓ خود آنحضرتؐ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے معراج کا واقعہ دہراتے ہوئے فرمایا:

بینما انا عند البیت بین النائم	میں کعبہ کے پاس خواب و بیداری کی
والیقظان[1]	درمیانی حالت میں تھا۔

صحیح بخاری باب المعراج اور مسند ابنِ حنبل میں مالک بن صعصعہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ

---

[1] صحیح بخاری ذکر الملائکہ و صحیح مسلم باب الاسراء۔

نے فرمایا:

بینما انا فی الحطیم	اس اثنا میں کہ میں (خانۂ کعبہ کے مقام)
مضطجعا۔	حطیم میں لیٹا ہوا تھا۔

لیکن یہ شبِ معراج میں آغاز کی کیفیت کا بیان ہے کہ اس وقت آنحضرتؐ آرام فرما رہے تھے۔ دلائلِ بیہقی میں ایک روایت ہے جس میں حضرت ابوسعید خدریؓ کے واسطہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "میں عشاء کے وقت خانۂ کعبہ میں سو رہا تھا۔ ایک آنے والا (جبریلؑ) آیا اور اس نے آکر مجھے جگایا۔ میں جاگا۔" اس کے بعد واقعۂ معراج کی تفصیل ہے۔ اس میں سونے کے بعد جگائے جانے کی گو تصریح ہے لیکن اس کا دوسرا ہی راوی جھوٹا، دروغ گو اور ناقابلِ اعتبار ہے[1] اور اس میں جو منکرات اور غرائب امور بیان کئے گئے ہیں وہ سرتاپا لغو ہیں۔ ابنِ اسحٰق نے سیرت میں اور ابنِ جریر طبری نے تفسیر میں (سورہ بنی اسرائیل) حضرت حسن بصری سے بھی اس قسم کی روایت کی ہے کہ "میں سو رہا تھا کہ جبریلؑ نے پاؤں سے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا۔" لیکن اس کا سلسلہ حضرت حسن بصری سے آگے نہیں بڑھتا۔ سیرت ابنِ ہشام اور تفسیر ابنِ جریر طبری میں محمد بن اسحاق کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ سے دو روایتیں ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ یہ بزرگوار معراج کو روحانی اور رؤیائے صادقہ کہتے تھے۔ یہ روایتیں مع سند کے حسبِ ذیل ہیں:۔

عن محمد ابن اسحٰق قال	محمد بن اسحٰق سے روایت ہے۔ انہوں
حدثنی یعقوب بن عتبۃ بن	نے کہا کہ یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ نے

---

[1] حافظ ابن کثیر نے تفسیر سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اس کے سلسلۂ سند میں دوسرا راوی وہی ابو ہارون العبدی ہے جس کو علمائے رجال نے بالاتفاق ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ھو اکذب من فرعون (وہ فرعون سے بھی زیادہ جھوٹا ہے)۔

لمغيرة ان معاوية بن ابی سفيانؓ كان اذا سئل عن مسرى رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كانت رؤيا من الله صادقة

بیان کیا کہ معاویہ بن سفیانؓ سے جب معراج کا واقعہ پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک سچا خواب تھا۔

ابن جریر تفسیر اسراء سیرت ابن سحق ذکر معراج)

لیکن یہ روایت منقطع ہے۔ یعقوب نے حضرت معاویہؓ سے خود نہیں سُنا ہے کیونکہ انہوں نے ان کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ دوسری روایت ہے :

حدثنا ابن حميد قال حدثنا سلمة عن محمد قال حدثنی بعض آل ابی بكر ان عائشةؓ كانت تقول مَا فقد جسد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكن الله اسری بروحه

ابنِ حمید نے ہم سے بیان کیا، ان سے سلمہ نے، سلمہ سے محمد بن اسحاق نے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ آنحضرتؐ کا جسم نہیں کھویا گیا، بلکہ آپؐ کی روح شب کو لے جائی گئی

ابن جریر تفسیر اسراء سیرت ابن سحق ذکر معراج)

اس روایت کے سلسلہ میں بھی محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی خاندانِ ابوبکرؓ کے ایک شخص کا نام ونشان مذکور نہیں ہے۔ اس لئے یہ بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے۔ تاہم ان روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ معراج کو رؤیا یا روحانی کہنا قرنِ اوّل

میں بعض لوگوں کا قول تھا۔ ابنِ اسحاق میں ہے کہ "حضرت حسن بصری کے سامنے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ یہ رؤیا تھا تو وہ اس کی تردید نہیں کرتے تھے۔"

لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ معراج جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں تھی۔ قاضی عیاض نے شفا میں اور امام نووی نے شرحِ مسلم میں لکھا ہے:

اختلف الناس فی الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیل انما کان جمیع ذٰلك فی المنام والحق الذی علیہ اکثر الناس ومعظم السلف وعامۃ المتاخرین من الفقہآء والمحدثین والمتکلمین انہ اسری بجسدہ صلی اللہ علیہ وسلم والاٰثار تدل علیہ لمن طالعہا وبحث عنہا ولا یعدل عن ظاہرہا الا بدلیل ولا استحالۃ فی حملہا علیہ فیحتاج الی تاویل۔

(شرح مسلم باب الاسراء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ سارا واقعہ خواب میں پیش آیا اور حق یہ ہے جس پر اکثر لوگ اور سلفِ صالحین کا بڑا حصہ اور عامہ متاخرین میں سے فقہاء و محدثین اور متکلمین سب متفق ہیں کہ آنحضرت کو جسم کے ساتھ معراج ہوئی اور جو شخص تمام آثار و احادیث کا غائر مطالعہ اور تحقیق کرے گا اس پر یہ حق واضح ہو جائے گا۔ اور اس ظاہر سے بے دلیل انحراف نہیں کیا جائے گا اور نہ ظاہر پر ان کو محمول کرنے میں کوئی محال لازم آتا ہے جو تاویل کی حاجت ہو۔

مفسرین میں سے ابنِ جریر طبری سے لے کر امام رازی تک نے جمہور کے اس مسلک پر

چار عقلی دلیلیں بھی قائم کی ہیں جو حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ قرآن مجید میں ہے سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (پاک ہے وہ خدا جو (شبِ معراج میں) لے گیا اپنے بندہ (عبد) کو) اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اپنے "بندہ" کو لے گیا۔ "بندہ" یا "عبد" کا اطلاق جسم پر یا جسم و روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ تنہا روح کو "عبد" یا "بندہ" نہیں کہتے۔

۲۔ واقعاتِ معراج میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ براق پر سوار ہوئے اور دودھ کا پیالہ نوش فرمایا۔ سوار ہونا، پینا، یہ سب جسم کے خواص ہیں۔ اس لئے یہ معراجِ جسمانی تھی۔

۳۔ اگر واقعۂ معراج رؤیا اور خواب ہوتا تو کفار اس کی تکذیب کیوں کرتے انسان تو خواب میں خدا جانے کیا کیا دیکھتا ہے۔ محال سے محال چیز بھی اُس کو عالمِ خواب میں واقعہ بن کر نظر آتی ہے۔

۴۔ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (اس مشاہدۂ معراج کو ہم نے لوگوں کے لئے معیارِ آزمائش بنایا ہے)۔ اگر یہ عام خواب ہوتا تو یہ آزمائش ایمان کی کیا چیز تھی اور اس پر ایمان لانا مشکل کیا تھا۔

معراج کے بحالتِ بیداری ہونے پر صحیح استدلال

میرے نزدیک معراج کے بحالتِ بیداری کے ثبوت کا صاف و صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلام کا فطری قاعدہ ہے کہ جب تک متکلم اپنے کلام میں یہ ظاہر نہ کردے کہ یہ خواب تھا تو طبعاً یہی سمجھا جائے گا کہ وہ واقعہ بحالت بیداری پیش آیا۔ قرآن پاک کے ان الفاظ میں سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَيْلًا (پاک ہے وہ جو اپنے بندہ کو ایک رات لے گیا) میں کسی خواب کی تصریح نہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذرؓ کی صحیح ترین روایت میں بھی اس کی تصریح نہیں۔ اس لئے بے شبہہ یہ بیداری ہی کا واقعہ سمجھا جائے گا۔

اور یہی جمہور اُمت کا عقیدہ ہے اور وہ بھی بجسم۔ اسی طرح صحیح احادیث میں بھی خواب کی تصریح نہیں اس لئے زبان کے محاورۂ عام کی بنا پر اس کو بیداری کا واقعہ سمجھا جائے گا۔

مدعیانِ رویا کا مقصود بھی رویا سے عام خواب نہیں جو لوگ اس کو رؤیا کہتے بھی ہیں اس سے اُن کا مقصود بھی وہ عام خواب نہیں ہے جو ہر روز ہر شخص دیکھا کرتا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ لوگوں نے انبیاءؑ کے رویا کی حقیقت پر غور نہیں کیا ہے۔ وہ غلطی سے انبیاءؑ کے رؤیا کو بھی عام انسانی خواب سمجھتے ہیں حالانکہ دراصل صرف لفظ کا اشتراک ہے۔ ورنہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے۔ یہ وہ "رؤیا" ہے جس میں گو آنکھیں بند ہوتی ہیں مگر دل بیدار ہوتا ہے۔ کیا یہی عام رؤیا کی حقیقت ہے؟ یہ وہ حالت ہے جو بہ ظاہر خواب ہے مگر دراصل ہشیاری بلکہ مافوقِ ہشیاری ہے۔ عام خواب اور اس رؤیا میں مشابہت صرف اس قدر ہے کہ اس عالم مادی اور کاروبار حواسِ ظاہری سے پہلے میں تغافل ہے تو دوسرے میں تعطل ہے لیکن پہلے میں عالم روح اور کائنات ملکوت کو دخل نہیں اور دوسرے میں سراپا ہشیاری، بیداری، حقیقت بینی، ہم سفری ناموس، سیر سماوات، لقائے ارواح، رویتِ حق سب کچھ ہے۔ اسی لئے جن لوگوں نے اس کو "منام" یا "رؤیا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے انہوں نے درحقیقت مجاز و استعارہ سے کام لیا ہے۔ ورنہ اصل مقصود یہی کیفیتِ روحانی اور یہی حالتِ ملکوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے ظاہری حواس کے مادی قوانینِ طبعی کے رُو سے جو چیزیں محال معلوم ہوتی ہیں وہ اس عالم میں محال نہیں ہیں۔

رؤیائے صادقہ کی تاویل بہرحال جو لوگ اس کو رؤیائے صادقہ کہتے ہیں اُن کو گو یہ مغالطہ بعض روایاتِ حدیث سے پیش آیا ہے جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اور جن میں سب سے مستند شریک کی روایت ہے جس کے الفاظ میں کمی بیشی پر اکثر محدثین نے اعتراض کیا ہے اور اسی لئے انہوں نے اس کو رد کر دیا ہے، تاہم محدثین میں سے امام خطابی صاحبِ معالم السنن

شریک کی اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واما من اعتبر اول الحدیث	لیکن جو شخص اس حدیث کے ابتدائی الفاظ کو
باخرہ فانہ یزول عنہ الاشکال	آخری الفاظ سے ملا کر دیکھے گا اس سے یہ اشکال
فانہ مصرح فیھما بانہ کان	اس لئے دور ہو جائے گا کہ ان میں یہ تصریح
رؤیا لقولہ فی اولہ وھو نائم	ہے کہ یہ رؤیا تھا۔ کیونکہ اس روایت کے
وفی اخرہ، استیقظ و بعض	شروع میں ہے کہ "آپؐ سو رہے تھے" اور
الرویا مثل یضرب لیتاول علی	آخر میں ہے کہ "آپؐ جاگ پڑے"۔ بعض
الوجہ الذی یجب ان یصرف	رؤیا تمثیلی رنگ میں ہوتے ہیں جن کی تاویل
الیہ معنی التعبیر فی مثلہ و	ضروری ہے کہ اُسی طرح کی جائے جس طرح
بعض الرؤیا لا یحتاج الی ذلک	اس قسم کے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے۔ اور
بل یاتی کالمشاھدۃ	بعض رؤیا اس کے محتاج نہیں ہوتے
(فتح الباری جلد سیزدھم)	بلکہ وہ مشاہدۂ عینی کی طرح پیش آتے ہیں۔

رویا سے مقصود روحانی ہے لیکن جو لوگ ان میں آشنائے راز ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ ایک عام قسم کا خواب تھا جو ہر انسان تقریباً ہر شب کو دیکھتا ہے۔ بلکہ وہ اس کیفیت پر رؤیا کا اطلاق محض مجازی اور انسانی طریقۂ ادا کے تصور کے باعث کرتے ہیں۔ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔ یہ روح جو جسم سے وابستہ ہے اس کا یہ تعلق محض عارضی ہے اور یہی عارضی تعلق عالمِ نور سے اس کے حجاب کا باعث ہے۔ جس قدر اس تعلق کا رشتہ ڈھیلا ہوتا جائے گا اسی نسبت سے وہ حجاب اٹھتا جائے گا۔ انسان جب بیداری میں ہوتا ہے تو حواسِ ظاہری کی مصروفیت روح کو مشاہدۂ باطن سے باز رکھتی ہے۔ نیند کی حالت میں کسی قدر اس کو

ظاہری مشغولیت سے آزادی ملتی ہے تو اس کو رنگا رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ یہ حالت انسان کی باطنی و روحانی قویٰ کی ترقی و تنزل پر موقوف ہے۔ ایک دن تو ہر انسان مرجاتا ہے یعنی اس کی روح کا تعلق اس کے جسم سے منقطع ہوجاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی ایک صنف ایسی بھی ہے، جس کا طائرِ روح خدا کے فضل و موہبت کے بازوؤں سے پُرزور ہوکر اپنے قفسِ عنصری کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر عالمِ ملکوت کی سیر کرتا پھرتا ہے اور پھر اسی قفسِ عنصری کی طرف رجعت کرجاتا ہے۔ یہی حالت ہے جس کو وہ اپنی محدود زبان میں مجازاً رویائے صادقہ یا رویائے نبوت کہتے ہیں اور اسی عالم کو عالمِ رؤیا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اسی کو قرآن مجید کی آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ میں رؤیا کہا گیا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جس میں آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار ہوتا ہے اور اسی کی طرف وحی کی حدیثوں میں اشارہ ہے۔ اور ابنِ ہشام میں حضرت عائشہؓ کی طرف جو روایت منسوب ہے کہ

ما فقد جسد رسول اللہ صلی	حضور انورؐ کو معراج روح کے ذریعہ
اللہ علیہ وسلم ولکن اسری بروحہ۔	ہوئی۔

کا بھی یہی مطلب ہے۔

حافظ ابنِ قیم نے زاد المعاد میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے :۔

فصل وقد نقل ابن اسحٰق	فصل ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ اور
عن عائشۃ رضؓ و معاویۃ رضؓ انھما	معاویہؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ ان دونوں نے
قالا انما کان الاسراء بروحہ	کہا کہ معراج میں آپؐ کی روح لے جائی گئی
ولم یفقد جسدہ ونقل عن	اور آپؐ کا جسم کھویا نہیں گیا (یعنی وہ اسی دنیا
الحسن البصری نحو ذٰلک	میں اپنی جگہ پر موجود تھا) اور حسن بصریؒ سے بھی

ولكن ينبغي ان يعلم الفرق
بين ان يقال كان الاسراء
منامًا و بين ان يقال كان
بروحه دون جسده وبينهما
فرق عظيم وعائشةؓ ومعاويةؓ
لم يقولا كان منامًا وانما
قالا اسري بروحه ولم يفقد
جسده وفرق بين الامرين
فان مايراه النائم قد يكون
امثالاً مضروبة للمعلوم
في الصور المحسوسة فيري
كانه قد عرج به الى السماء
او ذهب به الى مكة واقطار
الارض وروحه لم تصعد ولم تذهب
وانما ملك الرؤيا ضرب له المثال. و
الذين قالوا عرج برسول الله
صلى الله عليه وسلم طائفتان.
طائفة قالت عرج بروحه وبدنه
وطائفة قالت عرج بروحه ولم

اس قسم کی روایت ہے۔ لیکن یہ جاننا چاہیئے
کہ یہ کہنا کہ معراج منام (خواب) تھی اور یہ کہنا
کہ بذریعہ روح کے تھی جسم کے ساتھ نہ تھی،
ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حضرت عائشہؓ
اور معاویہؓ نے یہ نہیں کہا کہ وہ منام (خواب) تھی
انہوں نے یہی کہا ہے کہ معراج میں آپؐ کی
روح کو لے جایا گیا اور آپؐ کا جسم کھویا نہیں
گیا۔ ان دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ سونے والا
جو کچھ دیکھتا ہے کبھی محسوس صورتوں میں جو کچھ معلوم
ہے اس کی تمثیلیں اس کے سامنے کی جاتی ہیں۔
پس وہ دیکھتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھا گیا یا
مکہ اس کو لے جایا گیا اور زمین کے گوشوں میں اس
کو پھرایا گیا۔ حالانکہ اس کی روح نہ چڑھی، نہ گئی،
نہ پھری، صرف یہ ہوا کہ خواب کے فرشتے نے
اس کے لئے ایک تمثیل اس کے سامنے کر دی۔
اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو آسمان پر
چڑھایا گیا ان میں دو فرقے ہیں۔ ایک فرقہ کہتا
ہے کہ آپؐ کو معراج روح و بدن دونوں کے
ساتھ ہوئی اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ صرف

يفقد بدنه۔ وهولاء لم يريدوا
ان المعراج كان منامًا وانما
ارادوا ان الروح ذاتها اسرى
بها وعرج بها حقيقةً وباشرت
من جنس ما تباشر بعد المفارقة
وكان حالها فى ذٰلك كحالها
بعد المفارقة فى صعودها الى
السمٰوٰت سماءً سماءً حتى
ينتهى بها الى السمآء السابعة
فتقف بين يدى الله عزوجل
فيامر فيها بما يشاء ثم تنزل
الارض فالذى كان لرسول الله
صلى الله عليه وسلم ليلة الاسراء
اكمل مما يحصل للروح عند
المفارقة ومعلوم ان هذا امر
فوق ما يراه النائم۔ لكن لما
كان رسول الله صلى الله عليه
وسلم فى مقام خرق العوائد
حتى شق بطنه وهو حى لا يتالم

روح کے ساتھ ہوئی اور بدن کھویا نہیں گیا۔
(یعنی اس عالم سے)۔ ان لوگوں کا یہ مقصد نہیں کہ
وہ خواب تھا بلکہ یہ مقصد ہے کہ خود بذاتہٖ روح
کو معراج ہوئی اور وہی درحقیقت اوپر چڑھائی
گئی اور اُس نے اس طرح کیا جس طرح جسم سے
مفارقت کے بعد کرتی ہے۔ اور اس میں اس کی
حالت وہی تھی جو مفارقتِ جسم کے بعد آسمانوں پر
ایک ایک آسمان پر کر کے چڑھنے میں ہوتی ہے
یہاں تک ساتویں آسمان پر جاکر ٹھہر جاتی ہے۔
اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکر کھڑی ہو جاتی ہے۔
پھر وہ جو چاہتا ہے اس کی نسبت حکم دیتا ہے۔
پھر زمین پر واپس آجاتی ہے۔ پس آنحضرتؐ کو
شبِ معراج میں جو حاصل ہوا وہ اس سے بھی
زیادہ کامل تھا جو روح کو مفارقتِ جسم کے بعد
حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ درجہ اس سے
بڑا ہے جو سونے والے کو خواب میں نظر آتا ہے۔
لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرقِ عادات
کے مقام میں تھے یہاں تک کہ آپؐ کا سینہ چاک
کیا گیا اور آپؐ زندہ تھے لیکن آپؐ کو تکلیف نہیں

بذلك عرج بذات روحه
المقدسة من غير اماتة.
ومن سواه لاينال بذات
روحه الصعود الى السمآء الا
بعد الموت و المفارقة. فالانبياء
انما استقرت ارواحهم هناك
بعد مفارقة الابدان و روح
رسول الله صلى الله عليه وسلم
صعدت الى هناك فى حال الحياة
ثم عادت. وبعد وفاته استقرت
فى الرفيق الاعلى مع ارواح
الانبياء. ومع هذا افلها اشراف
على البدن و اشراف وتعلق به
بحيث يرد السلام على من سلم
عليه. وبهذا التعلق و اى
موسى قائما يصلى فى قبره
وراه فى السمآء السادسة و
معلوم انه يعرج بموسى من قبره
ثم رد اليه و انما ذلك مقام

ہوئی۔ اسی طرح خود روحِ مبارک بذاتہٖ اوپر چڑھائی
گئی، بغیر اس کے کہ آپؐ پر موت طاری کی جائے۔
آپؐ کے علاوہ اور کسی کی روح کو موت اور
مفارقتِ تن کے بغیر یہ عروج نصیب نہ ہوا۔
انبیاءؑ کی روحیں جو یہاں ٹھہری تھیں وہ مفارقتِ
جسم کے بعد تھیں۔ لیکن آنحضرتؐ کی روحِ پاک
زندگی کی حالت میں وہاں گئی اور واپس آئی اور
مفارقت کے بعد انبیاءؑ کی روحوں کے ساتھ
"رفیق اعلیٰ" میں جاکر ٹھہر گئی۔ لیکن باوجود اس کے
روحِ پاک کو اپنے جسم کے ساتھ ایک نوع کا
تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر آپؐ پر کوئی سلام بھیجے تو
آپؐ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ اسی تعلق سے
آپؐ نے شبِ معراج میں دیکھا کہ موسیٰؑ اپنی قبر
میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ نے اُن کو چھٹے
آسمان میں دیکھا، حالانکہ معلوم ہے کہ موسیٰؑ کو اپنی
قبر سے اٹھا کر نہیں لے جایا گیا تھا اور نہ پھر واپس
کیا گیا تھا۔ اس کی گرہ یوں کھلتی ہے کہ وہاں آسمان
پر جو موسیٰؑ کو آپؐ نے دیکھا تو وہ اُن کی روح کا
مقام و مستقر تھا اور قبر اُن کے جسم کا جہاں وہ

روحه و استقرارها۔ وقبره
مقام بدنه و استقراره الی
یوم معاد الارواح الی اجسادها۔
فرآه یصلی فی قبره ورآه فی
السّماء السادسة کما انه
صلی الله علیه وسلم فی ارفع
مکان فی الرفیق الاعلیٰ مستقرا
هناك وبدنه فی ضریحه غیر
مفقود۔ واذا سلم علیه المسلم
رد الله علیه روحه حتی یرد
علیه السلام۔ ولم یفارق الملأ
الاعلی۔ ومن کثفت ادراکه و
غلظت طباعه عن ادراك هذا
فلینظر الی الشمس فی علو
محلها وتعلقها و تاثیرها فی
الارض وحیاة النبات والحیوان
بها، هذا، وشأن الارواح فوق
هذا فلها شان وللابدان شان
وهذه النار تکون فی محلها و

قیامت میں روحوں کے لوٹانے کے وقت
تک رہے گا۔ اس طرح آپؐ نے اُن کو ان کی
قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا اور چھٹے آسمان پر
بھی دیکھا جس طرح کہ (بعد وفات) آنحضرتؐ
اس سے بلند تر مقام یعنی "رفیق اعلیٰ" میں بھی
قرار گیر ہیں اور جسم مبارک قبر شریف میں بھی
موجود ہے۔ جب سلام کرنے والا آپؐ پر سلام
کرتا ہے، تو اللہ آپؐ کی روح کو واپس کرتا ہے
تا آنکہ آپؐ جواب دیتے ہیں۔ حالانکہ مقام
"رفیق اعلیٰ" سے آپؐ علیحدہ نہیں ہوئے۔ جو موٹی
سمجھ اور بھدی طبیعت کا آدمی اس معاملہ کو
سمجھ نہ سکے اس کو چاہیئے کہ آفتاب کی طرف
دیکھے کہ اس دوری اور بلندی کے باوجود اُس
کا تعلق اور رشتہ زمین سے قائم ہے اور اُس
کے اندر وہ اثر ڈالتا ہے اور نباتات، حیوانات
کی زندگی میں اس کو دخل ہے۔ پھر روح کا
مرتبہ تو اس سے بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ روح
کا معاملہ اور ہے اور جسم کا معاملہ اور ہے۔
دیکھو کہ آگ اپنی جگہ پر رہتی ہے اور اس کی

حرارتها توثر فی الجسم البعید	گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے۔
عنها مع ان الارتباط والتعلق	روح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی
الذی بین الروح والبدن اقوی	زیادہ قوی اور کامل ہے اس لئے کہ روح
واکمل من ذلك واتم فشان	آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔
الروح اعلیٰ من ذلك والطف۔	

ے فقل للعیون الرمد ایاك ان تری سنا الشمس فاستخشی ظلام اللیالیا

گرد آلود آنکھوں سے کہہ دو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکی کو اوڑھ لیں۔

صوفیہ اور اربابِ حال نے معراج کے واقعات کی تشریح اپنے مذاق اور رنگ میں کی ہے۔ علمائے اسلام میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جو صوفی اور صاحبِ حال بھی ہے اور محدث اور متکلم بھی۔ یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شاہ صاحب کے متعلق معلوم ہے کہ وہ دیگر اہلِ باطن کی طرح عالمِ برزخ اور عالمِ مثال نام، عالمِ جسد اور عالمِ روح کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جہاں جسم پر روح کے خواص طاری ہوتے ہیں اور روح اپنی خصوصیت اور مناسبت کے مطابق جسمانی شکل و صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ شاہ صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ معراج بیداری میں اور جسم کے ساتھ ہوئی لیکن یہ عالمِ برزخ کی سیر تھی جہاں آپؐ کے جسم پر روحانی خواص طاری کئے گئے اور معانی و واقعات مختلف اشکال و صُور میں مشاہدہ کرائے گئے۔ چونکہ ایک بیگانہ کے لئے اس نادیدہ شہرستان کی ہو بہو تشریح اپنی زبان میں مشکل ہے اس لئے ہم اس ملک کے ایک سیاح کا بیان نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں معراج کی حقیقت ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

واسرے به الی المسجد الاقصیٰ ثم	آپؐ کو معراج میں مسجد اقصیٰ میں لے جایا گیا

الی سدرۃ المنتھیٰ و الیٰ ما شاء
اللہ۔ وکل ذٰلک لجسدہ صلے اللہ
علیہ وسلم فی الیقظۃ و لٰکن
ذٰلک فی موطن ھو برزخ بین
المثال والشھادۃ جامع لاحکامھما
فظھر علی الجسد احکام الروح
و تمثل الروح والمعانی الروحیۃ
اجسادًا۔ ولذلک بأن لکل واقعۃ
من تلک الوقائع تعبیر۔ و قد
ظھر لحزقیل وموسی وغیرھما
علیھما السلام نحو من تلک الو
قائع۔ وکذلک لاولیآء الامۃ
لیکون علو درجاتھم عند اللہ
کحالھم فی الرویا۔ واللہ اعلم۔

پھر سدرۃ المنتہیٰ، اور جہاں خدا نے چاہا۔
اور یہ تمام جسم مبارک کے لئے بیداری کی
حالت میں ہوا لیکن اُس مقام میں جو عالم
مثال اور عالمِ ظاہر کے بیچ میں ہے اور جو
دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے۔ اس
لئے جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے اور
روح پر معاملاتِ روحانی جسم کی صورت میں
نمایاں ہوئے اور اسی لئے ان واقعات میں سے
ہر واقعہ کی ایک تعبیر ظاہر ہوئی اور اسی طرح کے
واقعات حضرت حزقیل اور موسیٰ وغیرہ علیہم السلام
کے لئے ظاہر ہوئے تھے اور اولیائے اُمت کے
سامنے ظاہر ہوتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ان کے
درجہ کی بلندی مثل اس حالت کے ہوتی ہے جو رویا
میں اُن کو معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے معراج کے مشاہدات میں سے ایک ایک کی تعبیر کی ہے۔ خود احادیثِ صحیحہ اور معتبر روایات میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے کہ "آپؐ کے سامنے دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کئے گئے تو آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اس پر فرشتہ نے کہا کہ آپؐ نے فطرت کو اختیار کیا۔ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپؐ کی تمام اُمت گمراہ ہو جاتی"۔ اس عالمِ تمثیل میں گویا فطرت کو دودھ اور ضلالت کو شراب کے رنگ میں مشاہدہ کرایا گیا ہے۔

شاہ صاحب معراج کو عالمِ برزخ کا واقعہ بتا کر اسی طرح معراج کے تمام واقعات کی تشریح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

امّا شق الصدر وملؤہ ایماناً فحقیقتہ غلبۃ انوار الملکیۃ وانطفاء لھیب الطبیعۃ و خضوعھا لما یفیض علیھا من حظیرۃ القدس۔ اما رکوبہ علی البراق فحقیقتہ استواء نفسہ النطقیۃ علی نسمۃ التی ھی الکمال الحیوانی فاستوی راکباً علی البراق کما غلبت احکام نفسہ النطقیۃ علی البھیمۃ و تسلطت علیھا۔ و اما اسراءہ الی المسجد الاقصیٰ فلانہ محل ظھور شعائر اللہ ومتعلق ھمم الملاء الاعلی ومطمح انظار الانبیاء علیھم السلام فکانہ کوۃ الی الملکوت۔ و اما ملاقاتہ مع الانبیاء صلوٰت

لیکن سینہ کا چیرنا اور اس کا ایمان سے بھرنا تو اُس کی حقیقت مَلَکیّت کے انوار کا غلبہ اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھنا اور طبیعت کی فرمانبرداری اس فیضان کے قبول کرنے کے لئے جو حظیرۃ القدس سے خدا اس پر فائض کرتا ہے۔ لیکن آپؐ کا براق پر سوار ہونا تو اس کی حقیقت آپؐ کے نفسِ ناطقہ (بشری) کا اپنے اس روحِ حیوانی پر استیلاء حاصل کرنا ہے جو کمالِ حیوانی ہے۔ تو آپؐ براق پر اسی طرح سوار ہو گئے جس طرح آپؐ کی روحِ بشری کے احکام آپؐ کی روحِ حیوانی پر غالب آ گئے اور اس پر مسلّط ہو گئے۔ لیکن آپؐ کا رات کو مسجدِ اقصیٰ لے جانا تو وہ اس لئے کہ یہ مقام شعائرِ الٰہی کے ظہور کا مکان ہے اور ملاءِ اعلیٰ کے ارادوں کی تعلّق گاہ ہے اور انبیاءؑ کی نگاہوں کی نظارہ گاہ ہے گویا وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف ایک روشندان ہے جہاں سے روشنی چھن

الله علیهم و مفاخرته معهم
فحقیقتها اجتماعهم من حیث
ارتباطهم بحظیرة القدس
وظهور ما اختص به من بینهم
وجوه الکمال و امارقیه الی
السمٰوٰت سمآء سمآء فحقیقته
الانسلاخ الی مستوی الرحمان
منزلة بعد منزلة و معرفته
حال الملائکة المؤکلة بها و
من لحق بهم من افاضل البشر
والتدبیر الذی اوحاه الله
فیها و الاختصام الذی یحصل
فی ملئها۔ واما بکاء موسٰی فلیس
بحسد و لکنه مثال لفقد
عموم الدعوة و بقاء کمال لم
یحصله مما هو فی وجهه۔ و
اما سدرة المنتهی فشجرة
الکون و ترتیب بعضها علی
بعض و انجماعها فی تدبیر

چھن کر اس روشندان کے ذریعہ اس کرۂ انسانی
پر فائض ہوتی ہے۔ لیکن آپؐ کی انبیاءؑ سے
ملاقات اور مفاخرت (اور امامت) تو اس کی
حقیقت تو ان کا اجتماع ہے بحیثیت اس
کے کہ وہ سب ایک ہی رشتہ میں نظیرۃ القدس
سے مربوط ہیں۔ اور آپؐ کی ان حیثیاتِ کمال
کا ظہور ہے جو ان تمام پیغمبروں میں آپؐ کی
ذات سے مخصوص تھیں۔ لیکن آپؐ کا آسمانوں
پر ایک ایک آسمان کر کے چڑھنا (اور
فرشتوں اور مختلف پیغمبروں سے ملاقات)
تو اس کی حقیقت درجہ بدرجہ (تحت کی منزلوں
سے) کھینچ کر عرشِ الٰہی تک پہنچنا ہے اور ہر
آسمان پر جو فرشتے متعین ہیں اور کامل انسانوں
میں سے جو جہاں جس جس درجہ تک پہنچ کر اُن
کے ساتھ مل گیا ہے اُن کے حالات سے اور
اس تدبیر سے جو ہر آسمان میں خدا نے وحی کی
اور اس مباحثہ سے جو اُس آسمان کے فرشتوں
کی جماعت میں ہوتا ہے آگاہی ہے۔ لیکن
حضرت موسیٰؑ کا رونا تو از راہِ حسد نہ تھا۔

واحد كانجماع الشجرة في
الغاذية والنامية ونحوهما۔
ولم تتمثل حيوانا لان التدبير
الجملي الاجمالي الشبيه
بسياسة الكلي (لا) فراده
وانما اشبه الاشياء به
الشجرة دون الحيوان۔ فان
الحيوان فيها قوى تفصيلية
والارادة فيه اصرح من سنن
الطبيعة۔ واما الانهار
في اصلها فرحمة فائضة
في الملكوت حذو الشهادة
وحياة وانما فلذلك تعين
هنالك بعض الامور النافعة
في الشهادة كالنيل والفرات۔
واما الانوار التي غشيتها
فتدليات الهية وتدبيرات
رحمانية تلعلعت في الشهادة
حيثما استعدت لها۔ او اما

بلکہ وہ اس بات کی تمثیل تھی کہ ان کو دعوت
عامّہ نہیں ملی تھی اور اس کمال کی بقا اُن کو عنایت
نہیں ہوئی تھی جو عمومِ دعوت سے حاصل ہوتی
ہے۔ لیکن سدرۃ المنتہیٰ تو وہ وجود کا درخت
ہے اس کا ایک دوسرے پر مترتّب ہونا اور
پھر ایک ہی تدبیر میں مجتمع ہونا ہے جس طرح
درخت (اپنی شاخوں کے بے شمار افراد کے
اختلاف کے باوجود) اپنی قوّتِ غاذیہ اور اپنی
قوّتِ نامیہ کی تدبیر میں متحدّ و مجتمع ہوتا ہے۔
سدرۃ المنتہیٰ حیوان کی شکل میں نمایاں نہیں ہوا
اس لئے کہ اجمالی اور مجموعی تدبیر اس طرح ہے
جس طرح کُلّی اپنے افراد کی سیاست (اجمالی)
کرتی ہے اور اس تدبیرِ اجمالی کی بہترین شبیہ
درخت ہے نہ کہ حیوان۔ کیونکہ حیوان میں تفصیلی
قوّتیں ہوتی ہیں اور خصوصًا اس میں ارادہ قوانین
طبعی سے زیادہ مصرّح صورت میں ہوتا ہے۔
لیکن نہروں (کی جڑوں اور سوتوں کا وہاں نظر
آنا) تو وہ رحمت و حیات و نشوونما کا منبع ہے
جو عالمِ ملکوت میں اسی طرح جاری ہے جس طرح

بیت المعمور فحقیقته
التجلی الالٰهی الذی یتوجه
الیه سجدات البشر وتضرعاتها
تمثل بیتا علی حذو ما عندهم
من الکعبة و بیت المقدس ثم
اتی باناء من لبن و اناء من
الخمر فاختار اللبن۔ فقال
جبرئیلؑ هدیت الفطرة و لو
اخذت الخمر لغوت امتک۔
فکان هو صلی الله علیه وسلم
جامعا امة و منشأ ظهورهم
وکان اللبن اختیارهم الفطرة
والخمر اختیارهم لذات
الدنیا۔ وامر بخمس صلوٰت
بلسان التجوز لانها خمسون
باعتبار الثواب ثم اوضح
الله مراده تدریجا لیعلم ان
الحرج مدفوع و ان النعمة
کاملة وتمثل هذا المعنی

عالمِ ظاہر میں۔ اسی لئے وہاں بھی بعض وہ پُرفیض امور
نظر آئے جو یہاں اس عالم میں ہیں جیسے دریائے نیل
اور نہرِ فرات۔ لیکن وہ انوار جو اس درخت کو ڈھانکے
تھے تو وہ تنزّلاتِ الٰہیہ اور تدبیراتِ رحمانیہ ہیں جو
اس عالمِ ظاہر میں وہاں چمکتی ہیں جہاں جہاں اُن
کے قبول کی استعداد ہوتی ہے۔ لیکن بیت معمور تو
اس کی حقیقت وہ تجلّیِ الٰہی ہے جس کی طرف
انسانوں کے تمام سجدے اور بندگیاں متوجہ ہوتی
ہیں۔ وہ گھر کی صورت میں اس لئے نمایاں ہوا کہ
وہ ان قبلوں کی طرح ہو جو انسانوں کے درمیان
کعبہ اور بیت المقدس کی صورت میں ہیں۔ پھر آپؐ
کے سامنے ایک دودھ کا پیالہ اور ایک شراب کا
پیالہ لایا گیا۔ آپؐ نے دودھ پسند فرمایا تو جبرئیلؑ
نے کہا کہ فطرت کی طرف آپؐ نے ہدایت پائی۔ اگر
شراب پسند فرماتے تو آپؐ کی اُمّت گمراہ ہو جاتی۔
(آپؐ کے پسند و قبول کو اُمّت کا پسند و قبول کہنا
اس لئے تھا) کہ آپؐ اپنی اُمّت کے جامع و مرکز
اور اس کے ظہور کے منشاء و مولد تھے اور دودھ کا
پیالہ پسند کرنا فطرت کا پسند کرنا تھا اور شراب کو لینا

مستندًا الی موسٰی علیه السلام فانه اکثر الانبیآء معالجة للامة و معرفة بسیاستها.

دنیاوی لذتوں کو پسند کرتا تھا۔ اور آپؐ کو بزبانِ مجاز پانچ وقتوں کی نمازوں کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ درحقیقت ثواب کے اعتبار سے پچاس وقت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصد کو (کہ پچاس وقتوں سے پانچ وقت مقصود ہیں) بدفعات اور بتدریج اس لئے ظاہر کیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ پچاس وقت کو پانچ کر دینے میں تنگی دور کر دی گئی ہے اور نعمت پوری ہوئی ہے اور یہ بات حضرت موسیٰؑ کے مکالمہ کی طرف منسوب ہو کر اس لئے ظاہر ہوئی کہ تمام پیغمبروں میں اُمت کا تجربہ اور اُمت کی سیاست کی آگاہی انہی کو سب سے زیادہ تھی۔

احجة الله البالغه باب الاسرآء.

ہم نے اربابِ حال اور محدثین کے یہ انکشافات و حقائق اور جسم و روح کے یہ گوناگوں احوال و مناظر خود انہی کی زبانوں سے بتائے اور دکھائے ہیں ورنہ ہم خود اس باب میں سلفِ صالحین کا عقیدہ رکھتے ہیں جو ابنِ اسحاق کی عبارت میں حسبِ ذیل ہے:-

وکان فی مسراه و ما ذکر منه بلاء وتمحیص و امر من امر الله فی قدرته و سلطانه فیه عبرة لاولی الالباب وهدی و رحمة وثبات لمن اٰمن بالله

آپؐ کے اس سفرِ شبانہ اور جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس میں آزمائش اور کافر و مومن کی تمیز ہے اور خدا کی قدرت اور سلطنت میں سے کوئی الٰہی شان ہے۔ اور اس میں اہلِ عقل کے لئے عبرت ہے۔ اور جو اللہ پر ایمان لایا اور تصدیق

وصدق وکان من امر اللہ علی یقین فاسری بہ کیف شآء و کما شآء لیریہ من آیات ربہ ما اراد حتی عاین ما عاین من امرہ وسلطانہ العظیم وقدرتہ التی یصنع بھا ما یرید۔

(سیرۃ ابن ھشام باب الاسرآء)

کی اور خدا کے کاموں پر یقین رکھا۔ اُس کے لئے اس میں ہدایت، رحمت اور ثابت قدمی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو رات کے وقت لے گیا جس طرح چاہا اور جیسے چاہا تاکہ وہ اُس کو اُس کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے یہاں تک کہ آپؐ نے خدا کی شان اور اس کی عظیم الشان قوت کے مناظر دیکھے جو کچھ دیکھے اور اس قدرت کو دیکھا جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔

قرآن مجید اور معراج

معراج کے اسرار، اعلانات، احکام، بشارتیں اور انعامات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ اسراء (جس کو سورۂ بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے یعنی

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا	پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ	کے وقت مسجدِ حرام (کعبہ) سے اس مسجد
الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ	اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے
لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ	گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنے
السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○	بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں، وہی سننے
(بنی اسرآئیل ۱)	والا اور دیکھنے والا ہے۔

لیکن ہم نے اس سورہ کو شروع سے اخیر تک بار بار پڑھا اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ سورہ معراج کے اسرار و حقائق، نتائج و عبر اور احکام و اعلانات سے معمور ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سورہ کے جلی عنوانات کیا ہیں:۔

۱۔ یہ اعلان کہ آنحضرت نبی القبلتین (یعنی کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے پیغمبر) ہیں۔

۲۔ یہود جو اب تک بیت المقدس کے اصلی وارث اور اُس کے نگہبان و کلید بردار بنائے

گئے تھے اُن کی تولیت اور نگہبانی کی مدت حسبِ وعدۂ الٰہی ختم کی جاتی ہے اور آلِ اسمٰعیل کو ہمیشہ کے لئے اس کی خدمت گذاری سپرد کی جاتی ہے۔

۳۔ کفارِ قریش کو اعلان کہ تمہارے پند و موعظت کا عہد گذر گیا۔ فیصلۂ حق کے ثبوت کے لئے جس عذاب کو تم مانگتے تھے اب وہ آتا ہے کہ رسول اب ہجرت کرتے ہیں۔

۴۔ رسولوں کی سُنّت کے مطابق اب آنحضرتؐ کو ہجرت کا اِذن دیا جائے گا جس کے بعد نافرمان قوم پر عذاب آئے گا۔

۵۔ معراج کے احکام و شرائع۔

۶۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت۔

۷۔ نبوّت، قرآن، قیامت اور معجزات پر اعتراضات کے جوابات۔

۸۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات اور واقعات سے اِستشہاد۔

آنحضرتؐ کا نبی القبلتین ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا تھا اور اُن کو ارضِ مقدّس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا جس کی حدود خدا نے خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دکھائی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ تورات میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی اُن کو سُنا دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسمٰعیل و اسحاق علیہما السلام دو بیٹے عطا ہوئے تھے اور ارضِ مقدّس کو ان دونوں بیٹوں نے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی شام کا ملک حضرت اسحاق علیہ السلام کو اور عرب کا ملک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ملا تھا۔ شام میں بیت المقدّس اور عرب میں کعبہ واقع تھا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے، (اسرائیل حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام

کا لقب تھا) بیت المقدّس کی تولیت عطا ہوئی تھی۔ اور بنو اسمٰعیل کو کعبہ کا متولّی بنایا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں جس قدر پیغمبر پیدا ہوئے اُن میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیتُ المقدّس اور اسمٰعیل علیہ السلام کا کعبہ تھا۔ گویا آنحضرتؐ سے پہلے جس قدر انبیاءؑ عرب یا شام میں مبعوث ہوئے وہ ان دونوں قبلوں میں سے صرف ایک کے متولّی تھے۔ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرّق اوصاف وخصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا اسی طرح حضرت اسحاق و اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذاتِ محمدیؐ ہی کو قرار دیا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آتی تھی وہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہو گئی اور گویا وہ "حقیقتِ ابراہیمیہ" جو خاندانوں اور نسلوں میں منقسم ہو گئی تھی ذاتِ محمدیؐ میں پھر یکجا ہو گئی اور آپؐ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی اور ذی القبلتین کا منصب عطا ہوا۔ یہی نکتہ تھا جس کے سبب سے آنحضرتؐ کو کعبہ اور بیت المقدّس دونوں طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی لئے معراج میں آپؐ کو مسجدِ حرام (کعبہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدّس) تک لے جایا گیا۔ اور مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیاءؑ کی صف میں آپؐ کو امامت پر مامور کیا گیا تاکہ آج اس مقدّس دربار میں اس کا اعلان عام ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکارِ محمدیؐ کو عطا ہوتی ہے اور وہ ذی قبلتین نامزد ہوتے ہیں۔ اور قرآن مجید میں سورۂ اسراء (یعنی بنی اسرائیل) کی ابتداء اور واقعۂ معراج کا آغاز اسی حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ	پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	بندہ کو مسجدِ حرام سے اُس مسجدِ اقصیٰ تک لے
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا	گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل کی
حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ	ہیں تاکہ ہم اپنے اس بندہ کو اپنی چند

هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ (بنی اسرآئیل : ۱)

نشانیاں دکھائیں۔ بیشک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

بنی اسرائیل کی مدّتِ تولیت کا اختتام

بنو اسرائیل کو ارضِ مقدّس کی تولیت کا شرف بہت سی شرائط اور معاہدوں کے ساتھ عطا ہوا تھا اور یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جب وہ غیر معبودوں کی طرف جھکیں گے اور احکامِ الٰہی کی عدم پیروی کے ملزم ہوں گے تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائے گا اور محکومی و غلامی کی زنجیر اُن کی گردنوں میں ڈال دی جائے گی۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے عہد میں اُن کو جو نیابت اور وراثت عطا کی گئی تھی، عدم ایفائے عہد کی پاداش میں بابل کے بادشاہ بخت نقر (بنوخذ نذر) کے ہاتھوں اُن سے چھین لی گئی۔ ارضِ مقدّس سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے۔ شہر اور ہیکل کھنڈر کر دیا گیا۔ بیت المقدّس کی ایک ایک اینٹ چور کر دی گئی اور توراۃ کے پرزے پرزے اڑا دیئے گئے۔

اس پُرغم سانحہ پر انبیائے بنی اسرائیلؑ نے ماتم کیا۔ خدا کے سامنے دستِ تضرّع دراز کیا۔ بنی اسرائیل کو توبہ و انابت کی دعوت دی تو پھر اُن کو معاف کیا گیا اور ایرانیوں کے عہد میں ارضِ مقدّس کی دوبارہ تولیت سے وہ سرفراز ہوئے۔ لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہے۔ بتوں کو سجدے کئے، توراۃ کے احکام سے رُوگردانی کی تو اُن پر یونانیوں اور رومیوں کو مسلّط کیا گیا جنہوں نے بیت المقدّس کو جلا کر خاکستر کر دیا، یہودیوں کا قتلِ عام کیا، قربان گاہ کے مقدّس ظروف توڑ پھوڑ دیئے۔ اب اس کے بعد آنحضرتؐ کی بعثت ہوتی ہے اور بنو اسرائیل کو توبہ و انابت کا آخری موقع دیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے حق پسندی کو راہ دی تو خدا ان پر رحم فرمائے گا ورنہ ہمیشہ کے لئے وہ اس منصب سے محروم کر دیئے جائیں گے۔

چنانچہ آیاتِ بالا کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ
هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا
مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ مَنْ
حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا
شَكُوْرًا ۝ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ
فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ
اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ
اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا
خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ
وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ
وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ
اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ
وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ
وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ
وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا

اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کو بنی اسرائیل
کے لئے ہدایت نامہ ٹھہرایا کہ ہمارے سوا وہ کسی
کو کارساز نہ بنائیں۔ اے اُن لوگوں کی اولاد جو!
جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا
(دیکھو کہ اُن کا جنہوں نے اپنا کارساز دوسروں
کو بنا لیا تھا کیا حشر ہوا تم کو اس احسان کا
شکر ادا کرنا چاہیئے تھا کیونکہ تمہارا باپ (نوحؑ
شکرگذار بندہ تھا۔ اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل
کے متعلق فیصلہ کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں
فساد کرو گے اور بڑی زیادتیاں کرو گے جب
اُن میں سے پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے
تم پر ایسے بندوں کو کھڑا کر دیا جو بڑے سخت گیر
تھے۔ وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا
کا وعدہ پورا ہوا۔ پھر ہم نے تمہارے دن پھیرے
اور تم کو مال و اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد
بہت بڑھا دی۔ (اور کہہ دیا کہ) اگر تم نے اچھے
کام کئے تو اپنے ہی لئے اور بُرے کام کئے
تو اپنے لئے۔ پھر جب (تمہارے) دوسرے
فساد کا وقت آیا (تو پھر ہم نے اپنے دوسرے

تَتْبِيرًا ○ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ○

(بنی اسرآئیل ۱۷ - ۸)

بندوں کو کھڑا دیا کہ وہ تمہارے چہروں کو خراب کردیں اور یہ بھی بیت المقدس میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح تمہارے پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر وہ قابو پائیں اس کو توڑ پھوڑ ڈالیں۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ویسا ہی کیا تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے اور حق کے منکروں کے لئے ہم نے جہنم کا احاطہ بنا رکھا ہے۔

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ وہاں بنی اسرائیل سے تعلقات نہ تھے۔ اسی لئے مکی سورتوں میں بنو اسرائیل کو عموماً مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ بنو اسرائیل کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اب اسلام کے نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے اور آپؐ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے جہاں اُن سے تعلقات کا آغاز ہوگا اور اُن کو از سرِ نو خدا کے سامنے اپنی شرمساری کے اظہار کا موقع ملے گا اور خدا اُن پر اپنی رحمت کا دروازہ کھولے گا۔ لیکن اگر انہوں نے قبولِ حق سے انکار کیا تو اُن کے لئے پھر وہی سزا ہے، جو اُن کو اس سے پہلے دو دفعہ مل چکی ہے۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے عملاً اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور حق کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ خدا نے اُن سے کہا:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ

(البقرۃ ۴۰)

تم میرا عہد پورا کرو تو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔

اس لئے خدا نے اُن پر رحمت کا دروازہ نہیں کھولا اور اُن کو تیسری دفعہ بھی وہی سزا ملی۔ اور وہ مدینہ، اطرافِ مدینہ، خیبر، اذرعات وغیرہ سے بے دخل کر دیئے گئے اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے سپرد کی گئی۔

کُفّارِ مکّہ کے نام آخری اعلان آج کفّارِ مکّہ کے نام آخری اعلان ہے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ اگر اسلام سچّا اور ہمارا مذہب باطل ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر عذاب آئے۔ اُن کو یہ سُنّتِ الٰہی بتائی گئی کہ قوم پر اُس وقت تک عذاب نہیں آتا جب تک اس میں مُبلّغِ الٰہی مبعوث نہیں ہو لیتا اور اس کو بالکل اُس کی طرف سے مایوسی نہیں ہو جاتی۔ اس وقت قوم کا دولت مند اور مغرور طبقہ اُس حق کی بیخ کنی کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگ جن کو اُن کی قوّت پر بھروسہ ہوتا ہے اُن کا ساتھ دیتے ہیں۔ مومنوں کا طبقہ جو بظاہر کمزور اور ضعیف ہوتا ہے اس حق کو قبول کر لیتا ہے۔ ایک دنیا کے نفعِ عاجل کا طالب ہے اور دوسرا آخرت کے نفعِ جاوید کو ترجیح دیتا ہے۔ دُنیا میں بظاہر دونوں کو برابر زندگی کی نعمتیں ملتی ہیں مگر ایک دن آتا ہے جب رات اور دن کی روشنی الگ ہو جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی ایک دوسرے کا ذمّہ دار نہیں۔ مصلح اور ہادی اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں، ایمان و کفر کے وہ ذمّہ دار نہیں۔ اس دنیا میں ہر شخص اپنا آپ ضامن ہے۔ اسی انکار و کفر کی بدولت قریشِ مکّہ بھی تولیتِ کعبہ کے شرف سے معزول کئے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو فتحِ مکّہ کی خوشخبری سُنائی جاتی ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ	یہ قرآن وہ راستہ بتاتا ہے جو سب سے زیادہ
هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ	سیدھا ہے اور اُن مومنوں کو جو نیک کام کرتے
الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ	ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لئے بڑی
لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ	مزدوری ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ جن کو آخرت

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا
لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ وَيَدْعُ
الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ
وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ وَ
جَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ
فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ
النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ
وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ
تَفْصِيْلًا ۝ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ
طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝
اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ ؕ مَنِ
اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ
رَسُوْلًا ۝ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ

پر ایمان نہیں ہم نے اُن کے لئے دردناک عذاب
تیار کیا ہے۔ انسان (کبھی) برائی (عذاب) کو بھی اسی
طرح چاہتا ہے جس طرح بھلائی کو۔ انسان بڑا ہی
عجلت پسند واقع ہوا ہے۔ ہم نے دن اور رات کو
دو نشانیاں بنایا ہے نشانِ شب کو ہم مٹا دیتے
ہیں اور نشان روز کو روشن کر دیتے ہیں کہ اس روشنی
میں اپنے خدا کی مہربانی کو ڈھونڈو اور ماہ و سال کا
شمار اور حساب جانو۔ ہم نے ہر چیز کھول کر بیان کر دی۔
اور ہر انسان کے نیک و بد کو اسی کی گردن میں ڈال
دیا ہے۔ قیامت کے دن ہم اُس کے اعمال نامہ
کو نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا۔ (اور
اس وقت ہم اس سے کہیں گے کہ) لو اپنا اعمالنامہ
پڑھ لو۔ آج تم ہی اپنا حساب آپ لے لو۔ تو جو
ہدایت کو قبول کرتا ہے وہ خود اپنے لئے۔
کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنے لئے۔
کوئی ایک دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھاتا۔
اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں نازل کرتے
جب تک ایک پیغمبر نہ بھیج لیں۔ اور جب
کسی آبادی کو ہلاک کرنا ہوتا ہے تو ہم وہاں

قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا
فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا
تَدْمِيرًا ○ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ
الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ
بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا
بَصِيرًا ○ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ
عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ
نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا
مَذْمُومًا مَدْحُورًا ○ وَمَنْ أَرَادَ
الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ
مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
مَشْكُورًا ○ كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَ
هَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا
كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ○
انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ
بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ
وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ○

(بنی اسرآئیل : ۹-۲۱)

کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں
فسق و فجور کرتے ہیں (تو) اس پر قانونِ الٰہی کے
مطابق، سزا واجب ہو جاتی ہے تو ہم اُس آبادی
کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اور یاد کرو نوحؑ کے
بعد سے ہم کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ تیرا
پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھتا ہے
اور دیکھتا ہے۔ جو اس دُنیا کا نفعِ عاجل چاہتے ہیں
تو اُن میں سے جس کے لئے ہم چاہتے ہیں (اسی
دنیا کا نفعِ عاجل) اُس کو دے دیتے ہیں پھر
دوزخ کو اس کا ٹھکانا بناتے ہیں جس میں وہ
ہر طرح بُرا ٹھہر کر اور راندۂ درگاہ بن کر داخل
ہوگا۔ اور جو آخرت کو چاہے گا اور آخرت کے
لئے کوشش کرے گا اور وہ مومن ہوگا تو اُس
کی کوشش خدا کے یہاں مشکور ہوگی۔ ہم نیک و
بد ہر ایک کو تیرے پروردگار کے عطیہ سے
دیتے ہیں۔ تیرے پروردگار کا عطیہ محدود نہیں
ہے۔ دیکھ! ہم نے کیونکر دنیا میں ایک کو دوسرے
پر فضیلت دی ہے لیکن سب سے بڑا درجہ اور
مرتبہ آخرت کا درجہ اور مرتبہ ہے۔

معراج کے احکام ووصایا | یہود اور قریش دونوں کی معزولی کے بعد بیت المقدس اور خانۂ کعبہ دونوں کی تولیت کا منصب عطا کرنے کے لئے شہنشاہِ عالم اپنے بندۂ خاص کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے اور اس روحانی حکومت کی شرائط واحکام کا ایک نسخہ عطا کرتا ہے جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کو عطا ہوا تھا:

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ○ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ○ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○

خدا کے ساتھ کسی اور کو خدا نہ بنانا ورنہ تو بُرا ٹھہرے گا۔ اور بے یار و مددگار رہ جائے گا اور تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی اور کو نہ پوجنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ اگر ان میں ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کی بات میں اونھ تک نہ کرنا اور اُن کو نہ جھڑکنا، اُن سے ادب کے ساتھ بات کرنا اور اُن کے سامنے نرم دلی سے اِطاعت کا بازو جُھکا دینا اور اُن کے حق میں یہ دعا مانگنا کہ پروردگار! میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح اُنھوں نے جب میں چھوٹا تھا مجھ پر رحم کیا تھا۔ تمہارا پروردگار تمہارے دلوں کے راز سے خوب واقف ہے۔ اگر تم نیک ہو تو وہ تو توبہ کرنے والوں پر بخشش کرتا ہے۔ اور قرابت دار کو اُس کا حق ادا کر اور غریب و مسافر کا حق

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ
الشَّيٰطِيْنِ ط وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ
كَفُوْرًا ○ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ
ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا
فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ○ وَلَا
تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ اِنَّ رَبَّكَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ○
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ط اِنَّ
قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ○ وَلَا
تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ط
وَسَآءَ سَبِيْلًا ○ وَلَا تَقْتُلُوا
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي
الْقَتْلِ ط اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ○ وَ

بھی دے اور فضول خرچی نہ کیا کر۔ فضول خرچ
شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے آقا کا
بڑا ہی ناشکر گذار ہے۔ اگر اپنے پروردگار کے
فضل کے انتظار میں جس کی تجھ کو توقع ہو ان
مستحقین میں سے کسی سے تجھ کو منہ موڑنا پڑے
تو اُن کو نرمی سے سمجھا دے اور اپنا ہاتھ نہ اتنا
سکیڑ لے کہ گویا گردن میں بندھا ہے اور نہ اتنا
پھیلا دے کہ ہر طرف سے تجھ کو لوگ ملامت
کریں اور تو تہی دست ہو جائے۔ تیرا پروردگار
جس کی روزی چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے جس
کی چاہتا ہے کم کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں
کے حال کا دانا اور بینا ہے۔ اور تم افلاس کے
ڈر سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہم ہیں جو اُن
کو اور تم کو دونوں کو روزی پہنچاتے ہیں۔ اُن کا
قتل کرنا درحقیقت بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے
پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی ہے اور بُری راہ
ہے۔ اور جس جان کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے
اُن کو ناحق قتل نہ کرو اور جو شخص ظلم سے مارا
جائے تو اس کے والی وارث کو قصاص کا حق

لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ
هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪
وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ
مَسْئُوْلًا ○ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا
كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ
ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ وَلَا
تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ
اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○
وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ
لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ
الْجِبَالَ طُوْلًا ○ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ
سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ○
ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ
الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا
مَّدْحُوْرًا ○

(بنی اسرائیل: ۲۲ — ۳۹)

ہم نے دیا ہے۔ تو چاہیئے کہ وہ اس خون میں
زیادتی نہ کرے کیونکہ اسی میں اس کی جیت ہے۔
اور یتیم جب تک اپنی عقل و شعور اور جوانی کو نہ پہنچ
جائے اس کے مال و جائداد کے قریب بھی نہ
جانا لیکن اس طریقہ سے جا سکتے ہو جو ان کے
حق میں بہتر ہو۔ عہد کو پورا کیا کرو کہ اس کی بازپرس
ہوگی۔ اور جب ناپ کر دو تو پورا ناپ کر دو اور
تول کر دو تو سیدھی ترازو سے تول کر دو۔ یہ
طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بھی بہتر ہے۔
اور جس بات کا تجھ کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ
ہو۔ کیونکہ کان، آنکھ، دل سب سے مواخذہ ہوگا۔
اور زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ تو اس چال سے
نہ زمین کو چیر ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کے برابر
اونچا ہو جائے گا۔ ان تمام باتوں کی برائی تیرے
پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ تمام احکام
دانشمندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تجھ
پر وحی کی ہیں۔ اور خدا کے ساتھ کوئی اور دوسرا
خدا نہ بنا ورنہ تو ملامتی اور راندۂ درگاہ ہو کر دوزخ
میں ڈال دیا جائے گا۔

ان احکام کی تفصیل کے بعد آخر میں خدا فرماتا ہے :

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

یہ تمام باتیں دانشمندی کی اُن باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تم پر وحی کی ہیں۔

(بنی اسرآئیل : ۳۹)

معراج کے روحانی اَحوال کی تشریح کے ضمن میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے :

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ○

پھر خدا نے اپنے بندہ کی طرف وحی کی جو کچھ کہ وحی کی۔

(النجم : ۱۰)

اس اجمال اور ابہام کے اندر جس قدر احکام و شرائع کا حصہ تھا شاید وہ یہی ہیں جن کی اس مقام پر تفصیل کی گئی ہے۔

ان آیتوں میں جو احکام مذکور ہوئے ہیں وہ تعداد میں بارہ ہیں اور یہی احکامِ دوازدہ گانہ درحقیقت دنیا کے تمام خیر و شر کی بنیاد و اساس ہیں۔ کوئی اخلاق کی تفصیل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے تاہم ان احکامِ دوازدہ گانہ کے حلقہ سے باہر نہ نکل سکے گا۔ مختصر اور سادہ عبارت میں یہ احکام حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ شرک نہ کر۔

۲۔ ماں باپ کی عزت و اطاعت کر۔

۳۔ حق والوں کا حق ادا کر۔

۴۔ اسراف نہ کر اور افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال اور میانہ روی کی راہ چل۔

۵۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کر۔

۶۔ زنا کے قریب نہ جا۔

۷۔ ناحق کسی کو جان سے نہ مارنا۔

۸۔ یتیم سے بہتر سلوک کر۔

۹۔ اپنا عہد پورا کرنا کہ تجھ سے اس کی پوچھ ہوگی۔

۱۰۔ ناپ تول میں پیمانہ اور ترازو کو بھر پور رکھ۔

۱۱۔ نامعلوم بات کی پیروی نہ کر۔

۱۲۔ زمین پر مغرور نہ بن۔

یہ انہی احکامِ عشرہ کا نقشِ ثانی اور تکملہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور کی معراج میں عطا ہوئے تھے:[1]

۱۔ میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو۔
۲۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (یعنی جھوٹی قسم نہ کھا)۔
۳۔ سبت کے دن کی یاد کر۔
۴۔ اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے۔
۵۔ تو خون مت کر۔
۶۔ تو زنا نہ کر۔
۷۔ تو چوری نہ کر۔
۸۔ تو اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے۔
۹۔ تو اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ۔
۱۰۔ تو اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔

سورہ کے آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو یہ احکامِ عشرہ ملے تھے اُن کی طرف اشارہ آئے گا۔

ہجرت اور عذاب جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ مادّی میں کچھ طبعی و فطری قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن میں عموماً تخلّف نہیں ہوا کرتا اسی طرح عالمِ روحانی میں بھی اُس نے کچھ اصول و نوامیس بنا دیئے ہیں جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا۔ منجملہ ان اصول و نوامیس کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو ہر طرح اس کو سمجھایا جاتا ہے۔ تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کیا جاتا ہے۔ شریر قوم معجزات طلب کرتی ہے۔ بالآخر اس کے سامنے معجزے پیش کئے جاتے ہیں اور جب اُس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد اُس بدبخت قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ انبیائے کرامؑ کی سیرتیں اس اصول کی بہترین تشریح ہیں۔ آج اسی قاعدہ کی تعمیل کا آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے۔ آپؐ کو معراج کی سب سے

---

[1] توراۃ: سفر استثناء ۵-۶۔

بڑی نشانی عطا کی گئی مگر اس کو بھی وہ جھٹلاتے ہیں:

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا
قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا
عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي
الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَآ
اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ
بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ
النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ
وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝
وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ
بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ
اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ
الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ
وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا
طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝

(بنی اسرآئیل، ۵۸ — ۶۰)

(دنیا میں نافرمانوں کی، کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کر ڈالیں یا اس پر سخت عذاب نہ نازل کریں۔ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ اور ہم کو (فرمائشی) معجزات کے بھیجنے سے سوا اس کے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اگلوں نے بھی ان نشانیوں کی فرمائش کی اور جب ہم نے اُن کو بھیجا تو انہوں نے جھٹلا دیا۔ ہم نے ثمود کو ناقہ کی سُجھانے والی نشانی دی تو انہوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور ہم ان نشانیوں کو توڑ ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ یاد کرو اے پیغمبر کہ یہ کفار تیری ایذاء بلکہ قتل کے درپے ہیں لیکن) ہم نے تجھ سے کہہ دیا کہ تیرا رب لوگوں سے تیری حفاظت کئے ہوئے ہے۔ اور ہم نے (معراج کی جو) رؤیا تجھ کو دکھائی تو وہ لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور اسی طرح اس درخت کا ذکر جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ بھی لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور ہم اُن کو آئندہ عذاب سے ڈراتے ہیں لیکن اس سے اُن کی سرکشی میں اور ترقی ہوتی جاتی ہے۔

اس لئے حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کے قصہ سے اس واقعہ پر استدلال ہے پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ○ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ○ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ○

(بنی اسرآئیل: ۷۳ — ۷۷)

ہم نے جو تم پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا ہے قریب تھا کہ لوگ تم کو اُس سے آزمائش میں ڈال دیں کہ اس وحی کے علاوہ تم کوئی اور وحی بنا کر ہماری طرف جھوٹ منسوب کردو اور اس وقت وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ اُن کی طرف تم جھک چلے تھے۔ اگر تم ایسا کرتے تو ہم تم کو زندگی اور موت کے دوگونہ عذاب کا مزہ چکھا دیتے اور پھر تم کو میرے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی مددگار بھی نہ ملتا۔ اور وہ تم کو اس سرزمین (مکہ) سے قریب ہے کہ دل برداشتہ کر دیں تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ تمہارے چلے جانے کے بعد اطمینان سے بہت کم رہ سکیں گے۔ تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے ہیں سب کے ساتھ یہی دستور رہا ہے اور تم ہمارے دستور میں ردّوبدل نہ پاؤ گے۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گا کہ معراج ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج آنحضرتؐ کے ذریعہ سے خدا کی وہ نشانی تھی جس کے نہ تسلیم کرنے پر عذابِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

نمازِ پنجگانہ کی فرضیت اُوپر گذر چکا ہے کہ نمازِ پنجگانہ اسی معراج میں فرض ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ	آفتاب کے ڈھلنے کے وقت (ظہر، عصر، مغرب) سے
اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ	لے کر رات کے اندھیرے (عشا) تک
اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝	نمازیں پڑھا کرو اور صبح کی نماز میں حضورِ قلب
وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً	خوب ہوتا ہے۔ اور رات کے ایک حصہ
لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ	میں تہجد پڑھ لیا کرو یہ تمہارے لئے نفل ہے۔
مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝	عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم کو مقامِ محمود میں
(بنی اسرآئیل: ۷۸ - ۷۹)	پہنچا دے۔

لفظ لِدُلُوْكِ الشَّمس (آفتاب کے ڈھلنے کے وقت) میں ظہر، عصر اور مغرب، نماز کے تین اوقات اور ان اوقات کی تعیین کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ یہ معلوم ہے کہ دینِ محمدی ملّتِ ابراہیمی کا نقشِ ثانی ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی اور جس کی رسم کہن دنیا میں آج بھی قائم ہے۔ اس مذہب میں آفتاب کی پرستش کے وہ اوقات تھے جن میں اس کی روشنی کا ظہور یا کمال ہوتا ہے اور اسی لئے طلوع سے لے کر نصف النہار تک اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ ملّتِ ابراہیمی نے اس کے برخلاف اپنے لئے وہ اوقات متعین کئے جو آفتاب کے زوال کے ہیں یعنی سورج ڈھلنے سے لے کر آفتاب کے غروب تک کہ یہ تمام اوقات

اس کے اِنحطاطِ نور اور زوال کے ہیں۔ آفتاب کے اِنحطاط اور زوال کی تین منزلیں ہیں ایک وہ جب سمتِ راس (سر) سے وہ ڈھلتا ہے۔ یہ ظہر کا وقت ہے۔ اور دوسری منزل وہ ہے جب وہ برابر کی نگاہ سے نیچے اترتا ہے۔ یہ عصر کا وقت ہے۔ اور تیسری منزل وہ ہے جب وہ سمتِ اُفق سے نیچے گر جاتا ہے۔ اور یہ مغرب کا وقت ہے۔ چوتھی نماز کا وقت رات کی تاریکی کا مقرر کیا ہے جب آفتاب کے بقیہ وجود کی سُرخ نشانی جس کو عرفِ عام میں شفق کہتے ہیں، وہ بھی مٹ جاتی ہے۔ اور صبح کی نماز وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ[1] یعنی ستاروں کی روشنی کے ماند ہونے کے بعد ہے۔ غرض آیاتِ بالا میں پنجگانہ نماز کی فرضیت نہایت لطیف اور خوبی[2] سے ادا کی گئی ہے۔

ہجرت کی دعا اس کے بعد ہجرت کے لئے دعا بتائی جاتی[3] اور اس کے بعد فتحِ مکہ کی فوراً بشارت بھی سُنائی جاتی ہے کہ نماز کے ساتھ قبلہ کا فوراً خیال آتا ہے۔ جہاں اس وقت تین سو ساٹھ بُت پوجے جا رہے تھے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ	اے پیغمبر یہ دعا مانگو کہ خداوندا! مجھے اچھی
صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ	جگہ پہنچائیو اور (مکہ) سے اچھی طرح
وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا	نکالیو اور دشمنوں پر اپنی طرف سے فتح و
نَّصِیْرًا ○ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ	نصرت دیجیو۔ اور اے پیغمبر اعلان کر دے
زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ	کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل
زَهُوْقًا ○	کو مٹ ہی جانا تھا۔

(بنی اسرآئیل: ۸۰-۸۱)

---

[1] الطور: ۴۹۔ [2] یہ نکتہ مخدومی مولانا حمید الدین صاحب مفسّر تفسیر نظام القرآن کا افادہ ہے۔ [3] صحیح بخاری و مستدرک حاکم کتاب الہجرۃ و صحیح ترمذی تفسیر سورۂ مذکور و مسند احمد عن ابن عباسؓ۔

یہ آخری الفاظ اسلام کے ایک نئے دور کی بشارت اور فتح مکہ کی نوید ہیں۔ اس سے فتح مکہ کے دن جب خلیل بُت شکن کا گھر بُتوں سے پاک کیا جا رہا تھا۔ آنحضرتؐ کی زبان مبارک پر یہی آیت جاری تھی[1]

نبوّت، قرآن، قیامت، معراج اور معجزات پر اعتراض

کفّارِ مکہ کو ان مسائل پر جو معاندانہ اعتراضات تھے اس موقع پر جب پیغمبر کی ہجرت اور اُن کے لئے عذابِ الٰہی کے نزول کا وقت قریب آ رہا ہے، اُن کے جوابات دیئے جا رہے ہیں کہ اب بھی اُن کی تشفّی ہو جائے تو یہ بلائے آسمانی جو پیغمبر کے ہجرت کرتے ہی ان پر نازل ہونا شروع ہو جائے گی وُہ رُک جائے:

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ
وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ
كَانَ يَئُوْسًا ۝ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى
شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ
اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ
عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ
رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا
قَلِيْلًا ۝ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ
بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا
تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝
اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ

(یہ کفارِ قریش اپنے مال اور دولت پر بھولے ہوئے ہیں، انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس پر انعام کرتے ہیں تو الٹا ہم سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلوتہی کرتا ہے اور جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس توڑ بیٹھتا ہے۔ اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ اپنے اپنے طور پر عمل کئے جاؤ تمہارا پروردگار اُن کو خوب جانتا ہے جو زیادہ سیدھے راستہ پر ہیں۔ وہ تم سے روحِ امین کی (جو قاصدِ وحی ہے) حقیقت دریافت کرتے ہیں۔ کہدو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک بات ہے اور تم کو علم نہیں دیا گیا ہے لیکن بہت تھوڑا۔ اور اس وحی کے معجزۂ صداقت کے لئے یہ بات کیا کم ہے

---

[1] صحیح بخاری: باب فتح مکہ و تفسیر آیتِ مذکورہ۔

كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ○ قُلْ لَّئِنِ
اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى
اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا
يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا
لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ
مَثَلٍ ۚ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا
كُفُوْرًا ○ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ
حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ○
اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا
تَفْجِيْرًا ۙ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا
زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ○ اَوْ يَكُوْنَ
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى
فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ
حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا
بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ

کہ باوجود اُمّی ہونے کے وہ لفظ بہ لفظ تم کو یاد ہے
اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تم پر وحی کی وہ سب تمہارے
سینہ سے لے جائیں پھر تم کو اُس کے لئے ہمارے مقابل
کوئی حمایتی بھی نہ ملے۔ لیکن یہ تیرے پروردگار کی رحمت
ہے (کہ اس کا لفظ لفظ تم کو محفوظ ہے۔ بیشک اس کی
تم پر بڑی مہربانی ہے۔ (ان شک کرنے والوں سے)
کہدو کہ اگر تمام انس وجن بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس
قرآن کی طرح کا کوئی اور کلام بنا لائیں تو یہ ناممکن ہے
اگرچہ وہ ایک دوسرے کی پشتی پر کیوں نہ ہوں۔ باوجودیکہ
ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کے لئے بھی قسم
کی مثالیں طرح طرح سے بدل کر بیان کیں مگر اکثر لوگ
انکار کئے بدون نہ رہے۔ اور یہ کفار مکہ کہتے ہیں کہ ہم تو
اس وقت تک تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم
ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ بہا دو یا کھجوروں اور
انگوروں کا ایک باغ تمہارے لئے ہو جائے اور تم اس
میں نہریں بہا دو یا یہ کہ جیسا تم کہتے ہو کہ ہم ایمان نہ لائیں گے
تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑے گا تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے
لا گراؤ یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے کھڑا کر دو یا
یہ کہ تمہارے رہنے کے لئے ایک سونے کا گھر بن جائے

اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا
رَّسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ
مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ
مَلَكًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا
بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ○ وَمَنْ
يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ
يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ
مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا
وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ
كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ○
ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا
وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا
جَدِيْدًا ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ
الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے
کو بھی ہم اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک وہاں
سے ہم پر کوئی ایسی کتاب اتار نہ لاؤ جس کو ہم پڑھیں۔ کہدو اے
پیغمبر! سبحان اللہ! میں تو خدا کا ایک قاصد بندہ ہوں۔ ہدایت
آجانے کے بعد لوگوں کو اس کے قبول سے بجز اس کے کوئی
امر مانع نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بشر کو اپنا قاصد
بنایا ہے۔ کہدو کہ اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے تو البتہ
ہم آسمان سے کسی فرشتہ ہی کو اُن کے پاس قاصد بنا کر
بھیجتے۔ کہدو کہ اب دلیلوں اور حجتوں کا وقت گذر گیا۔
اب میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کے لئے خدا بس
ہے، وہ اپنے بندوں کے حال کا دانا اور بینا ہے۔ جس کو
وہ راست دکھائے وہی راہِ راست پر ہے اور جن کو
وہ گمراہ کرے تو اس کے سوا ان کا کوئی یار و مددگار نہیں پھر
ہم انہیں قیامت کے دن اوندھے منھ، اندھے اور بہرے
کر کے اٹھائیں گے کہ وہ اس دنیا میں حق کے دیکھنے اور
سُننے سے اندھے اور بہرے تھے، اور اُن کا ٹھکانا دوزخ
ہوگا۔ جب وہ بجھنے کو ہوگی تو ہم پھر اس کو بھڑکا دیں گے۔
یہ ہماری نشانیوں کے انکار کا بدلہ ہوگا اور وہ کہتے ہیں کہ
کیا جب ہم مر کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم

قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ
جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ○
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ
رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ
خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ
قَتُوْرًا ○

(بنی اسرآئیل : ۸۳ - ۱۰۰)

پھر از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا
وہ نہیں سمجھتے کہ وہ خدا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا وہ
بیشک اس پر قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی پھر پیدا کر دے۔
اور اُس نے ان کے لئے ایک میعاد مقرر کر رکھی ہے جس میں
کوئی شک نہیں لیکن یہ ظالم انکار کئے بدون نہ رہے۔ اے
پیغمبر یہ کفار مکہ اس حسد سے تم پر ایمان نہیں لائے کہ تم کو
اور تمہارے خاندان کو یہ شرف کیوں عطا ہوا ان سے
کہدو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کا خزانہ تمہارے
قبضہ میں ہوتا تو بیشک تم اس کے خرچ ہو جانے کے
ڈر سے اس کو روکے رہتے۔ سچ یہ ہے کہ انسان بڑا
ہی تنگ دل ہے۔

ان آیتوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے آسمان پر تشریف لے جانے پر بھی یقین نہیں رکھتے ہیں یعنی واقعۂ معراج کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو ہم اس وقت تک تسلیم نہیں کریں گے جب تک آپؐ ہمارے سامنے آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور وہاں سے پورا قرآن مکمل لکھا ہوا لا کر ہمارے ہاتھ میں نہ دے دیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات اور حالات سے استشہاد

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرتؐ کے واقعاتِ زندگی میں متعدد حیثیتوں سے مماثلت ہے اور خود قرآن مجید نے اس مماثلت کو ظاہر کر دیا ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا

(لوگو!) ہم نے جس طرح فرعون کی طرف

شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا	ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری
إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ○	طرف بھی ایک رسول بھیجا ہے جو تم
(المزمل: ۱۵)	پر گواہ ہے۔

اسی سبب سے قرآن مجید میں بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو دہرایا گیا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے اندر زندگی بسر کی یہی حال آنحضرتؐ کا تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار کو ہر طرح سمجھایا مگر وہ ایمان نہ لائے اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنا پڑی اسی طرح صنادیدِ قریش بھی آپؐ پر ایمان نہ لائے اور بالآخر آنحضرتؐ نے صحابہؓ کو لے کر مکہ سے ہجرت فرمائی۔ جس طرح ہجرت سے کچھ پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر خدا کی ہم کلامی نصیب ہوئی اور احکامِ عشرہ عطا ہوئے اسی طرح آنحضرتؐ کو بھی ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج ہوئی اور احکامِ دوازدہ گانہ عطا ہوئے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت کے بعد فرعونیوں پر بحرِ احمر کی سطح پر عذاب نازل ہوا اسی طرح آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد صنادیدِ قریش پر بدر کے میدان میں عذاب آیا اور جس طرح اس کے بعد فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے۔ اسی طرح مکہ معظمہ کی حکومت بھی ہجرت کے بعد آپؐ کو عطا کی گئی۔

ان امور کو پیشِ نظر رکھ کر کفارِ قریش کو معلوم ہونا چاہیئے کہ قانونِ الٰہی معراج کے بعد ہجرت کا حکم دے گا۔ اور اس کے بعد اُن پر عذابِ الیم کا نزول ہوگا۔ چنانچہ سورۂ اسرا کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ	اور ہم نے اگر طور پر موسیٰؑ کو نو کھلے احکام دیئے
بَيِّنَاتٍ فَسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ	جس طرح محمدؐ کو معراج میں عطا کئے تو پوچھ لو

لہ سبت کا حکم خاص یہود کے لئے تھا اس لئے شمار میں اس کو چھوڑ دیا گیا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوگا۔

جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ
لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ
لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ
وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝
فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ۝
وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ
الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ۝

(بنی اسرآئیل: ۱۰۱–۱۰۴)

بنی اسرائیل سے کہ جب موسیٰؑ بنی اسرائیل کے
پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰؑ!
میں سمجھتا ہوں کہ تم پر کسی نے جادو کر کے (تمہاری
عقل کھو دی ہے)۔ موسیٰؑ نے کہا اے فرعون!
تجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان حکموں کو آسمان
اور زمین کے مالک کے سوا کسی اور نے ان کو دانائی
بنا کر نہیں اُتارا ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہوں
کہ تم اب ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے۔ فرعون نے
چاہا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھیڑ دے تو ہم نے اس
کو اور اس کے ساتھیوں کو سب کو غرق دیا۔ اور اس
کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم ملک میں رہو۔
جب قیامت کا وعدہ پورا ہو گا تو سب کو سمیٹ
کر ہم اپنے حضور میں لائیں گے۔

ان آیتوں کے آغاز میں جن نو نشانیوں کے دیئے جانے کا حکم ہے بعض مفسرین نے اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات مراد لئے ہیں مگر بعض احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گذرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ "چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں"۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو۔ سُن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی" (یعنی خوش ہو گا)۔ اس کے بعد وہ آپؐ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰؑ کو تو آیتیں کونسی دی گئیں؟ آپؐ نے فرمایا "وہ یہ ہیں: کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری

نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدانِ جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو" یہ سُن کر دونوں یہودیوں نے آپؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ جریر میں ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے۔ ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسرے باب ماجاء فی قُبلۃ الرجل میں اور دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"

اس حدیث میں جن دس احکام کی تفصیل ہے اور موجودہ ترجمۂ توراۃ میں یہ احکام جن الفاظ میں مذکور ہیں اُن میں کسی قدر فرق ہے خصوصاً حدیث کا نواں حکم جس کے متعلق شعبہ راوی خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کو یہ نویں بات اچھی طرح یاد نہیں۔ یہ نواں حکم دراصل ماں باپ کی اطاعت اور عزت ہے۔ باقی احکام وہی ہیں جو تورات میں مذکور ہیں۔ صرف طریقۂ ادا اور تعبیر کا فرق ہے تورات کے موجودہ تراجم لفظی تو ہیں نہیں۔ علاوہ ازیں اس حدیث کے ایک راوی عبداللہ ابن سلمہ کا حافظہ اچھا نہ تھا۔ ابنِ کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں اس تصریح کی ہے۔ بہرحال اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان احکامِ عشرہ اور آنحضرتؐ کے احکامِ دوازدہ گانہ میں ایک وجہ مماثلت ہے اس لئے ان دونوں کے منکروں کا ایک ہی حال ہوگا۔

معراج کے انعامات ان احکام، بشارت اور نمازِ پنجگانہ کے علاوہ آنحضرتؐ کو دو اور خاص عطیے عنایت ہوئے۔ ایک یہ بشارت کہ امتِ محمدیہ میں سے جو شخص شرک کا مرتکب نہ ہوگا دامنِ مغفرت کے سایہ میں اُس کو پناہ مل سکے گی۔ دوسرے سورۂ بقرہ کا اختتامی رکوع اسی بارگاہ میں فرمانِ خاص کے طور پر مرحمت ہوا۔[1]

---

[1] صحیح مسلم: باب الاسراء: اُس روایت میں یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں مرحمت ہوئیں۔ یہ تفصیل نہیں کہ وہ کس قدر آیتیں ہیں لیکن حدیث کی دوسری کتابوں میں جن خواتم سورہ بقرہ کی فضیلت آئی ہے وہ یہی ہیں۔

اس رکوع میں سب سے پہلی مرتبۂ ایمان کی تکمیل کے اصول اور عفو و مغفرت کے سبق انسانوں کو سکھائے گئے ہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پہلے عطیہ کی بشارت بھی درحقیقت انہی آیات میں مذکور ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَقْفَه وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَقْفَه وَارْحَمْنَا ۟ وَقْفَه اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(البقرۃ: ۲۸۵ — ۲۸۶)

پیغمبر اُس پر ایمان لایا جو اس پر اُترا اور تمام مسلمان بھی اُس پر ایمان لائے۔ یہ سب کے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کے پیغمبروں میں یہ تفریق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کے احکام کو سُنا اور ان کی اطاعت کی تو اے ہمارے پروردگار! مجھ پر بخشش فرما اور تیری ہی طرف آخر لوٹ کر جانا ہے۔ خدا کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جس نے اچھے کام کئے تو اپنے ہی لئے کئے اور بُرے کام کئے تو اس کا نقصان بھی وہی اٹھائے گا۔ اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو اس کی باز پرس ہم سے نہ کر اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈال جس طرح ہم سے پہلوں پر تو نے ڈالا اے ہمارے پروردگار! اور اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہم سے نہ اُٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگذر کر ہمارے قصوروں کو

معاف کر اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مددگار ہے تو اُن
لوگوں کے مقابلہ میں جو تیرے منکر ہیں، ہماری مدد فرما۔

معراج کا پُراسرار منظر | سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے معراج کے روحانی مناظر کا بیان صرف دو لفظوں میں ختم کر دیا ہے:

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ (بنی اسرائیل: ۱)

(ہم نے اپنے بندہ کو یہ سیر اس لئے کرائی) کہ ہم اپنی کچھ نشانیاں اُس کو دکھائیں۔

یہ "نشانیاں" کیا تھیں؟ کیا اُن کی تفصیل کے لئے عاجز و درماندہ انسان کی زبان میں کچھ الفاظ ہیں؟ ہاں ہیں، مگر ناتمام۔ ہمارا فہم، ہمارا علم، ہمارا خیال، ہمارا قیاس غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور ہمارے تعقّلات سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور ہمارے ذخیرۂ لُغت میں صرف ان ہی کے لئے کچھ الفاظ ہیں۔ اس بنا پر وہ معانی جو نہ عام محسوساتِ انسانی کی حدود میں داخل ہیں اور نہ تعقّل و تصوّر کے احاطہ کے اندر ہیں وہ الفاظ و کلمات میں کیونکر سما سکتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے کمالِ قدرت سے ان کو حروف و کلمات کا جامہ پہنا بھی دے تو دماغِ انسانی ان کے فہم و تحمّل کی قدرت کہاں سے لائے گا؟

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○

(اے انسانو! تم کو علم کا بہت تھوڑا سا حصّہ عطا گیا ہے۔

(بنی اسرائیل: ۸۵)

اسی لئے سورۂ والنجم میں جہاں ان اسرار کے چہرہ سے کچھ پردہ ہٹایا گیا ہے ایسی تفصیل ہے جو تمامتر اجمال ہے۔ اور ایسی توضیح ہے جو سرتاپا ابہام ہے۔ دو لفظ کے فقرے ہیں ضمیریں محذوف ہیں۔ فاعل کا ذکر ہے تو مفعول کا نہیں، مفعول بیان ہوا ہے تو فاعل نہیں، متعلقاتِ فعل

کی تشریح نہیں ضمائر کے مرجعوں کی تعیین نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس مقام کا مقتضا یہی ہے۔

ع عبارت از سخنداں ہم نہ گنجد :

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ مَا ضَلَّ	قسم ہے ستارہ کی جب وہ گرے کہ تمہارا رفیق
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا	(محمدؐ) نہ تو بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے۔ اور نہ وہ یہ
يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا	باتیں اپنے دل سے بنا کر کہتا ہے۔ بلکہ وہ تو وہی
وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ	ہے جو اس کو بتایا جاتا ہے۔ اس کو تو بڑی طاقتوں
الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۙ	والا اور بڑی عقل والا تعلیم دیتا ہے۔ وہ آسمان
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا	کے اونچے کنارے میں سیدھا ہو کر نمودار ہوا۔
فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ	پھر قریب آیا اور جھکا تو دو کمانوں کا فاصلہ رہ
اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ	گیا یا اس سے بھی کم۔ پھر اس کے بندے سے
اَوْحٰى ۭ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا	جو باتیں کیں کیں۔ دل نے جو دیکھا اس نے
رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰي مَا يَرٰى ۝	جھوٹ نہیں بیان کیا۔ اے لوگو! کیا وہ جو دیکھتا
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ	ہے اس پر تم اس سے نزاع اور مناظرہ کرتے ہو۔
سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ	اس نے یقیناً دوبارہ اس کو اترتے دیکھا۔ انتہا کے
الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ	درخت کے پاس جس کے قریب (نیک بندوں
مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا	کے) رہنے کی بہشت ہے۔ جب بیری کے
طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ	درخت پر چھا رہا تھا، جو چھا رہا تھا۔ نہ نظر بہکی
الْكُبْرٰى ۝	نہ اچٹی۔ اس نے یقیناً اپنے پروردگار کی بڑی
(النجم : ۱-۱۸)	بڑی نشانیاں دیکھیں۔

حضورؐ نے جب معراج کے روحانی مشاہدات و مناظر اور ملکوتی آیات و مظاہر کا قریش سے تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ راہِ حق سے دیدۂ و دانستہ (غوایت) یا نادانستہ (ضلالت) بھٹک گیا ہے یا اپنے دل سے بنا کر یہ جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے۔ یہ انہوں نے کیوں کہا؟ اس لئے کہا کہ روحانی جلووں کے دیکھنے کی اُن کے پاس آنکھیں نہ تھیں۔ صوتِ سرمدی کے سُننے کی اُن کے کانوں میں طاقت نہ تھی۔ اسرارِ ملکوتی کے سمجھنے کے لئے اُن کے سینوں میں دل نہ تھے۔ خدا نے کہا یہ جو کچھ تھا اور جو کچھ معلوم ہوا یہ بڑی طاقت و قدرت اور علم و عقل والی ہستی کی جلوہ انگیزیاں تھیں۔ وہ کبھی اتنا دور تھا کہ آسمان کے کناروں میں نظر آیا اور کبھی اتنا قریب کہ دو کمانوں کے فاصلہ سے بھی قریب تر تھا۔ کون جھکا؟ کون قریب آیا؟ کون دو کمانوں کے فاصلہ تک آکر رہ گیا؟ کیا خدا؟ نہیں! کیا جلوۂ خدا؟ شاید۔ کس نے باتیں کیں؟ معلوم نہیں۔ کیا باتیں کیں؟ بتائیں نہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟ انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد پر ایک درخت[1]! کیا اس کو شئون و صفاتِ الٰہی کی نیرنگی نے ڈھانک لیا[2]؟ کیا انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد کا درخت صرف شئون و صفات کی نیرنگی کا مظہر ہے؟ کیا یہاں پہنچ کر کون و مکان اور وجوب و امکان کا عقدۂ مشکل حل ہو گیا؟ کیا دل بھی دیکھتا ہے؟ حضورؐ نے دل کی آنکھوں سے کیا دیکھا؟ دیدۂ چشم سے کیا نظر آیا؟ آپؐ کو اس سفر میں آیاتِ ربانی دکھائی گئیں مگر یہ مشاہدۂ قلب تھا یا معائنۂ چشم؟ ع

رازِ ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

---

[1] اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے۔ [2] بخاری شریف میں ہے فغشیھا من امر اللہ ما غشی یعنی جلوۂ الٰہی اس پر چھا گیا۔

شقِّ صدر یا شرحِ صدر

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (الانشراح:۱)

(کیا اے پیغمبر! ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا)

منجملہ نبوّت کے اُن خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں شقِّ صدر یا شرحِ صدر بھی ہے۔ چنانچہ یہ رتبۂ خاص پیش گاہِ الٰہی سے آنحضرتؐ کو مرحمت ہوا۔ شقِّ صدر سے مراد یہ ہے کہ سینۂ مبارک کو چاک کر کے اس کو بشری آلودگیوں سے پاک اور ایمان و حکمت کے نور سے منوّر کیا گیا۔ بعض روایتیں ایسی بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی یہ کیفیت آپؐ پر گذری تھی۔ ان روایتوں میں بعض جزئیات کی تفصیل اور وقت کی تعیین میں اختلافات ہیں۔ چنانچہ تمام روایتوں کے جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپؐ پر اس کیفیت کا گذرنا ظاہر ہوتا ہے۔ ایک جب آپؐ چار یا پانچ سال کے تھے اور حضرت حلیمہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے۔ دوسرے جب عمر شریف دس برس کی تھی۔ تیسرے جب آپؐ بیس برس کی عمر کو پہنچے۔ چوتھے جب حضرت جبریلؑ سب سے پہلی دفعہ وحی لے کر آئے۔ پانچویں معراج کے موقع پر۔

یہ مسئلہ کہ شقِّ صدر واقع ہوا تمام صحیح روایتوں سے ثابت ہے اور اس کے متعلق کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ وقت کی تعیین اور بعض جزئیات کی تفصیل میں

روایتیں مختلف ہیں۔ تیسری دفعہ کی روایت جس میں بیس برس کی عمر میں اس کیفیت کا گذرنا بیان کیا گیا ہے، محدثین[1] بلکہ خود اربابِ سیر[2] کے نزدیک قطعاً غیر ثابت ہے۔ باقی چار موقعوں کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو ہر اختلافِ روایت کو ایک نیا واقعہ تسلیم کرکے مختلف روایتوں میں توفیق اور تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، تسلیم کیا ہے۔ امام سہیلی روض الانف میں صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ صغرسنی میں اور دوسری دفعہ معراج میں۔ اور اس کی مصلحت یہ بتائی ہے کہ صغرسنی میں اس لئے یہ ہوا کہ بچپن ہی سے حضورؐ کے قلبِ مبارک سے دنائم کے حصہ کو نکال دیا جائے اور معراج کے وقت تو ظاہر ہے اس لئے تاکہ حضورِ ربانی کے موقع پر حکم صلوٰۃ کا جو طہارتِ محض ہے، تحمل کیا جائے اور ملائکۂ الٰہی کی امامت نماز میں فرما سکیں۔ لیکن یہ بات ہر شخص کو کھٹک سکتی ہے کہ سینۂ مبارک کا آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر منور ہو جانا ایک ہی دفعہ میں ہو سکتا ہے اور وہ ایک دفعہ پاک و منور ہو کر پھر دوبارہ پاکی و طہارت کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر بعض محدثین جیسے قاضی عیاض وغیرہ اس کو ایک ہی دفعہ کا واقعہ سمجھتے ہیں اور وہ صغرسنی میں جب آپؐ حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پا رہے تھے۔ اور معراج کے موقع پر شقِ صدر کے واقعہ کو راویوں کا سہو جانتے ہیں[3]۔ لیکن یہ پوشیدہ نہیں کہ واقعۂ شقِ صدر کی روایت جن طریقوں کے ساتھ آئی ہے ان میں سب سے صحیح، سب سے

---

[1] فتح الباری، جلد اوّل۔ [2] زرقانی بر مواہب جلد اول۔ [3] فتح الباری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء جلد اوّل و کتاب التوحید جلد سوم، باب ما جاء فی قولہ عزوجل وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا روض الانف سہیلی، زرقانی بر مواہب جلد اوّل۔ قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں: وقد خلط فیہ غیرہ لاسیما من روایۃ شریک بن ابی نمر فقد ذکر فی اولہ یجیئ الملک لہ و شق صدرہ وغسل بماء زمزم وھذا انما کان وھو صبی وقبل الوحی۔

(انسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض ج دوم)

مستند اور معتبر طریقہ وہی ہے جس میں اس کا شبِ معراج میں ہونا بیان ہوا ہے اس لئے اس موقع کو راویوں کا سہو قرار دینا اور بچپن میں اس کا ہونا تسلیم کرنا اصولِ روایت سے صحیح نہیں۔

شقِّ صدر کی ضعیف روایتیں اصل یہ ہے کہ شقِّ صدر کے وقت یا اوقات کی تعیین اور اس کا مکرر اور بار بار پیش آنا صرف مختلف روایات کے پیش کر دینے سے نہیں ہو سکتا جیسا کہ حافظ ابنِ حجر نے کیا ہے اور قسطلانی اور زرقانی نے اس کی تقلید کی ہے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ان روایات کے سلسلۂ سند پر بھی بحث اور راویوں کی قوت و ضعف کی بھی تنقید کی جائے۔ دس برس کے سن میں شقِّ صدر والی روایت جس میں یہ تصریح ہے کہ سب سے پہلی دفعہ آپؐ پر نبوت کی یہ علامت طاری ہوئی، حسب ذیل ہے :-

"حضرت ابوہریرہؓ آپؐ سے نبوت کا ابتدائی نشان پوچھتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں : میں دس برس کا تھا کہ میدان میں دو آدمی میرے سر پر آئے۔ ایک نے کہا یہ وہی ہیں۔ دوسرے نے کہا ہاں۔ پھر دونوں نے پیٹھ کے بل مجھے پچھاڑا اور میرے پیٹ کو پھاڑا۔ ایک سونے کے طشت میں پانی لاتا رہا اور دوسرا پیٹ کو دھوتا رہا پھر ایک نے کہا سینہ کو چاک کرو تو ناگاہ دیکھتا ہوں کہ سینہ چاک ہے اور کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ پھر ایک نے کہا کہ دل کو چاک کرو تو اس نے دل کو چاک کیا۔ پھر اس نے کہا اس میں سے کینہ اور حسد نکال لو تو اس میں سے جمے ہوئے خون کی طرح کی کوئی چیز نکالی۔ پھر کہا اس میں مہربانی اور رحمت رکھ دو تو اس نے چاندی کی طرح کی کوئی چیز رکھ دی۔ پھر اس نے چند گھنڈیاں جو اس کے پاس تھیں نکالیں اور وہ گھنڈیاں میرے سینہ پر لگا دیں۔ پھر میرے انگوٹھے کو کھونٹ کر مجھ سے کہا جاؤ۔ جب میں لوٹا تو اپنے میں وہ لے کر لوٹا جو لے کر نہیں آیا تھا" یعنی چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کے ساتھ نرمی"

یہ روایت زوائدِ مسند احمد، ابنِ حبان، حاکم، ابنِ عساکر اور ابونعیم میں ہے۔ لیکن ان تمام کتابوں

میں مرکزی سلسلۂ سند ایک ہی ہے یعنی یہ کہ معاذ بن محمد اپنے باپ محمد بن معاذ اور وہ اپنے باپ معاذ ابن محمد سے اور وہ اپنے دادا ابی بن کعبؓ سے روایت کرتے ہیں۔ محدث ابن المدینی نے اپنی کتاب العلل میں اس حدیث کے تحت میں لکھا ہے:

حدیث مدنی و اسنادہ مجہول	یہ مدنی حدیث ہے۔ اس کی سند تمام تر مجہول
کلہ و لا نعرف محمدا ولا اباہ	ہے۔ ہم لوگ نہ محمد کو جانتے ہیں اور نہ اس کے
ولا جدہ[1]	باپ کو اور نہ اس کے دادا کو۔

حافظ ابونعیم نے دلائل میں جہاں یہ حدیث نقل کی ہے، صاف لکھ دیا ہے:

وھٰذا الحدیث تفرد بہ معاذ	یہ حدیث صرف معاذ بن محمدؒ نے نقل کی ہے
ابن محمد و تفرد بذکر السن	اور وہی اس عمر کی تعیین کے بیان میں جس میں
الذی شق فیہ عن قلبہ	شقِ صدر ہوا منفرد ہیں (یعنی اس روایت کی
	کسی اور نے تائید نہیں کی ہے)۔

بیس برس کے سن کی روایت بھی بعینہٖ ان ہی لوگوں سے تھوڑے تغیر کے ساتھ ان ہی الفاظ میں زوائدِ احمد، صحیح ابنِ حبان، حاکم، بیہقی اور مختارہ ضیاء میں ہے[2]۔ لیکن اس سلسلۂ روایت کا حال آپ سن چکے کہ وہ معتبر نہیں۔

آغازِ وحی کے موقع پر شقِ صدر کی روایتیں دلائلِ ابونعیم، دلائلِ بیہقی، مسند طیالسی اور مسند حارث میں ہیں۔ یہ روایتیں حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی آغازِ وحی والی حدیث بخاری، مسلم اور ابنِ حنبل وغیرہ تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ اور اس باب میں یہی روایت سب سے زیادہ مفصل، صحیح اور محفوظ ہے۔ لیکن ان کتابوں میں اس موقع پر

---

[1] بحوالہ تہذیب التہذیب جلد اول۔ [2] کنز العمال جلد ششم۔

میں مرکزی سلسلۂ سند ایک ہی ہے یعنی یہ کہ معاذ بن محمد اپنے باپ محمد بن معاذ اور وہ اپنے باپ معاذ ابن محمد سے اور وہ اپنے دادا ابی بن کعبؓ سے روایت کرتے ہیں۔ محدث ابن المدینی نے اپنی کتاب العلل میں اس حدیث کے تحت میں لکھا ہے:

حدیث مدنی واسنادہ مجہول	یہ مدنی حدیث ہے۔ اس کی سند تمام تر مجہول
کلہ ولا نعرف محمدا ولا اباہ	ہے۔ ہم لوگ نہ محمد کو جانتے ہیں اور نہ اس کے
ولا جدہ[1]	باپ کو اور نہ اس کے دادا کو۔

حافظ ابونعیم نے دلائل میں جہاں یہ حدیث نقل کی ہے، صاف لکھ دیا ہے:

وھٰذا الحدیث تفرد بہ معاذ	یہ حدیث صرف معاذ بن محمدؒ نے نقل کی ہے
ابن محمد و تفرد بذکر السن	اور وہی اس عمر کی تعیین کے بیان میں جس میں
الذی شق فیہ عن قلبہ	شقِ صدر ہوا منفرد ہیں (یعنی اس روایت کی
	کسی اور نے تائید نہیں کی ہے)۔

بیس برس کے سن کی روایت بھی بعینہٖ ان ہی لوگوں سے تھوڑے تغیر کے ساتھ ان ہی الفاظ میں زوائدِ احمد، صحیح ابنِ حبان، حاکم، بیہقی اور مختارۂ ضیاء میں ہے[2]۔ لیکن اس سلسلۂ روایت کا حال آپ سن چکے کہ وہ معتبر نہیں۔

آغازِ وحی کے موقع پر شقِ صدر کی روایتیں دلائلِ ابونعیم، دلائلِ بیہقی، مسند طیالسی اور مسند حارث میں ہیں۔ یہ روایتیں حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی آغازِ وحی والی حدیث بخاری، مسلم اور ابنِ حنبل وغیرہ تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے۔ اور اس باب میں یہی روایت سب سے زیادہ مفصل، صحیح اور محفوظ ہے۔ لیکن ان کتابوں میں اس موقع پر

---

[1] بحوالہ تہذیب التہذیب جلد اول۔ [2] کنز العمال جلد ششم۔

شقِ صدر کا مطلق ذکر نہیں۔ اس سے اس واقعہ کی بے اعتباری ظاہر ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ابونعیم، بیہقی، طیالسی اور حارث والی اس روایت کی مرکزی سند ابوعمران الجونی عن یزید بن بانوس عن عائشہؓ ہے۔ یزید بن بانوس مجہول ہے اور اس سے صرف ابوعمران الجونی ہی نے روایت کی ہے۔ کسی اور نے اس کو نہیں لیا ہے۔ طیالسی میں اس روایت کی سند یہ ہے کہ حماد بن سلمہ ابوعمران الجونی سے اور وہ ایک "شخص سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے راوی ہے"۔ معلوم نہیں یہ نامعلوم شخص کون ہے؟ اور ابوعمران نے اس کا نام کیوں نہیں لیا ہے۔ ابونعیم میں اس روایت کا جو سلسلۂ سند ہے اس میں یہ خالی جگہ یزید بن بانوس کے نام سے پُر کی گئی ہے جس کا حال ابھی اوپر گذر چکا۔ علاوہ ازیں ابونعیم کی روایت میں اس کے نیچے داؤد بن الحبر ایک شخص آتا ہے جس کو اکثر محدثین ضعیف بلکہ دروغ گو تک کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس روایت کے اندر بعض ایسی لغو باتیں بھی ہیں جو اس کو صحت کے پایہ سے ساقط کرتی ہیں۔

ایک اور روایت حضرت ابوذرؓ سے ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ جب آپؐ کو نبی بنانا چاہا گیا تو آپؐ کو اپنی پیغمبری کا حال کیونکر معلوم ہوا اور آپؐ نے کیونکر یقین کیا کہ آپؐ پیغمبر ہیں؟" فرمایا "اے ابوذرؓ! میں مکہ کی ترائی میں تھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے۔ ایک زمین پر آیا اور دوسرا آسمان پر تھا۔ ایک نے دوسرے سے کہا یہی وہ ہیں۔ پھر کہا ان کو تولو پہلے ایک سے پھر دس سے پھر سو سے پھر ہزار سے، مجھ کو تولا لیکن میرا پلہ بھاری رہا تو کہا کہ یہ تمام اُمت سے بھاری ہیں۔ بعدازیں میرا شکم چاک کیا اس کے بعد شقِ صدر کے مختلف واقعات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ہے کہ ان فرشتوں نے پھر میرے شانہ پر مہر کی۔ اس روایت میں گو وقت کی تعیین نہیں مگر یہ ذکر ہے کہ یہ واقعہ مکہ کی ترائی میں پیش آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرت حلیمہؓ کے پاس بنو ہوازن میں قیام کے زمانہ کے بہت بعد کا واقعہ ہے۔ پھر

اس میں یہ ہے کہ "جب آپؐ کو نبی بنانا چاہا گیا" اور نبوت کی سب سے پہلی علامت کا سول ہے اور اُمت کا ذکر ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آغازِ وحی کا واقعہ ہے۔ یہ روایت مسند دارمی اور دلائل ابونعیم میں ہے۔ ان کے مشترک راوی بہ ترتیب ابوداؤد، جعفر بن عبداللہ بن عثمان القریشی، عثمان بن عروہ بن زبیر ہیں۔ جعفر بن عبداللہ کی نسبت محدث عقیلی نے تنقید کی ہے کہ اس میں "وہم" تھا یعنی الفاظ کی صحیح یادداشت نہ تھی۔ اور "اضطراب" تھا یعنی ایک ہی واقعہ اور سند کو کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح بیان کرتا تھا۔ پھر اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس کی متابعت نہیں کی جاتی" یعنی اس کے ہم شیخ اور ہم درس اس کی تائید نہیں کرتے[1]۔ پھر بعینہٖ یہی واقعات شداد بن اوسؓ کی روایت سے ابونعیم، ابویعلیٰ اور ابنِ عساکر نے عتبہ بن عبد سلمی کی روایت سے دارمی اور ابنِ اسحاق نے (مرسلاً) بچپن کے شقِ صدر میں بیان کئے ہیں جن سے ان کا باہم تعارض واضح ہے۔

اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شقِ صدر کا ذکر ہے۔ یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمام تر خالی ہیں اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔

۱۔ اس روایت کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ جہم بن ابی جہم عبداللہ بن جعفر سے اور عبداللہ بن جعفر خود حلیمہ سعدیہؓ سے راوی ہیں۔ اس طریقہ سے یہ روایت ابنِ اسحاق اور دلائل ابی نعیم میں ہے۔ جہم بن ابی جہم مجہول ہے اور عبداللہ بن جعفر کی حلیمہ سعدیہؓ سے ملاقات ثابت نہیں۔ اور ابنِ اسحاق جہم بن ابی جہم کا شک ظاہر کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ "عبداللہ

---

[1] دیکھو میزان الاعتدال ذہبی اور تہذیب التہذیب ابن حجر۔

ابن جعفر نے خود مجھ سے کہا یا ان سے سن کر کسی اور نے مجھ سے کہا۔" ابونعیم میں گو یہ شک مذکور نہیں ہے بلکہ اس میں تصریحاً عبداللہ بن جعفر کا نام لیا گیا ہے مگر اس میں اس کے نیچے کے راوی مجروح ہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ واقدی کا ہے۔ ابنِ سعد نے اس روایت کو اسی سلسلہ سے ذکر کیا ہے۔ مگر علاوہ اس کے کہ واقدی کا اعتبار نہیں اس کی تفصیلی سند تک اس میں مذکور نہیں۔ اوپر کے راویوں کا نام مطلق نہیں بتایا گیا ہے۔

۳۔ ابونعیم نے ایک اور سلسلہ سے اس کو بیان کیا ہے جو یہ ہے:" عبدالصمد بن محمد السعدی اپنے باپ سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ ایک شخص سے جو حضرت حلیمہؓ کی بکریاں چرایا کرتا تھا، بیان کرتے ہیں" یہ تمام تر مجہول لوگ ہیں۔

۴۔ بیہقی اور ابنِ عساکر نے ایک اور سند سے حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ لیکن اس سند میں محمد بن زکریا الغلابی جھوٹا اور وضّاع ہے۔ اس کا شمار قصّہ گویوں میں ہے۔

۵۔ ابنِ عساکر نے شدّاد بن اوسؓ صحابی کے واسطہ سے ایک نہایت طویل داستان نقل کی ہے جس میں مذکور ہے کہ قبیلۂ بنی عامر کے ایک پیر مرد نے خدمتِ نبویؐ میں آکر آپؐ سے آپؐ کے ابتدائی حالات دریافت کئے تو آپؐ نے پورا پورا حال بیان کیا۔ منجملہ اس کے ایک واقعہ اپنے بچپن کے شقِّ صدر کا بیان کیا۔ لیکن خود ابنِ عساکر اس روایت کو "غریب" (یعنی ثقات کے بیان سے مختلف) کہتے ہیں۔ اس کے سوا اس سلسلۂ سند کے بیچ میں ایک بے نام و نشان راوی ہے۔ اس سے اوپر ایک اور قابلِ اعتراض راوی اس میں ابوالعجفاء ہے جو شدّاد بن اوسؓ صحابی سے اس قصّہ کا سننا بیان کرتا ہے۔ امام بخاری نے تاریخ صغیر میں اس کی نسبت لکھا ہے فی حدیثہ نظر (اس کی حدیث بحث طلب ہے) ابوحاکم کہتے ہیں لیس حدیثہ بالقائم

یعنی اس کی حدیث ٹھیک نہیں[1]۔

حضرت شدّاد بن اوسؓ سے مکحول شامی کے واسطہ سے ابو یعلیٰ اور ابنِ عساکر نے بعینہٖ اسی واقعہ کو ایک اور سلسلہ سے نقل کیا ہے جس میں گو کوئی مجہول راوی بیچ میں نہیں آیا ہے مگر اس میں یہ کمی ہے کہ مکحول اور شدّاد صحابیؓ کے بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے یا چھوڑ دیا گیا ہے یعنی روایت منقطع ہے۔ کیونکہ مکحول نے حضرت شدّادؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ مکحول تدلیس میں بدنام تھے یعنی ان کی عادت یہ تھی کہ بیچ میں اگر کوئی کمزور راوی آجاتا تو وہ اس کا نام چھپا دیتے تھے یا بیچ سے اس کو حذف کرکے اگلے سے سلسلہ جوڑ دیتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مکحول اور حضرت شدّادؓ کے بیچ میں دراصل وہی ابوالعجفاء تھا۔ مکحول نے یہ دیکھ کر کہ وہ مجروح ہے اس کو بیچ سے نکال دیا ہے اس لئے یہ سلسلہ بھی نامعتبر ہے۔

۶۔ عتبہ بن عبد السلمیؓ ایک کمسن صحابی ہیں۔ ان سے ایک ہی سلسلۂ سند کے ذریعہ سے حاکم، دارمی، ابو یعلیٰ، ابنِ عساکر اور ابنِ حنبل نے اس واقعہ کی یوں روایت کی ہے کہ "آپؐ نے فرمایا ایک دن میں اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چرانے گیا۔ کھانا ساتھ نہ تھا۔ میں نے اس کو ماں (دایہ) کے پاس کھانا لانے کے لئے بھیجا۔ وہ گیا تو دیکھا کہ گدھ کی طرح کے دو پرندے آئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ یہی ہے۔ دوسرے نے کہا ہاں۔ پھر دونوں نے جھپٹ کر مجھے پکڑا اور زمین پر پچھاڑ کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے دو سیاہ جمے ہوئے خون کے قطرے نکالے اور برف اور ٹھنڈے پانی سے دھویا۔" یہ حاکم کے الفاظ ہیں۔ دارمی وغیرہ میں اس کے بعد اتنا زیادہ ہے کہ "دھونے کے بعد ایک نے کہا کہ سکینت یعنی تسکینِ قلبی لاؤ۔ اس کو لاکر میرے سینہ میں چھڑک دیا۔ پھر دونوں چھوڑ کر مجھے چلے گئے۔ میں ڈرا اور اپنی ماں کے

---

[1] دیکھو تہذیب التہذیب و میزان۔

پاس گیا اور حال کہا۔ وہ ڈری کہ بچّہ کی عقل ٹھیک نہیں رہی۔ اس نے کہا میں تم کو خدا کی پناہ میں دیتی ہوں اور پھر وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر میری والدہ کے پاس لائی۔ والدہ نے کہا تم نے امانت پوری طرح ادا کی۔ دایہ نے میرا حال اور اپنا خوف بیان کیا۔ لیکن والدہ کو یہ واقعہ سن کر کوئی خوف یا تعجّب نہیں ہوا۔ فرمایا "جب یہ بچّہ پیدا ہوا تو میں نے دیکھا تھا کہ ایک نور میرے بدن سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے"۔ حاکم نے اس حدیث کو مسلم کی شرط کے مطابق کہا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ روایت کا پہلا مشترک راوی بقیہ بن ولید ہے جس کو گو بذاتِ خود بعضوں نے ثقہ کہا ہے تاہم اس پر سب کا اتّفاق ہے کہ وہ سخت بے احتیاط تھا۔ ابنِ مبارک کہتے ہیں کہ وہ راست گو ہے۔ مگر وہ آگے پیچھے کے ہر شخص سے روایت لے لیا کرتا تھا۔ ابنِ عیینہ کہتے ہیں کہ بقیہ سے احکام کی روایتیں نہ لیا کرو۔ ثواب (فضائل) کی روایتیں خیر لے لیا کرو۔ امام ابنِ حنبل اور امام یحییٰ کا قول ہے کہ "اگر وہ مشہور لوگوں سے روایت کرے تو خیر ورنہ مت لو"۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ "اس کی حدیث لکھی جائے مگر وہ دلیل میں نہ پیش کی جائے"۔ امام نسائی فرماتے ہیں "جب وہ اخبرنا اور حدّثنا کہے تو خیر اور جب عن عن کر کے بیان کرے تو نہ لو"۔ (یاد رہے کہ یہ روایت مذکورہ بطریق عن عن ہی ہے) ابنِ عدی کا قول ہے کہ اس کی بعض روایتیں ثقہ اور معتبر راویوں کے خلاف ہیں۔ امام احمد بن حنبل ایک شخص سے فرماتے ہیں کہ "میں سمجھتا تھا کہ بقیہ مجہول الحال لوگوں سے سن کر حدیثیں نقل کرتا ہے لیکن دیکھا تو وہ مشہور لوگوں سے بھی اسی قسم کی حدیثیں بیان کرتا ہے۔ تم نے جانا وہ کہاں سے یہ روایتیں لاتا ہے؟" مخاطب نے جواب دیا "ہاں تدلیس کے ذریعہ سے"۔ (یعنی بیچ کے کمزور راوی کو حذف کر کے آگے کے معتبر راوی سے سلسلہ جوڑ دیا کرتا تھا)۔ ابو عبد اللہ حاکم کہتے ہیں کہ "اوزاعی وغیرہ مشہور لوگوں سے وہ ایسی روایتیں کرتا ہے جو موضوعات کے مشابہ ہیں اور اس کی صورت یہ کرتا ہے کہ بیچ کے ضعیف

راوی کو حذف کر دیتا ہے۔" خطیب کہتے ہیں کہ" اس کی اکثر روایتیں مُنکر ہیں۔ گو وہ بذاتِ خود راست گو تھا۔" ابن القطان کا قول ہے کہ" وہ ضعیف راویوں سے تدلیس کر کے بیان کرتا ہے اور اس کو وہ جائز سمجھتا ہے۔ یہ الزام اگر اس پر صحیح ہے تو اس کے معتبر ہونے میں خلل انداز ہے۔"

حماد بن سلمہ کی روایت میں ان کا وہم بچپن میں شقِ صدر کا سب سے صحیح اور محفوظ سلسلۂ سند وہ ہے جو حماد بن سلمہ ثابت بنانی سے اور ثابت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں چنانچہ یہ روایت صحیح مسلم، مسند احمد، ابنِ سعد اور دلائل ابو نعیم میں ایک ہی سلسلۂ سند سے مذکور ہے۔ یعنی حضرت انسؓ سے ثابت البنانی اور ان سے حماد بن سلمہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریلؑ آئے اور آپؐ کو پکڑ کر زمین پر لٹایا اور قلبِ مبارک کو چاک کیا اور اس کو نکال کر اس میں سے ذرا سا جما ہوا خون نکالا اور کہا کہ یہ اتنا شیطان کا حصہ تم میں تھا۔ پھر اس کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا۔ پھر شگاف کو جوڑ دیا۔ پھر اس کو اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ لڑکے دوڑے ہوئے آپؐ کی ماں (دایہ حلیمہؓ) کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ محمدؐ مار ڈالے گئے۔ لوگ آپؐ کے پاس پہنچے۔ دیکھا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ سینۂ مبارک میں زخم کے سینے کے نشان یعنی ٹانکے مجھ کو نظر آتے تھے۔ مسند ابنِ حنبل میں یہی حدیث اسی سلسلۂ سند سے حضرت انسؓ سے مروی ہے اور اس میں آخر میں واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم ہے، یعنی یہ کہ مجھ کو نظر آتے تھے۔ کی جگہ پر یہ ہے کہ" ہم کو زخم کے ٹانکے نظر آتے تھے۔"

اس سلسلۂ سند کے صحیح اور محفوظ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے صحاح میں معراج اور شقِ صدر کی جس قدر روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں ان کے دوسرے راوی تابعین میں حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے قتادہ، زُہری، شریک اور ثابت بنانی چار شخص ہیں۔

ثابت بنانی سے دو آدمی ان واقعات کو نقل کرتے ہیں۔ سلیمان بن مغیرہ اور حماد بن سلمہ۔ حماد کے علاوہ اور جو طرق اوپر مذکور ہوئے ان سب میں معراج کے واقعات کے آغاز میں شقِ صدر کا ذکر ہے۔ لیکن حماد نے اپنی روایت میں یوں کیا ہے کہ معراج کے سلسلہ میں وہ شقِ صدر کے ذکر کو ترک کر دیتے ہیں اور شقِ صدر کے واقعہ کو الگ اور مستقل بچپن کے زمانہ کی تخصیص کے ساتھ بیان کرتے ہیں حالانکہ نہ صرف حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے کوئی بلکہ حماد کے دوسرے ہم درس طلبہ میں سے بھی کوئی ان کی تائید نہیں کرتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے معراج کی حدیث، حماد کے واسطہ سے نقل نہیں کی ہے۔ حماد کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ "آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ اسی سبب سے امام بخاری نے ان کی روایتیں نہیں لی ہیں۔ امام مسلم اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر کے خرابیٔ حافظہ سے پہلے کی جو ان کی روایتیں ہیں ان ہی کو چن کر اپنی کتاب میں لائے ہیں"۔ میرا میلانِ تحقیق یہ ہے کہ حماد کی یہ روایت اسی خرابیٔ حافظہ کے زمانہ کی ہے کہ انھوں نے تمام معتبر راویوں کے خلاف شقِ صدر اور معراج کے مشترک واقعہ کو دو کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ امام مسلم بھی اپنی ترتیبِ بیان کے اشارات سے ایسا ہی کچھ بتانا چاہتے ہیں کہ معراج اور شقِ صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد سے غلطی ہوئی ہے۔ چنانچہ واقعاتِ معراج کے ذکر میں امام مسلم یہ کرتے ہیں کہ پہلے حضرت انسؓ سے ثابت کے شاگرد حماد کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں جس میں معراج کے شقِ صدر کا ذکر نہیں۔ پھر حماد کے ساتھی اور ثابت کے شاگرد سلیمان بن مغیرہ کی روایت ہے جس میں شقِ صدر کے ساتھ معراج کا ذکر ہے۔ اس کے بعد حماد کی وہ روایت ہے جس میں تنہا بچپن کے شقِ صدر کا تذکرہ ہے۔ بعد ازیں حضرت انسؓ کے دوسرے شاگردوں کی روایتیں ہیں، جس میں شقِ صدر اور

معراج کا ایک ساتھ واقع ہونا مذکور ہے۔

حماد کی اس روایت میں بعض ایسے معنوی وجوہ بھی ہیں جن کی تائید کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ کہ شقِ صدر کی یہ کیفیت کسی عمر میں بھی گذری ہو مگر بہرحال اس کا تعلق روحانی عالم سے تھا۔ گذشتہ تمام مستند اور مجروح روایتوں میں حسد، بغض، حصۂ شیطانی، سکینت، تسلی، رحمت شفقت، ایمان اور حکمت وغیرہ جن امور کا سینۂ مبارک سے نکالنا یا اس میں رکھنا بیان ہوا ہے ان میں سے کسی چیز کا تعلق جسمانیات سے نہیں۔ بایں ہمہ حماد حضرت انسؓ سے روایت کرکے کہتے ہیں کہ "آپؐ کے سینہ پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھ کو (جیسا کہ مسلم میں ہے یا ہم کو (جیسا کہ مسند احمد میں ہے) نظر آتے تھے"۔ اگر یہ جسمانی واقعہ بھی تھا تو حضرت انسؓ کی دیگر مروی روایات میں سے جو حماد کے علاوہ دوسرے راویوں نے نقل کی ہیں یہ مذکور نہیں۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ کی شکل و شمائل کا ایک ایک حرف، جسم اطہر کے ایک ایک خط و خال کی کیفیت صحابہؓ نے بیان کی ہے، مگر کسی نے سینۂ مبارک کے ان نمایاں ٹانکوں کا نام تک نہیں لیا۔ ایسی حالت میں واقعہ کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہو سکتی ہے۔

دو دفعہ شقِ صدر ہو تو اس کی تاویل اس تشریح اور تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حماد کی اس روایت کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینۂ مبارک سے حصۂ شیطانی، جو ہر انسان کے اندر ہے، اس کو نکالا گیا کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے۔ ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی مگر معراج کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم و حکمت سے معمور کیا گیا جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے۔

شقِ صدر کی صحیح کیفیت شقِ صدر کی صحیح کیفیت حالتِ معراج کے سلسلہ میں صحیح بخاری صحیح مسلم

اور نسائی وغیرہ میں متعدد روایتوں اور طریقوں سے مذکور ہے کہ ایک شب آنحضرتؐ خانۂ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے۔ آنکھیں سوتی تھیں مگر دل بیدار تھا۔ کہ ناگاہ حضرت جبرئیلؑ چند فرشتوں کے ساتھ نظر آئے۔ آپؐ کو اٹھا کر وہ چاہِ زمزم کے پاس لے گئے یا آبِ زمزم لے کر کوئی آپؐ کے پاس آیا۔ سینۂ مبارک کو چاک کیا۔ پھر آبِ زمزم سے دھویا۔ اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا۔ پھر اس طشت کے سرمایہ کو سینۂ مبارک میں بھر کر شگاف کو برابر کر دیا گیا۔ اس کے بعد فرشتے آپؐ کو آسمان کی طرف لے چلے۔[1]

شقِّ صدر کی حقیقت علمائے ظاہر ہیں اس واقعہ کے ظاہر الفاظ کے جو عام اور سیدھے سادھے معنی سمجھتے ہیں کہ واقعی سینۂ مبارک چاک کیا گیا اور قلبِ اقدس کو اسی آبِ زمزم سے دھو کر ایمان اور حکمت سے بھر دیا گیا، اس کو ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے۔ لیکن صوفیائے حقیقت ہیں اور عرفائے رمز شناس ان الفاظ کے کچھ اور ہی معنی سمجھتے ہیں اور ان تمام غیر محتمل الالفاظ معنی کو تمثیل کے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عالمِ برزخ کے حقائق ہیں جہاں روحانی کیفیات جسمانی اشکال میں اسی طرح نظر آتی ہیں جس طرح حالتِ خواب میں تمثیلی واقعات جسمانی رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں اور جہاں معنی اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

اما شق الصدر وملوہ ایمانا	لیکن سینہ کا چاک کرنا اور اس کو ایمان سے
فحقیقتہ غلبۃ انوار الملکیۃ	بھرنا، اس کی حقیقت انوارِ ملکیہ کا روح پر غالب
والطفاء لھیب الطبیعۃ و	ہو جانا اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھ جانا
خضوعھا لما یفیض علیھا من	اور عالم بالا سے جو فیضان ہوتا ہے اس کے قبول

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و نسائی: ابواب معراج یا فرض الصلوٰۃ و مسند احمد روایات انسؓ وغیرہ۔

حظیرۃ القدس[1] کے لئے طبیعت کا آمادہ ہو جانا ہے۔

ان کے نزدیک معراج بھی اُسی عالم کی چیز تھی۔ اس لئے شقِ صدر بھی اُسی دنیا کا واقعہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک صحیح اصطلاح شرحِ صدر ہے جیسا کہ صحیح مسلم باب الاسراء میں حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت میں مذکور ہے فشرح صدری الی کذا وکذا (میرا سینہ یہاں سے یہاں تک کھولا گیا) اور قرآن مجید کی اس سورہ میں جیسا کہ ترمذی میں ہے، اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَ	کیا ہم نے تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا
وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْ	اور تجھ سے تیرے اس بوجھ کو ہٹا نہیں دیا
اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝	جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا تھا۔

(الانشراح : ۱-۳)

"شرح" کے لغوی معنی عربی میں "چیر نے پھاڑنے" کے ہیں۔ اسی سے طب کی اصطلاح "علمِ تشریح" اور "تشریحِ اجسام" نکلی ہے۔ چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہو جاتی ہے اس لئے اس سے "تشریحِ امر" اور "تشریحِ کلام"، "شرحِ بیان" اور "شرحِ کتاب" وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوئے ہیں۔ اسی سے ایک اور محاورہ "شرحِ صدر" کا پیدا ہوا ہے جس کے معنی "سینہ کھول دینے" کے ہیں۔ اور کلامِ عرب میں اس سے مقصود "بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا" ہوتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ نے دُعا مانگی رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ[2] ۝ (پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم۔ [2] طٰہٰ ۲۵ - ۲۸۔

گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں")۔

انبیاءؑ کا علم اور فہم انسانی تعلیم و تعلّم اور مادی حکمت و دانائی سے پاک و مبرّا ہوتا ہے اور وہ اپنے اخذِ نتائج اور اثباتِ دعویٰ کے لئے گذشتہ تجربات اور منطق کے استقراء و تمثیل اور ترتیبِ مقدّمات کے ممنون نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیمِ الٰہی، القائے ربّانی اور فہمِ ملکوتی ہوتا ہے۔ اسی کا نام علمِ لدنّی ہے۔ "لدن" کے معنی عربی زبان میں "پاس اور نزدیک" کے ہیں۔ چونکہ یہ علم اُن کو کسب و تحصیل کے بغیر خدا کے پاس سے اور اس کے نزدیک سے عطا ہوتا ہے اس لئے عرف عام میں علمِ لدنّی کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ○ (الکھف: ۶۵)

ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

آنحضرتؐ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ○ (طٰہٰ: ۹۹)

اسی طرح ہم تجھ سے گذشتہ زمانہ کی باتیں بیان کرتے ہیں۔ اور ہم نے اپنی طرف سے تجھ کو علم (ذکر) بخشا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصّہ کے آغاز میں آنحضرتؐ کو خطاب ہوتا ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ

ہم تجھ کو قرآن کی وحی بھیج کر ایک بہترین قصّہ سناتے ہیں جس سے تو قطعاً اس سے پہلے بے خبر تھا۔

الْغٰفِلِيْنَ ○

(یوسف : ۳)

سورۂ شوریٰ میں ہے :

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ	اور اسی طرح ہم نے (اے محمدؐ) تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کو وحی کیا۔ تو تو پہلے یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان سے واقف تھا لیکن ہم نے اس کو روشنی بنایا ہے جس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہم راستہ دکھا دیتے ہیں۔
(الشوریٰ : ۵۲)	

دوسرے پیغمبروں کی نسبت بھی یہی ارشاد ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہتے ہیں :

يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ۔	اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔
(مریم : ۴۳)	

حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے متعلق ہے :

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ	اور ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو علم بخشا۔
(النمل : ۱۵)	

حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت ارشاد ہے :

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ	ہم نے یوسفؑ کو حکم اور علم عطا کیا۔
(یوسف : ۲۲)	

حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں :

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ط — یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں۔

(یوسف : ۳۷)

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے :

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا — اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔

(الانبیآء : ۷۴)

حضرت سُلیمان اور چند دیگر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد ہے :

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ج وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا — ہم نے یہ بات سلیمانؑ کو سمجھا دی اور ہم نے ان سب کو حکم اور علم عطا کیا۔

(الانبیآء : ۷۹)

الغرض انبیاء کا یہ علم محض تعلیمِ الٰہی اور القائے ربّانی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور غور و فکر، تجربہ و امتحان، تحصیل و اکتساب اور جمعِ معلومات اور ترتیبِ مقدّمات کے بغیر ان کے علم کی باتیں ان کے سامنے آئینہ ہو کر آجاتی ہیں۔ صرف فہم و تمثیل کے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ کبھی کبھی شعراء، مصنّفین، موجدین اور دیگر عقلاء کے ذہن میں بے غور و تامّل ایک بات اس طرح خطور کر جاتی ہے کہ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا دماغ کا دروازہ یک بیک کھل گیا اور ایک چیز اندر داخل ہو گئی۔ لیکن یہ شرحِ صدر کی نہایت معمولی مثال ہے۔ اس منصبِ خاص کے سینکڑوں مدارج ہیں جو انبیاءؑ کو، اولیاء کو اور دیگر مومنین کو اپنے اپنے رتبہ کے مطابق عطا ہوتے ہیں :

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ج — جس کی رہنمائی خدا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول

(الانعام: ۱۲۵) دیتا ہے۔

یعنی بلا حجت و برہان اسلام کی صداقت اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو ان کی خلافت کے زمانہ میں مشورہ دیا اور بہ اصرار کہا کہ قرآن مجید کو اوراق و مصاحف میں لکھوا دیجئے۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ نے مخالفت کی کہ جو کام آنحضرتؐ نے خود اپنی زندگی میں نہیں کیا وہ ہم لوگ کیوں کر کر سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار اور حضرت ابو بکرؓ کو انکار رہا۔ مگر چند ہی روز میں یک بیک ان کی سمجھ میں بات آگئی اس موقع پر انہوں نے فرمایا:

حَتّٰی شرح اللہ صدری لذٰلک۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کام کے لئے

(صحیح بخاری تالیف القرآن) میرے سینہ کو کھول دیا۔

مفسر ابن جریر طبری نے متعدد صاحبوں سے روایت کی ہے کہ صحابہؓ نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ! شرح صدر کیونکر ہوتا ہے"؟ فرمایا "قلب میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس سے سینہ کھل جاتا ہے"۔ پھر سوال کیا کہ "یارسول اللہؐ! اس کی نشانی کیا ہے؟" ارشاد ہوا "حیاتِ جاوید کے گھر کا اشتیاق اور اس فریب کدۂ عالم سے دل برداشتگی اور موت سے پہلے موت کی تیاری"۔[1] یہ تو حقیقت ہے اور اس حقیقت کی جسمانی تمثیل سینۂ مبارک کا چاک کیا جانا اور اس میں نور و حکمت کا بھرا جانا ہے۔

شرح صدر کے لئے مناسب موقع اور مصلحت جن آیتوں میں دیگر انبیاءؑ کو عطیۂ علم کے دیئے جانے کا ذکر ہے ان میں اکثر علم کے ساتھ "حکم" کا لفظ بھی ہے۔ جس

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری: جلد ہشتم (حاکم فی المستدرک جلد چہارم بسند فیہ عدی بن الفضل)۔

سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ خالص شرعی ضرورتوں کے نظم وحکومت اور فیصلۂ احکام کے لئے بے غور وفکر کے بدیہی، صحیح اور حاضر علم کی ضرورت ہے۔ چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا عنوان تھا جس کے بعد آنحضرتؐ کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی اس لئے شرحِ صدر کے عطیہ کے لئے یہی مناسب موقع تھا۔ علاوہ ازیں معراج کے حقائق ومناظر جو نفوسِ نبویہؐ کے ادراکات کی آخری سرحد ہیں، ان کے احاطہ کے لئے بھی شرحِ صدر کی ضرورت تھی۔

آیات و دلائل نبویؐ

قرآن مجید میں

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے سابقینؑ کے معجزے جس تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں آنحضرتؐ کے معجزے اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ اس میں مذکور نہیں۔ اس سے ایک طرف تو مخالفینِ اسلام نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذاتِ پاک اس عطیۂ الٰہی سے محروم تھی۔ دوسری طرف اسلام کے عقل پرست فرقہ کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ اسلام نے خوارقِ عادت کے ظہور سے انکار کیا ہے کیونکہ جب اس کے نزدیک خاتم الانبیاءؐ کی زندگی ان سے خالی تھی تو گذشتہ انبیاءؑ کے سوانح میں جو اعجاز نظر آتا ہے وہ بھی سمجھنے والوں کے لئے فہم کا قصور ہے۔

قرآن مجید میں آپؐ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیگر انبیائے کرامؑ اور آنحضرتؐ کے معجزات اور آیات و دلائل میں جو یہ اختلافِ منظر نمایاں ہے اس کے متعدد وجوہ اور اسباب ہیں۔ جن پر ان کوتاہ بینوں کی نظر نہیں پڑی۔ اس لئے وہ مختلف قسم کے شکوک و شبہات میں گرفتار ہو گئے۔

(۱) اس اختلافِ منظر کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جس نے قرآن مجید کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے یا گذشتہ صفحات میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے معجزہ کی جو حقیقت واضح

کی گئی ہے اس کو سمجھا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ اسلام نے نبوّت کی تصدیق کے باب میں ظاہری اور مادّی معجزات کو وہ اہمیّت نہیں دی ہے جو خصوصیت کے ساتھ عیسائی مذہب اور اس کے مقدّس صحیفہ میں نظر آتی ہے۔ بلکہ وہ انسانوں کو زیادہ تر غور و فکر، فہم و تدبّر، سوچ اور سمجھ کی دعوت دیتا ہے اور نبوّت کی اندرونی خصوصیات اور روحانی دلائل کو ایمان و تصدیق کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس بنا پر اس کے لئے اپنے پیش کرنے والے کی سچائی کے ثبوت میں اس کے خوارق اور معجزات کو تفصیل اور تکرار کے ساتھ ہر جگہ پھیلانا اور دہرانا اس کے اصول کے خلاف تھا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام ان گمراہیوں سے پاک رہا جن کی تاریکیوں کے پردہ میں عیسوی مذہب کا نور چھپ کر رہ گیا۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ انبیاءؑ کو جو نشانیاں ملی تھیں، وہ چند محدود رگنی ہوئی متعیّن شکل میں تھیں۔ اس لئے قرآن مجید کو جب کبھی ان پیغمبروں کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو خواہ مخواہ ان کے ان ہی چند حیرت انگیز واقعات کو بار بار دہرانا پڑتا ہے اور اس کی تفصیل اور تکرار سے کوتاہ بینوں کی نگاہوں میں ان پیغمبروں کی یہ نشانیاں اُجاگر ہو کر نظر آتی ہیں۔ اس کے برخلاف آنحضرتؐ کو جو نشانیاں عطا ہوئیں وہ اس قدر متنوّع، مختلف اور غیر محدود تھیں کہ ان کے تذکرے کے وقت ایک ہی نشانی کو بار بار پھیلانے اور دہرانے کی حاجت نہ تھی۔ اس لئے یہ دلائلِ محمدیؐ قرآن مجید کے سیکڑوں صفحات کے مختلف گوشوں میں اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ دوسرے انبیاءؑ کے معجزوں کی طرح وہ اُجاگر اور نمایاں ہو کر کم سوادوں کو نظر نہیں آتے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ مباحث میں یہ پوری تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے معجزات، خوارق اور نشانیاں پیغمبر کی قوّت اور اختیار سے

نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ و مشیت سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس بنا پر آنحضرتؐ کی آیات و دلائل بھی ذاتِ محمدیؐ کی طرف منسوب ہو کر نہیں بلکہ قدرتِ الٰہی کی طرف منسوب ہو کر بیان ہوئی ہیں۔ اس لئے عام لوگوں کا خیال ان کو دلائلِ محمدیؐ سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی اُن کا صحیفہ ہے جس میں ان کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح، معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں۔ لیکن اسلام کے قبضہ میں دو چیزیں ہیں۔ ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام و مطالب ہیں۔ دوسرے حدیث و سنّت جس میں پیغمبرؐ کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں اور وہ بجائے خود روایتی استناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے۔ اس لئے خدا نے پیغمبرؐ کے ان دلائل و معجزات کو عدم اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفہ میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اس کے لئے احادیث کے مستند ذخیرۂ روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا۔

قرآن مجید سے آپؐ کے صاحبِ معجزہ ہونے کی دلیل غرض یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر بعض کم سواد اس دعویٰ کی جرأت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتیں آپؐ کو معجزات اور نشانیوں سے معرّا ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں غور کے قابل سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے آپؐ کے متعلق آپؐ کے زمانہ کے کافروں کے جو اقوال تردید کی غرض سے نقل کئے ہیں ان میں متعدد موقعوں پر آپؐ کو (نعوذ باللہ) "کاہن" اور "ساحر" کہا گیا ہے اور قرآن مجید پر سحر کا الزام لگایا گیا ہے۔ عرب میں کاہنوں کا کام پیشین گوئی کرنا اور غیب کا حال بتانا تھا اور ساحر کی نسبت تو عام طور پر معلوم ہے کہ وہ عوام کے نزدیک عجائب و خوارق کا پیکر ہوتا ہے۔ اب اگر آپؐ امورِ غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات و خوارق کا صدور آپؐ سے نہیں ہوا کرتا تھا تو کفار

آپؐ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے؟ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل آیتوں پر غور کی ایک نگاہ ڈالئے :۔

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ (الطور : ۲۹)	(اے محمدؐ!) تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے۔
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط (الحاقۃ : ۴۲)	یہ (قرآن) کسی کاہن کا کلام نہیں۔

آنحضرتؐ کو خطاب کر کے خدا کفارِ قریش کا حال بتاتا ہے :

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۴-۱۵)	جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ کفار کو جو نشانیاں نظر آتی تھیں وہ ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے اور ان کو جادو کہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی خارقِ عادت نشانیاں ان کے مشاہدہ میں آتی تھیں۔ اور دوسری آیتوں میں بھی سحر کی نسبت آپؐ کی طرف کفار کی زبان سے کی گئی ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ (الزخرف : ۳۰-۳۱)	اور جب اُن کے پاس سچی بات آئی تو انہوں نے کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا	حق کے منکروں نے جب ان کے

جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ	پاس حق آیا تو کہا یہ تو کھلا جادو ہے
الاحقاف	
هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○	یہ (محمدؐ) تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہیں۔ کیا تم جان بوجھ کر جادو کے پاس آتے ہو۔
الانبیآء ۔	
قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ○	کافروں نے کہا یہ (محمدؐ) تو کھلا جادوگر ہے
یونس	

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپؐ کی آمد کی جو بشارت دی تھی، اس کے بعد ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○	پس جب وہ آنے والا پیغمبر کھلی آیتیں لے کر آیا تو کافروں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔
الصف	

کفار کے ان اقوال سے ثابت ہے کہ آپؐ کی ذات بابرکات سے کچھ تو مافوق العادۃ باتیں ظاہر ہوتی تھیں جن کی تعبیر کہانت اور جادوگری کے الفاظ سے کرکے وہ اپنے نادان دل کو تسلی دیتے تھے۔ اور اسی سے آپؐ کے صاحبِ معجزہ ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آپؐ کے دلائل و معجزات مذکور ہیں

اس اجمالی ثبوت کے بعد ضرورت ہے کہ ہم آنحضرتؐ کے ان آیات و دلائل کے بکھرے ہوئے موتیوں کو جو قرآن مجید کے اوراق میں منتشر ہیں ایک خاص ترتیب کے رشتہ میں منسلک کردیں

کہ وہ نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائیں۔ تنوع کے لحاظ سے یہ آیات و دلائل تین قسم کے ہیں۔ ایک تو کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کے لئے معجزانہ نشانیاں، دوسری مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیداتِ غیبی کا ظہور اور تیسری وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا ہے۔ آئندہ اوراق میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔



مُعجزۂ قرآن

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (بنی اسرائیل : ۸۸)

(کہدے اے پیغمبر!) اگر تمام جنّ وانس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنالائیں تو نہیں لاسکتے۔)

آنحضرتؐ کو پیش گاہِ الٰہی سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن مجید ہے۔ چنانچہ جب کفار نے معجزہ طلب کیا تو خدا نے فرمایا:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ (العنکبوت : ۵۰-۵۱)

اور انہوں نے کہا کہ پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں کہہ دے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں۔ میں تو صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے اس پر کتاب اتاری جو اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

اور آنحضرتؐ نے بھی دیگر انبیاءؑ کے معجزات کے مقابلہ میں اپنی اسی وحیٔ آسمانی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا۔ چنانچہ گویا اسی آیتِ پاک کی تفسیر میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ما من الانبیآء نبی الا اعطی من الاٰیات ما مثلہ او من او اٰمن علیہ البشر۔ و انّما کان الذی اوتیت وحیًا اوحاہ اللہ الی فارجوانی اکثرھم تابعا یوم القیٰمۃ۔

بخاری باب الاعتصام

پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزات عنایت کئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے۔ لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا وہ وحی (قرآن) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اُتارا۔ اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

اس حدیث سے متعدد نکتے حل ہوتے ہیں:۔

۱۔ ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا ہوا ہے۔

۲۔ دیگر انبیاءؑ کے معجزات وقتی اور عارضی تھے۔ ہوئے اور ہو کر مٹ گئے لیکن آنحضرتؐ کا معجزۂ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک دُنیا میں قائم اور باقی رہے گا۔

۳۔ چونکہ وہ معجزے وقتی اور عارضی تھے اس لئے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا۔ برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے، اس لئے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور قیامت تک نئے نئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا۔

آنحضرتؐ کو جو ربانی نشانیاں خدا کی طرف سے عنایت ہوئیں ان میں صرف یہی ایک معجزہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے تحدّی کی ہے اور اعلانِ عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے۔ اور پھر خود ہی اس کی پیشین گوئی بھی کر دی ہے کہ دنیا ہمیشہ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے گی۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ
الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا
الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ
كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○

(بنی اسرآئیل : ۸۸)

کہدے اے پیغمبر! اگر تمام جن وانس مل کر
بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنا لائیں
تو نہیں لا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے
کی مدد پر کیوں نہ ہو۔

سورہ ہود میں پورے قرآن کے بجائے صرف دس سورتوں کا جواب مانگا گیا ہے :

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ
ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(هود : ۱۲)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے
جی سے بنا لیا ہے۔ تو کہدے کہ وہ ایسی بنائی
ہوئی دس ہی سورتیں لے آئیں اور اپنی مدد
کے لئے خدا کے سوا جس کو چاہیں بلا لیں
اگر وہ سچے ہیں۔

اس کے بعد کی آیتوں میں دس سورتوں سے گھٹا کر ایک ہی سورہ کا جواب لانے کی تحدید کی گئی ہے :

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا
عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ
مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(البقرة : ۲۳)

اور اگر تم کو اس میں بھی کچھ شک ہو
جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے، تو
اس جیسا ایک ہی سورہ لاؤ اور خدا کے
سوا اپنے تمام گواہوں کو بلاؤ اگر تم
سچے ہو۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا

تو اگر تم ایسا سورہ بنا کر نہ لا سکو اور یقیناً

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ○ (البقرۃ : ۲۴)

نہ لاسکو گے تو اس آتش دوزخ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر (جن کو تم پوجتے ہو) سب ہوں گے جو کافروں کے لئے تیار رکھی گئی ہے۔

اسی کے ہم معنی دوسری آیت سورۂ یونس میں ہے:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ (یونس : ۳۸)

کیا یہ کفار یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس قرآن کو اپنی طرف سے بنالیا ہے۔ ان سے کہدے کہ اس جیسی ایک سورہ تم تو لاؤ اور خدا کے سوا اور جس کو چاہو مدد کے لئے بلالو اگر تم سچے ہو۔

پھر سورہ طور میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس جیسی ایک ہی بات پیش کرو:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ○ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ○ (الطور: ۳۳-۳۴)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کو ایمان نہیں اگر وہ سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات بھی پیش کریں۔

اس امر پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے۔ لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے اور وجہ اعجاز کیا ہے؟

(۱) بعض معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید کا نظم کلام (اسٹائل) معجزہ ہے۔ یعنی اہل عرب کا کلام جس طرز اور اسلوب پر ہوا کرتا تھا قرآن مجید نے ان کو چھوڑ کر ایک اور بدیع طرز اور عجیب

اسلوب اختیار کیا جو عرب میں موجود نہ تھا۔ اُن کے کلام کا تمامتر نمونہ شعر تھا۔ قرآن مجید نے نثر کا ایک اسلوب اختیار کیا۔ کاہنانِ عرب کا کلام بھی نثر ہوتا تھا مگر اس میں تکلف اور آورد تھی۔ قرآن مجید نے نظم و نثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغائے عرب کے تخیل میں نہ تھا۔ قرآن کے مطالع، مقاطع اور فواصل یعنی جس طرح قرآن کسی بیان کا آغاز اور اس کا خاتمہ کرتا ہے اور جس طرح ایک ایک آیت کو توڑتا جاتا ہے، وہ حدِ اعجاز میں داخل ہے۔

۲۔ معتزلہ میں سے جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کی حیثیت سے معجزہ قرار دیتے ہیں۔

۳۔ نظام معتزلی اور ابنِ حزم ظاہری[1] یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور امام رازی بھی اس کو اقرب الی الصواب کہتے ہیں[2] کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تمام بلغائے عرب و عجم کی زبانیں اس کے مقابلہ میں گنگ کر دیں اور اس لئے وہ اس کا جواب نہیں لا سکتے۔

۴۔ بعض متکلمین کے نزدیک وجہِ اعجاز قرآن مجید کا اظہارِ غیب اور پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہیں۔

۵۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دل کے چھپے ہوئے اسرار کو فاش کرتا تھا جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔

۶۔ کسی نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ اور انسانوں کے کلام بلند و پست، کامل و ناقص، صحیح و غلط غرض مختلف المراتب ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید شروع سے اخیر تک بلندی، کمال اور صحت کے لحاظ سے ایک ہی نوعیت کا ہے۔

---

[1] الفصل فی الملل والنحل ابن حزم: جلد سوم باب اعجاز القرآن۔ [2] تفسیر کبیر: جلد اول تفسیر آیہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ۔

۷۔ ایک دو آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ معجزہ یہ ہے کہ ایک اُمّی کی زبان سے ایسا کلامِ بلاغت نظام نکلا۔[1]

۸۔ قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ اس کی خارقِ عادت تاثیر اور قلوبِ انسانی کی تسخیر بھی قرار دی جاسکتی ہے۔

۹۔ بعضوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اعجاز اس کے احکام، تعلیمات اور ارشادات ہیں۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اختلافات باہم متضاد نہیں ہیں جو ایک جگہ مجتمع نہ ہوسکیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ وجہِ اعجاز صرف ایک میں محدود ہو۔ قرآن مجید کے وجوہِ اعجاز اس قدر کثیر ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کو اپنے مذاق کے مطابق جو بات نمایاں نظر آئی ہے اسی کو اس نے وجہِ اعجاز قرار دے لیا ہے۔ کوئی حسین اور خوب صورت چیز جب نقّادانِ فن کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے تو کوئی اس کے رنگ وروغن کا مدّاح ہوتا ہے، کوئی اس کے اعتدالِ قامت کی تعریف کرتا ہے، کوئی اس کی وضع قطع کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، کوئی اس کی زیبائش وآرائش کی مدح کرتا ہے۔ تو درحقیقت اس کی ذات ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہوتی ہے اور ہر ناقد اپنی چشمِ اعتبار سے جو کچھ دیکھتا ہے اسی کو اس کے حسن کا معیار قرار دے لیتا ہے۔ حافظ وسعدی کے کلام کا معترف کون نہیں؟ لیکن لوگوں سے اس کے حُسن وخوبی کی تفصیل پوچھو تو کوئی ایک بات نہیں کہے گا۔ کسی کے نزدیک ان کے کلام کا حُسن یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں

---

[1] متکلّمین کے یہ مذاہب شرح مواقف، اعجازِ قرآن باقلانی، الاتقان سیوطی، فصل فی الملل والنحل ابنِ حزم میں مذکور ہیں۔ [2] شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں اور مولانا شبلی نے اپنے مضمون اعجاز القرآن میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

کے لئے بحریں نہایت مطربانہ اور موسیقیانہ اختیار کرتے ہیں، کوئی طریقۂ ادا اور اسلوبِ تعبیر کی تعریف کرے گا، بعض ناقدین سخن الفاظ کی شیرینی اور ترکیب کی ندرت پیش کریں گے، کوئی تشبیہ و استعارہ کی جدت پر زور دے گا، دوسرے اصحاب ان کی نازک خیالی کے معترف ہوں گے۔ بعضوں کے نزدیک ان کی معنی آفرینی، عمیق فلسفہ و حکمت اور دلپذیر موعظت ان کے کلام کا تمغائے کمال ہے۔

عبارتنا شتی وحسنك واحد وكل الى ذاك الجمال يشير

ہماری عبارتیں گو مختلف ہیں لیکن تیرا حُسن ایک ہی ہے، ہر شخص اپنی عبارت میں اسی ایک حُسن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

قرآن مجید کی ان آیتوں کا اگر استقصاء کیا جائے جن میں اس کے وجوہِ اعجاز کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے تو وہ ہم کو خود مختلف نظر آتی ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے وجوہِ اعجاز اس قدر متعدد اور کثیر الاطراف ہیں کہ اُن کو کسی ایک میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کہیں تو اپنی تعلیم و ارشاد کی مدح ہے، کہیں اپنی تاثیر اور قوتِ جذب کی طرف اشارہ کیا ہے، کہیں اپنی یکسانی اور عدمِ اختلاف کو اپنے خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی بتائی ہے، کہیں اس نے اپنی عربیت اور حُسنِ کلام کو ظاہر کیا ہے، کہیں ایک اُمّی کی زبان کا پیغام ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے، ایک موقع پر اپنی ہدایت و رہنمائی کو مخصوص ترین وصف قرار دیا ہے، کہیں وہ خود کو نُوْرٌ، هُدًى، حِكْمَةٌ، بَيِّنَةٌ اور دیگر مختلف اوصافِ معنوی کا پیکر کہتا ہے۔

چنانچہ ذیل میں ہم ان آیتوں کو بہ ترتیب لکھ دیتے ہیں:

فصاحت و بلاغت

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ	جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس
اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ	کی زبان تو عجمی ہے اور یہ ایسی زبان ہے جو

مُّبِيْنٌ ○ (النحل : ۱۰۳)

عربی ہے اور اپنے مدعائے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○ (الشعرآء : ۱۹۵)

یہ قرآن ایک ایسی زبان میں ہے جو اپنے مدعائے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (الزمر : ۲۸)

قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔

قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ○ (الحجر : ۱، یٰس : ۶۹)

اپنے مدعا کو خوبی سے ظاہر کرنے والا قرآن۔

یکسانی اور عدمِ اختلاف

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○ (النسآء : ۸۲)

کیا یہ کافر قرآن میں غور نہیں کرتے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔

قوّتِ تاثیر

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ○ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ ۖ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ○ (القمر : ۴-۵)

اُن کو (قرآن کے ذریعہ) اگلی امتوں کے اتنے حالات سُنائے جا چکے ہیں جو ان کی تنبیہ کو کافی تھے۔ یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے لیکن ان کو ڈرانا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

کفار قرآن مجید کو سحر اور جادو کہتے تھے۔ یہ کیوں؟ اس کی اسی تاثیر اور قوتِ تسخیر کی بنا پر:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ (الاحقاف : ۷)	جب ان کافروں پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو سچائی کے آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

کفار کہتے تھے کہ جب محمدؐ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگیں تو شور کرو تاکہ لوگ سُن کر متاثر نہ ہوں:

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (حم السجدۃ : ۲۶)	کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سُنا نہ کرو اور اس کے پڑھتے وقت شور و غل کرو شاید تم جیت جاؤ۔

تعلیم و ہدایت

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ (البقرۃ : ۲)	یہی ہے وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لئے سرتاپا ہدایت ہے۔
اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل : ۹)	یہ قرآن اُس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ صحیح اور سیدھی ہے۔
قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰی مِنْهُمَا اَتَّبِعْهُ	کہدے قرآن اور تورات سے بڑھکر کوئی ہدایت والی کتاب لاؤ تو میں اس

(القصص: ۴۹)

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝

کی پیروی کروں۔

تمہارے پاس روشنی اور مدعا کو ظاہر کرنے والی کتاب آچکی۔

(المائدۃ: ۱۵)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ

(البقرۃ: ۹۹)

ہم نے تیری طرف کھلی ہوئی آیتیں اتاریں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ

(الانعام: ۱۵۵—۱۵۷)

یہ مبارک کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے یہود و نصاریٰ دو قوموں پر کتاب اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان دونوں قوموں سے زیادہ راہِ راست پر ہوتے۔ تو لو یہ تمہارے رب کی طرف سے دلیل و ہدایت و رحمت آئی ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

(بنی اسرائیل: ۸۲)

اور قرآن سے ہم وہ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ
الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا
مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ
حَمِيْدٍ ۝ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا
قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ
اَلِيْمٍ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا
لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ
وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى
وَّشِفَآءٌ ؕ

(حٰمٓ السجدۃ : ۴۱-۴۴)

یہ عزت والی کتاب ہے جس کے آس پاس
بھی باطل نہیں آسکتا۔ یہ حکمت اور تعریف والے
خدا کی اتاری ہوئی ہے۔ اے پیغمبر تجھ سے وہی
کہا جاتا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا
گیا۔ تیرا پروردگار بخشش والا بھی ہے اور عذاب
والا بھی ہے۔ اگر ہم اس قرآن کی زبان
عجمی کرتے تو وہ لوگ یہ کہتے کہ اس کے
احکام کیوں نہیں کھول کے بیان کئے
گئے۔ ہم عرب ہیں اور کتاب عجمی۔ کہہ
دے کہ یہ کتاب مومنوں کے لئے ہدایت
اور شفا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ
مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا
فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(یونس : ۵۷)

لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار
کی طرف سے نصیحت آچکی اور وہ
دلوں کے امراض کا علاج ہے اور
مسلمانوں کے لئے ہدایت اور
رحمت ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝

(یٰسٓ : ۲)

حکمت والا قرآن۔

وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝ ؕ (صٓ : ۱)

نصیحت والا قرآن۔

قرآن کا جواب لانے کی قدرت نہیں

لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ

(بنی اسرائیل : ۸۸)

جن و انس اس کا جواب نہیں لا سکتے۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا

(البقرۃ : ۲۴)

یہ کفار ہرگز اس کا جواب نہیں لا سکتے۔

ایک اُمّی کی زبان سے ادا ہونا

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(العنکبوت : ۴۸ - ۵۱)

قرآن سے پہلے اے پیغمبرؐ نہ تو تو کچھ پڑھ کر سُناتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو البتہ یہ باطل پرست شک کر سکتے۔ بلکہ یہ کھلی آیتیں ہیں جو اُن لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم بخشا گیا ہے۔ اور ہماری آیتوں سے صرف گنہگار ہی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیوں اس پیغمبرؐ پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں نہیں اتریں۔ کہدے کہ نشانیاں خدا کے قبضہ میں ہیں۔ میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اس میں ایمان والوں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے۔

حفظ و بقاء کا وعدہ

وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

الحجر ۹

اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ

(القیٰمۃ : ۱۷)

ہم پر ہے اس قرآن کا جمع کرنا۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ

(حٰمٓ السجدۃ : ۴۲)

اس قرآن کے پاس آگے اور نہ پیچھے سے باطل آسکتا ہے۔

قوّتِ دلائل

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

(الانعام : ۱۵۷)

یقیناً تمہارے پاس تمہارے خدا کی دلیل آچکی۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ

(الانعام : ۱۴۹)

کہہ دے کہ خدا ہی کے لئے وہ دلیل ہے جو دلوں تک اتر جاتی ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

(الاعراف : ۲۰۳)

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں اور ہدایت و رحمت ہے مومنوں کے لئے۔

قرآن مجید کی یہ آیتیں صرف چند حیثیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی استقصا کرے تو متعدد وجوہ اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ الغرض مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزۂ کامل ہے۔ اس کے

معجزہ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گذرے کہ کوہِ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمّیؐ نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدّی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گذر گیا مگر ایک آواز بھی اس تحدّی کو قبول کرنے کے لئے بلند نہ ہوئی۔ اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیارِ اعجاز قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اُس وقت جب ایک اُمّی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا[1] یہ مدّعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا۔ اُس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے۔ مگر اس "صوتِ سرمدی" کے سامنے سب کی زبانیں گُنگ ہو گئیں۔ کفّارِ عرب نے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں۔ انہوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں پَرے جمائے، ان کے دولتمندوں نے اپنے خزانے کھول دئے، اُن کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستانِ عرب کو تنور بنا دیا۔ یہ سب کچھ کیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کے ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق و صداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے۔ اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لئے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔ حسّان بن ثابتؓ، عامر بن اکوعؓ، طفیل بن عمر، زید الجلیل، زیر قان، شماس، اسود بن سریع، کعب بن زہیر، عبداللہ بن رواحہؓ وغیرہ عرب کے مشہور زبان آور شاعر تھے مگر

---

[1] صحیح بخاری۔

قرآن مجید کے سامنے ان سب نے سرِ نیاز خم کیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی بزم شاعرہ کے ایک رکن تھے۔ اسلام کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ان سے چند اشعار کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا "جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آلِ عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں[1]۔"

انیس قبیلۂ غفار کے شاعر تھے۔ انہوں نے جب آنحضرتؐ کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آئے اور آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سن کر واپس گئے۔ ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیسا پایا؟ انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں اور کاہن ہیں۔ ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ اُن کی بولی نہیں۔ ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھ لیا ہے وہ شعر بھی نہیں ہے۔ خدا کی قسم محمدؐ سچے اور قریش جھوٹے ہیں[2]۔"

ضماد ازدی ایک صاحب تھے جو جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ وہ یہ سن کر کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (العوذ باللہ) دیوانے ہو گئے ہیں آپؐ کے علاج کے لئے آئے۔ آپؐ نے مختصر سی حمد اور کلمۂ شہادت پڑھا۔ وہ سُن کر متحیر رہ گئے۔ تین دفعہ پڑھوا کر سنا پھر کہا کہ خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی اور جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں۔ لیکن تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے۔ یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا[3]۔ جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل اور قریش کے دیگر اکابر جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ محمدؐ کی تحریک روز بروز پکڑتی جاتی ہے کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا چاہیئے جو جادو، کہانت اور شعر کہنا جانتا ہو تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ کیا ہے"۔ قریش کے مشہور سردار عتبہ بن ربیعہ نے کہا "میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ کہو تو میں جا کر دیکھوں"۔ چنانچہ آستانۂ نبویؐ میں آکر اس نے صلح کی کچھ شرائط پیش کیں۔ آنحضرتؐ نے اس کے جواب میں سورۂ فصلت (حٰمٓ السجدہ) پڑھنی شروع کی۔ کچھ ہی آیتیں پڑھی تھیں کہ اس نے آپؐ کے منہ پر ہاتھ

---

[1] استیعاب ابن عبدالبر ترجمہ لبید۔ [2] صحیح مسلم، اسلام ابی ذرؓ [3] صحیح مسلم، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ۔

رکھ دیا کہ قرابت کا واسطہ بس کرو۔ واپس پھرا تو چند روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ابوجہل نے جاکر کہا۔ "کیوں عتبہ! محمدؐ کے یہاں کھانا کھاکر پھسل گئے"۔ عتبہ نے کہا "تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں مجھ کو دولت کی طمع دامنگیر نہیں ہوسکتی۔ لیکن محمدؐ نے میرے جواب میں جو کلام پیش کیا وہ نہ شعر تھا، نہ کہانت تھی، نہ جادو۔ میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا۔ انہوں نے جو کلام پڑھا اس میں عذابِ الٰہی کی دھمکی تھی۔ میں نے ان کو قرابت کا واسطہ دیا کہ چپ ہو جائیں۔ میں ڈرا کہ تم پر عذاب نہ آجائے"۔ لوگوں نے کہا "محمدؐ نے اپنی زبان سے عتبہ پر جادو کر دیا"۔[1]

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولتمند اور صاحبِ اثر تھا۔ وہ ایک دفعہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنایئے۔ آپؐ نے چند آیتیں پڑھیں۔ اُس نے مکرر پڑھوا کر سنیں آخر بیخود ہوکر بولا "خدا کی قسم اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے۔ اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنہ بھاری ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں"۔[2]

بنوذہل بن شیبان کے سردار مفروق کے سامنے آپؐ نے چند آیتیں پڑھیں تو گو وہ مسلمان نہ ہوا مگر کلام الٰہی سے متاثر ہوا۔[3] نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جب سورۂ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"۔[4]

اس قسم کے اور بعض واقعات ابنِ اسحٰق نے سیرت میں نقل کئے ہیں۔ پہلی جلدوں میں پڑھ چکے ہو کہ لوگ کیونکر قرآن مجید کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا دل ایک سورہ

---

[1] کتاب التفسیر ابنِ مردویہ، مسند ابویعلی و سیرۃ ابنِ اسحاق۔ اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابنِ اسحاق میں ہے۔ [2] مصنف عبدالرزاق مستدرک حاکم جلد دوم میں یہ اور اوپر کا واقعہ دونوں مل جل گئے ہیں۔ [3] روض الانف شرح سیرۃ ابنِ ہشام جلد اوّل۔ [4] مسند ابنِ حنبل جلد اول و مستدرک حاکم جلد دوم۔

کی چند آیتیں پڑھ کر[1] اور سُن کر[2] پتھر سے موم ہوگیا۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ اسیرانِ بدر کو چھڑانے آئے تھے۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے سورۂ طور کی ایک دو آیتیں سُن لیں تو ان کا دل دھڑکنے لگا۔[3] حضرت عثمان بن مظعونؓ نے چند آیتیں سُن لیں تو فوراً حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔[4] حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن مجید کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو مسلمان ہوگئے۔[5] طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانیؓ نے آپؐ کو وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ پڑھتے سُنا تو گو وہ اُس وقت مسلمان نہ ہوئے مگر پوری سورۃ ان کے دل میں گھر کر گئی یعنی یاد ہوگئی۔[6] حبش سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت حاضرِ خدمت ہوئی۔ آپؐ نے ان کو قرآن مجید پڑھ کر سُنایا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔[7] حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت ارقم بن ارقمؓ یہ تینوں اصحاب اسی کی کششِ مقناطیسی سے کھنچ کر حلقۂ اسلام میں آئے۔[8] اور تو اور خود مہبطِ وحیؐ اور حاملِ کلامِ ربانیؐ کا کیا حال تھا؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک دفعہ قرأت شروع کی تو بے اختیار چشمِ مبارک سے آنسو جاری[9] ہوگئے۔ ایک اور موقع پر قرآن مجید کی چند آیتیں زبانِ مبارک سے ادا ہوئیں اور اس کے بعد آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔[10]

کلام کی یہ شیرینی، یہ نمکینی، یہ تاثیر، یہ تسخیر جو دوست و دشمن، موافق و مخالف، شاہ و گدا، عالم و جاہل، پیغمبر و امت سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہے، اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ حکماء، فلاسفہ، ادباء، اہلِ لغت، مُفسّرین، مُحدّثین، فُقہا، صوفیا، شعراء، مُتکلّمین غرض نوعِ انسانی

---

[1] ابن سعد جلد سوم حصہ اوّل۔ و ابو یعلیٰ و حاکم و بیہقی۔ [2] مسند ابن حنبل جلد اوّل۔ [3] صحیح بخاری: تفسیر سورۂ طور۔ [4] مسند ابن حنبل جلد اوّل۔ [5] استیعاب تذکرہ طفیل بن دوسیؓ۔ [6] مسند ابن حنبل جلد چہارم۔ [7] سیرۃ ابن ہشام۔ [8] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ۔ [9] صحیح بخاری: تفسیر فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ۔ [10] صحیح مسلم: باب بکاءہ صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ۔

کی وہ کونسی صنف ہے جس نے ایک اُمّی کی زبان سے ادا ہونے والے پیغام کے عشق و محبت میں اپنا سرمایۂ حیات قربان نہیں کر دیا اور جن کو اس کلام کی تشریح و تفصیل اور تحقیق و توضیح کی خدمات کی لذت میں دُنیا کی تمام نعمتیں ہیچ نظر آئیں۔ کیا یہ اعجاز نہیں؟

غور کیجئے کہ ایک اُمّی محض جو اُمّیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا، اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آیا۔ علوم و فنون اور تمدّن و تہذیب سے ایک عاری ملک، عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی جہاں اہلِ فکر اور اربابِ علم کا وجود نہ تھا۔ وہ خود، اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے آشنا نہ تھا۔ گذشتہ صحفِ انبیاءؑ اور افکارِ عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علماء اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اٹھائی۔ اصولِ قانون، مبادیٔ اخلاق، محاسنِ علم و عمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسۂ علم و حکمت کے سایۂ دیوار تک کبھی اس کا گذر نہیں ہوا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دورے پورے کرتا ہے کہ دفعتہً غارِ حرا کے ایک دہانے سے اجالا ہوتا ہے، علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا سرچشمہ اُبلتا ہے، ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، صحفِ انبیاءؑ اور افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کے پرتوِ صحبت سے اُمّی اور جاہل علمائے دہر اور دانشورانِ روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں۔ اصولِ قانون، مبادیٔ اخلاق اور محاسنِ علم و عمل کی تعلیم کا غُلغُلہ اس کی بزمِ فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے۔ کلامِ ربّانی کے پردہ میں علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں۔ اس سے زیادہ قرآن مجید کے معجز ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے!

توراۃ قانون و شریعت ہے، لیکن اخلاق و موعظت نہیں۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے

لیکن قانون و شریعت نہیں۔ زبور مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح علیہ السلام کے صحیفہ میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں۔ صحفِ بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائقِ حکمت اور اسرارِ ایمان و عمل سے خالی ہیں۔ دنیا میں ایک ہی کتابِ الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی، مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کُتبِ الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہارِ غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائقِ حکمت و اسرارِ ایمان و عمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اُس وقت جب اور کُتبِ الٰہی تحریف و تغییر اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک لفظ، ایک حرف، ایک نقطہ میں تغیّر و تبدّل نے راہ نہیں پائی۔ وہ اپنی زندگیٔ جاوید کے لئے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانہ کے صندوق ہیں اور وہ اُسی زبان اور اُن ہی الفاظ اور اُن ہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دستِ قدرت نے اُس کو ڈھالا تھا اور جبریل امینؑ نے اُس کو اُتارا تھا اور محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو اُمّت کے ہاتھوں میں سونپا تھا۔ کیا یہ اعجاز نہیں؟

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے اور اُس کی فصاحت و بلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں بن سکتیں کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں۔ چنانچہ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام و عبارت کے لحاظ سے معجز کہا ہے۔

چنانچہ اسی لئے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحیٔ موسوی (تورات) اور عیسوی (انجیل) نے ظہور کیا، مدّت ہوئی کہ دنیا اُن سے محروم ہوگئی۔ تورات کی اصل عبرانی زبان جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلی تھی وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہوگئی اور اس نے آرامی اور سریانی زبان کا قالب اختیار کرلیا اور آخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیر علیہ السلام نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا۔ انجیل کے متعلق ابھی تک یہی طے نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی؟ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین کے ملک میں بولتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور اس کے الفاظ کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف اس کے دُنیا میں "وحی محمدیؐ" سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے جس نے اِس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ قرآن مجید کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تحریف و تغییر سے پاک ہے۔ اس لئے اس کے الفاظ، کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔[1]

---

[1] یہاں مسئلۂ اعجاز القرآن پر بحث مقصود نہیں۔ یہ مباحث مفصّل آئندہ کسی جلد میں آئیں گے یہاں صرف سلسلۂ معجزات میں اس کا محض تذکرہ مقصود تھا۔

اُمیّت

یعنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک ہونا

الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (الاعراف، ۱۵۷)

(اَن پڑھ پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی)

یہ واقعہ محتاجِ بیان نہیں کہ آنحضرتؐ ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک تھے۔ قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ	یہ مسلمان وہ ہیں جو اَن پڑھ پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔
(الاعراف: ۱۵۷)	

اسی سورہ میں پھر اس کے بعد ہی ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ	تو لوگو! خدا پر اور اس کے اَن پڑھ پیغمبر اور فرستادہ پر ایمان لاؤ۔
(الاعراف: ۱۵۸)	

سورۂ جمعہ میں نہ صرف آپؐ کے اُمّی بلکہ اغلب آبادی کی حالت کے لحاظ سے تمام قریش اور عرب کے اُمّی ہونے کا اظہار ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (الجمعة: ۲)	اسی خدا نے اُمّیوں کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا۔

دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ (العنکبوت: ۴۸)	اور قرآن کے نزول سے پہلے (اے پیغمبر) تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اس کو لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحتِ الٰہی کا ایک خاص منشاء تھا، اسی لئے اس کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ (العنکبوت: ۵۰-۵۱)	اور معترضین کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانیاں کیوں نہیں اتریں کہدے کہ نشانیاں خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور میں تو صرف خدا سے ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان معترضین کو یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر (جو امّی ہے) کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں اس کا اظہار ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری زبان سے آج گذشتہ پیغمبروں، اگلی اُمتوں اور عہدِ ماضی کے واقعات ادا ہوتے ہیں۔ ان واقعات اور حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک،

یہ کہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو۔ دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے۔ تیسرا یہ کہ اوروں سے سُنے۔ آنحضرتؐ اطلاع کے ان تینوں ذرائع سے ناآشنا تھے۔ اول ذریعہ تو ظاہر ہے کہ مفقود تھا۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام سے مولدِ محمدیؐ تک کے تمام واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ واقعات آپؐ کی پیدائش سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے اور آپؐ کے پاس ان کے علم کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا۔ اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع مثلاً حضرت مریم علیہا السلام اور زکریا علیہ السلام کے قصہ میں کہا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ	یہ گذشتہ زمانہ کی خبروں میں سے ہے جس کو
اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ	ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں۔ تو اُن کے
يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ	پاس اُس وقت موجود نہ تھا جب وہ اپنا اپنا
مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ	پانسہ ڈال رہے تھے کہ کون مریمؑ کی کفالت
يَخْتَصِمُوْنَ ○	کرے گا اور نہ تو اُن کے پاس اُس وقت تھا
(آل عمران: ۴۴)	جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ	جب ہم نے موسیٰؑ کو اپنا فیصلہ دیا تو تو اُس
قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا	وقت مغربی گوشہ میں موجود نہ تھا۔ بلکہ ہم نے
كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ وَلٰكِنَّآ	صدیاں اس پر گذار دیں قومیں پیدا کیں جن کی
اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ	بڑی بڑی عمریں ہوئیں۔ اور نہ تو اہلِ مدین میں
الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ	قیام پذیر ہو کر آیاتِ الٰہی اُن کو پڑھ کر سناتا تھا۔
اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ	بلکہ ہم آئندہ تم کو بھیجنے والے تھے۔ اور نہ تو اس

وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ○ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

(القصص : ۴۴-۴۶)

وقت گوشۂ طور میں تھا جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی ہے۔ بلکہ اس قصہ کا علم تجھ کو جو حاصل ہو رہا ہے محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ

(یوسف : ۱۰۲)

یہ اُس گذشتہ زمانہ کے قصہ کا علم ہم تم کو اپنی وحی سے عطا کر رہے ہیں۔ تو اُس وقت اُن کے پاس موجود نہ تھا جب وہ باہم مشورہ سے بات کر رہے تھے۔

علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو۔ قرآن مجید نے اس کی بھی نفی کی:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ

(العنکبوت : ۴۸)

نہ تو تو اِس سے پہلے کوئی کتاب پڑھ کر سُناتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے تو اِس کو لکھ سکتا تھا۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ

(الشوریٰ : ۵۲)

تجھ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کس کو کہتے ہیں۔

تیسری صورت یہ تھی کہ دوسروں سے سُن کر یہ علم حاصل کیا جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ نبوّت سے پہلے آنحضرتؐ کی زندگی تمام تر مکہ معظمہ میں گذری۔ بجز اِس کے کہ چند مہینے بصریٰ وغیرہ کے سفرِ تجارت میں گذرے ہوں اور خود مکہ معظمہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا

اور نہ قریش کو اِن سے آگاہی تھی۔ اس لئے یہ ذریعۂ علم بھی ثابت نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے علی الاعلان کہا:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ	یہ گذشتہ زمانہ کی باتیں ہیں جن کی بذریعہ
اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ	وحی ہم تجھ کو تعلیم کرتے ہیں۔ تو خود اور
لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ	تیری قوم اس سے پہلے ان سے آگاہ
(ھود: ۴۹)	نہ تھی۔

آنحضرتؐ کی جو زندگی مکہ معظمہ میں گذری اور سفرِ تجارت میں قریش کے شامی قافلوں کے ساتھ جو زمانہ بسر ہوا اس کا ایک ایک واقعہ قریش کے سامنے تھا۔ جب آپؐ مکہ میں تھے تب بھی آپؐ قریش کے مجمع میں تھے۔ اور جب کبھی مکہ سے باہر گئے تو بھی قریش ہی کے جھرمٹ میں رہے۔ اس لئے آپؐ کی زندگی کا کوئی لمحہ ان سے مخفی نہ تھا۔ اگر آپؐ نے کوئی ظاہری تعلیم پائی ہوتی تو شاعر و مجنون و ساحر کی طرح وہ اس الزام کا اظہار بھی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بآواز بلند کہا:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ	کہدے کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو میں تم کو نہ
وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ	یہ قرآن پڑھ کر سناتا اور نہ خدا تم کو اس قرآن
فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا	سے آگاہ کرتا۔ اس سے پہلے میں مدتوں تم
تَعْقِلُوْنَ ○	میں رہ چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

(یونس: ۱۶)

قرآن مجید نے اُن تمام شکوک اور الزامات کو دہرایا ہے۔ اُن کو یہ شک تھا کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسرے سے سُن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کے اس اعتراض کو نقل کیا اور اُس کا جواب دیا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ○

(النحل: ۱۰۳)

اور ہم کو بہ تحقیق معلوم ہے کہ یہ کفار کہتے ہیں کہ محمد کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔ اُس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں، عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔

سورۂ فرقان میں چند آدمیوں کی شرکت کا شبہہ مذکور ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ○

(الفرقان: ۴)

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن من گھڑت چیز ہے جس کو محمد نے گھڑ لیا ہے اور اس افترا پردازی میں چند اور آدمی بھی شریک ہیں۔ وہ یقیناً غلط اور جھوٹ کہتے ہیں۔

یہ سب شُبہات کئے گئے مگر کفار نے کبھی یہ شبہہ نہیں ظاہر کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کی اُمّیت پر ان کو یقین تھا۔ مدینہ آکر یہودیوں سے معاملہ پڑا۔ روایات میں بکثرت اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ یہود آپؐ کے پاس آتے تھے اور آپؐ سے وہ سوالات کرتے تھے جو اُن کی کتابوں میں مذکور تھے اور کہتے تھے کہ اُن کے جواب پیغمبر ہی دے سکتا ہے۔ آنحضرتؐ اُن کے صحیح جوابات دیتے تھے اور وہ متحیّر رہ جاتے تھے۔ اِس واقعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو

پہنچتا ہے کہ یہود کو بھی یہ یقین تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امّیِ محض ہیں اور ہماری کتابوں کو نہ انہوں نے پڑھا ہے اور نہ پڑھ سکتے ہیں ورنہ اس جرأت کے ساتھ وہ اپنی کتابوں کے سوالات اُس شخص کے سامنے جس کی نسبت اُن کو معلوم ہوتا کہ وہ اُن کو پڑھ چکا ہے یا پڑھ سکتا ہے، نہ پیش کرتے اور نہ اُس کو حق و باطل کا معیار قرار دیتے۔

قریش کو جس شخص کی نسبت شبہہ تھا کہ وہ آنحضرتؐ کو سکھاتا ہے اس کے متعلق امام طبری نے تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی شخصیت اور نام کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا جو اپنی زبان میں کتبِ مقدسہ کبھی کبھی پڑھا کرتا تھا اور آپؐ راستہ چلتے اس کے پاس کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی پر کفار نے کہا کہ محمدؐ کو یہی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اس غلام کی اور جو کتابیں وہ پڑھا کرتا ہے اُن کی زبان عربی نہیں اور نہ وہ عربی جانتا ہے۔ اور آنحضرتؐ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اور خود قرآن کی زبان فصیح عربی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرتؐ غیر زبان کو سمجھ لیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں کلام کرے۔

آنحضرتؐ کے بچپن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپؐ کو آپؐ کے چچا ابو طالب اپنے ساتھ شام لئے جا رہے تھے۔ راستہ میں بُحیرا نام ایک راہب نے آپؐ کو دیکھا اور آثار سے پہچان لیا کہ آپؐ ہی پیغمبرِ آخر الزماں ہیں۔ چنانچہ اُس نے ابو طالب کو مشورہ دیا کہ ان کو مکہ واپس بھیج دو ورنہ یہود اگر دیکھ لیں گے تو قتل کر ڈالیں گے۔ اگرچہ یہ واقعہ جیسا

[illegible]

سے بڑا معجزہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کیا چاہیئے کہ ایک ابجد ناشناس طفلِ دوازدہ سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق و اسرارِ دین، نکاتِ اخلاق، مہماتِ قانون اور ایک شریعتِ عظمیٰ کی تکمیل و تاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لئے۔ کیا ہمارے عیسائی دوست اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی پیغمبرانہ زندگی پورے تیئیس برس تک قائم رہی۔ اگر آنحضرتؐ کسی انسانی معلم سے فیض پاتے رہتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانہ تک یا بڑی حد تک خلوت و جلوت میں آپؐ کے ساتھ رہتا کہ وقتِ ضرورت (نعوذ باللہ) آپؐ اس سے قرآن بنواتے، احکام و مواعظ سیکھتے، اسرار و نکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا کیونکہ جو شخص خود مدعیٔ نبوت کو تعلیم دے رہا ہو وہ کیونکر اس کی نبوت کو تسلیم کر سکتا تھا اور پھر اس شہرتِ عام، ذکرِ جمیل، رفعتِ مقام کو دیکھ کر جو مدعیٔ نبوت کو حاصل ہو رہی تھی وہ خود پردہ کے پیچھے گمنامی پسند کرتا اور صحابہ کرامؓ کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا۔ جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہہ تھا اگر حقیقت میں آپؐ اس سے تعلیم حاصل کیا کرتے تو قریش جو آپؐ کی تکذیب، تذلیل اور آپؐ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا ہو رہے تھے، اُن کے لئے آسان تھا کہ اِس غلام عجمی کو الگ کر دیتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعۃً درہم برہم ہو جاتا۔ علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ اس کا وجود مکہ میں تھا۔ پھر مدینہ میں تیرہ برس تک سینۂ نبوت سے فیضانِ الٰہی کا سرچشمہ کیونکر اُبلتا رہا۔ قرآن، شریعتِ اسلام اور احکام کا بڑا حصہ یہیں وحی ہوا ہے۔ مکہ میں تو نسبتہً بہت کم سورتیں نازل ہوئی ہیں۔

جب مدینہ منورہ میں اسلام کا چرچا پھیلا تو یہود و نصاریٰ نے اسلام کو بدنام اور بے اثر کرنے کی ایک تدبیر یہ سوچی کہ لوگ جھوٹ موٹ آکر پہلے مسلمان اور پھر چند روز کے بعد مرتد

ہو جائیں تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدنامی ہو اور لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچّا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا
اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ	ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح
اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ	کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝	جاؤ۔ شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی
(اٰل عمرٰن: ۷۲)	پھر جائیں۔

چنانچہ اسی سازش کے مطابق ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا اور سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھی۔ آنحضرتؐ نے کتابتِ وحی کی خدمت اُس کے سپرد کی۔ چند روز کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں نے محمدؐ کو جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ خدا نے اپنی نشانی ظاہر کی اور موت نے بہت جلد اس کی افترا پردازی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا[1] اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ نبوّت کا چشمہ اب بھی اسی طرح جوش زن ہے۔

صلحِ حدیبیہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان عہد نامہ مرتّب ہو رہا تھا۔ حضرت علیؓ عہد نامہ لکھ رہے تھے۔ عہد نامہ کی عبارت یہ تھی کہ "یہ وہ شرائط ہیں جن کو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور کیا"۔ قریش نے کہا "اگر ہم آپؐ کو خدا کا رسول مانتے تو اس لڑائی کی نوبت ہی کیوں آتی۔ اس لفظ کو مٹا کر اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھئے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو ایما فرمایا کہ ان کی حسبِ خواہش ترمیم کر دو۔ حضرت علیؓ نے کہا مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی آپؐ نے پوچھا وہ الفاظ کہاں ہیں؟ حضرت علیؓ نے انگلی رکھ کر بتایا تو آپؐ نے خود اپنے دستِ

---

[1] صحیح بخاری علامات النبوّۃ فی الاسلام۔

مبارک سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔ یہ واقعہ بخاری، مسلم، نسائی، مسند ابن حنبل اور تمام کتب سیر میں مذکور ہے۔ اسی کے ساتھ بخاری میں یہ تصریح ہے کہ ولیس یحسن یکتب اور مسند احمد میں بروایت اسرائیل یہ الفاظ ولیس یحسن ان یکتب یعنی آپؐ لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن باوجود اس کے تمام احادیث و سیر میں یہ ہے کہ "آپؐ نے محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھ دیئے۔" روایت کے ظاہری معنی سے بعضوں کو یہ شبہہ ہوا کہ آپؐ نے خود اپنے دستِ مبارک سے یہ الفاظ لکھے اور آپؐ نے شاید اخیر زمانہ میں لکھنا سیکھ لیا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے مجاہد کے واسطہ سے یہ روایت کی ہے کہ "آپؐ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک آپؐ کو لکھنا پڑھنا نہ آگیا" اور ایک اور روایت (بواسطہ یونس بن میسرہ عن ابی کبشۃ السلولی عن سہل بن الحنظلیہ) نقل کی ہے کہ آپؐ نے حضرت امیر معاویہؓ سے ایک فرمان لکھوا کر اقرع اور عیینہ کو عنایت فرمایا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا کہ معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہے۔ آپؐ نے اس پر ایک نظر ڈال کر فرمایا کہ "وہی لکھا ہے جو میں نے حکم دیا ہے۔"

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو یہ آنحضرتؐ کا ایک اور معجزہ ہوگا کہ انسانی تعلیم کے بغیر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ فن بھی اپنی بارگاہ سے عنایت کیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایتیں تمام تر موضوع یا نہایت ضعیف ہیں۔ اس لئے آپؐ کی اُمیّت کے متعلق جو متواتر روایتیں ہیں، اِن سے اُن کی تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ امّی سے امّی آدمی کے ہاں جب شب و روز لکھنے پڑھنے کا کام لگا رہے تو وہ کسی قدر حرف شناس ہو جائے۔ خصوصاً اپنے نام اور دستخط کو پہچان لینا اور ان کو لکیر کھینچ کر لکھ دینا تو معمولی بات ہے۔ لیکن اصل یہ

ؔ صحیح بخاری: باب عمرۃ القضاء۔

ہے کہ فاعل مجازی وحقیقی کی تفصیل میں راویوں سے مسامحت ہوتی ہے۔ عموماً سلاطین، امرا اور اکابر جو فرامین اور مراسلات لکھاتے ہیں، محاورۂ عام میں ان کو لکھنا ہی کہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے یہ فرمان لکھ کر دیا۔ شاہ جہاں نے جامع مسجد بنائی۔ فلاں بادشاہ نے یہ قلعہ تعمیر کیا۔ حالانکہ لکھنے والے، بنانے والے اور تعمیر کرنے والے کاتب اور معمار تھے۔ مگر چونکہ ان سلاطین کے حکم سے اور ان ہی کی طرف سے وہ لکھا یا بنایا گیا اس لئے بولنے والے خود سلاطین اور امراء کی طرف فعل کی نسبت کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی محاورہ کے مطابق اس موقع پر جب آنحضرتؐ نے سلاطینِ عالم کے نام دعوت نامے بھیجے ہیں تو وہاں عام طور پر یہ الفاظ ہیں وکتب الیٰ قیصر وکتب الیٰ کسریٰ (آپؐ نے قیصر کو یہ خط لکھا۔ کسریٰ کو یہ لکھا) مگر سب کو معلوم ہے کہ آپؐ نے دستِ خاص سے یہ خطوط لکھ کر نہیں بھیجے۔ مگر چونکہ آپؐ ہی نے لکھوائے تھے اس لئے ان کی نسبت آپؐ ہی کی طرف کی گئی۔ روزمرّہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے ادنیٰ طبقے جو نوشت و خواند سے عاری ہیں وہ اپنے اعزّہ اور احباب کو خط لکھاتے ہیں مگر کہنے والے اس کو یوں ہی کہتے ہیں کہ "اس نے خط میں لکھا ہے کہ میں آنے والا ہوں" حالانکہ وہ خود لکھنے والا نہیں اس نے دوسروں سے لکھایا ہے۔ مگر چونکہ لکھنے والے نے اپنا مدّعا نہیں لکھا بلکہ لکھانے والے کی زبان سے اس کا مدّعا ظاہر کیا ہے اس لئے اسی کی طرف فعل کی نسبت کر دی گئی۔ قرآنِ پاک نے آپؐ کو بار بار اور برملا امّی کہا ہے۔ اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہیئے؟ لیکن آپؐ امّی ہو کر، اُمّیوں میں پل کر، کتب سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی سب کچھ جانتے تھے۔ اور یہ آپؐ کا معجزہ تھا۔ کفّار کو خطاب کر کے قرآن کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کی یہ دلیل کافی

نہیں کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہو کر بھی وہ کچھ جانتا ہے جس کی علمائے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں:

اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ○ اَوَلَمْ	یہ باتیں گذشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں
یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا	ہیں۔ کیا ان کافروں کے لئے یہ نشانی نہیں
بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ○	کہ ان باتوں کو (جو ایک امی کی زبان سے ادا
(الشعراء : ۱۹۶-۱۹۷)	ہو رہی ہیں) بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں۔

ذاتِ نبویؐ کی حفاظت

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدۃ: ۶۷)

(اور اللہ ان لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا)

انبیائے کرامؑ جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ دنیا کی جہالت وظلمت، جور وستم، گناہ ومعصیت کے خلاف اپنا جہاد شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں انسان ان کے دشمن بلکہ ان کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اس تنہائی وبیکسی کے عالم میں جس سے ہر مصلح کو آغازِ دعوت میں دوچار ہونا پڑتا ہے، صرف اسی قادر وتوانا کا ہاتھ ہوتا ہے جو ان کی تسکین ونصرت کا سہارا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی بارگاہ میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام رومیوں اور یہودیوں کی عدالت میں ایک ہی گناہ کے مجرم تھے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغام کی بقا وقیام کا جس کے لئے وہ پیغمبر کو مبعوث کرتا ہے، خود ذمہ دار ہوتا ہے اس لئے اس بیکسی وبیچارگی کے عالم میں اس کی زندگی کا وہی محافظ اور نگہبان بن جاتا ہے کہ وہ بے خوف وخطر اپنے فرائض کو انجام دے سکے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کو شروع ہی میں تسکین دے دی گئی تھی:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (الطور: ۴۸)

اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے بیٹھا رہ کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ آنحضرتؐ نے جب دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کا بچہ بچہ آپؐ کا دشمن ہوگیا۔ آپؐ کو طرح طرح کے آزار پہنچائے گئے۔ آپؐ کے خلاف سیکڑوں منصوبے باندھے گئے۔ آپؐ کے قتل کی سازشیں ہوئیں۔ تلواریں زہر میں بجھا کر رکھی گئیں۔ سوتے میں آپؐ کے قتل کا ارادہ کیا گیا۔ میدانِ جنگ میں آپؐ پر نرغہ کیا گیا۔ کمین گاہوں سے آپؐ پر حملے کئے گئے۔ غفلت میں آپؐ کے سر پر پتھر گرانے کی تدبیر سوچی گئی۔ کھانے میں زہر دیا گیا مگر ہر موقع پر یہ ظاہر ہوا کہ ع

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

اور قرآن مجید کا یہ اعلان صحیح ثابت ہوا:

اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ	تیرے پروردگار نے لوگوں کو گھیر رکھا ہے
(بنی اسرائیل: ۶۰)	کہ تجھ پر دسترس پائیں۔

یہ خود ایک مستقل معجزہ ہے کہ ان ہنگاموں، فتنوں اور سازشوں کے عالم میں خصوصاً عرب کے ملک میں جہاں اقتدارِ حکومت یا نظامِ امن کا نام و نشان تک نہ تھا کیونکر آپؐ نے بحفاظتِ تمام اپنے فرض کو انجام تک پہنچایا۔

قریش کی مجلسیں اکثر خانۂ کعبہ میں منعقد ہوا کرتی تھیں اور اکثر وہیں ان کی نشست و برخاست رہا کرتی تھی۔ تاہم آنحضرتؐ نماز اور طواف کے لئے بے خوف و خطر وہیں تشریف لے جایا کرتے اور برملا ان کے دیوتاؤں اور بتوں کی برائیاں بیان کیا کرتے تھے۔ آخر قریش نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ نعوذ باللہ آپؐ کا خاتمہ کر دیں۔ یہ خبر آپؐ تک پہنچتی ہے۔ مگر اس سے آپؐ کے ارادہ میں کسی قسم کا دہن یا ضعف نہیں پیدا ہوتا۔ ایک دن قریش نے یہ طے کیا کہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے۔ اتفاق سے کفار کی یہ تقریر حضرت فاطمہؓ سن لیتی ہیں، وہ

روتی ہوئی باپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں۔ آپؐ تسلی دیتے ہیں اور وضو کر کے حرم کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں۔ دشمنوں کی نگاہیں آپؐ پر پڑتی ہیں تو وہی نگاہیں جو اب تک خون آشامی کے لئے تیار تھیں دفعتہً سرنگوں ہو جاتی ہیں[1]۔ حاکم میں ہے کہ اِس کے بعد آپؐ نے چند کنکریاں اٹھا کر ماریں۔ جن جن کو یہ کنکریاں جا کر لگیں وہ بدر میں مارے گئے۔

ایک دفعہ ابوجہل نے ارادہ کیا کہ اگر اب وہ آپؐ کو سجدہ میں دیکھے گا تو آپؐ کی پیشانی کو رگڑ دے گا۔ جب وہ اس ارادہ سے آگے بڑھا تو جھجک کر پیچھے لوٹ گیا۔ لوگوں نے دریافت کیا تو اس نے کہا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی خندق حائل ہے اور چند پردار ہستیاں کھڑی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے اڑا دیتے[2]۔

معلوم ہے کہ جس شب کو آپؐ نے ہجرت کا ارادہ کیا ہے قریش کے تمام خاندانوں نے مل کر آپؐ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قریش کے بہادر رات بھر خانۂ اقدس کا پہرہ دے رہے تھے تاہم آپؐ ان کے سامنے سے نکلے۔ زبانِ مبارک پر یہ آیت پاک تھی:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا	اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے
وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ	دیواریں کھڑی کر دیں (ان کی آنکھوں پر)
فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ○	پردہ ڈال دیا کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

(یٰسٓ: ۹)

پہرہ داروں کی آنکھوں پر قدرت نے مہر لگا دی اور آنحضرتؐ اُن کے درمیان سے نکل کر

---

[1] مستدرک حاکم جلد اول، مسند ابنِ حنبل جلد اوّل۔

[2] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ۔

چلے گئے۔ صبح ہوئی تو دشمن آپؐ کے تعاقب میں اُس غار تک پہنچ گئے جہاں آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ جاکر چھپے تھے۔ وہ اس غار کے دہانہ تک پہنچ گئے اور اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو ان مقدس پناہ گزینوں پر ان کی نظر پڑ جاتی۔ مگر خدا نے ان کی عقل اور دور اندیشی کے نور کو بجھا دیا کہ نیچے جھک کر دیکھنے کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آیا۔

کفار نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر لائے گا یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا، اس کو سو اونٹ انعام میں ملیں گے۔ یہ سن کر سراقہ بن جعشم اپنے اسپِ راہوار پر سوار ہو کر آپؐ کے تعاقب میں روانہ ہوا اور دمبدم اس مختصر قافلہ کے قریب ہو رہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ پر بمقتضائے بشری اضطراب طاری تھا۔ مگر آنحضرتؐ کی سکینتِ خاطر میں کوئی فرق نہ آیا۔ آپؐ نے دعا کی۔ تین دفعہ اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس دھنس گئے۔ اس نے فال کے تیر نکال کر دیکھے تو ہر دفعہ نفی میں جواب آیا۔ بالآخر اس کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور ہی راز ہے اور ذاتِ محمدیؐ ہماری گرفت سے باہر ہے۔ اس نے اپنے ارادۂ فاسد سے توبہ کی اور آنحضرتؐ سے ایک خطِ امان لے کر واپس پھر گیا[1] اور بعد کو مسلمان ہو گیا۔

شروع شروع میں جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو صحابہؓ جان نثاری کی بنا پر راتوں کو آپؐ کے گرد پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک رات صحابہؓ آپؐ کے خیمہ کے گرد پہرہ دے رہے تھے کہ آیت نازل ہوئی:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدۃ: ۶۷) — اور اللہ ان لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

آپؐ نے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکالا اور پہرہ والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ "لوگو! واپس

---

[1] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

جاؤ، خدا نے میری حفاظت کا فرض خود اپنے ذمہ لے لیا ہے[1]"، یہ وعدۂ حفاظت ہزارہا مشکلات اور خطرات کے باوجود بھی پورا ہوتا رہا۔ غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ چلے تھے اور ذاتِ مبارک دشمنوں کے نرغہ میں تھی اور آپؐ پر تیغ و تبر و سنگ کی بارش ہو رہی تھی، لیکن دو سپید پوش فرشتے آپؐ کے پاس کھڑے ہوئے آپؐ کی حفاظت کا فرض انجام دے رہے تھے[2]۔

ایک دفعہ ایک شخص کو لوگ گرفتار کر لائے اور عرض کی کہ یہ حضور کے قتل کی گھات میں تھا۔ فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو کہ اگر یہ مجھ کو قتل کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سے خیبر میں جب ایک یہودیہ نے گوشت میں زہر ملا کر پیش کیا، تو آپؐ نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ فرمایا "یہ گوشت نہ کھاؤ کیونکہ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس میں زہر ملا ہے"۔ یہودیہ کو بلا کر جب واقعہ کی تحقیق کی اور اُس نے اپنی نیتِ فاسد کا اقرار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "خدا تجھ کو اس پر قابو نہ دیتا"[3]۔

---

[1] جامع ترمذی: تفسیر سورہ مائدہ۔ [2] صحیح بخاری غزوۂ اُحد و صحیح مسلم کتاب الفضائل۔ [3] صحیح مسلم: باب السم۔

لیلۃ الجنّ

جنّوں کی انقلابِ آسمانی کی تلاش اور ان کا مشرف باسلام ہونا

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِنَ الْجِنِّ (سورۂ جن)

مخلوقات الٰہی کی تعداد اور اصناف کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ۔ (مدثر) اور تیرے رب کی فوجوں کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔

مخلوقاتِ الٰہی کی ایک صنف کا نام جن ہے، اہل لغت کہتے ہیں کہ عربی میں جن کا لفظ جن سے مشتق ہے، جس کے معنی "چھپنے" اور "چھپانے" کے ہیں، چونکہ یہ مخلوق انسانوں کی آنکھوں سے عموماً مستور رہتی ہے، اس لیے اس کو جن کہتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں یا اسی کے قریب قریب مختلف قوموں کی زبانوں میں پایا جاتا ہے، فرنچ میں "جنّی" (Genee) اور انگریزی میں (Genei) اسی مفہوم میں ہے جس میں عربی میں جنی (دیو، بھوت، پلیت) ہے لاطینی میں جینیوس (Genius) اور جینی (Genii) وہ مفہوم رکھتا ہے۔ جو ہمارے ہاں ہمزاد کا۔ اور روح نوعی کے معنی میں بھی یہ لفظ رومی اساطیر (میتھالوجی) میں مستعمل ہوا ہے، فارسی میں "جان" کے معنی مطلق "روح" کے ہیں، بہرحال دُنیا کی قوموں میں

یہ اعتقاد کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہا ہے کہ انسانوں کے سوا اس سطحِ ارضی پر ایک اور غیر مرئی مخلوق بھی موجود ہے۔ یورپ کے موجودہ دورِ الحاد میں ارواح سے نامہ و پیام اور ان کے عمل و تسخیر کے کارنامے بڑے بڑے فلسفیوں اور مادہ پرستوں کو آئینۂ حیرت بنائے ہوئے ہیں اور روز بروز ان کے انکار اور شک کی جرأت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلام کے علاوہ دوسری مسلم مذہبی کتابوں میں بھی جن اور شیطان کے تذکرے موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات جو موجودہ انجیل میں مذکور ہیں ان کی بڑی تعداد انسانوں اور حیوانوں کی ان کے پنجۂ ظلم سے رہائی ہے۔

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ان کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی ہے اور آگ سے بنائے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ (الحجر: ۲۶-۲۷)	اور ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔ اور جنوں کو اس سے پہلے لُو کی آگ سے پیدا کیا۔
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ (الرحمٰن: ۱۵)	اور اس نے جنوں کو آگ کی لَو سے پیدا کیا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں جنات کا بڑا تسلط تھا۔ ان کی پوجا کی جاتی تھی[1]۔ ان کی دہائی مانگی جاتی تھی۔ بت خانوں میں جو عامل اور کاہن ہوتے تھے ان سے اُن کی دوستی ہوتی تھی

---

[1] صحیح مسلم: باب التفسیر۔

اور وہ اُن کو غیب کی خبریں بتایا کرتے تھے۔ بچّوں کے سرہانے استرے رکھے جاتے تھے کہ ان سے جنّات بھاگ جاتے ہیں۔ یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ وہ صورتیں بدل بدل کر لوگوں میں پھرتے ہیں اور ان کو ستاتے ہیں۔ خدا کے کارخانۂ قدرت میں بھی ان کے استیلاء اور تصرّف کو دخل تھا۔ وہ جنگلوں میں انسانوں کو مار ڈالتے تھے۔ راستوں سے اٹھالے جاتے تھے۔ لوگوں کو بیمار ڈال دیتے تھے۔ ان کے ہوش و حواس کے خزانہ پر قبضہ کر لیتے تھے۔ غرض جس طرح خدائی الوہیت میں عرب کے بہت سے دیوتا اور دیبیان شریک تھیں اسی طرح یہ جنّات بھی شریک تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ	اور ان مشرکوں نے جنّوں کو خدا کا شریک
(الانعام : ۱۰۰)	بنایا ہے۔
وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ	اور ان مشرکوں نے خدا اور جنّوں کے
(الصّٰفّٰت : ۱۵۸)	درمیان رشتے قائم کر رکھے ہیں۔
بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ○	(خدا قیامت میں ان سے کہے گا) بلکہ یہ لوگ جنّوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں اکثر لوگ ان ہی کے معتقد تھے۔
(سبا : ۴۱)	

اسلام آیا تو اس نے ان اعتقاداتِ باطلہ کے تار و پود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اس نے دنیا میں صرف ایک ہی قوّت کی تعلیم دی اور وہ خدا کی تھی۔ اس نے بتایا کہ جنّات بھی اس کے حضور میں ویسے ہی عاجز اور درماندہ ہیں جیسے انسان۔ وہ بھی اسی طرح اس کی مخلوق ہیں جیسی اس کی دوسری مخلوقات۔ ان میں لوگ اسی طرح اچھے اور بُرے، کافر و مومن، سعید اور شقی ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں۔ وہ بھی توحید و رسالت اور احکامِ الٰہی کے ماننے کے ویسے

ہی مکلّف ہیں جیسے عام انسان :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○

(الذّٰریٰت : ۵۶)

اور میں نے جنّ اور انس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

قیامت میں دونوں سے سوال ہوگا :

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيَاتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ

(الانعام : ۱۳۰)

اے جن اور انس کی جماعت! کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر تمہارے پاس نہیں آئے اور وہ تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر نہیں سناتے تھے اور اِس دن کے آنے سے نہیں ڈراتے تھے۔

قرآن کے تحدّی کے جواب سے دونوں عاجز ہیں :

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ

(بنی اسرائیل : ۸۸)

کہدو کہ اگر انس و جنّ دونوں مل کر چاہیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو ان کے لئے یہ ناممکن ہے۔

خدا کی قدرت اور طاقت کے سامنے دونوں لاچار اور درماندہ ہیں :

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ

اے جنّ وانس! اگر آسمان وزمین کی حدود سے نکل کر باہر جا سکتے ہو تو نکل جاؤ۔ لیکن خدا کی قدرتِ قاہرہ

لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ ○ — کے بغیر تم نکل نہیں سکتے۔

(الرحمٰن : ۳۳)

کاہنوں اور عاملوں کو جو غیب کی بعض بعض باتیں معلوم ہو جاتی ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اپنے ملاءِ اعلیٰ میں اس کا ذکر کرتا ہے ملاءِ اعلیٰ والے اپنے نیچے کے فرشتوں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس طرح درجہ بدرجہ ہر آسمان کے فرشتوں کو علم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ آخری آسمان تک بات پہنچ جاتی ہے جہاں سے نیچے دنیا کی حد شروع ہوتی ہے۔ یہاں جنات و شیاطین سُن گن لینے کے لئے اِدھر اُدھر چھپے رہتے ہیں۔ ایک دو لفظ انہوں نے سن لئے اور ان میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر کاہنوں اور عاملوں سے کہہ دیتے ہیں۔ وہ اس کو انسانوں میں مشتہر کرتے ہیں[1]۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان میں بے شمار ستاروں کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں کہ ایک تو اُن سے آسمان کی زیبائش و آرائش ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ جنات اور شیاطین اپنی سرحد سے آگے بڑھ کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتے ہیں تو فوراً ایک چمکتا ہوا تارا (شہابِ ثاقب) ٹوٹ کر اُن پر گرتا ہے۔ مختلف سورتوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا	اور ہم نے آسمان میں بُرج بنائے ہیں اور ان ستاروں
وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ○ وَحَفِظْنٰهَا	کو دیکھنے والوں کے لئے زینت و آرائش بنایا ہے اور
مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ○ اِلَّا مَنِ	ہر راندۂ درگاہ شیطان سے اُس کو محفوظ رکھا ہے۔
اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ	لیکن اتنا ہے کہ وہ چوری چھپے کچھ سُن لے تو ایک چمکتا
مُّبِيْنٌ ○ (الحجر : ۱۶-۱۸)	ستارہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: تفسیر سورۂ حجر و تفسیر سورۂ نساء و بدء الخلق وغیرہ۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ
ٱلْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ
شَيْطَٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُونَ
إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ مِنْ
كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ
وَاصِبٌ ۝ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ
فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

(الصّٰفّٰت : ۶-۱۰)

ہم نے آسمانِ زیریں کو ستاروں کی آرائش سے
مزیّن کیا ہے اور ان کو ہر سرکش شیطان کا نگہبان
بنایا ہے۔ وہ ملاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے
وہ ہر طرف سے پھینک کر مارے جاتے
ہیں اور یہ ان کے لئے لازمی سزا ہے
(اس طرح وہ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے)۔
لیکن یہ کہ کوئی اچک کر سن لے تو ایک دہکتا
ہوا ستارہ اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا
بِمَصَٰبِيحَ وَجَعَلْنَٰهَا رُجُومًا
لِّلشَّيَٰطِينِ ۝

(الملك : ۵)

ہم نے آسمانِ زیریں کو ستاروں کے چراغوں
سے مزیّن کیا ہے اور ان کو شیطانوں
کے لئے پھینک کر مارنے کی ایک چیز
بنایا ہے۔

وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَٰبِيحَ
وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ
الْعَلِيمِ ۝

(حٰمٓ السجدة : ۱۲)

اور ہم نے آسمانِ زیریں کو ستاروں کے
چراغوں سے مزیّن کیا ہے اور ان کو نگہبان
بنایا ہے یہ غالب و دانا خدا کی
تقدیر ہے۔

دنیا میں اُس سلسلۂ نبوّت کا جو آغازِ آفرینش سے جاری تھا اور دینِ الٰہی کا ہزاروں منزلوں کے طے ہونے کے بعد تکمیل کی منزل میں پہنچ جانا اور نوعِ انسان کو خدا کی وہ آخری شریعت سپرد ہونا جس کے بعد خاکدانِ عالم کو وحی و نبوّت کے کسی اور حامل کی ضرورت نہ ہوگی

ایک ایسا واقعہ تھا جس نے آب وخاک کے عالم میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اُس نے سطحِ زمین کے ہزاروں پیغمبروں کے دین و ملت کو منسوخ کر دیا۔ ان کی آسمانی کتابوں کے احکام و رسوم کو بدل دیا۔ ملکوں کی شہنشاہیاں ہل گئیں۔ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ گئے۔ صومعۂ و کلیسا ویران ہو گئے۔ اسی طرح مملکتِ فلکی اور آسمانی بادشاہی میں بھی انقلاب کا ظاہر ہونا ضرور تھا۔ آسمانی مخلوقات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہوا مگر اس کو وہی دیکھ سکے جو دیکھ سکتے تھے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے موقع پر بھی ایک نئے نورانی ستارہ کے ظہور کی خبر ہے جس کو دیکھ کر دوسرے ملک کے لوگ ان کی تلاش میں بیت الحم پہنچے اور ان کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ مگر بنی اسرائیل کو آخر تک اس بینائی سے محرومی رہی۔

صحیحین میں ہے کہ جب آنحضرتؐ نبوت سے سرفراز ہوئے تو ستاروں کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ جن اور شیاطین اب اوپر چڑھنے سے روک دیئے گئے۔ ٹوٹنے والے ستاروں کی بھرمار ہو گئی۔ کاہنوں اور عاملوں کی خبر رسانی کے ذرائع مسدود ہو گئے اور ان باطل پرستیوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اس آسمانی انقلاب نے جنوں اور شیطانوں کی محفلوں میں حیرت پیدا کر دی۔ سب نے کہا یقیناً روئے زمین پر کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے۔ دنیا کی ہر سمت کو انہوں نے چھان ڈالا۔ اس پر چند سال گذر گئے۔ آنحضرتؐ اسلام کی تبلیغ کے لئے قبائل میں دورے کر رہے تھے اور اسی تقریب سے عکاظ کے میلہ میں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں رات کے وقت مقام نخلہ میں قیام ہوا۔ صبح کے وقت حضور انورؐ اپنے رفقاء کے ساتھ نماز میں مصروف تھے اور قرآن مجید کی آیتیں جہر کے ساتھ تلاوت فرما رہے تھے کہ اتفاق سے جنوں کی ایک جماعت کا، جو تفتیشِ حال کے لئے تہامہ کی طرف آئی تھی، اس مقام پر گذر ہوا۔ اُس نے جب قرآن مجید کی آیتیں سُنیں تو یکبارگی پکار اٹھی کہ یہی وہ نورِ حق ہے جو درخشاں ستاروں میں ہمیں

نظر آتا ہے۔ وہ لوٹ کر اپنی قوم میں گئی اور اُن کو جا کر خاتم نبوت کے ظہور کی بشارت[1] سنائی:

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ	اے پیغمبر! لوگوں سے کہدو کہ مجھ کو بذریعہ وحی
الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا	خبر دی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن کو
عَجَبًا ۙ یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ	سُنا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب وغریب
فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ	کتابِ الٰہی سُنی، جو ہدایت کی طرف رہنمائی
اَحَدًا ۙ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا	کرتی ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب
مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۙ	ہم ہرگز خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔
وَّاَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَی اللّٰهِ	خداوند تعالیٰ کی نہ تو کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی
شَطَطًا ۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ	لڑکا ہے۔ ہم میں سے کچھ بیوقوف خدا پر بہت
تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَی اللّٰهِ	دور از عقل الزام قائم کرتے تھے۔ ہم سمجھتے
كَذِبًا ۙ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ	تھے کہ کوئی انسان یا جن خدا پر جھوٹ الزام نہیں
الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ	قائم کر سکتا۔ انسانوں میں کچھ ایسے لوگ تھے
فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۙ وَّاَنَّهُمْ	جو بعض جنوں کی پناہ مانگا کرتے تھے تو ان ہی نے
ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ	اُن کو اور زیادہ گمراہ کر دیا۔ انسان بھی ہماری ہی
اللّٰهُ اَحَدًا ۙ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ	طرح یہ سمجھتے تھے کہ اب خدا کوئی پیغمبر نہ بھیجے گا۔
فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا	ہم نے آسمان کو خوب ٹٹولا تو ہم نے پایا کہ
وَّشُهُبًا ۙ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا	وہ نگہبانوں سے اور ٹوٹنے والے تاروں سے بھرا ہوا ہے

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب الجہر فی الصبح میں ہے اور امام بخاری نے مختلف ابواب میں اس واقعہ کو درج کیا ہے مثلاً تفسیر سورۂ جن و باب الجہر بقرأۃ صلوٰۃ الفجر و مسند ابن حنبل روایت ابن عباس جلد اوّل و صحیح ترمذی تفسیر سورۂ جن۔

مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ
الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ
وَّ اَنَّا لَا نَدْرِيْۤ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ
فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ
رَشَدًا ۙ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ
وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ
قِدَدًا ۙ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ
اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ
هَرَبًا ۙ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى
اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ
فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ؕ
وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا
الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ
تَحَرَّوْا رَشَدًا ۙ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ
فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ

(الجن : ۱ — ۱۵)

ہم پہلے اِس آسمان کی بعض نشست گاہوں
میں سننے کو بیٹھ جاتے تھے، اب جو کوئی سننے
جاتا ہے تو اپنی تاک میں ٹوٹنے والے ستارہ کو پاتا
ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ اِس انقلاب سے زمین والوں کے
ساتھ کسی بُرائی کا ارادہ کیا جا رہا ہے یا اُن کا پروردگار
اُن کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ ہم میں اچھے بھی
ہیں اور اُن کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں۔ ہم جدا جدا
راستوں پر تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ ہم خدا کو اس زمین
میں عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اس کے
قبضہ سے نکل سکتے۔ اور اب جب ہم نے اِس ہدایت
کی بات کو سن لیا تو اب ہم اِس پر ایمان لاتے ہیں۔ تو
جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے، تو پھر
گھاٹے ٹوٹے کا اُس کو ڈر نہیں رہتا۔ ہم میں کچھ اطاعت
گذار ہیں، کچھ گنہگار ہیں۔ تو جو اطاعت گذار ہیں انہی
نے حقیقت میں ہدایت کا راستہ ڈھونڈھ نکالا ہے
اور جو گنہگار ہیں وہ جہنم کے ایندھن ہیں۔

پھر سورہ احقاف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ
الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا

ہم نے جب جنوں کی ایک جماعت کے رُخ کو اے
پیغمبر! تیری طرف پھیر دیا کہ وہ قرآن کو سنیں تو

حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا
قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○
قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا
اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ
وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ يٰقَوْمَنَآ
اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ
يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ
مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

(الاحقاف: ۲۹-۳۱)

جب وہ آئے تو انھوں نے ایک دوسرے
سے کہا چپ رہو۔ جب قرآن ختم ہو گیا تو وہ اپنی
قوم کے پاس گئے کہ انہیں خبردار کریں۔ انہوں نے
جاکر کہا بھائیو! ہم نے ایک شریعت کی کتاب
کو سُنا جو موسیٰؑ کے بعد اتاری گئی ہے اور اس کے پہلے
جو کتابِ الٰہی آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور
سچائی اور سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ اے بھائیو!
خدا کے پکارنے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان
لاؤ تاکہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے اور
دردناک عذاب سے تم کو پناہ دے۔

صحیح مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں نے دو دفعہ آنحضرتؐ کو کلام مجید پڑھتے سُنا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ دونوں سورتیں الگ الگ واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہوں۔ پہلے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شریک نہ تھے[1] اور آنحضرتؐ نے اور نہ کسی صحابیؓ نے ان جنوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔[2] بلکہ آنحضرت کو اس کی اطلاع ایک درخت نے کی[3] اور تفصیلی کیفیت وحیٔ آسمانی سے معلوم ہوئی۔ اسی واقعہ کو واقعہ لیلۃ الجن (جن کی رات) کہتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں واقعے مکہ معظمہ ہی میں گذرے ہیں۔ صحیح مسلم[4]، ترمذی[5] اور مسند طیالسی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کے شاگردِ خاص علقمہ نے پوچھا کہ آپ صاحبوں میں سے کوئی لیلۃ الجن میں آنحضرتؐ

---

[1] صحیح مسلم: باب الجہر بقراۃ الصبح۔ [2] صحیح بخاری و مسلم: باب الجہر بقراۃ الصبح و مسند احمد جلد اوّل۔ [3] صحیح مسلم: باب الجہر بقراۃ الصبح۔ [4] صحیح مسلم: باب الجہر بقراۃ الصبح۔ [5] ترمذی تفسیر سورۂ احقاف۔

کے ساتھ تھا؟ انہوں نے کہا "نہیں۔ لیکن ایک اور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ شب کو ہم لوگوں نے آنحضرتؐ کو نہیں پایا۔ میدانوں اور گھاٹیوں میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر آپؐ نہیں ملے۔ ہم لوگوں کو طرح طرح کے خیال آنے لگے کہ آپؐ کو کوئی اٹھا لے گیا یا دھوکے سے کسی نے قتل کر دیا۔ سخت اضطراب اور قلق میں ہم نے یہ رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپؐ غارِ حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں۔ ہم سب نے عرض کی کہ "یارسول اللہؐ! ہم نے شب کو ہر جگہ آپؐ کو ڈھونڈا مگر آپؐ کہیں نہیں ملے ہم نے سخت اضطراب اور قلق میں رات بسر کی"۔ فرمایا کہ "رات کو جنوں کا قاصد آیا تھا میں اس کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا"۔ اس کے بعد آپؐ ہم سب کو لے کر اس مقام پر تشریف لے گئے اور وہاں ان کے قیام اور آگ جلانے کے نشانات دکھائے اور فرمایا کہ انہوں نے مجھ سے زادِ راہ کی خواہش کی۔ میں نے ان کے لئے دعا کی کہ وہ جس ہڈی اور گوبر پر گذریں ان کے لئے وہ کھانا ہو جائے۔[1]

مسند ابنِ حنبل کے زیادات میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی جنوں کی آمد کا ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ مکہ میں رات کے وقت ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ یکایک آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلے لیکن وہ نہ چلے جس کے دل میں ذرا سا بھی کھوٹ ہو۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں پانی کا لوٹا لے کر آپؐ کے ساتھ ہو لیا۔ آپؐ مجھے ساتھ لئے ہوئے مکہ کے آگے پہنچے۔ وہاں مجھ کو کچھ پرچھائیاں ایک جگہ اکٹھی نظر آئیں۔ آپؐ نے ایک خط کھینچ دیا اور فرمایا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں کھڑے رہو۔ یہ کہہ کر آنحضرتؐ آگے بڑھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ پرچھائیاں آپؐ کی طرف چلیں۔ آپؐ اُن کے ساتھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب فجر کا اُجالا ہوا تو آپؐ میرے پاس آئے

---

[1] صحیح مسلم: باب الجہر بقراۃ الصبح و صحیح بخاری: باب ذکر الجن فی المبعث صحیح بخاری و مسلم و ترمذی: باب الاستنجاء۔

اور وضو کا پانی مانگا۔ میں نے دیکھا تو وہ پانی کے بجائے کھجور کا شربت (نبیذ) تھا۔ آپؐ نے فرمایا اس میں کیا ہرج ہے۔ کھجور بھی پاک ہے اور پانی بھی پاک ہے۔ یہ کہہ کر آپؐ نے اُسی سے وضو کیا۔ اس کے بعد نماز کو کھڑے ہوئے تو ان میں سے دو آدمی پاس آکر کہنے لگے کہ یا رسول اللہؐ! ہم بھی آپؐ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا یہ شہر نصیبین کے جن تھے۔ اپنے کچھ معاملات میرے پاس فیصلہ کے لئے لائے تھے۔ انہوں نے مجھ سے توشہ مانگا تو میں نے دے دیا۔ عرض کی "یا رسول اللہؐ! کیا آپؐ کے ساتھ کوئی توشہ کا سامان تھا؟" فرمایا "میں نے انہیں گوبر اور ہڈی کا توشہ دے دیا ہے۔ گوبر ان کے لئے جَو اور ہڈی پُر گوشت ہو جائے گی"۔ اسی موقع پر آپؐ نے گوبر اور ہڈی سے استنجاء منع فرمایا۔[1]

زیاداتِ مسند اور صحیح مسلم کی دونوں روایتیں کیا ایک ہی واقعہ کی دو تفصیلیں ہیں؟ مگر ان دونوں روایتوں کے جزئیات میں اس قدر فرق ہے کہ وہ یقیناً ایک نہیں ہو سکتیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیاداتِ مسند کی روایت بالکل لغو اور بے سروپا ہے۔ اس روایت کا سلسلۂ سند یہ ہے عن ابی فزارۃ عن ابی زید مولی عمرو بن الحریث المخزومی عن عبد اللہ بن مسعودؓ۔ اس میں ابو زید مولیٰ عمرو بن حریث ایک مجہول راوی ہے۔ جس سے محدثین میں کوئی واقف نہیں۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

ابو زید مولیٰ عمرو بن حریث	ابو زید غلام عمرو بن حریث اس کو کوئی جانتا
لا یعرف عن ابن مسعود وعنہ	نہیں۔ اس نے ابن مسعودؓ سے روایت کی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اوّل۔

ابو فزارة لا یصح حدیثه ذکره البخاری فی الضعفاء ومتن حدیثه ان نبی اللہ توضأ بالنبیذ وقال ابو احمد الحاکم رجل مجهول قلت مالهسوی حدیث واحد۔

ہے اور اس سے ابو فزارہ نے اس کی حدیث صحیح نہیں۔ بخاری نے ضعفاء میں اس کو درج کیا ہے۔ اس کی حدیث کا متن یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے نبیذ سے وضو کیا۔ ابو احمد حاکم کہتے ہیں کہ یہ مجہول الحال آدمی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی یہی ایک حدیث ہے۔

البتہ جامع ترمذی میں اسی قسم کا ایک واقعہ عبداللہ بن مسعودؓ سے فرشتوں کی آمد اور دیدار کے متعلق بروایتِ صحیحہ مروی ہے۔

شقِّ قمر

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (قمر: ۱)

(قیامت نزدیک آگئی اور چاند شق ہوگیا)

پیغمبر کی صداقت کی گواہی کائنات کا ذرّہ ذرّہ دیتا ہے۔ آسمان اور زمین، چاند اور سورج ہر چیز اس کی صداقت کا ثبوت بن جاتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک نیا ستارہ طلوع ہوا[1] اور جب انہوں نے وفات پائی تو تین گھنٹہ کے لئے تمام دنیا میں اندھیرا چھا گیا[2]۔ قربِ قیامت کی ایک نشانی یہ بھی تھی کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوجائیں گے۔ یہ نشانی آنحضرتؐ کے دستِ مبارک پر پوری اُتری اور قرآن نے کہا:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○	قیامت نزدیک آگئی، اور چاند شق ہوگیا۔
وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا	اگر کافر کوئی سا بھی نشان دیکھیں تو اس سے
سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○	اعراض ہی کریں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے
(القمر: ۱ - ۲)	جو سدا سے ہوتا آیا ہے۔

بعض عقل پرست مسلمانوں نے قربِ قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ اس آیت سے آنحضرتؐ کے عہد میں شقِّ قمر کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ یہ قیامت کے واقعہ

---

[1] متی: ۲-۲ - [2] متی ۲۷-۴۵-

کا ذکر ہے لیکن اس حالت میں اوّل تو بے قرینہ ماضی (چاند پھٹ گیا) کو مستقبل (چاند پھٹ جائے گا) کے معنی میں لینا پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر قیامت کا واقعہ ہوتا تو اس کے بعد یہ کیوں ہوتا کہ "یہ کافر اگر کوئی سی نشانی بھی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے"۔ قیامت سامنے آجانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو مستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیونکر تردید کی جا سکتی ہے۔

اس شقِّ قمر کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند ابنِ حنبل، مسند طیالسی، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی اور دلائل ابونعیم میں بہ تصریح تمام مذکور ہے۔ صحابہؓ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیر بن مطعمؓ، علی بن ابی طالبؓ اور حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے[1]۔ ان میں سب سے صحیح اور مستند تر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے جو صحیح بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں مروی ہے۔ وہ اس واقعہ کے وقت موقع پر موجود تھے اور اس معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

انشق القمر ونحن مع النبی صلی	ہم آنحضرتؐ کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند
اللہ علیہ وسلم بمنی فقال	پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف
اشھدوا وذھبت فرقۃ نحو الجبل۔	چلا گیا۔ آپؐ نے فرمایا گواہ رہو۔

(صحیح بخاری و ترمذی تفسیر سورہ قمر و صحیح مسلم)

صحیحین میں اُن کی دوسری روایت یہ ہے:

---

[1] زرقانی بر مواہب جلد پنجم۔

انشق القمر علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فرقتین فرقة فوق الجبل وفرقة دونه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اشهدوا۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ ایک ٹکڑا تو پہاڑ کے اُوپر رہا اور دوسرا اس کے نیچے۔ آپؐ نے فرمایا گواہ رہو۔

(صحیح بخاری ومسلم)

حضرت انس بن مالکؓ کی یہ روایت بخاری ومسلم دونوں میں ہے،

ان اهل مکة سألوا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان یریهم اٰیة فاراهم القمر شقتین حتی راؤا حراء بینهما۔

اہلِ مکہ نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ آپؐ ان کو کوئی معجزہ دکھائیں۔ آپؐ نے ان کو چاند کے دو ٹکڑے دکھائے۔ ایک ٹکڑا حرا کے اس طرف تھا دوسرا اس طرف۔

صحیح مسلم میں ہے:

ان اهل مکة سالوا النبی صلی الله علیه وسلم ان یریهم اٰیة فاراهم انشقاق القمر فرقتین۔

اہلِ مکہ نے آنحضرتؐ سے کوئی نشانی طلب کی تو آپؐ نے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کو دکھایا۔

جامع ترمذی میں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

سأل اهل مکة النبی صلی الله علیه وسلم اٰیة فانشق القمر بمکة فرقتین فنزلت:

اہلِ مکہ نے آنحضرتؐ سے کوئی نشانی طلب کی تو چاند مکہ میں دو ٹکڑے ہوگیا۔ اس پر یہ آیت اتری:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ قیامت آگئی اور چاند پھٹ گیا۔

جامع[1] ترمذی اور مسند ابنِ حنبل میں جبیر بن مطعمؓ کی جو روایت ہے اس میں ہے کہ اس معجزہ کو دیکھ کر کفار نے کہا کہ محمدؐ نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ دوسروں نے کہا کہ اگر ہم پر جادو کر دیا ہے تو تمام آدمیوں پر تو وہ جادو نہیں کر سکتے۔ مسند ابوداؤد طیالسی[2] اور بیہقی میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ محمدؐ تمام دنیا پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ مسافروں کو اور مقامات سے آنے دو۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ جب اِدھر اُدھر سے مسافر آئے اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا۔

بہرحال یہ معجزہ رات کے وقت مکہ میں بمقام منیٰ واقع ہوا۔

عقلی حیثیت سے یہ معجزہ زمانۂ قدیم سے معرکۃ الآراء رہا ہے۔ علمائے متکلمین نے فلسفۂ قدیم کے اصول پر اس میں خوب خوب موشگافیاں کی ہیں۔ مثلاً فلاسفۂ قدیم کا یہ اعتقاد تھا کہ اجرامِ فلکی میں خرق والتیام اور شکست وریخت محال ہے۔ اس لئے شقِ قمر بھی ناممکن ہے۔ متکلمین نے ثابت کیا کہ اجرامِ فلکی میں خرق والتیام اور شکست وریخت ممکن ہے۔ مگر اب کہ جدید طبعیات وہیئت نے ہماری معلومات کے آسمان وزمین کو بدل دیا ہے، یہ مباحث بے سود اور بیکار ہیں۔ اب تو ہر روز نئے نئے ستاروں کے شکست وریخت اور تصادم کے حادثے سُنے جا رہے ہیں اور ہیئتِ جدید اور علمِ تکوین میں تو زمین، سورج اور ستاروں کے آغازِ آفرینش کی داستان ہی اس باب سے شروع ہوتی ہے۔

اس سے دوسرے درجہ پر ایک اور قدیم اعتراض وجواب کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے۔ اور ہمارے مسیحی مناظرین نے اس کو نئے آب ورنگ سے شہرت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ

---

[1] جامع ترمذی، تفسیر سورۂ قمر۔ [2] مسند عبداللہ بن مسعودؓ۔

اگر یہ معجزہ درحقیقت واقع ہوتا تو یہ صرف اہلِ مکّہ ہی کو نظر نہ آتا بلکہ اُس کو تمام دنیا دیکھتی اور اس کی روایتیں مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتیں۔ لیکن بجز مکّہ کے اور ملکوں میں اس واقعہ کا چرچا نہیں ہوا اور تمام قدیم اہلِ نجوم و ہیئت و تاریخ اس کی روایت سے خاموش ہیں۔

لوگوں نے اس شبہہ کے یہ جوابات دئے ہیں کہ اوّلاً ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ واقعہ دوسرے ملک کے لوگوں نظر نہیں آیا تم اس کے ثبوت میں کہو گے کہ اگر نظر آتا تو اس ملک کے اہلِ تاریخ اس کا ذکر کرتے حالانکہ کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ملک کا مشہور واقعہ جو دوسرے ملک کی معاصر تاریخوں میں مذکور نہ ہو تو صرف اس کا یہ عدمِ ذکر کیا اس کے انکار کی سند ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو ہندوؤں کی مہابھارت کا تم انکار کر سکتے ہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے تمام معجزات بلکہ واقعاتِ زندگی تک کا انکار کر سکتے ہو کہ شام و مصر کے معاصر رومی مؤرخوں نے ایسے عجیب و غریب واقعات کا ایک حرف بھی قلمبند نہیں کیا۔ اس کے برخلاف ابھی اُوپر کی روایتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب و شام سے آنے والے مسافروں نے یہ بیان کیا کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔

فلکی حیثیت سے جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اہلِ ہیئت جو اجرامِ فلکی کے ایک ایک واقعہ کو قلمبند کرتے آئے ہیں انہوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ رات کے وقت ظاہر ہوا تھا اور اس وقت دنیا کا بڑا حصّہ خوابِ راحت میں مصروف تھا۔ جو لوگ بیدار بھی ہوں گے، وہ اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف ہوں گے اور جنہوں نے دیکھا بھی ہوگا ان میں کتنا بڑا حصّہ ان کا ہوگا جو اپنے مشاہدات کو تحریری صورت میں لانے پر قادر نہ تھے یعنی ناخواندہ تھے اور اگر ان میں چند لکھے پڑھے اربابِ ہیئت اور اصحابِ تاریخ تھے تو ضروری نہیں کہ انہوں نے اپنے اس مشاہدہ کا تذکرہ بھی کیا ہو یا تذکرہ کیا تو ان

کی یادداشت مثل دوسری سیکڑوں علمی یادداشتوں کے ضائع ہوگئی ہو۔ آغازِ آفرینش سے اب تک اجرامِ فلکی میں لاکھوں انقلابات پیش آئے ہوں گے۔ لیکن کیا وہ سب کے سب دنیا کے اوراقِ ہیئت میں درج ہیں؟ اور کیا ان کا درج نہ ہونا ان کے عدمِ وقوع کی دلیل ہے؟ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اس قسم کے حوادثِ فلکی کا ذکر ہے۔ لیکن علمِ ہیئت و فلک اس کے ذکر سے خاموش ہے۔ لیکن کیا یہ خاموشی اس کے عدمِ وقوع پر شہادت ہے؟ خود تمہاری انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک ستارۂ نبوت طلوع ہوا جس کو یورپ کے لوگوں نے دیکھا اور پھر انجیل میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تو تمام دنیا دفعۃً تاریک ہوگئی۔ لیکن کیا ہیئت و افلاک کی کتابوں میں ان انقلاباتِ سماوی کا تذکرہ موجود ہے؟

حوادثِ فلکی کے حدوث اور وقوع میں بڑی چیز یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ مطالع اور مغارب پر موقوف ہے۔ اور ہر جگہ کے مطالع و مغارب دوسری جگہ سے نہایت مختلف ہیں۔ بالخصوص قمر کے مطالع میں تو اور بھی سخت اختلاف ہے۔ ایک جگہ چاند ڈوبتا ہے دوسری جگہ نکلتا ہے، ایک جگہ چاندنی ہے دوسری جگہ اندھیری ہوتی ہے، ایک جگہ چاند کو گہن لگتا ہے اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو وہ نظر تک نہیں آتا۔ اس لئے اگر تمام دنیا نے اس معجزہ کو نہیں دیکھا تو یہ شقِ قمر کی نفی کی دلیل نہیں۔ چنانچہ دنیا کی مختلف باخبر قوموں نے اپنی اپنی کتابوں میں مختلف حوادثِ فلکی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن جس واقعہ کو ایک نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے اس کی معاصر قوموں کی کتابیں اس کی شہادت سے قطعاً خالی ہیں۔ لیکن کیا یہ خاموشی اس کے عدمِ وقوع کی سند ہو سکتی ہے؟ علاوہ اور وجوہ کے اس خاموشی اور اختلاف کی ایک وجہ یہی ہوتی ہے کہ تمام دنیا کا ایک مطلع نہیں ہے۔ اس لئے ایک چیز ایک جگہ

نظر آتی ہے دوسری جگہ نہیں آتی۔

بعض متکلمین نے جن میں ایک شاہ ولی اللہ صاحب بھی ہیں، لکھا ہے اور امام غزالی کا بھی ادھر ہی رجحان معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت چاند میں شگاف نہیں ہوا تھا بلکہ لوگوں کو ایسا نظر آیا۔ چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں:

ان اھل مکۃ سألوا النبی صلی	اہلِ مکہ نے آپؐ سے نشانی
اللہ علیہ وسلم ان یریھم آیۃ	طلب کی تو آپؐ نے چاند دو
فاراھم انشقاق القمر فرقتین۔	دو ٹکڑے دکھایا۔

(صحیح مسلم)

ہم ان تمام پُر پیچ راستوں سے گذر کر صرف ایک سیدھی سی بات کہدینا چاہتے ہیں۔ شق القمر اہلِ مکہ کی طلب پر ایک آیتِ الٰہی تھی یعنی ان منکروں کو ان کی خواہش کے مطابق ثبوت کی ایک نشانی دکھائی گئی تھی۔ احادیث میں یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا۔ خواہ دراصل چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا۔ جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلافِ عادت تصرف کر سکتا ہے وہ خود چاند میں بھی خلافِ عادت تصرف کر سکتا ہے۔ پھر چونکہ اللہ نے یہ نشانی اہلِ مکہ کے لئے ظاہر کی تھی اور انہی کے لئے یہ آیۂ ثبوت تھی، اس لئے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور روایت کی حاجت نہ تھی۔ اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شقِ قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں بلکہ اہلِ مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحتِ الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاعِ عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ

آسمان کے طبعی انقلابات میں سے کوئی انقلاب تھا جیسا کہ اور سیکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں جیسا کہ فلکیات اور علم بدء خلق (کسموگریفی اور نیچر ہسٹری) میں مذکور ہیں لیکن جب اہلِ مکہ کے علاوہ جو شہرِ مکہ میں تھے یا باہر قافلہ میں تھے، صرف ان ہی کو نظر آیا تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرتؐ کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدِ۔

غلبۂ رُوم کی پیشین گوئی

الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ (الروم: ۱-۳)

(رومی قریب ترین زمیں مغلوب ہو گئے)

آنحضرتؐ نے اپنی الہامی زبان سے جن واقعات کی پیشین گوئی کی ہے ان سب میں سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ صاف وصریح، سب سے زیادہ معرکۃ الآراء غلبۂ روم کی پیشین گوئی ہے۔

عرب کے چپ وراست دونوں پہلوؤں میں روم وفارس کی پُرزور حکومتیں قائم تھیں۔ اس وقت ایران کا تاجدار خسرو اور روم کا فرمانروا ہرقل تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں ایک مدت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا۔ بعثتِ نبویؐ کے پانچویں سال یعنی ۶۱۳ء میں ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ شروع ہوگئی۔ اگرچہ ان دونوں قوموں میں کسی قوم نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ تاہم رومی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو اور اہلِ کتاب تھے اور ایرانیوں کے عقائد مشرکینِ مکہ کے عقائد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔ اس لئے لازمی طور سے مسلمانوں کو رومی عیسائیوں کے ساتھ اور مشرکینِ مکہ کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اس لئے مسلمانوں اور کفارِ قریش دونوں کو جنگ کے نتیجہ کا شدت کے ساتھ انتظار تھا۔

ان دونوں سلطنتوں کی حدود دریائے دجلہ وفرات کے کناروں پر آکر ملتی تھیں۔

رومی سلطنت مشرق میں ایشیائے کوچک، حدودِ عراق، شام، فلسطین اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایرانیوں نے دو طرفہ حملہ کیا۔ ایک طرف تو وہ دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھے اور دوسری طرف ایشیائے کوچک کی جانب آذربائیجان سے آرمینیا ہو کر موجودہ اناطولیہ میں داخل ہو گئے اور دونوں طرف سے رومیوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے سمندر میں ان کو دھکیل دیا۔ شام کی سمت میں انہوں نے یکے بعد دیگرے اس ارضِ مقدس کا ایک ایک شہر رومیوں سے چھین لیا۔ ۶۱۴ء میں فلسطین اور اس کا مقدس شہر یروشلم صلیبی علم کے بجائے درفشِ کاویانی کے زیر سایہ آگیا۔ کینسے مسمار کئے گئے۔ مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ چھبیس ہزار یہودیوں نے ایرانی فوج میں شامل ہو کر ساٹھ ہزار بے گناہ عیسائیوں کا قتلِ عام کیا۔ شہنشاہِ ایران کے قصرِ اقامت کی تیس ہزار مقتول سروں سے آرائش کی گئی۔ ایرانی فتوحات کا سیلاب اس سے آگے بڑھ کر ۶۱۶ء میں پوری وادیٔ نیل یعنی مملکتِ مصر پر محیط ہو گیا اور آخر اسکندریہ کے ساحل پر جا کر تھما۔ اور دوسری طرف تمام ایشیائے کوچک کو زیر و زبر کرتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا کر رُکا۔ اور قسطنطنیہ کی دیواروں سے جا کر ٹکرایا۔ شہنشاہِ روم کے دارالسلطنت کے سامنے ایران کے فاتح لشکر نے جا کر اپنے خیمے کھڑے کر دئے اور اب رومیوں کے بجائے عراق و شام و فلسطین و مصر و ایشیائے کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو گئی۔ ہر جگہ آتشکدے تعمیر ہوئے اور مسیح علیہ السلام کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا۔ رومی سلطنت کی اس تباہی کو دیکھ کر رومی شہنشاہی کی وسیع مملکت میں بغاوتیں کھڑی ہو گئیں۔ افریقہ میں بھی شورش ہوئی۔ خود قسطنطنیہ کے قریب یورپ میں مختلف قومیں قتل و غارت گری میں مصروف ہو گئیں۔ غرض اُس وقت سلطنتِ رومہ کے پرزے پرزے اڑ گئے تھے۔

جنگ کا نتیجہ جب ایسا خلافِ امید ظاہر ہوا تو مسلمانوں کو یقیناً رنج اور کفّار کو

مسرت حاصل ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ جس طرح ہمارے بھائی غالب ہوئے ہیں اسی طرح اگر تم ہم سے لڑتے تو ہم غالب ہوتے۔ اس وقت رومیوں کی جو افسوسناک حالت تھی وہ آپ سن چکے کہ وہ اپنے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ کھو چکے تھے۔ خزانہ خالی تھا۔ فوج منتشر تھی۔ ملک میں بغاوتیں پیدا تھیں۔ شہنشاہِ روم ہرقل ہمہ تن عیاش، بے پروا، سُست اور مبتلائے اوہام تھا۔ ایرانیوں کا فاتح سپہ سالار قسطنطنیہ کے دروازہ پر پہنچ کر رومیوں کے سامنے حسبِ ذیل شرائط پیش کرتا ہے: رومی باج ادا کریں۔ ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار حریر کے تھان، ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار باکرہ لڑکیاں ایرانیوں کے حوالہ کریں۔ رومیوں کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ وہ ان شرمناک شرائط کو قبول کرتے ہیں۔ اس پر بھی جب رومی قاصد شہنشاہِ ایران کے دربار میں مصالحت کا پیام لے کر جاتا ہے تو مغرور خسرو جواب دیتا ہے کہ مجھ کو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیئے۔ اور اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک شہنشاہِ روم اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کے آگے سر نہ جھکائے گا۔

کارزارِ عالم کا نقشہ یہ تھا کہ معرکۂ جنگ سے بہت دور ایک خشک اور بنجر زمین کی سنسان پہاڑی سے ایک شہزادۂ امن نمودار ہوا اور واقعات عالم کے بالکل خلاف سروشِ غیب کے نغمۂ قدس میں گویا ہوا:

الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ○ فِيْٓ اَدْنَى	رومی قریب تر زمین میں مغلوب ہو گئے لیکن
الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ	وہ چند سال میں مغلوب ہو جانے کے بعد پھر
سَيَغْلِبُوْنَ ○ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ	غالب ہوں گے۔ خدا ہی کے ہاتھ میں پہلے
لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ	اور پیچھے سب اختیار ہے۔ اور اس دن مسلمان خدا

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۔

کی مدد سے خوش ہوں گے۔ وہ جس کی چاہے مدد کرے۔ وہ غالب رحم والا ہے۔ خدا کا وعدہ ہے۔ خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

(الروم : ۱-۶)

یہ پیشین گوئی واقعات کے لحاظ سے اس قدر مستبعد اور ناقابلِ یقین تھی کہ کفار نے اس کے صحیح ہونے کی صورت میں کئی اونٹوں کے ہارنے کی مسلمانوں سے شرط لگائی۔ اب مسلمانوں اور کافروں کو بڑی شدت سے واقعات کے پہلو کا انتظار تھا۔ آخر چند سال کے بعد دنیا نے خلافِ امید پلٹا کھایا۔ مؤرخ گبن کے الفاظ میں "شہنشاہ جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی، عیاشی اور اوہام کا غلام اور رعایا کے مصائب کا نامرد تماشائی تھا جس طرح صبح و شام کی کہر آفتاب نصف النہار کی روشنی سے پھٹ جاتی ہے۔ دفعۃً (۶۲۱ء) محلوں کا ارکارڈیوس میدانِ جنگ کا سیزر بن گیا۔ اور روم اور ہرقل کی عزت نہایت شاندار طریقہ سے بچالی گئی"[1] جس وقت ہرقل اپنی بقیہ فوج لے کر قسطنطنیہ سے چلا ہے، لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ رومۃ العظمیٰ کے آخری لشکر کا منظر دنیا کے سامنے ہے[2]۔ لیکن عرب کے نبی امی کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور عین اس وقت جب مسلمانوں نے بدر کے میدان میں قریش کو شکست دی، رومیوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا۔ مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے سواحل کی طرف دھکیل دیا۔

اس عظیم الشان پیشین گوئی کی صداقت کے اثر نے دنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ قریش کے

---

[1] تاریخ زوال روم مصنفہ گبن جلد سوم [2] تاریخ زوال روم مصنفہ گبن جلد سوم۔

بہت سے لوگ اس صداقت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے[1]۔ واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوالِ روم کا مشہور مصنف گبن اس حیرتناک پیشین گوئی کی سچائی سے متحیر ہو کر کہتا ہے:

"مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دونوں کی ایک دوسرے کو تباہ کر دینے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا اور عین اس وقت جب کہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں، اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ "چند سال میں فتح و ظفر رومی علم پر سایہ فگن ہو گی"۔ جس وقت یہ پیشینگوئی کی گئی تھی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہرقل کی بارہ سال کی (سنہ ۶۱۰ء سے سنہ ۶۲۲ء تک) حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ جلد بکھر جائے گا۔"[2]

ہرقل کی طبیعت میں اس فوری انقلاب اور واقعات کی رو سے اس حیرتناک تغیر اور اس کے اسباب کی تفصیل میں تاریخِ روم کے مصنفین نے عجیب عجیب باتیں پیدا کی ہیں۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس خونی معرکہ سے دور ایک پیغمبرانہ ہاتھ رومیوں کی مدد کے لئے دراز تھا۔ اور وہی اس انقلاب اور تغیر کا سب سے بڑا روحانی سبب تھا۔

مستدرک[3] (علی شرط الصحیحین) اور جامع ترمذی[4] میں ہے کہ "روم و فارس کی جب جنگ شروع ہوئی تو مشرکین ایرانیوں کے طرف دار تھے کیونکہ وہ بھی بت پرست تھے اور مسلمان رومیوں کے طرف دار تھے کہ وہ اہلِ کتاب تھے۔ اس وقت ایرانی روم کو دباتے جا رہے تھے۔ اس پر سورۂ روم کی پیشین گوئی نازل ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے چلا چلا کر تمام مشرکین کو یہ پیشینگوئی سنائی۔ مشرکین نے کہا کہ اس پیشین گوئی کے لئے کوئی سال مقرر کرو۔ حضرت ابوبکرؓ نے پانچ

---

[1] ترمذی: تفسیر سورۂ روم۔ [2] تاریخ زوال روم: جلد سوم۔ [3] مستدرک: جلد دوم تفسیر سورۂ روم۔ [4] ترمذی: تفسیر سورۂ روم۔

سال کی شرط کی۔ آنحضرتؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ بضع کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے۔ اس لئے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیئے تھی۔ چنانچہ اس تشریح کے مطابق نویں سال غزوۂ بدر کے موقع پر پیشین گوئی پوری ہوئی اور رومی غالب آئے۔

غزوۂ بدر ہجرت کے پہلے سال اور بعثت کے چودھویں سال پیش آیا۔ اس سے نو برس پہلے بعثت کا پانچواں سال ہوگا۔ اس بنا پر پیشین گوئی کا زمانہ ۵ سنہ بعثت اور اس کے پورے ہونے کا زمانہ ۱۴ سنہ بعثت یا ۱ سنہ ھ ہے۔ بعض لوگوں نے اس پیشینگوئی کے پورے ہونے کا زمانہ صلح حدیبیہ کا سال یعنی ۶ سنہ ھ بیان کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ شاید لوگوں کو اس سے دھوکا ہوا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ قاصدِ نبویؐ جب اسلام کا دعوت نامہ لے کر قیصر کے پاس گیا تو وہ اُس وقت فتح کا شکریہ ادا کرنے کے لئے شام آیا ہوا تھا۔ اور معلوم ہے کہ قاصدِ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں روانہ ہوئے تھے۔ اس لئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ حصولِ فتح کی بھی یہی تاریخ ہے۔ مگر یہ مغالطہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ فتح مکّہ کی تاریخ نہیں بلکہ فتح کے جشن کی تاریخ ہے۔ رومی تاریخ کی مطابقت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۶۰۹ء میں آپؐ کی بعثت ہوئی۔ ۶۱۰ء سے روم و فارس کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ ۶۱۳ء میں اعلانِ جنگ ہوا۔ ۶۱۴ء سے رومیوں کی شکست کا آغاز ہوا۔ ۶۱۶ء میں رومی شکست تکمیل کو پہنچ گئی۔ ۶۲۲ء سے پھر رومیوں نے حملہ شروع کیا۔ ۶۲۳ء سے ان کی کامیابی کا آغاز ہوا اور ۶۲۵ء میں ان کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی۔ اس ترتیب سے دیکھئے تو ظاہر ہوگا کہ اس پیشین گوئی کی خوبی یہ ہے کہ آغازِ شکست سے آغازِ فتح تک جوڑیے تو بھی وہی نو برس ہو گئے ہیں اور اگر انجامِ شکست سے آغازِ فتح تک جوڑیے تو بھی وہی نو برس ہوں گے۔

اس فتح کی تکمیل کے بعد ہرقل پھر وہی سست وعیاش قیصر بن گیا جو پہلے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دستِ قدرت نے صرف اس پیشین گوئی کے پورا کرنے کے لئے چند سال کے واسطے اس کے دل ودماغ کو بیدار اور دست وبازو کو ہشیار کر دیا تھا۔ پیشین گوئی کی تکمیل کے بعد پھر پہلے کی طرح تعیّش اور کاہلی نے اس کو عیش وغفلت کے بستر پر تھپک تھپک کر سلا دیا۔



دیگر آیات و دلائلِ نبویؐ

قرآن مجید میں

طیراً ابابیل کی نشانی آنحضرتؐ کی ولادت عامِ الفیل میں ہوئی جس میں ابرہۃ الاشرم نے ہاتھیوں کی قطار کے ساتھ خانۂ کعبہ پر حملہ کرنا چاہا تھا لیکن فضائے آسمانی کے ایک نہایت حقیر پرندہ نے کنکریوں کے ذریعہ سے اُن کو ہلاک کر دیا۔ یہ ایک عظیم الشان نشان تھا جس کا ظہور مسلمان اور عیسائی دونوں تسلیم کریں گے کہ مشرکینِ عرب کی تائید کے لئے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ابرہۃ الاشرم ایک عیسائی بادشاہ تھا جس کا مذہب بہر حال مشرکین سے بہتر تھا بلکہ یہ خود آنحضرتؐ کے ظہور کا نشان تھا جن کی ذاتِ پاک حقیقی طور پر خانۂ کعبہ کی حفاظت کی کفیل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس معجزہ کے ذکر میں خاص طور پر آپؐ کی طرف روئے خطاب کیا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے
الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ	ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ اُن کی چھپی
فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ	گھاتوں کو بے راہ نہیں کر دیا؟ اور ان
طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ	پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ	اُن کو پتھریلی کنکریوں سے مارتے

مَّاْكُوْلٍ ○ (الفیل: ۱-۵)

تھے۔ تو خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھُس کے مانند کر دیا۔

یہ سورۃ واقعہ کے تقریباً پینتالیس برس بعد اتری تھی اور غالباً اس وقت متعدد اشخاص اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں گے۔ اور ایسے تو ہزاروں ہوں گے جنھوں نے دیکھنے والوں سے براہِ راست اور بلا واسطہ اس واقعہ کو سُنا ہوگا۔ کفّار جو ہمیشہ آنحضرتؐ کی تکذیب کے درپے رہتے تھے اگر اس صورتِ واقعہ کے بیان میں کچھ بھی غلطی یا جھوٹ شامل ہوتا، تو وہ اس کی علانیہ تردید کر دیتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے اس کی سچائی میں کوئی شک و شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔

شہبِ ثاقب کی کثرت آنحضرتؐ کو جب نبوّت عطا ہوئی تو نظمِ آسمانی میں ایک خاص انقلاب پیدا ہوا۔ جنّات جو پہلے آسمان کے قریب تک جا سکتے تھے، ان کی آمد و رفت مسدود کر دی گئی اور ان پر ٹوٹنے والے تاروں کی بارش ہونے لگی۔ چنانچہ قرآن مجید میں خود جنّات کی زبانی بیان ہے:

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن: ۸-۹)

ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو پایا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور ٹوٹنے والے تاروں سے بھر دیا گیا ہے۔ اور ہم پہلے سُننے کو وہاں ٹھکانوں پر بیٹھتے تھے لیکن اب جو کوئی سُنے تو تارے کو اپنی تاک میں پاوے۔

شرحِ صدر شرحِ صدر یعنی سینہ کا کھول دینا یا اس غرض سے چاک کرنا کہ وہ انوارِ الٰہی سے معمور کیا جائے، ایک دولتِ ربّانی تھی جو آنحضرتؐ کو عطا ہوئی۔ ارشاد ہوا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝	(اے محمدؐ) کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول
(الانشراح: ۱)	نہیں دیا (یا چاک نہیں کر دیا)۔

احادیث میں گو اس شرحِ صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے مگر بہر حال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نورِ معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو ہر صورت میں وہ ایک فہم سے بالاتر کیفیت تھی۔

مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر آنحضرتؐ نے معجزانہ طریق پر ایک شب میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک جو پُر اسرار سفر کیا قرآن نے ان الفاظ میں اس کی تصدیق کی ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ	پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو خانہ کعبہ
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	سے بیت المقدس تک رات
الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی	کے وقت ایک شب میں لے
(بنی اسرائیل: ۱)	گیا۔

حالانکہ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اُس زمانہ میں مہینوں کا سفر تھا۔

قریش پر قحط سالی کا عذاب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے پہلے بھی یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب قریش نے آپؐ کی مخالفت کی تو آپؐ نے ان کو بد دعا کی کہ "خداوندا اُن کو سات سال تک قحط میں مبتلا رکھ جس طرح تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں سات سال تک مستقل قحط کو قائم رکھا تھا"، چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے۔ یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ ان کو دھوئیں کی طرح نظر آتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر ابوسفیان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ	(اے محمدؐ) کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول
(الانشراح: ۱)	نہیں دیا (یا چاک نہیں کر دیا)۔

احادیث میں گو اس شرحِ صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے مگر بہر حال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نورِ معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو ہر صورت میں وہ ایک فہم سے بالاتر کیفیت تھی۔

مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر آنحضرتؐ نے معجزانہ طریق پر ایک شب میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک جو پُر اسرار سفر کیا قرآن نے ان الفاظ میں اس کی تصدیق کی ہے:

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ	پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو خانہ کعبہ
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	سے بیت المقدس تک رات
الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی	کے وقت ایک شب میں لے
بنی اسرائیل: ۱)	گیا۔

حالانکہ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اُس زمانہ میں مہینوں کا سفر تھا۔

قریش پر قحط سالی کا عذاب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے پہلے بھی یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب قریش نے آپؐ کی مخالفت کی تو آپؐ نے ان کو بد دعا کی کہ "خداوندا اُن کو سات سال تک قحط میں مبتلا رکھ جس طرح تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں سات سال تک مستقل قحط کو قائم رکھا تھا"، چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے۔ یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ ان کو دھوئیں کی طرح نظر آتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر ابوسفیان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم خدا کی اطاعت اور صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہو۔ حالانکہ خود تمہاری قوم تباہ ہو رہی ہے۔ اس کے لئے خدا سے دعا کرو۔ آپؐ نے دعا فرمائی اور بارش ہوئی جس نے قحط کی مصیبت کو دور کر دیا۔ اس کے بعد پھر قریش نے حسبِ دستور آپؐ کی مخالفت شروع کی تو قیام مکہ ہی کے زمانہ میں خدا نے آپؐ کی زبان سے یہ پیشین گوئی قریش کو سنائی کہ آئندہ اس کا انتقام ایک اور سخت گرفت سے لیا جائے گا۔ وہ گرفت بدر کی لڑائی تھی۔ چنانچہ سورۂ دخان کی ان آیتوں میں اسی واقعہ کا ذکر ہے[1]

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ
مُّبِينٍ ۝ يَغْشَى النَّاسَ ۖ هَٰذَا
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ
عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝
أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ
رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ
وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ إِنَّا
كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ
عَائِدُونَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ
الْكُبْرَىٰ ۚ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ۝

(الدخان : ۱۰ - ۱۶)

اس دن کا انتظار کرو جب آسمان دھواں
نمایاں کرے گا جو لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ
نہایت تکلیف دہ عذاب ہے۔ خداوندا! یہ
عذاب ہمارے اُوپر سے ہٹا لے ہم مسلمان ہیں۔
اور کہاں اُن کے لئے ہے نصیحت پکڑنا۔ حالانکہ
اُن کے پاس ایک رسول کُھلم کُھلا آیا۔ پھر اُن
لوگوں نے اُس سے اعراض کیا اور کہا یہ سکھایا
ہوا پاگل ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس
عذاب کو ہٹا لینے والے ہیں تم لوگ اُسی قدیم
حالت کی طرف عود کر جاؤ گے۔ ہم اس روز
انتقام لیں گے جو سب سے بڑی پکڑ کا دن ہوگا۔

موقعِ ہجرت کی معجزانہ نشانیاں | کفار نے دار الندوہ میں چھُپ کر آپؐ کے قتل وغیرہ

[1] صحیح مسلم تفسیر سورۂ دخان۔

کے مشورے کئے۔ کوئی مسلمان نہ اُن میں شریک تھا اور نہ کسی طرح ہو سکتا تھا۔ مگر آنحضرتؐ کو ہر چیز کی خبر اللہ نے دے دی۔ دن، تاریخ، وقت، سب سے آگاہی ہو گئی اور پھر یہ کہ جس شب کو آپؐ نے ہجرت کی سب کو معلوم ہے کہ اس رات کو آپؐ کے گھر کے چاروں طرف دشمنوں کا پہرہ تھا۔ تاہم آپؐ اُن کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ان ہی کے درمیان سے گذر کر حضرت صدیقؓ کے ساتھ شہر سے نکل گئے۔ آپؐ مکہ کے قریب ہی غارِ ثور میں جا کر چھپے۔ عرب آثارِ قدم سے اشخاص کے مقام و گذرگاہ کا پتہ لگانے میں نہایت مشاق تھے۔ صبح کو وہ آپؐ کا پتہ لگاتے ہوئے غارِ مذکور کے دہانہ تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو آپؐ ان کے سامنے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اقتضائے بشری سے گھبرا اُٹھے۔ مگر آپؐ نے تسلی دی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ چنانچہ ساتھ والے خدا نے یہ تدبیر کی کہ کافروں سے ان کی یہ سوجھ چھین لی کہ وہ جھک کر دیکھیں۔ اور ان کے دل میں ایسی بات ڈال دی کہ وہ بے دیکھے واپس چلے گئے۔ سیر کی اکثر ضعیف روایتوں میں اور مسند ابنِ حنبل کی ایک روایت میں جو زیادہ کمزور نہیں ہے، مذکور ہے کہ مکڑی نے غار کے منہ پر جالے تن دئے تھے۔ کفار نے کہا اگر کوئی اس غار میں جا کر چھپتا تو ظاہر ہے کہ یہ جالے ٹوٹ جاتے اور یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے۔ اس غار سے نکل کر جب آپؐ مدینہ کی راہ چلے تو قریش کے سوار آپؐ کے تعاقب میں نظر آئے۔ چنانچہ سراقہ اپنا گھوڑا دوڑاتا آپؐ کے قریب پہنچ گیا۔ دفعۃً گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ تین دفعہ یہی واقعہ پیش آیا۔ سراقہ اس اعجاز کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور خطِ امان لے کر واپس چلا گیا۔

واقعۂ ہجرت کے ان معجزانہ واقعات کا تفصیلی بیان احادیث میں ہے۔ مگر قرآن مجید کا یہ اجمالی اعتراف ان کی تائیدی شہادت ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا — اور یاد کرو (اے پیغمبرؐ) جب کفار تمہارے

لِيُثْبِتُوكَ اَوْ يَقْتُلُوكَ اَوْ يُخْرِجُوكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ○

(الانفال، ۳۰)

ساتھ داؤ کر رہے تھے تاکہ تم کو قید کریں یا قتل کریں یا گھر سے نکال دیں۔ وہ بھی داؤ کر رہے تھے اور خدا بھی داؤ کر رہا تھا۔ اور خدا سب داؤ کرنے والوں میں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(التوبۃ: ۴۰)

(اے لڑائی سے پیچھے رہنے والے لوگو!) اگر تم اس پیغمبر کی مدد نہ کرو تو وہ تمہاری مدد سے بے نیاز ہے کہ خدا نے اس وقت اس کی مدد کی جب اس کو کافروں نے مکہ سے نکال دیا تھا۔ دو فقیروں میں سے ایک نے جب وہ دونوں غار میں تھے، اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔ پھر خدا نے اس پر اپنی تسکین نازل کی اور ان فوجوں سے اس کی مدد کی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا۔ اور خدا ہی کی بات اونچی رہتی ہے اور خدا غالب اور تدبیر والا ہے۔

خواب میں کفار کا کم دیکھنا ہجرت کے بعد سب سے بڑا معرکہ غزوۂ بدر کا پیش آیا جس میں ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان تھے جو ہتھیاروں سے بھی پورے آراستہ نہ تھے۔ دوسری طرف ایک ہزار قریش کی لوہے میں غرق فوج تھی۔ دنیا قیاس کر سکتی ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ کس کے حق میں ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ اسلام کی ہمیشہ کے لئے موت وحیات کی ساعت تھی اس لئے کارسازِ قدرت نے اپنی عجیب وغریب نشانیوں سے حق کو فتح اور باطل کو شکست دی۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے

کہ غزوۂ بدر سے پہلے آنحضرتؐ کو اس معرکہ کا نقشہ عالمِ رؤیا میں دکھایا گیا تھا۔ اور اس میں کفار کی تعداد بہت کم دکھائی گئی تھی جو اُن کی ذلت اور شکست کی طرف اشارہ تھا۔ مسلمانوں نے جب یہ خواب سنا تو اُن کو ہمت ہوئی۔ اگر عالمِ رؤیا میں کفار کی کثرت دکھائی جاتی تو مسلمانوں کے حوصلے پہلے ہی سے پست ہو جاتے۔ چنانچہ خود قرآن نے اس کی تصریح کر دی:

اِذْ يُرِيكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ	خدا کے احسان کو یاد کرو جب وہ تجھ کو تیرے
وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ	خواب میں ان کافروں کو تھوڑا دکھا رہا تھا۔
لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	اگر تم کو زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے
سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ	اور لڑائی کے بارے میں آپس میں اختلاف کرتے
الصُّدُوْرِ ○	لیکن خدا نے بچا لیا۔ بے شک خدا سینوں
(الانفال: ۴۳)	کے راز جانتا ہے۔

مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھانا

اس معرکہ میں سُن چکے کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا۔ خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ کا یہ تماشہ دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے معلوم ہونے لگے۔ اُدھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ رؤسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ لے جانے پائیں۔ اس کی یہ تدبیر کی کہ مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر حصولِ نتیجہ کے لئے نہ تو سرفروشانہ کوشش کی اور نہ بھاگنے کی کوئی ضرورت سمجھی۔ اور یہی بات مسلمانوں کے حق میں مفید ہو گئی:

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ	خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم دشمنوں

فِیْٓ اَعْیُنِکُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُکُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ؕ

(الانفال : ۴۴)

سے صف آرا ہوئے تو وہ تمہاری نگاہوں میں اُن کو تھوڑا کرکے دکھاتا تھا۔ اور تم کو ان کی آنکھوں میں کم کرکے دکھا رہا تھا تاکہ اس کام کو جس کا ہونا مقرر ہے، طے کر دے۔

پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دُونا نظر آنا پہلے تو خدا نے کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو کم کرکے دکھایا تاکہ کفار بے پروا ہو کر لڑ پڑیں۔ پھر جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دُونی نظر آنے لگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش نے ڈر کر ہمت ہار دی:

قَدْ کَانَ لَکُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی کَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ○

(آل عمران : ۱۳)

اے یہودیو! تمہارے لئے ان دونوں فوجوں میں جو صف آرا ہوئیں جن میں ایک خدا کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسری خدا کی منکر تھی، یقیناً ایک نشانی تھی۔ کافروں کا لشکر آنکھوں دیکھتے اپنی مقابل فوج کو اپنے سے دُونا دیکھ رہا تھا۔ اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے! اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو چشمِ بینا رکھتے ہیں، بڑی عبرت ہے۔

فرشتوں کی آمد یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیونکر گئی؟ کیا آسمان سے فرشتے اتر آئے؟ خدا فرماتا ہے:

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ

یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر

لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○

رہے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں لگاتار ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔ اور خدا نے یہ نہیں کیا لیکن خوش کرنے کے لئے اور تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوں۔ ورنہ فتح تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

(الانفال: ۱۰)

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

یاد کر جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں کے دل مضبوط کئے رہو۔ کافروں کے دلوں میں میں عنقریب رعب ڈال دوں گا۔

(الانفال: ۱۲)

میدانِ جنگ میں پانی برسانا بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں، وہ جگہ بلند تھی۔ اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سامان یہ پیدا کر دیا کہ عین اُس وقت میدانِ جنگ میں موسلا دھار پانی برسایا جس نے اُدھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر ان کے پاؤں جما دیئے اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا یہ ریلا ہوا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ خدا خود فرماتا ہے:

وَیُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً

اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب وہ

لِيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝

(الانفال: ۱۱)

آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تم کو اس پانی سے پاک کرے اور ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور اس سے قدموں کو جما دے۔

لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا معرکۂ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اڑ جاتی ہے مگر مایۂ تسکینِ عالم کا اعجاز یہ تھا کہ بدر و اُحد کے کارزاروں میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری اور بے خوفی کے لئے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا تاکہ کسی خوف و خطر کا خیال کئے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ خدا احسان جتاتا ہے:

اِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ

(الانفال: ۱۱)

یاد کرو جب خدا اپنی طرف سے تمہاری بے خوفی کے لئے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ

(آل عمران: ۱۵۴)

پھر خدا نے غم کے بعد بے خوفی کے لئے تم پر نیند اتاری جو ایک گروہ پر چھا رہی تھی۔ اور دوسرا گروہ تھا جس کو اپنی جان کی فکر غم میں ڈالے تھی۔

آپؐ کا کنکری پھینکنا یہ سب کچھ تھا لیکن عین اس دار و گیر کے معرکہ میں ایک مقدس وجود پُر سکونِ دل اور سر بسجود پیشانی کے ساتھ ظاہری ہتھیاروں سے منزّہ ہو کر دعاؤں میں مصروف تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ اِس حیرت ناک منظر پر نگاہ ڈالی اور زمین سے ایک

مٹھی کنکری اور خاک اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی۔ دفعۃً باطل کا طلسم چور چور تھا۔ قرآن گواہی دیتا ہے

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	تو تم نے (مسلمانو) ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خود
قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ	خدا نے ان کو قتل کیا۔ اور اے پیغمبر! تو نے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ	نہیں پھینکا جب تو نے پھینکا، بلکہ خدا نے
مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ	پھینکا تاکہ مسلمانوں کو اس سے (فتح کی) اچھی
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝	نعمت عطا کرے۔ خدا دعاؤں کا سننے والا
(الانفال: ۱۷)	اور بھیدوں کا جاننے والا ہے۔

لوئی رمی کے معنی تیر پھینکنے کے نہ لے کہ آپؐ نے اس موقع پر کیا تمام عمر میں سخت سے سخت خطرہ میں بھی کبھی تیغ و تبر اور تیر و خنجر سے دستِ مبارک کو آلودہ نہیں کیا۔

غزوۂ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ

پڑھ چکے ہیں کہ بدر کے معرکہ سے پہلے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا شام سے مکہ جا رہا تھا اور اُدھر سے قریش کی فوج بڑے سر و سامان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کو نکلی تھی۔ مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس صورت واقعہ سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک چیز تم کو ملے گی یا تو یہ قافلہ اور یا یہ قریش کی فوج شکست کھائے گی اور تم کو غنیمت کا مال ملے گا۔ چنانچہ یہ صورتِ واقعہ بھی درست نکلی اور وعدہ بھی پورا ہوا:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى	اور یاد کرو جب تم سے اللہ وعدہ کر رہا
الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ (الانفال: ۷)	تھا کہ ان دو گروہوں میں ایک تمہارا ہے

غزوۂ احزاب کی خبر

غزوۂ احزاب جس میں دفعۃً متحدہ عرب قبائل کا سیلاب مدینہ کے چاروں طرف امنڈ آیا تھا، واقعہ سے بہت پہلے آنحضرتؐ کو عالمِ رؤیا میں اس کی اطلاع دی

جا چکی تھی۔ اور آپؐ نے تمام مسلمانوں کو اس مُصیبت کے آنے سے پیشتر باخبر کر دیا تھا چنانچہ جب یہ صورتِ حال نظروں کے سامنے آگئی تو اس نشان کے ظاہر ہونے سے مسلمانوں کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آگئی۔ اور ان کے دلوں میں آپؐ کی صداقت کا مزید یقین پیدا ہو گیا:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا	اور جب مسلمانوں نے ان متحدہ حملہ آور قبائل
هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ	کو دیکھا تو کہا یہی وہ ہے جس کا وعدہ ہم سے
صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ ۫	خدا اور اس کے رسول نے کیا تھا۔ اور خدا اور
اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝	اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔ اور اس واقعہ
(الاحزاب : ۲۳)	نے ان کو ایمان اور اقرار میں اور زیادہ پختہ کر دیا۔

غزوۂ احزاب میں آندھی اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل نے مل کر مسلمانوں پر متحدہ حملہ کیا تھا اور چاروں طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور ڈیرے خیمے ڈال کر اس بات پر جم گئے تھے کہ ہم اسی محاصرہ کی حالت میں مسلمانوں کو مدینہ میں گھیر کر ان کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ بیس دن تک وہ محاصرہ کئے پڑے رہے۔ آس پاس کے یہودی جو پہلے مسلمانوں سے عہد کر چکے تھے دشمنوں سے جا کر مل گئے اور اس قدر زور کا حملہ کیا کہ مسلمان فریضۂ نماز بھی وقت پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ میں فاقہ ہونے لگا۔ منافقین اور کچے دل کے لوگ گھبرا کر ساتھ چھوڑنے لگے کہ عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے باہر اس زور کی آندھی چلائی کہ دشمنوں کے خیمے اکھڑ گئے، طنابیں ٹوٹ گئیں، ہانڈیاں اُلٹ گئیں اور ایسی سخت سردی پڑی کہ دشمن ٹھٹھر کر رہ گئے۔ اور ہمت ہار کر خود محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خدا نے مسلمانوں کو اپنا یہ احسان جتایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ	مسلمانو! اپنے اوپر خدا کی اس نعمت کو یاد
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ	کرو کہ جب فوجوں نے تم پر حملہ کیا تو ہم

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝

نے ان پر ہوا، اور ایسی فوجیں بھیجیں جن کو تم نے نہیں دیکھا۔ اور جو تم کر رہے تھے، خدا اس کو دیکھ رہا تھا۔

(الاحزاب: ۹)

غزوۂ حنین میں نصرت فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین پیش آیا۔ گو اس میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی بھیڑ شامل تھی لیکن اس میں کچھ نوجوان تھے جو لڑائی کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ کچھ مکہ کے نومسلم تھے جو ابھی صبر و ضبط کے خوگر نہیں ہوئے تھے۔ فوج میں زرہ پوش بھی کم تھے۔ اور مقابلہ قبیلۂ ہوازن سے پڑا جو قدر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ مسلماں جونہی آگے بڑھے حریف نے ان کو تیروں پر رکھ لیا۔ پہلے ہی حملہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ لیکن مرکزِ نبوت اپنی جگہ پر تھا۔ آپؐ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا۔ انہوں نے مہاجرین و انصار کو آوازیں دیں۔ وہ پلٹے تو آپؐ سواری سے نیچے اترے اور زمین سے ایک مشتِ خاک اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکی۔ دفعۃً جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ ہوازن شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ یہ واقعہ صحیح مسلم اور دیگر معتبر روایتوں میں مذکور ہے اور قرآن کی اس صداقت کی گواہی دیتا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى

خدا نے تمہاری نصرت بہت سے مقامات میں کی اور نیز حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم کو مغرور بنا دیا تھا۔ تو یہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی۔ پھر پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے۔ پھر اللہ نے اپنی تسکین

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ	اپنے رسول پر اور مومنوں پر نازل کی اور وہ
تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ	فوجیں اُتاریں جن کو تم نے نہیں دیکھا اور
(التوبۃ : ۲۵-۲۶)	کفر کرنے والوں کو پوری سزا دی۔

"نظر نہ آنے والی فوجوں" کے الفاظ سے قرآن مجید نے ہمیشہ فوق الفہم اور غیر مادّی ذرائع و وسائل کی تعبیر کی ہے۔

غیب پر اطلاع غیب پر ذاتی علم تو خدا کے سوا کسی اور کو نہیں مگر وہ جس کو چاہے اپنی اس بخشش سے سرفراز بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی نگاہوں کے سامنے کبھی دور دراز مقامات کی خبریں، کبھی لوگوں کے دلوں کے حالات، کبھی مخفی واقعات آئینہ کر دیئے جاتے تھے۔ مسلمان تو مسلمان وہ بھی جو سچے دل سے آپؐ کی صداقت کے قائل نہ تھے اس سے ڈرتے تھے کہ وحیٔ الٰہی جس کے متعلق انہیں تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ واقعاتِ غیبی کے پردہ درہے۔ کہیں ان کے مخفی جرائم اور دل کے کھوٹوں کو برملا ظاہر نہ کر دے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ	منافقین اس سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی
سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ	ایسی سورہ اترے جو ان کو اُن باتوں سے آگاہ
(التوبہ : ۶۴)	کر دے جو منافقوں کے دلوں میں ہیں۔

بنو نضیر کی سازش کی اطلاع ایک دفعہ ایک ضروری کام کے لئے آنحضرتؐ چند رفقائے خاص کے ساتھ بنو نضیر کے قلعہ میں تشریف لے گئے۔ یہود بنی نضیر نے آنحضرتؐ اور دیگر اکابر اسلام کے خفیہ قتل کا اس کو بہترین موقع سمجھا۔ چنانچہ جس دیوار کے نیچے آپؐ کھڑے تھے اس کی چھت پر ایک شخص چڑھ گیا کہ اوپر سے ایک بھاری پتھر آپؐ پر گرا دے کہ دب کر مر جائیں۔ اللہ تعالیٰ جو اپنے پیغمبر کی حفاظت کا کفیل تھا، اُس نے بروقت اطلاع دی اور

آپؐ فوراً اُن کے دام سے باہر نکل آئے اور اُن کو اور اُن کے اس ارادۂ فاسد کی اطلاع بھیج دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ	اے مسلمانو! خدا کے اس احسان کو جو اس
اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا	نے تم پر کیا یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے تم
إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ	پر دست درازی کا قصد کیا تو خدا نے تم سے
وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	اُن کے ہاتھوں کو روک دیا۔ اور اللہ
الْمُؤْمِنُونَ ○	سے ڈرتے رہو اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ اللہ
(المائدہ: ۱۴)	ہی پر بھروسہ رکھیں۔

مہاجرینِ حبش کو بشارت قریش کے گوناگوں مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اپنے ملک و وطن کو خیرباد کہہ کر حبش چلی گئی۔ اوّل تو غیر ملک اور بدیس میں ان مسلمانوں کا جانا ہی فکر و تردّد کا باعث تھا اور معلوم نہ تھا کہ حبش کے عیسائی بادشاہ اور امراء نئے مذہب کے ان پیروؤں کے ساتھ کیونکر پیش آئیں گے۔ اس سے زیادہ فکر کی چیز یہ تھی کہ رؤسائے قریش کے تجارتی تعلّقات کے باعث حبش کے امراء ان سے شناسا تھے اور باہم ان کے درمیان دیرینہ روابط تھے۔ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ تردّد انگیز یہ واقعہ ہوا کہ رؤسائے قریش نے اپنے گذشتہ تعلّقات کی بنا پر نجاشی کے دربار میں تحفہ تحائف دے کر اپنے سفراء اس غرض سے بھیجے تاکہ ان بے وطن مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہ دے۔ یہ تمام اسباب ایسے تھے جن کی بنا پر مسلمانوں کو عموماً اور مہاجرین کو خصوصاً اپنے مستقبل کی نسبت سخت تشویش کا پیدا ہونا ضرور تھا۔ اس بنا پر سکینتِ الٰہی نے ان کو امن و امان کا پیام سنانا ضروری سمجھا چنانچہ اسی تشویشناک اور تردّد انگیز عہد میں یہ آیت نازل ہوئی:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ	اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر مظلومی کی
مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا	حالت میں ہجرت کی ہم ان کو بالیقین دنیا
حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ	میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا ثواب
(النحل: ۴۱)	سب سے بڑا ہے۔

اگرچہ ہجرت کا لفظ عام ہے مگر اس دلیل سے کہ یہ سورہ قیام مکہ کے زمانہ کا ہے اور جن لوگوں نے اس عہد میں ہجرت کی تھی ان کا ذکر ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص مہاجرین حبش کے لئے بشارت ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ خدا کا یہ وعدہ کتنا سچا ہوا۔ نجاشی نے نہ صرف یہ کہ قریش کے سفراء کو خلاف توقع ناکام واپس کر دیا بلکہ مسلمانوں کو اس نے بڑی عزت سے جگہ دی اور خود اسلام کی طرف میلان ظاہر کیا۔ بعض مسلمان چودہ چودہ برس وہاں رہے اور اس اثناء میں کئی نجاشی سریر آرا ہوئے۔ مگر کسی نے ان سے تعرض نہیں کیا۔

ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی

آنحضرتؐ نے جس بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر کسی شخص کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بے خانماں قافلہ ایک دن مدینہ سے اس قدر طاقتور ہو کر نکلے گا کہ جن لوگوں نے ابتدائے نبوت سے آغاز ہجرت تک اس کی جان لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی وہ اس کے ہاتھوں خود ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ لیکن قرآن مجید دوسری پیشین گوئی کر رہا تھا۔ چنانچہ ہجرت سے ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں یہ آیت اتری:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اگر وہ تم کو سرزمین مکہ سے
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا	گھبرا چکے تاکہ تم کو اس سے
يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○	نکال دیں تو وہ تمہارے بعد بہت

(بنی اسرائیل : ۷) کم مدت باقی رہیں گے۔

چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ایک ہی سال کے بعد غزوۂ بدر نے صنادیدِ قریش کا خاتمہ کر دیا اور اہلِ عرب کی مخالفت کی جڑ کٹ گئی۔

مدینہ میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہو گا

عجب نہیں کہ مدینہ آکر مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو گیا ہو کہ ان کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس وقت کوئی ایسا قرینہ بھی نہ تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ قریش انتقام کے جوش میں نیام سے تلواریں کھینچ لیں گے اور تمام عرب اس مہم میں ان کا ہم آہنگ ہو جائے گا اور متصل آٹھ برس تک لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہے گا جس میں مسلمانوں کو تنگدستی، فاقہ، قتل و خونریزی ہر نوع کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مگر عالمِ غیب کا پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی پہنچ چکا تھا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ (البقرۃ : ۱۵۵)

اور ہم یقیناً تم کو کسی قدر خوف، فاقہ اور جانوں کی اور مال اور پھلوں کی کمی کی مصیبتوں سے آزمائیں گے۔

دینی اور دنیاوی شہنشاہی کا وعدہ

لیکن اس بے سروسامانی کے عالم میں اس بے خانماں گروہ کے ساتھ خداوند تعالیٰ نے ایک وعدہ اور بھی کیا اور ان کو خلافتِ ارض یعنی دینی و دنیاوی شہنشاہی کی بشارت دی۔ یہ بشارت واقعاتِ موجودہ کے کس قدر خلاف تھی مگر چند ہی سال میں محال نے وقوع کی صورت اختیار کر لی:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا خدا نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ	اُن کو زمین کا خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اُس
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ	نے تم سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور
دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَ	جو دین اُن کے لئے پسند کیا ہے اُس
لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	کو مستحکم کر دے گا اور ان کے خوف
اَمْنًا ط	کو امن سے بدل دے گا۔

(النور، ۵۵)

مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے یہ بشارت کس قدر عجیب و غریب تھی۔ مسلمانوں کا گروہ ایک مظلوم بیکس اور ضعیف گروہ تھا جس کو کفار نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر خانماں برباد کر دیا تھا اور اس نے مدینہ میں آکر خدا کے چند نیک بندوں کے سائے میں پناہ لی تھی۔ یہاں آکر بھی اُس کو اطمینان و راحت کی نیند نصیب نہ ہوئی۔ کفارِ مکہ پہلے ہی سے جان کے دشمن تھے۔ یہاں آکر دشمنوں کی تعداد میں منافقین اور یہود کا اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہؓ کو ہمیشہ کفار کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا اور ذرا سے شور و غل پر مدینہ میں بدحواسی پھیل جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صحابہؓ ہمیشہ سوتے جاگتے مُسلّح رہتے تھے۔ چنانچہ اس مظلوم گروہ نے اس حالت سے تنگ آکر ایک دن کہا کہ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم کو اطمینان حاصل ہوگا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہ ہوگا۔ اس پر اُن کو قرآن مجید نے خلافتِ ارض کی بشارت دی[1] اور وہ پوری ہوئی۔ اور اس گروہ نے دنیا پر اس طرح کامیاب حکومت کی اُس کے سامنے تمام متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس سے بڑھ کر اس پیشین گوئی کی صداقت کیا ہو سکتی ہے۔

قبائلِ عرب کی شکست ہوگی آنحضرتؐ کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے، اسلام کو

---

[1] مستدرک جلد دوم۔

جو غلبہ حاصل ہوا، کفار کو جو شکستیں ہوئیں قرآن مجید نے ان کے متعلق پیشین گوئیاں کیں۔ اور اس حالت میں کیں جب ظاہری اسباب کے لحاظ سے کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہر طرف سے کفار کا ہجوم تھا اور اس ہجوم کو دیکھ کر ان کو یقین تھا کہ تمام عرب مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کر دے گا خدا نے یہ اعلانِ عام دیا کہ عنقریب خود مسلمان تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ○ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ○ (القمر: ۴۴-۴۵)	کیا وہ کفار کہتے ہیں کہ ہم سب ایک اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ یہ جتھا عنقریب توڑ دیا جائے گا اور وہ پشت پھیریں گے۔
وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○ (الفتح: ۲۲)	اور اگر کفار تم سے لڑیں گے تو ان کو بھاگنا پڑے گا۔ پھر وہ کوئی حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔
قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ط (التوبۃ: ۱۴-۱۵)	تم اُن سے لڑو۔ خدا ان کو تمہارے ہاتھ سے عذاب دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور تم کو اُن پر فتح دے گا اور مسلمانوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور اُن کے دلوں کا غصہ دور کرے گا۔

اور یہ تمام پیشین گوئیاں آنحضرتؐ ہی کے زمانہ میں پوری ہوئیں۔ اسلام نے عرب کے تمام قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیا اور انہوں نے ہر موقع پر شکستیں کھائیں۔

قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے

مُصیبت زدہ اور بے سروسامان مسلمانوں کی تسکین کی خاطر آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے قریش کی تباہی و بربادی اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے متعدد وعدے کئے گئے تھے جن میں سے بعض آپؐ کی زندگی میں اور بعض آپؐ کی وفات کے بعد پورے ہونے والے تھے:

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ○ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ○

(الزخرف: ۴۱-۴۲)

پس اگر ہم تجھ کو اٹھالیں تو بھی ان کافروں سے انتقام لیں گے۔ اور اگر ہم تیری زندگی میں تجھ کو وہ دکھادیں جس کی دھمکی ان کافروں کو ہم نے دی ہے تو ہم ان پر یہ قدرت رکھتے ہیں۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ○

(المومن: ۷۷)

تو صبر کر، خدا کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ تو جس بات کی دھمکی ہم ان کافروں کو دیتے ہیں اس کو یا تیری زندگی میں دکھادیں گے یا تجھ کو موت دیں گے تو وہ ہمارے پاس ہی لوٹائے جائیں گے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ

اور اگر تیری ہی زندگی میں بعض وہ وعدے جو ہم نے ان سے کئے ہیں دکھادیں یا تجھ کو موت دے دیں تو تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔ کیا یہ کافر نہیں دیکھتے کہ (ہم اسلامی فتوحات کے ذریعہ سے) سرزمین (عرب) کے حدود میں (کافروں کے قبضہ کو) کم کرتے جاتے

(الرعد: ۴۰-۴۱) ہیں۔ خدا ہی اپنا حکم چلاتا ہے کوئی اس کے حکم کو ردّوبدل نہیں کر سکتا۔

فتح مکّہ کی پیشین گوئیاں جو چیز مسلمانوں کے دل سے لگی ہوئی تھی وہ فتح مکّہ تھی یعنی اس شہر پر قبضہ جہاں سے وہ نہایت بے بسی اور بے کسی کے عالم میں نکلے تھے اور جس کے حدود میں اُن کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گو اب مدینہ کے دارالسلطنت میں تھے تاہم وطن کی یاد دلوں سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اُن کو فتح پر فتح ہوتی جاتی تھی لیکن اُن کے دل کی کلی اپنی شگفتگی کے لئے جس موسمِ بہار کا انتظار کر رہی تھی وہ ہنوز نگاہوں سے دور تھا۔ مگر بشارتِ الٰہی ہر قدم پر اُن کے لئے تسکین کا پیام لا رہی تھی اور مژدۂ فتح سے اُن کو دل شاد کرتی جاتی تھی۔ سورۂ قصص میں یہ آیت اُتری:

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ

(القصص: ۵)

جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ تجھ کو ٹھکانے کی طرف پھر لوٹا کر لے جانے والا ہے۔

یعنی مکّہ[1] پھر سورۂ صف میں خدا نے مسلمانوں کو آخرت میں جنّت کی بشارت دینے کے ساتھ اس دُنیا میں بھی ایک بشارت دی:

وَ اُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

(الصّف: ۱۳)

اور دوسری نعمت جس کو تم دل سے چاہتے ہو وہ خدا کی طرف سے نصرت اور عنقریب فتح ہے۔ اور مسلمانوں کو بشارت سُنا دے۔

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور۔

صلحِ حدیبیہ سے پہلے خواب میں آپؐ کو خانۂ کعبہ کا داخلہ دکھایا گیا:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ

خدا نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دیا۔ تم لوگ یقیناً مسجدِ حرام میں اگر خدا نے چاہا تو بے خوف و خطر داخل ہوگے بال مُنڈا کر یا ترشوا کر، کسی سے نہ ڈروگے۔

(الفتح : ۲۷)

❊

حدیبیہ سے آپؐ واپس آرہے تھے کہ سورۂ فتح نازل ہوئی:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ

ہم نے کھلی فتح تم کو دی۔

(الفتح : ۱)

❊

آپؐ نے اُسی وقت حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ خوش خبری سُنائی۔ اُس کے دو برس کے بعد مکّہ کی دولت مسلمانوں کو مل گئی۔

خیبر اور حنین کی فتح کی پیشین گوئی ۶ھ ہجری کی صلحِ حدیبیہ میں فتحِ مکّہ کی پیشین گوئی کی جا چکی تھی جو ۸ھ میں پوری ہوئی۔ لیکن حدیبیہ کی صلح میں مسلمانوں نے رسولؐ کی اطاعت اور متابعت کا جو بہترین نمونہ پیش کیا تھا اور جس صبر اور تحمّل سے صلحِ حدیبیہ کے شرائط کو مسلمانوں نے تسلیم کر لیا تھا اس کے معاوضہ میں اللہ تعالیٰ نے دوسری فتوحاتِ عظیمہ کا وعدہ مسلمانوں سے کیا جن میں بے شمار مالِ غنیمت اُن کو ہاتھ آنے والا تھا:

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ هُوَ

تو خدا نے وہ جانا جو تم نے نہیں جانا۔ اور اس (فتحِ مکّہ) سے پہلے ایک عنقریب فتح

الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ○

(الفتح : ۲۷ — ۲۸)

تمہارے لئے بنائی۔ اور اسی نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے۔ اور خدا گواہ کافی ہے۔

یہ خیبر کی فتح تھی جو صلح حدیبیہ کے ایک سال کے بعد اور فتح مکہ سے ایک سال پہلے حاصل ہوئی اور جس پر عرب میں یہودیوں کی قوت کا خاتمہ ہوگیا اور اسلام کو عرب کے تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہوگیا۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ○ وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ

(الفتح : ۱۸ — ۱۹)

خدا مسلمانوں سے خوش ہوگیا۔ جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے تو ان کے دلوں میں جو تھا (یعنی فتح کے لئے بے چینی) اس کو جان لیا۔ تو اس نے ان پر تسکین نازل کی۔ اور مکہ کے بدلہ میں سر دست ایک فتح ان کو دی اور بہت سا مال غنیمت جس پر وہ قبضہ کریں گے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَیْدِیَ النَّاسِ عَنْكُمْ ج وَلِتَكُوْنَ اٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ

(الفتح : ۲۰)

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جس کو تم لوگے۔ تو یہ ایک غنیمت تم کو جلد عطا کردی اور لوگوں کی دست درازی کو تم سے روک دیا اور تاکہ مسلمانوں کے لئے ایک نشانی ہو۔

چنانچہ خیبر کی فتح میں مسلمانوں کو خیبر کی تمام سرسبز و شاداب زمینیں اور ہرے بھرے نخلستان مل گئے اور اس کے ایک سال بعد حنین کی فتح میں مالِ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ (چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی) مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

یہود کو اعلان عرب کے یہود اگرچہ آنحضرتؐ کی مخالفت میں جان و مال سے دریغ نہیں کرتے تھے تاہم یہ آنحضرتؐ کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق بعض پیشین گوئیاں ایسی کیں کہ اگر وہ ہمت سے کام لیتے تو اس کا ابطال خود ان کے امکان میں تھا۔ مثلاً یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ "وہ خدا کے چہیتے ہیں اور جنت ان کے لئے مخصوص ہے"۔ لیکن چونکہ جنت صرف مرنے کے بعد نصیب ہو سکتی ہے اور جن لوگوں کو اس کے ملنے کا یقینِ کامل ہو وہ اس کے لئے جان دینے سے دریغ نہیں کر سکتے، اس لئے قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق کہا:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○

(البقرۃ: ۹۴-۹۵)

کہہ اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے لئے مخصوص ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو۔ لیکن وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز یہ آرزو نہ کریں گے۔ خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ

کہہ اے یہود! اگر تمہارا یہ خیال ہے

زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○

کہ صرف تمہیں خدا کے دوست ہو تو اگر تم اس میں سچے ہو تو موت کی آرزو کرو۔ وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز اس کی آرزو نہ کریں گے۔ خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

(الجمعۃ: ۶-۷)

لیکن باوجود اس کے کہ وہ آنحضرتؐ کی تکذیب کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے اور آرزوئے موت اُن کے لئے ممکن تھی تاہم قرآن مجید کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور آج تک کسی یہودی نے لقائے الٰہی کی آرزو میں جان نہیں دی۔

یہود کی دائمی ناکامی | یہود سے دمبدم مقابلہ درپیش تھا اور پورے سات برس تک یہ مقابلہ درپیش رہا۔ یہود عرب میں بڑی طاقت رکھتے تھے۔ تمام مالی کاروبار اُن کے قبضہ میں تھا۔ اُن کے پاس بکثرت دولت تھی۔ عربوں سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں علانیہ فائق تھے۔ ہر طرح کا سامانِ جنگ رکھتے تھے اور فنِ جنگ سے بھی کما حقہٗ واقف تھے۔ مدینہ سے لے کر حدودِ شام تک اُن کے تجارتی قلعوں کی مسلسل قطاریں تھیں۔ اور اِدھر مسلمانوں کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہ تھی باایں ہمہ قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی زبانی یہ اعلانِ عام کر دیا:

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ لَنْ

اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو اُن کے لئے یہ بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایماندار اور اکثر فاسق ہیں۔ وہ تم کو سوا تھوڑی تکلیف

يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ○ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ

(آل عمران: ۱۱۱-۱۱۲)

دینے کے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اور اگر وہ تم سے لڑیں تو پشت پھیر دیں پھر اُن کی مدد نہ کی جائے گی۔ اُن پر ذلت جہاں کہیں وہ ہوں پھینک ماری گئی ہے۔ لیکن خدا کے کسی وسیلہ سے یا لوگوں کی سفارش سے کبھی کبھی اس ذلت سے بچ جائیں۔ خدا کا غضب لے کر وہ لوٹیں گے اور بیچارگی اُن پر چھادی گئی ہے۔

اُس وقت سے آج تک اُن کی ایشیا، افریقہ اور یورپ ہر جگہ کی تاریخ اس صداقت سے معمور پیشین گوئی کی صرف ظرفِ تصدیق ہے۔

روم کی قوّت ٹوٹ جائے گی | ۸ھ کے بعد مسلمانوں کا مقابلہ عرب کے مشرکین اور یہود سے زیادہ سخت اور طاقت ور دشمن رومی عیسائیوں سے آپڑا۔ رومن امپائر کی وسعت، قوّت، سامان، نظام، فوج، خزانہ کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کی حالت پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ ایک پرِ کاہ کا کوہ سے مقابلہ ہے۔ تاہم اسلام کے پیغمبرؐ کی زبان سے اُسی وقت یقین و تسلّی کے کلمات دنیا نے سُن لئے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

(الصف: ۹)

وہی خدا ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچّا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے۔

دنیا کو اس پیشین گوئی کی تصدیق کے لئے صرف چند سال کا انتظار کرنا پڑا۔

خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں | لیکن قرآن مجید کی پیشین گوئیاں صرف انہی غزوات کے ساتھ مخصوص نہ تھیں جو عہدِ نبوت میں پیش آئے۔ بلکہ اس کے بعد بھی خلفاء کے زمانہ میں جو عظیم الشان لڑائیاں واقع ہوئیں ان کے متعلق قرآن مجید نے پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی اور وہ آئندہ زمانہ میں پوری ہوئیں۔ مسلمانوں کو ایرانیوں اور رومیوں سے جو جنگ کرنا پڑی وہ تاریخِ اسلام کا ایک نمایاں واقعہ ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اس کے نتائج کا پہلے ہی سے اعلان کر دیا تھا:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ	جہاد میں جان چرانے والے بدوؤں سے
سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ	کہدو کہ تم کو ایک سخت طاقت ور قوم سے
شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ	جنگ کرنے کے لئے بلایا جائے گا تم لوگ
(الفتح : ۱۶)	ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہوں گے۔

چنانچہ یہ جنگ ہوئی اور وہی نتیجہ ہوا جس کو قرآن مجید نے دو صورتوں یعنی قتل اور اسلام میں محدود کر دیا تھا۔

وفاتِ نبویؐ کی پیشین گوئی | مکہ کی فتح کے بعد آپؐ کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا اور اس عام اصول کی بنا پر کہ انبیاءؑ اپنی زندگی کا مقصد پورا کرنے کے بعد نہیں رہتے وہ وقت آیا کہ آپؐ اپنے اصلی مرکز یعنی ملاءِ اعلیٰ سے جا ملیں۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس راز کو ایک مستقل پیشین گوئی کی صورت میں ظاہر کر دیا:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب خدا کی مدد اور فتح آگئی اور
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ	تم نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے

دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ	دین میں جُھنڈ کے جُھنڈ داخل ہو
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ	رہے ہیں تو خدا کی تسبیح اور استغفار
كَانَ تَوَّابًا ۝	کر۔ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

(النصر:۱-۳)

اس سورہ میں آپؐ کے وصال کی پیشین گوئی اگرچہ نہایت مبہم الفاظ میں کی گئی ہے لیکن اشارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مُژدۂ فتح نہیں بلکہ مژدۂ وصال ہے۔ کیونکہ مژدۂ فتح کے ساتھ تسبیح واستغفار کو کوئی مناسبت نہیں بلکہ اس کے لئے شکر موزوں ہے۔ تسبیح و استغفار کا اصلی وقت وہ ہے جب انسان دُنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ چنانچہ صحابہؓ میں جو لوگ نکتہ دانِ شریعت تھے وہ اس راز کو سمجھ گئے تھے۔[1]

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مذکور۔

آیات و دلائلِ نبوّیہ

بروایاتِ صحیحہ

گذشتہ صفحات میں صرف وہی آیات و دلائل بیان کی گئی ہیں جو صراحۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں یا کم از کم ان کے اشارات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ذیل میں اُن آیات و دلائل کا استقصا مقصود ہے جو صحیح اور مستند روایتوں سے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اس قسم کی آیات و دلائل کا بڑا حصہ گو فرداً فرداً خبرِ احاد سے ثابت ہے، مگر مجموعی حیثیت سے ان کا درجہ خبرِ مشہور تک پہنچ جاتا ہے مثلاً تھوڑی سی مقدار کا بڑھ کر زیادہ ہو جانا، ہاتھ سے پانی کے چشمہ کا اُبل پڑنا، امراض سے غیر معمولی طور پر شفایابی حاصل کرنا، دُعاؤں کا غیر معمولی طریق سے قبول ہو جانا۔ ان میں سے ہر قسم کے معجزات کے جزئی جزئی واقعے گو صرف ایک ایک دو دو راویوں کی زبانی بیان ہوئے ہیں، مگر ان میں سے ہر قسم کے معجزہ کے متعلق تو بر تو شہادتیں موجود ہیں، جن کی بنا پر ان میں سے ہر قسم کے معجزات خبرِ متواتر نہیں تو خبرِ مشہور تک ضرور پہنچ جاتے ہیں

البتہ بعثت سے پہلے جو عجائبات آپؐ سے صادر ہوئے یا غیر معمولی سوانح آپؐ کو پیش آئے ان کی صحت محدّثانہ اصول سے بہت کم ثابت ہے لیکن اس کی وجہ اس عہد میں اس قسم کے واقعات کا کم ہونا یا غلط ہونا نہیں ہے بلکہ اس عہد کے واقعات کے راوی چونکہ عموماً ماں باپ اور خاندان کے بڑے بزرگ ہوا کرتے ہیں اور آنحضرتؐ کے عہدِ بعثت کے بعد، بلکہ مدینہ کی پُر امن زندگی شروع ہونے کے بعد جب اسلام کے سلسلۂ روایات کا صحیح طریقہ سے آغاز ہوا تو آپؐ کے

خاندان کے بزرگوں میں سے جنھوں نے آپؐ کے بچپن اور نوجوانی کا عہد دیکھا تھا، کوئی موجود نہ تھا۔ والدین پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ دادا کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ چچاؤں میں ابولہب آپؐ کا دشمن ہی تھا۔ ابوطالب آغازِ اسلام ہی میں مر چکے تھے۔ حضرت حمزہؓ ہم سن تھے اور ۳ھ میں ہی شہادت پا چکے تھے۔ حضرت عباسؓ صرف برس دو برس بڑے تھے۔ اس بنا پر محدثانہ اصولِ تنقید کے معیار پر اس زمانہ کے واقعات کا سلسلۂ روایت بہت کم صحیح اُترتا ہے، اور اس لئے وہ غیر مستند ٹھہرتے ہیں۔

بہرحال تمام معجزات کے استقصا سے کچھ واقعات بعثت سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں، کچھ مکہ کی زندگی کے اور زیادہ تر مدینہ کے عہد کے جب اسلامی روایتوں کا سلسلہ راویوں کی کثرت کے باعث مستحکم ہو چکا تھا، ملتے ہیں۔ بعثت کے بعد جو معجزات ظاہر ہوئے ہیں وہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ مثلاً بعض واقعات اجسامِ کائنات میں تصرف اور تاثیر کے ہیں۔ بعض تکثیرِ اشیاء کے ہیں۔ بعض استجابتِ دُعا اور شفائے امراض وغیرہ کے ہیں۔ اس لئے ذیل میں ہر نوع کے معجزات کو ہم علٰحدہ علٰحدہ لکھتے ہیں۔

علاماتِ نبوّت

قبلِ بعثت

ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ ممتاز افراد کے سوانحِ زندگی میں شروع ہی سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ جب ان عام ممتاز افرادِ انسانی کا یہ حال ہے جو خاندانوں، قوموں اور ملکوں کے صرف ظاہری رہنما اور رہبر ہوتے ہیں، تو اس حیثیت سے ان برتر ہستیوں کی نسبت کیا شبہہ ہو سکتا ہے جو قوموں کے روحانی پیشوا اور انسانیت کے حقیقی رہبر اور رہنما ہوتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے ابتدائی سوانحِ زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ کتبِ سیر و دلائل کے مصنّفین نے آنحضرتؐ کی ولادت سے لے کر بعثت تک کے ان تمام واقعات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ مگر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے محدثانہ اُصول کی سخت گیری نے ہمارے لئے ان کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے۔ صحیح روایتوں سے اس عہد کے جو واقعات علاماتِ نبوّت کے تحت آ سکتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں :-

حضرت آمنہ کا خواب | متعدد صحابیوںؓ سے روایت ہے کہ صحابہ نے ایک دفعہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ! اپنا حال بیان فرمائیے۔ فرمایا "میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دُعا اور عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔ میری ماں نے جب میں پیٹ میں تھا، خواب دیکھا کہ ان کے بدن سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے"۔ یہ خالد بن معدان تابعی کی روایت ہے[1]

---

[1] ابن سعد جلد اوّل، مستدرک حاکم، جلد دوم۔

جو گو ابنِ سعد میں مُرسل ہے مگر مستدرک میں ہے کہ اُنہوں نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ صحابی کی روایت میں کچھ الفاظ زیادہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سُنا کہ میں خدا کا بندہ اور خاتمِ انبیاء اُس وقت سے ہوں کہ میرا باپ (آدمؑ) آب و گِل میں تھا۔ میں اس کی تفصیل بتاتا ہوں۔ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دُعا، عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی ماں آمنہ کا خواب ہوں۔ اور اسی طرح پیغمبروں کی مائیں خواب دیکھا کرتی ہیں۔" آنحضرتؐ کی والدہ نے آپؐ کی ولادت کے وقت خواب دیکھا کہ ایک نور ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے[1]

پھر یہ آیت پڑھی[2]:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ	اے پیغمبر! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝	سُنانے والا اور ڈرانے والا اور خدا کے حکم
وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا	سے خدا کی طرف پکارنے والا اور روشن
مُنِيرًا ۝ (الاحزاب: ۴۵-۴۶)	چراغ بنا کر بھیجا۔

ولادتِ نبویؐ کی پیشین گوئیاں یہود و نصاریٰ میں

احادیث، سیر اور دلائل کی کتابوں میں تو بر تو ایسی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہورِ نبویؐ کے عہد میں یہود و نصاریٰ خاص طور سے آنے والے پیغمبر کے منتظر تھے اور اس کے جلد ظہور اور بعثت کی مختلف پیشین گوئیاں کر رہے تھے۔ ان روایتوں میں سے گو ہر روایت بجائے خود ضعیف ہے، مگر ان کی مجموعی حیثیت سے یہ قدرِ مشترک ضرور نکلتی ہے کہ یہ عہد ان لوگوں کے نزدیک آنے والے پیغمبر کے خاص انتظار کا تھا اور مدینہ کے لوگوں میں اور مکہ کے جویانِ حق اشخاص میں اس پیغمبر کے ظہور کا خاص ذکر اور چرچا تھا۔

---

[1] مسند ابن حنبل، جلد چہارم، بیہقی، مستدرک، (علی شرط الصحیح)، جلد دوم و ابن سعد، جلد اوّل [2] مستدرک حاکم (صحیح) جلد دوم۔

بُت خانوں سے غیبی آوازیں اسی طرح ان کتابوں میں بکثرت روایتیں ایسی ہیں جن میں بیان ہے کہ آپؐ کی پیدائش کے بعد لوگوں نے بت خانوں کے اندر غیبی آوازیں سنی کہ "اب صنم خانوں کی بربادی کا زمانہ آگیا۔ پیغمبرِ صادق کی ولادت ظہور میں آچکی ہے"۔ ان روایتوں کا اکثر حصہ سخت کمزور اور ناقابلِ اعتبار ہے تاہم مجموعی شہادت سے اس قدر اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں اس قسم کا کوئی واقعہ ضرور ہوا تھا۔ چناں چہ صحیح بخاری کے حوالہ سے اس قسم کی ایک روایت آگے آتی ہے۔

شقِّ صدر تمام اربابِ سیر اور بعض محدثین کی روایت کی بنا پر بچپن کے زمانہ میں جب آپؐ حضرت حلیمہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے، شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا۔ ایک روایت میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہؐ! آپؐ کو سب سے پہلا غیبی واقعہ کیا پیش آیا"؟ اس کے جواب میں آپؐ نے دو فرشتوں کی آمد اور شقِّ صدر کا واقعہ بیان کیا۔[1] اس واقعہ کی سب سے مستند روایت وہ ہے جو حماد بن سلمہ اور ثابت البُنانی کے واسطہ سے صحیح مسلم، مسند احمد اور ابنِ سعد[2] وغیرہ میں ہے کہ آپؐ ایک روز بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے آپؐ کو پکڑ کر سینۂ مبارک کو چاک کیا اور قلبِ اقدس سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر پھینک دیا اور کہا کہ یہی حصہ تجھ میں شیطان کا تھا۔ پھر سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھو کر برابر کر دیا۔ لڑکے بھاگے ہوئے حلیمہؓ کے پاس آئے کہ "محمدؐ کو کسی نے مار ڈالا"۔ حلیمہ آئیں تو دیکھا کہ آپؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے سینہ میں اس زخم کے ٹانکے کے نشان

---

[1] مستدرک حاکم، جلد سوم باب معجزات، ابنِ سعد، جلد اوّل، مسند دارمی، باب کیف کان اوّل شان النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسند ابویعلی و ابونعیم و ابنِ عساکر و احمد (عن عتبہ بن عبدان)۔ [2] صحیح مسلم، باب الاسراء، ابنِ سعد، جلد اوّل و مسند ابنِ حنبل، روایات حضرت انسؓ جلد سوم۔

ہم کو نظر آتے تھے۔ مستدرک میں بھی اسی قسم کی ایک اور روایت[1] خالد بن معدان سے عتبہ بن عبد السلمی کے واسطہ سے مذکور ہے۔

ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کے مطابق میں نے اس واقعہ کو یہاں لکھ دیا ہے مگر اس باب میں میری جو ذاتی تحقیق ہے وہ اس سے پہلے (شرح صدر) حوالۂ قلم کر چکا ہوں۔

مبارک قدم ہونا روایتوں میں آپؐ کے مبارک قدم ہونے کے بہت سے واقعات مذکور ہیں مگر ان میں سے کوئی بطریق صحیح مروی نہیں۔ صرف ایک روایت صحیح طریقہ سے مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک صحابیؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اسلام سے پہلے جاہلیت میں حج کرنے گئے تھے۔ تو انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص طواف میں مصروف ہے اور اس کی زبان پر شعر میں یہ دُعا ہے :-

رُدّ الی راکبی محمدًا یارب ردّوا صطنع عندی یدا

اے میرے پروردگار ! میرے سوار محمدؐ کو واپس بھیج اور مجھ پر یہ ایک احسان کر :

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے ؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ عبد المطلب ہیں۔ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے پوتے کو اس کے ڈھونڈنے کے لئے بھیجا ہے اور وہ اب تک لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ اُن کا یہ پوتا ایسا ہے کہ انھوں نے جب کسی کام کے لئے اس کو بھیجا ہے اُن کو کامیابی ہی ہوئی ہے۔ کچھ دیر کے بعد آپؐ اونٹ لے کر واپس آتے نظر آئے۔ عبد المطلب نے سینہ سے لگا لیا۔[2]

---

[1] مستدرک، جلد دوم باب دلائل النبوۃ۔ [2] مستدرک حاکم، جلد سوم۔ ذہبی نے حاکم کی اس روایت کو علیٰ شرطِ مسلم تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ بخاری، ابنِ سعد، ابو یعلی، طبرانی، بیہقی، ابو نعیم اور ابنِ مندہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

بے ستری میں آپؐ کا غش کھا کر گرنا

آپؐ بچے تھے کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر درپیش ہوئی۔ تمام شرفائے مکہ اس مقدس گھر کے معمار اور مزدور بنے۔ بچے اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر لا رہے تھے انہی بچوں کی صف میں آنحضرتؐ اور آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ نے آنحضرتؐ سے کہا کہ تہبند کھول کر گردن پر رکھ لو کہ پتھر کی رگڑ سے گردن پر خراش نہ آئے۔ آنحضرتؐ نے چچا کے حکم کی تعمیل کی۔ دفعتہً آپؐ غش کھا کر گر پڑے اور آنکھیں پھٹ کر آسمان سے لگ گئیں جب ہوش آیا تو آپؐ کی زبان پر یہ لفظ تھے، "میرا تہبند۔ میرا تہبند"۔ لوگوں نے تہبند کمر سے باندھ دیا۔ صحیحین[1] کی روایت ہے۔ حاکم اور ابونعیم میں ہے کہ ابو طالب نے اس کے بعد واقعہ دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھے ایک سپید پوش مرد نظر آیا جس نے کہا کہ "ستر پوشی کرو"۔ بیہقی و ابنِ سعد میں اور حاکم کی دوسری روایت میں ہے کہ ندا آئی کہ "محمدؐ! اپنے ستر کو چھپاؤ"۔ ان روایتوں میں ہے کہ غیب کی یہ پہلی آواز تھی جو آپؐ کو سنائی دی۔

نیند طاری ہونا

حضرت علیؓ آنحضرتؐ سے سُن کر بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ بعثت سے پہلے صرف دو دفعہ میرے دل میں بُرا خیال آیا اور دونوں دفعہ خدا نے مجھے بچا لیا۔ ایک دفعہ رات کو میں نوجوان چرواہوں کے ساتھ مکہ کے باہر تھا۔ میرے دل میں آیا کہ شہر کے اندر جا کر لطفِ احباب اٹھاؤں۔ چلا تو سرِ راہ شادی کا ایک جلسہ نظر آیا۔ میں دیکھنے کھڑا ہو گیا تو خدا نے مجھ پر نیند طاری کر دی تو اس وقت تک میں نہ جاگا جب تک سورج کی کرنوں نے آ کر میرے شانے ہلائے۔ دوسری دفعہ جب خیال آیا تو پھر یہی واقعہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے جاہلیت کا کوئی ارادہ نہ کیا یہاں تک کہ خدا نے مجھ کو نبوت سے مشرف کیا۔[2]

---

[1] صحیح بخاری، جلد اوّل، کتاب المناقب باب بنیان الکعبہ و صحیح مسلم۔ [2] مسند ابنِ راہویہ ابنِ اسحٰق، بزار، بیہقی، ابونعیم ابنِ عساکر قال ابنِ حجر اسنادہ حسن متصل و رجالہ ثقاۃ (خصائص کبریٰ سیوطی جلد اوّل)، مستدرک حاکم جلد چہارم، علی شرط مسلم۔

صدائے غیب | آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ بیٹھے تھے۔ سامنے سے ایک خوبصورت سا آدمی گذرا۔ حضرت عمرؓ نے بلوا کر حال پوچھا اُس نے کہا میں جاہلیت میں کاہن تھا۔ دریافت کیا کہ اس زمانہ میں عجیب ترین واقعہ تم نے کیا دیکھا؟ اس نے کہا میں بازار میں تھا کہ میرا مؤکل جن میرے پاس گھبرایا ہوا آیا اور یہ شعر پڑھا ؎

الم تر الجن و ابلاسہا ویاسہا من بعد انکاسہا

ولحوقہا بالقلاص واحلابہا

حضرت عمرؓ نے فرمایا اُس نے سچ کہا خود مجھ پر اسی قسم کا ایک واقعہ گذرا۔ ایک دفعہ میں جاہلیت کے بتوں کے پاس سویا تھا کہ ایک آدمی بچھڑا لے کر آیا اور اُس کی قربانی کی۔ ناگاہ اس کے اندر سے بڑے زور سے چیخنے والے کی آواز آئی جس سے زیادہ چیخ کی آواز میں نے کبھی نہیں سُنی، آواز یہ تھی:۔

یا جلیح، امر نجیح، رجل فصیح — اے جلیح! کامیاب بات ایک فصیح آدمی

یقول لا الٰہ الا اللہ۔ — کہتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ آواز سُن کر سب لوگ کود کود کر بھاگ نکلے لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ٹلا اور دل میں کہا کہ اصل حقیقت دریافت کر کے ٹلوں گا۔ ناگاہ دوسری دفعہ اور پھر تیسری دفعہ وہی آواز آئی۔ اس واقعہ کو کچھ ہی دن گذرے تھے کہ مکہ میں یہ شہرہ ہوا کہ آپؐ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے[1]

پتھروں سے سلام کی آواز | آنحضرتؐ نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھ کو نبوت سے پہلے سلام کیا کرتا تھا۔ میں اب بھی اُس کو پہچانتا

---

[1] صحیح بخاری: باب اسلام عمرؓ۔

ہوں۔ یہ صحیح مسلم، مسند احمد اور مسند دارمی کی روایت ہے[1]۔ دوسری روایتوں میں[2] ہے کہ میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت کے زمانہ میں مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔

خواب میں فرشتوں کی آمد نبوّت سے پہلے آنحضرتؐ کو حالتِ خواب میں فرشتے نظر آیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آغازِ وحی سے پہلے رویا میں تین فرشتے آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ دوسرے لوگوں کے ساتھ کعبہ کے احاطہ میں آرام فرما رہے تھے۔ ایک فرشتے نے پوچھا ان میں وہ کون ہے؟ بیچ والے نے جواب دیا "ان میں جو سب سے بہتر ہے"۔ پچھلے نے کہا "تو ان میں سے بہتر کو لے لو"۔ اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے[3]۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الفضائل مسند احمد جلد پنجم و مسند دارمی: باب ما اکرم اللہ بہ نبیہ من ایمان الشجر بروایت جابر بن سمرہؓ۔ [2] جامع ترمذی: ذکر معجزات و ابو نعیم۔ [3] صحیح بخاری: کتاب التوحید و باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب الانبیاءؑ۔

اشیاء میں اثر

اشیاء میں اثر سے مقصود یہ ہے کہ بحکمِ الٰہی کبھی کبھی آپؐ کے فیض و برکت کی قوتِ اثر سے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہو گیا جس کی بناء پر اشیاء سے اُن کی فطرت کے مافوق یا اُن کے معمول کے برخلاف افعال، حرکات اور اثرات رُونما ہوئے۔ اس قسم کے معجزات حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی سیرت میں زیادہ نمایاں ہیں۔ مثلاً پانی کا خون ہو جانا، عصا کا سانپ بن جانا ہتھیلی کا چمکنے لگنا، عصا کی ضرب سے دریا کا خشک ہو جانا، چٹان سے پانی بہنے لگنا، اوس کے اُٹھانے سے دشمن کا شکست کھانا۔ آنحضرتؐ کو بھی یہ نشانیاں ملی تھیں جن میں سب سے مستند معجزہ شَقّ القمر ہے۔ جس کی تفصیل دلائلِ قرآنی کے ضمن میں پہلے گذر چکی۔ اس کے بعد ستونِ حنّانہ یعنی مسجدِ نبویؐ کے ستونِ خرما سے گریہ و بکا کی آواز پیدا ہونے کا واقعہ ہے۔

ستون کا رونا مسجدِ نبویؐ میں پہلے منبر نہ تھا۔ مسجد میں خرمے کے تنہ کا ایک ستون تھا۔ آپؐ اس سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ منبر تیار ہوا تو آپؐ نے اس پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دینا شروع کیا تو دفعتہً اُس ستون سے بچّوں کی طرح رونے کی آواز آنے لگی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اونٹنیوں کی طرح بلبلانے کی آواز آئی۔ یہ حاضرین کے اختلافِ مذاق کی بنا

پر رونے کی مختلف تشبیہیں ہیں۔ راویوں کا مشترک مقصود یہ ہے کہ دردِ فراق سے اس سے جزع وفزع کی آواز سُنائی دینے لگی۔ یہ دیکھ کر آنحضرتؐ منبر سے اُتر کر آئے اور ستون پر تسکین کے لئے ہاتھ رکھا اور اس کو سینہ سے لگایا تو آواز بند ہوگئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کا یہ رونا اس بنا پر تھا کہ یہ پہلے خدا کا ذکر سنا کرتا تھا[1]۔ یہ واقعہ حدیث وسیر کی کتابوں میں گیارہ مختلف صحابیوںؓ سے منقول ہے۔

منبر کا ہلنے لگنا ایک دفعہ آنحضرتؐ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ جلال وکبریائے الٰہی کا بیان تھا۔ آپؐ خود بہت متاثر تھے۔ حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا تو آپؐ داہنے بائیں ہل رہے تھے اور نیچے سے منبر اس زور سے ہل رہا ہے کہ مجھے ڈر ہوا کہ آپؐ کو لے کر گر نہ پڑے[2]۔

چٹان کا پارہ پارہ ہوجانا غزوۂ خندق میں تمام صحابہؓ مل کر مدینہ کے چاروں طرف دشمنوں سے بچنے کے لئے خندق کھود رہے تھے۔ اتفاق سے ایک بہت سخت چٹان نکل آئی۔

---

[1] صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ ومسند احمد وترمذی وابویعلی وابنِ ماجہ ودارمی (معجزات) ونسائی (باب خطبۃ الجمعہ)۔

[2] (۱) جابر بن عبداللہؓ (بخاری، نسائی، امام احمد، بزار، ابونعیم) (۲) سہیل بن سعدؓ (ابن ابی شیبہ، ابنِ سعد علی شرط الصحیحین)۔ (۳) عبداللہ بن عمرؓ (بخاری، امام احمد، ترمذی) (۴) انس بن مالکؓ (ترمذی، امام احمد، ابویعلی، ابنِ ماجہ، بزار، ابونعیم) (۵) ابی بن کعبؓ (امام احمد، امام شافعی، ابنِ ماجہ، دارمی، ابویعلی، ابنِ سعد) (۶) عبداللہ بن عباسؓ (امام احمد، ابن ماجہ علی شرط مسلم، ابنِ سعد، بیہقی، دارمی) (۷) ابوسعید خدریؓ (ابنِ ابی شیبہ، ابویعلی، دارمی، عبد بن حمید، ابونعیم علی شرط مسلم) (۸) بریدہؓ (دارمی)۔ (۹) مطلب بن دواعہ (زبیر بن بکار فی اخبار المدینہ) (۱۰) ام سلمہؓ (طبرانی، بیہقی) (۱۱) عائشہؓ (بیہقی وابونعیم)

[3] صحیح مسلم: باب ابتداء الخلق، ابنِ ماجہ ذکر البعث، مسند احمد عن ابن عمر وغیرہ۔

لوگوں نے ہر چند اس کو توڑنا چاہا مگر وہ نہ ٹوٹی۔ کدالیاں اس پر پڑ پڑ کر اچٹ جاتی تھیں۔ آخر لوگوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر صورتِ حال عرض کی۔ آپؐ اٹھ کر خود تشریف لائے اور کدالی ہاتھ میں لے کر ایک ضرب لگائی تو وہ چٹان ریگ ہو کر چور چور ہو گئی۔[1]

درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ مکہ میں ایک طرف کو نکلا تو میں نے دیکھا کہ جو پہاڑ اور درخت بھی سامنے آتا ہے اُس سے اَلسَّلَامُ یَارَسُوْلَ اللّٰہ کی آواز آتی ہے اور میں اُس کو سُن رہا تھا۔[2]

پہاڑ کا ہلنا

صحیح بخاری میں ہے ایک دن آپؐ اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ[3] اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ[4] بھی تھے، ایک پہاڑ پر چڑھے۔ پہاڑ جنبش کرنے لگا۔ آپؐ نے پہاڑ کو پائے مبارک سے ٹھوکر مار کر فرمایا "ٹھہر جا! کہ تیری پشت پر اس وقت پیغمبر ہے یا صدیق ہے یا شہید ہے۔"[5]

صحیح بخاری میں راوی کو شک ہے کہ یہ پہاڑ کوہِ اُحد تھا یا کوہِ حرا، مگر صحیح مسلم اور مسند احمد میں صرف کوہِ حرا کا اور مسند ابویعلی اور بیہقی میں صرف کوہِ اُحد کا نام ہے۔ بہرحال اگر یہ کوہِ اُحد تھا تو مدینہ کا یہ واقعہ ہے اور اگر کوہِ حرا تھا تو مکہ کا ہے۔

آپؐ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا

فتح سے پہلے خانۂ کعبہ تین سو ساٹھ بتوں کا معبد تھا۔ جب مکہ فتح ہوا تو آپؐ کعبہ میں تشریف لے گئے۔ دست مبارک میں ایک چھڑی تھی اور زبانِ اقدس پر یہ آیتِ کریمہ جاری تھی:-

---

[1] صحیح بخاری: (غزوۂ خندق) و نسائی، (کتاب الجہاد) و بیہقی و ابونعیم و ابنِ سعد و ابنِ اسحاق و ابنِ جریر۔ [2] جامع ترمذی، ذکر معجزات بروایتِ حسن۔ [3] صحیح بخاری: مناقب ابی بکرؓ۔ [4] صحیح مسلم، فضائل حضرت طلحہؓ و زبیرؓ۔ [5] صحیحین کے علاوہ یہ واقعہ مسند ابنِ حنبل بروایتِ بریدہ اور ترمذی، نسائی اور دارقطنی بروایتِ حضرت عثمانؓ اور ابویعلی اور بیہقی میں بروایتِ سہل بن سعد مذکور ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ	حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل مٹنے
الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝	ہی کے لئے آیا تھا۔

(بنی اسرائیل: ۸۱)

آپؐ چھڑی سے جس بُت کی طرف اشارہ کرتے تھے وہ بے چھوئے دھم سے گر پڑتا تھا۔[1]

یہ واقعہ کہ کعبہ کے چاروں طرف تین سو ساٹھ بت تھے اور آپؐ دستِ مبارک میں چھڑی لے کر اُن بتوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور آیتِ مذکور تلاوت کرتے جاتے تھے، صحیح بخاری و مسلم باب فتحِ مکہ میں موجود ہے۔ مگر اس اشارہ سے بے چھوئے بتوں کا خود بخود گرتے جانا صحیحین میں مذکور نہیں۔ البتہ فاکہی میں بروایتِ عمر اور طبرانی، ابنِ اسحاق اور ابونعیم میں بروایت ابن عباسؓ موجود ہے۔ فاکہی کی روایت کو ابنِ حبان نے صحیح کہا ہے۔ صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح میں جو روایت ہے اُس سے ضمناً اس کے خلاف یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے اُن لوگوں سے اکھڑوا کر پھنکوا دیا۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباس لما قدم رسول	ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ جب
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی ان	آپؐ مکہ آئے تو اس حالت میں کہ خانہ کعبہ کے اندر
یدخل البیت وفیہ الالھۃ	بُت تھے۔ آپؐ نے اس کے اندر جانے سے
فامر بھا فاخرجت۔	انکار کیا۔ تو آپؐ نے ان کے باہر نکال دینے
	کا حکم دیا تو وہ باہر نکال دیئے گئے۔

اگر فاکہی، طبرانی، ابنِ اسحاق اور ابونعیم کی روایتِ بالا صحیح ہو تو اس میں اور بخاری کی اس روایت میں یہ تطبیق ممکن ہے کہ پہلے جن بتوں کا ذکر ہے وہ حول البیت یعنی خانہ کعبہ کے باہر

---

[1] فاکہی بتصحیح ابنِ حبان و بیہقی و طبرانی و ابونعیم۔

چاروں طرف تھے۔ آپؐ اُن کی طرف اشارہ کر کے آیتِ مذکور کو پڑھتے تھے اور وہ گر جاتے تھے اور خانۂ کعبہ کے اندر جو بُت تھے، اپنے اندر جانے سے پہلے آپؐ نے اُن کو نکلوا کر پھکوا دینے کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح بخاری و مسلم کی فتحِ مکّہ والی روایت میں جن بتوں کو چھڑی سے کونچے دینے کا ذکر ہے وہ وہ ہیں جو باہر تھے یعنی حولُ البیت اور جن کے نکلوانے کا ذکر بخاری کی دوسری روایت میں ہے وہ خانۂ کعبہ کے اندر تھے۔

کھانوں سے تسبیح کی آواز | حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ معجزوں کو خوف کی چیز سمجھتے ہو اور ہم لوگ اُن کو برکت سمجھتے تھے۔ ہم کھانوں سے جب وہ کھائے جاتے تھے تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔

زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا | ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا اور سورۂ بقرہ و آلِ عمران پڑھی۔ آنحضرتؐ نے اس کے متعلق کتابتِ وحی کی خدمت کی۔ چند دنوں کے بعد وہ مرتد ہو کر بھاگ گیا اور عیسائی ہو گیا۔ اور مشہور کیا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی دکھائی یعنی اس کو موت دے دی۔ اس کے دوستوں نے اس کو دفن کیا تو صبح کے وقت لاش قبر کے باہر تھی۔ اُس کے دوستوں کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ یہ محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ کا کام ہے۔ چونکہ وہ اُن سے علیٰحدہ ہو گیا اس لئے قبر کھود کر اس کو باہر پھینک دیا۔ اس خیال سے اُن لوگوں نے اب کی مرتبہ خوب گہری قبر کھود کر اس میں اُس کو دفن کیا۔ صبح کے وقت پھر مردہ قبر سے باہر تھا۔ اب اُن کا یہ خیال پختہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں ہی کی حرکت ہے۔ پھر جس قدر وہ گہری قبر کھود سکتے تھے کھود کر اس میں اس کو دفن کیا۔ صبح کو دیکھا تو پھر وہی منظر سامنے تھا۔ اب اُن کو یقین ہوا کہ یہ آدمی کا کام نہیں۔ چنانچہ اس کو اسی طرح

لہ صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ۔

زمین پر چھوڑ دیا۔[1]

درختوں کا چلنا ایک بار آپؐ سفر میں قضائے حاجت کے لئے نکلے۔ حضرت جابرؓ پانی لئے ہوئے ساتھ تھے۔ آپؐ نے میدان میں اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی چیز آڑ کرنے کے لئے نہ ملی۔ میدان کے کنارے صرف دو درخت تھے۔ آپؐ ایک درخت کے پاس گئے اور اُس کی ایک ڈالی کو پکڑ کر کہا کہ خدا کے حکم سے میری اطاعت کر۔ وہ فرمانبردار اونٹ کی طرح آپؐ کے ساتھ ہولیا۔ پھر دوسرے درخت کے نزدیک تشریف لے گئے اور وہ بھی اسی طرح آپؐ کے ساتھ چل پڑا۔ پھر آپؐ نے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا اور فرمایا کہ خدا کے حکم سے باہم جڑ جاؤ۔ دونوں باہم مل گئے۔ جب اُن کی آڑ میں فراغت کر چکے تو پھر دونوں درخت الگ الگ اپنی اپنی جگہ پر آ گئے۔[2]

اسی قسم کا واقعہ دوسرے سفروں میں بھی پیش آیا ہے۔ چنانچہ صحابہؓ نے اپنی عینی شہادت کی بنا پر اس کو بیان کیا ہے۔ حضرت اُسامہ بن زیدؓ حجۃ الوداع میں[3] اور حضرت یعلی بن مرّہؓ نے کسی[4] سفر میں اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔

ایک اور واقعہ ہے کہ آپؐ ایک روز اہلِ مکّہ کی ایذا رسانی سے نہایت غمگین بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں حضرت جبریلؑ آئے اور انہوں نے دریافت کیا تو حضرت جبریلؑ نے کہا یا خود آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، (روایتیں مختلف

---

[1] صحیح بخاری: باب علامات النبوّۃ ۔ [2] صحیح مسلم: حدیث جابر الطویل (احمد و دارمی و بیہقی باختلاف یسیر۔ [3] بسند ابو یعلی و بیہقی و ابو نعیم۔ حافظ ابنِ حجر نے مطالبِ عالیہ میں اس روایت کی تحسین کی ہے۔ [4] امام احمد بروایت یعلیٰ بن مرّہ و ابنِ شیبہ برجال ثقات و حاکم بروایت صحیح۔

ہیں، کہ" مجھے ایک ایسی نشانی دکھا جو اس غم کو مجھ سے دور کر دے"۔ حکم ہوا کہ میدان کے کنارے جو ایک درخت ہے آپؐ اُس کو بلائیے۔ آپؐ نے بلایا تو وہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس سے واپس جانے کو کہا تو وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ آپؐ نے فرمایا "اب مجھے کوئی غم نہیں"۔[1]

خوشۂ خرما کا چلنا آپؐ کی خدمت میں ایک بدّو آیا اور کہا کہ مجھے یہ کیونکر یقین ہو کہ آپؐ پیغمبر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا اگر میں اس خوشۂ خرما کو بلا لوں تو تم میری نبوّت کی شہادت دو گے؟ اس نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے خوشۂ خرما کو بُلایا اور وہ درخت سے اُتر کر آپؐ کے پاس آیا اور پھر آپؐ کے حکم سے واپس گیا۔ بدّو فوراً اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان لایا۔[2]

درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا آپؐ ایک سفر میں تھے کہ ایک بدّو آتا ہوا نظر آیا۔ جب وہ آپؐ کے قریب آگیا تو آپؐ نے پوچھا "کہاں جاتے ہو"؟ اُس نے جواب دیا "مکان کا ارادہ ہے"۔ پھر آپؐ نے فرمایا "تمہیں نیکی کی حاجت ہے"؟ اُس نے کہا "وہ نیکی کیا ہے"؟ آپؐ نے کلمۂ توحید کی تلقین کی اُس نے کہا "اس کی شہادت کون دیتا ہے"؟ آپؐ نے فرمایا "سامنے کا یہ درخت"۔ چنانچہ یہ کہہ کر آپؐ نے وادی کے کنارے سے اُس درخت کو بُلایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور آپؐ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے تین بار اُس سے کلمۂ توحید پڑھوایا اور اُس نے پڑھا۔ پھر وہ اپنی جگہ پر

---

[1] سنن ابن ماجہ: باب الصبر علی البلاء، و مسند احمد عن انس بن مالکؓ و ابنِ سعد و بزار و بیہقی عن عمر بن الخطابؓ۔

[2] ترمذی (معجزاتِ نبوی)، نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام بخاری نے تاریخ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور ابو یعلی نے ابنِ عباسؓ سے اس کی روایت کی ہے۔

واپس چلا گیا۔ اور بدّو یہ کہہ کر اپنے مکان کو روانہ ہوا کہ اگر میرے اہل و عیال نے بھی اسلام قبول کر لیا تو اُن سب کو لے کر آؤں گا ورنہ تنہا آپؐ کے ساتھ قیام کروں گا۔"

بے دودھ کی بکری نے دودھ دیا عبداللہ ابنِ مسعودؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نوخیز چھوکرا تھا۔ عقبہ بن معیط ایک قریشی کافر رئیس کی بکریاں مکّہ میں چرایا کرتا تھا۔ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کا ادھر سے گذر ہوا۔ آپؐ نے مجھ سے کہا "لڑکے! تمہارے پاس دودھ ہے؟ ہم کو پلاؤ گے"؟ میں نے

---

[1] مسند دارمی بسندِ صحیح و بزار و ابونعیم باختلافِ یسیر، و ابنِ سعد جلد اوّل۔ [2] یہ روایت مسند ابوداؤد طیالسی، مسند ابنِ حنبل، ابنِ سعد اور دلائل ابی نعیم میں ہے۔ طیالسی اور ابونعیم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ جب مشرکین سے بھاگے تھے تب یہ واقعہ پیش آیا یعنی ہجرت کے ایام میں۔ طیالسی کی اس روایت کا سلسلۂ سند ہر طرح سے محفوظ ہے۔ ابوداؤد، حماد بن سلمہ سے اور وہ عاصم ابن بہدلہ سے اور عاصم زر بن حبیش سے اور وہ خود عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔ یہ تمام اصحاب ثقہ اور معتبر ہیں۔ بایں ہمہ اس واقعہ کو زمانۂ ہجرت میں قرار دینے سے متعدد خرابیاں نظر آتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت میں کسی صاحب سے بھول ہوئی ہے۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہجرت کے وقت نوخیز لڑکے تھے اور ابھی تک قرآن مجید سے ناواقف تھے۔ بلکہ مسلمان بھی نہ تھے۔ حالانکہ وہ ہجرت سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے۔ وہ چھٹے مسلمان تھے اور ہجرت کے وقت وہ حبش میں تھے اور وہاں سے اس وقت لوٹے جب آنحضرتؐ مدینہ جا چکے تھے جیسا کہ نماز میں سلام کرنے والی روایت سے جو حدیث کی تمام کتابوں میں ہے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس وقت مکّہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھے۔ اس روایت کے ان الفاظ کے متعلق میں اپنے یہ شکوک لکھ چکا تھا کہ رجال اور سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا حال الٹ پلٹ کر پڑھا۔ سب نے اُن کے حال میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ مگر ان شبہات پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔ اسی اثنا میں فتح الباری جلد ہجرت اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعینہٖ یہی اعتراضات حافظ ابنِ حجر کے ذہن میں بھی گذرے ہیں۔ لیکن انہوں نے حسبِ دستور مختلف روایات کی تطبیق کے متعلق جو

کہا "میں امین ہوں تم کو نہیں پلا سکتا"۔ آپؐ نے پوچھا "اچھا کوئی بکری کا بچہ ہے"؟ میں نے کہا "ہاں"۔ فرمایا "لے آؤ"۔ میں لے آیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بچہ پکڑا اور آنحضرتؐ نے تھن میں ہاتھ لگایا اور دعا کی۔ ابوبکرؓ ایک گہرا پتھر لے آئے اس میں دودھ دوہا گیا۔ پہلے آپؐ نے خود پیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے پیا۔ اُس کے بعد حضرت ابنِ مسعودؓ کہتے ہیں کہ پھر مجھے پلایا۔ دودھ پی کر آپؐ نے فرمایا "اے تھن! سمٹ جا"۔ وہ سمٹ کر خشک ہوگیا۔ اس کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۴) اُن کا عام اصول ہے، اس سے کام لے کر آگے بڑھ گئے ہیں یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے یہ ہجرت کے علاوہ کسی اور زمانہ کا واقعہ ہو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہجرت کے علاوہ کوئی اور زمانہ ایسا نہیں جس میں آنحضرتؐ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مشرکین سے بھاگے ہوں۔ لیکن الحمدللہ کہ اثنائے تحقیق میں مجھے مسند احمد بن حنبل (جلد اوّل) میں یہی روایت اسی قسم کی سند سے مل گئی ہے جس میں ان قابلِ اعتراض الفاظ کے بجائے مطلق یہ الفاظ ہیں کہ "میں بکریاں چرا رہا تھا کہ آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا"۔ اس میں فرار اور ہجرت کا مطلق ذکر نہیں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہجرت سے بہت پہلے کا کوئی واقعہ ہے۔ پہلے الفاظ کے راوی عاصم سے ان کے شاگرد حمّاد بن سلمہ ہیں اور دوسرے الفاظ کے راوی ان ہی کے شاگرد ابوبکر عیاش ہیں۔ گو حافظہ کی خرابی اور اغلاط کی کثرت میں یہ دونوں برابر ہیں تاہم ناقدانہ وجوہ ابوبکر بن عیاش کی تائید میں ہیں۔ پہلی روایت میں فرّ (بھاگے) کا لفظ ہے اور دوسری میں "مرّ" (یعنی گذرے) کا لفظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راویوں میں فرّ اور مرّ کے الفاظ میں باہم تشابہ ہوگیا ہے اور بعد کو پھر فرّ کی مناسبت سے عن المشرکین بڑھ گیا ہے۔ ابنِ سعد نے بسند حسن (جلد اوّل) اس واقعہ کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے جس سے تمام مسئلہ صاف ہوجاتا ہے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ کہتے ہیں میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا۔ میں گھر کی بکریاں چرا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کسی بکری میں دودھ ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے ایک بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا فوراً دودھ اُتر آیا تو میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں مانتا۔

بعد میں آپؐ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ اس عمدہ کلام یعنی قرآن مجید میں سے مجھے کچھ سکھائیے۔ فرمایا "تم سیکھنے والے لڑکے ہو"۔ تو میں نے خود آنحضرتؐ کے منھ سے ستر سورتیں سیکھیں جن میں کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ابنِ سعد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ میرے اسلام لانے میں اسی معجزہ کو دخل ہے[1]۔

سُست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا

ابو طلحہؓ صحابی کا گھوڑا نہایت سُست رفتار اور مٹھا تھا۔ ایک دفعہ مدینہ میں شور و غل ہوا۔ آپؐ نے اسی گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگایا۔ وہ آپؐ کی سواری کی برکت سے اس قدر تیز رو ہو گیا کہ جب آپؐ واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ "یہ تو دریا ہے"۔ اس کے بعد کوئی گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا[2]۔

اندھیرے میں روشنی ہونا

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ دو صحابیؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں رات کو دیر تک حاضر رہے۔ جب واپس ہوئے تو رات بہت اندھیری تھی۔ مگر خدا کی قدرت کہ اُن کے سامنے دو چراغوں کی طرح آگے آگے کوئی چیز روشن ہو گئی۔ جب دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے گھر چلے تو ایک چراغ ایک کے ساتھ اور دوسرا دوسرے کے ساتھ ہو گیا یہاں تک کہ دونوں گھر چلے گئے۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے[3]۔ اس میں ان دونوں صحابیوں کے ناموں کی تصریح نہیں لیکن حاکم، ابنِ سعد، بیہقی اور ابو نعیم میں حضرت انسؓ نے اُن کے نام عباد بن بشرؓ اور اُسید بن حضیرؓ بتائے ہیں۔ اور ان میں یہ اضافہ ہے کہ یہ روشنی اُن کی لکڑیوں کے سروں میں پیدا ہو گئی تھی۔ ابو نعیم کی ایک دوسری روایت میں جو حضرت انسؓ ہی سے مروی ہے، عباد بن بشرؓ اور اسید بن حضیرؓ کے بجائے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے نام ہیں۔

---

[1] ابنِ سعد: جلد اوّل۔ [2] صحیح بخاری: کتاب الجہاد باب الرکوب علی الدابۃ الصعبۃ جلد اوّل۔
[3] صحیح بخاری: باب علاماتِ النبوۃ۔

روایت کی صحت کی صورت میں ممکن ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہو۔ نیز حاکم، بیہقی اور ابونعیم میں اسی قسم کا واقعہ ابوعبس بن جبرؓ صحابی جو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھا کرتے تھے، اُن کو بھی ایک دفعہ پیش آنا بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ بخاری اور بیہقی میں ایک سفر میں اندھیری رات کو حمزۃ الاسلمیؓ کی انگلیوں کا روشن ہو جانا بھی مذکور ہے۔

جانور کا سجدہ کرنا حدیث کی اکثر کتابوں میں چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ روایت مذکور ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری کا اونٹ باولا ہو گیا تھا یا بگڑ گیا تھا۔ لوگوں نے جا کر آپؐ کو خبر کی۔ آپؐ نے اس کے پاس جانا چاہا تو سب نے روکا کہ "یا رسول اللہؐ! یہ آدمی کو کتے کی طرح کاٹ کھاتا ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کا خوف نہیں۔ یہ کہہ کر آپؐ آگے بڑھے تو اونٹ نے آپؐ کے سامنے آکر اپنی گردن ڈال دی۔ آپؐ نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کو پکڑ کر اس کے مالک کے حوالہ کر دیا۔ پھر فرمایا "ہر مخلوق جانتی ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ لیکن گنہگار انسان اور نافرمان جن۔" صحابہؓ نے یہ منظر دیکھ کر کہا "یا رسول اللہؐ! جب جانور آپؐ کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو سب سے پہلے کرنا چاہیئے۔" آپؐ نے فرمایا "اگر کسی انسان کا دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔"[1]

جانور کا آپؐ کے مرتبہ کو پہچاننا ایک دفعہ آپؐ ایک انصاری کے باغ میں گئے۔ ایک اونٹ گھر آ چلا رہا تھا۔ آپؐ کو دیکھ کر وہ بلبلانے لگا اور اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ آپؐ نے قریب جا کر اوس کے سر اور کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہو گیا۔ آپؐ

---

[1] دارمی۔ [2] امام احمد بن حنبل نے مسند میں متعدد صحابیوں کی سند سے یہ واقعہ نقل کیا ہے چنانچہ کتاب مذکور میں حضرت جابرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی مسند دیکھو۔ نیز سنن نسائی، ابن ابی شیبہ، طبرانی و بیہقی اہل دلائل نے اس ایک واقعہ کو ذرا ذرا سے لفظی اختلاف کے باعث متعدد واقعات بنا دیا ہے۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ششم۔

نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام بتایا۔ وہ بلوائے گئے تو آپؐ نے فرمایا "تم ان جانوروں پر جن کو خدا نے تمہارا محکوم بنایا ہے، رحم کیا کرو۔ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اُس کو تکلیف دیتے ہو"[1]

حافظہ بڑھ جانا تمام صحابہؓ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایتیں سب سے زیادہ ہیں حالانکہ وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں صرف تین چار برس رہے تھے۔ لوگوں کو آج بھی اس پر تعجب ہے اور خود اُن کے زمانہ میں بھی تھا۔ لیکن حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائی تو بیوپار میں لگے رہتے تھے اور انصاری بھائی اپنے کھیتوں میں اور میرا آپؐ کی خدمت میں حاضری کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ایک دن خدمت میں حاضر تھا کہ زبانِ مبارک سے نکلا کہ "جو دامن پھیلا کر اس وقت میری باتیں سینہ میں سمیٹ لے گا وہ پھر کبھی نہ بھولے گا۔ میں نے دامن پھیلایا۔ جب کلامِ مُبارک ختم ہوا۔ سینہ میں سمیٹ لیا۔ اس وقت سے کوئی بات نہ بھولا"[2]

صحیح بخاری میں یہی واقعہ ایک اور طرح سے بھی مذکور ہے چنانچہ وہ آگے آئے گا۔

---

[1] ابوداؤد: کتاب الجہاد باب الشفقہ علی البہائم و مسند احمد بسند عبداللہ بن جعفر و مسلم بسند مہدی بن میمون (البدایہ) ابونعیم وغیرہ میں اسی واقعہ میں اور بہت سی نامستند باتیں شامل ہیں۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم: مناقب ابوہریرہؓ۔

شفائے امراض

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ○ (الشعراء : ۸۰)

(اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے)

پیغمبر دنیا میں درحقیقت بیمار دلوں کے روحانی طبیب بن کر آتے ہیں مگر کبھی کبھی ارواح و قلوب کے معالجہ میں اُن کو جسمانی امراض و عوارض کا علاج بھی کرنا پڑتا ہے۔ تمام انبیاءؑ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اس وصف میں سب سے ممتاز ہے۔ آنحضرتؐ کو بھی اس قسم کے معجزات کا وافر حصہ ملا تھا۔

حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہو جانا حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سلمہ بن اکوعؓ اور حضرت سہیل بن سعدؓ تین چشم دید گواہوں سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر میں جب آپؐ نے علم عطا فرمانے کے لئے حضرت علی ابنِ ابی طالبؓ کو طلب فرمایا تو معلوم ہوا کہ اُن کی آنکھوں میں آشوب ہے۔ اور یہ آشوب جیسا کہ مسند ابنِ حنبل میں ہے، ایسا سخت تھا کہ ایک صاحب سلمہ بن اکوعؓ اُن کا ہاتھ پکڑ کر لائے تھے۔ آپؐ نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن مل دیا اور دم کر دیا۔ وہ اُسی وقت اچھی ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی درد تھا ہی نہیں[1]۔

---

[1] صحیح بخاری: باب غزوۂ خیبر و مناقبِ علیؓ کتاب الجہاد و صحیح مسلم: باب فضائل علیؓ و مسند ابنِ حنبل جلد چہارم۔ سہیل بن سعدؓ اور سلمہ بن اکوعؓ کی روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے اور حضرت سعدؓ کی روایت صرف مسلم میں ہے۔

ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہوجانا | حضرت عبداللہ بن عتیکؓ قلعہ میں داخل ہوکر جب ابورافع یہودی کو قتل کرکے واپس آنے لگے تو کوٹھے کے زینہ سے گر پڑے جس سے اُن کی ایک ٹانگ میں سخت چوٹ آئی۔ پہلے پہل تو یہ چوٹ معلوم نہیں ہوئی لیکن بعد کو یہ حالت ہوئی جیسا کہ ابنِ اسحاق میں ہے کہ اُن کے ہمراہی اٹھاکر اُن کو لائے۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا آپؐ نے اس ٹانگ پر دستِ مبارک سے مسح کردیا اور وہ فوراً بالکل اچھی ہوگئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ کبھی چوٹ لگی ہی نہ تھی[1]

تلوار کے زخم کا اچھا ہونا | غزوۂ خیبر میں حضرت سلمہ بن اکوعؓ کی ٹانگ میں تلوار کا زخم لگ گیا۔ وہ آنحضرتؐ کے پاس آئے، آپؐ نے اس پر تین مرتبہ دم کردیا۔ پھر انہیں کوئی شکایت محسوس نہیں ہوئی صرف نشان رہ گیا تھا[2]

غزوۂ حنین میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاؤں میں زخم لگا۔ جب لڑائی ختم ہوچکی تو آنحضرتؐ کو معلوم ہوا۔ آپؐ حضرت خالدؓ کی فرودگاہ پوچھتے ہوئے اُن کے پاس آئے۔ دیکھا کہ کجاوہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آپؐ نے اُن کے زخم پر ایک نگاہ ڈالی اور اس پر لُعاب دہن ڈال دیا۔ زخم اچھا ہوگیا[3]

اندھے کا اچھا ہونا | آپؐ کی خدمت میں ایک اندھا حاضر ہوا اور اپنی تکلیفیں بیان کیں۔ آپؐ نے فرمایا "اگر چاہو تو دعا کردوں اور اگر چاہو تو صبر کرو اور یہ تمہارے لئے اچھا ہے"۔ عرض کی کہ دُعا کیجئے۔ فرمایا اچھی طرح وضو کرکے یہ دعا مانگو کہ خداوندا! اپنی رحمت والے

---

[1] صحیح بخاری: باب قتل ابی رافع میں یہ واقعہ دو طرح بیان ہوا ہے۔ یہاں ان دونوں میں تطبیق کردی گئی ہے [2] صحیح بخاری: باب غزوۂ خیبر و مسند ابنِ حنبل جلد چہارم۔ حدیث مسلمہ بن اکوعؓ۔ [3] مسند ابنِ حنبل جلد چہارم وعبدالرزاق وعبد بن حمید وابنِ عساکر۔

پیغمبر کے وسیلہ سے میری حاجت پوری کردے۔ ترمذیؒ[1] اور حاکم کی ایک روایت[2] میں اسی قدر ہے۔ مگر ابن حنبلؒ[3] اور حاکمؒ[4] کی دوسری روایت میں اس کے بعد ہے کہ اُس نے ایسا کیا تو فوراً اچھا ہوگیا۔ حاکم کی ایک اور روایت[5] میں جو علی شرط البخاری ہے، یہ واقعہ ان الفاظ میں منقول ہے: حضرت عثمان بن حنیفؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک نابینا صحابیؓ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ یارسول اللہؐ! میری خدمت کے لئے کوئی آدمی نہیں۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ فرمایا" وضو خانہ میں جاکر وضو کرو۔ پھر دو رکعت نماز پڑھو۔ اس کے بعد یہ دعا مانگو"۔ عثمان بن حنیفؓ کہتے ہیں کہ ابھی ہم مجلس سے الگ بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ کچھ زیادہ بات کرنے پائے تھے کہ وہ نابینا واپس آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کو نابینائی کی بیماری کبھی تھی ہی نہیں۔

حبیب بن فدیکؓ ایک اور نابینا صحابی کے اچھے ہونے کا واقعہ ابن ابی شیبہ، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے[6]۔ مگر چونکہ اُس کے سلسلۂ سند میں مجہول الاسم اشخاص ہیں اس لئے اس کو قلم انداز کردیا ہے۔

بلا دور ہونا آپؐ ایک سفر میں جارہے تھے۔ راستہ میں ایک عورت بچہ کو لئے ہوئے سامنے آئی اور کہا کہ یارسول اللہؐ! اس کو دن میں کئی دفعہ کسی بلا کا دورہ ہوتا ہے۔ آپؐ نے بچہ کو اٹھاکر کجاوہ کے سامنے رکھا اور تین بار کہا کہ" اے خدا کے دشمن نکل۔ میں خدا کا رسول ہوں" پھر لڑکے کو اُس عورت کے حوالے کردیا۔ سفر سے پلٹے تو وہ عورت دو دنبے لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی یارسول اللہؐ! میرا ہدیہ قبول فرمایئے۔ خدا کی قسم پھر

---

[1] ترمذی: کتاب الدعوات۔ [2] مستدرک جلد اوّل۔ [3] مسند جلد چہارم۔ [4] مستدرک: جلد اوّل۔
[5] مستدرک: جلد اوّل۔ [6] دلائل ابی نعیم واصابہ ترجمہ حبیب بن فدیکؓ۔

بچے کے پاس وہ بلا نہ آئی۔ آپؐ نے ایک دنبہ قبول فرما لیا اور دوسرے کو واپس کر دیا۔[1]

گونگے کا بولنا | حجۃ الوداع میں آپؐ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچہ کو لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یہ بولتا نہیں۔ آپؐ نے پانی منگایا۔ ہاتھ دھویا اور کلی کی اور فرمایا کہ یہ پانی اُس کو پلا دو اور کچھ اُس کے اوپر چھڑک دو۔ دوسرے سال وہ عورت آئی تو بیان کیا کہ لڑکا بالکل اچھا ہو گیا[2] اور بولنے لگا۔

مرضِ نسیان کا دور ہونا | ایک دفعہ حضرت علیؓ نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہؐ! قرآن یاد کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "اس طرح نماز پڑھ کر یہ دعا مانگو"۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کیا اور فائدہ ہوا اور جا کر آنحضرتؐ سے عرض کی کہ پہلے چار چار آیتیں یاد کرتا تھا اور اب چالیس چالیس آیتیں یاد کر لیتا ہوں۔ پہلے بات بھول جاتا تھا اور اب حرف حرف یاد رہتا ہے۔[3]

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو آپؐ نے طائف کا عامل مقرر فرمایا۔ انہوں نے وہاں سے آکر بیان کیا کہ یا رسول اللہؐ! مجھے یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ نماز میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا پڑھتا ہوں۔ آپؐ نے پاس بلا کر اُن کے سینہ پر ہاتھ مارا اور منہ میں دم کیا۔ پھر یہ

---

[1] مسند ابن حنبل، جلد چہارم میں دو حسن روایتوں سے حضرت یعلی بن مرہؓ سے یہ واقعہ مذکور ہے۔ علاوہ ازیں ابنِ ابی شیبہ اور حاکم میں بھی یہ منقول ہے۔ دارمی میں یہ واقعہ حضرت جابرؓ سے جس سلسلۂ سند سے مذکور ہے وہ مستند نہیں۔ نیز دارمی اور ابونعیم میں اسی قسم کا ایک اور واقعہ (یعنی ایک جن کا ایک بچہ پر مسلط ہونا اور آپؐ کے اثر سے ایک کتے کے پلّہ کی شکل میں نکل کر بھاگنا) حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے۔ وہ بھی صحیح نہیں۔

[2] سنن ابن ماجہ باب النشرہ وابونعیم وابن ابی شیبہ۔ [3] جامع ترمذی: ابواب الدعوات ومستدرک حاکم، جلد اوّل۔ ذہبی نے جودتِ سند کے باوجود اس روایت میں کلام کیا ہے۔

حالت بالکل زائل ہو گئی۔[1]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی ایک دفعہ حافظہ کی شکایت کی۔ تو آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ دامن پھیلاؤ۔ انہوں نے پھیلایا۔ آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈالا۔ پھر فرمایا کہ اب اس کو سمیٹ لو۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ تب سے پھر میں کوئی بات نہ بھولا۔[2]

بیمار کا تندرست ہونا حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دفعہ سخت بیمار ہوئے۔ آنحضرتؐ اُن کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا کہ "یہ دعا سات دفعہ پڑھو اور ہاتھ بدن پر پھیرو"۔ حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو خدا نے میری بیماری دور کر دی۔ اور اب میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی یہ دُعا بتایا کرتا ہوں۔[3]

ایک بار حضرت علیؓ اس قدر بیمار ہوئے کہ موت کی دُعا کرنے لگے۔ آپؐ کا گذر ہوا تو ان کو اس پر تنبیہ کی اور دُعا فرمائی۔ پھر اُن کو اس مرض کی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔[4]

ایک جلے ہوئے بچے کا اچھا ہونا محمد بن حاطبؓ ایک صحابی ہیں وہ جب بچہ تھے تو اپنی ماں کی گود سے گر کر آگ میں گر پڑے اور کچھ جل گئے۔ اُن کی ماں اُن کو لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں آئیں۔ آنحضرتؐ نے اپنا لعابِ دہن اُن پر ملا اور دُعا پڑھ کر دم کیا۔ طیالسی اور ابنِ حنبل میں اسی قدر ہے مگر امام بخاری نے تاریخ میں بسند بیان کیا ہے کہ محمد بن حاطبؓ کی ماں کہتی تھیں کہ

---

[1] سنن ابنِ ماجہ: باب الفزع والارق۔ [2] صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ۔ [3] جامع ترمذی: کتاب الطب۔
[4] جامع ترمذی: ابواب الدعوات بروایت حسن وصحیح حاکم فی المستدرک۔

بچّہ کو لے کر میں وہاں سے اُٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ بچّہ کا زخم چنگا ہو گیا۔[1]

جنون کا دور ہونا ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یا رسول اللہؐ! میرا بھائی بیمار ہے۔ دُعا کیجئے۔ پوچھا کیا بیمار ہے؟ عرض کی اس پر جنون کا اثر ہے۔ فرمایا اس کو لے آؤ۔ وہ آیا تو آپؐ نے قرآن مجید کی متعدد سورتیں پڑھ کر جھاڑ دیا۔ وہ کھڑا ہوا تو اس پر جنون کا کوئی اثر نہ تھا۔[2]

---

[1] مسند ابوداؤد طیالسی، مسند ابنِ حنبل، جلد چہارم۔ تاریخ بخاری کی روایت ابنِ عبدالبر نے بسند استیعاب (ترجمۂ محمد بن حاطبؓ میں) اور سیوطی نے خصائص الکبریٰ جلد دوم میں نقل کی ہے۔ [2] سنن ابن ماجہ باب الفزع والارق۔ اس روایت کے سلسلۂ سند میں ابو خباب ایک راوی ہیں جن پر تدلیس کا الزام ہے مگر اس روایت میں تو تدلیس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ واللہ اعلم۔

اِستجابتِ دُعاء

منجملہ دیگر علامتوں کے اللہ کی بارگاہ میں دُعاؤں کا قبول ہونا بھی ایک بڑی علامت ہے جس سے نیک اور مقبول بندوں کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے۔ انبیاء الٰہیؑ سے بڑھ کر خدا کے نیک اور مقبول بندے اور کون ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ اُن کی دُعاؤں کو شرفِ اجابت بخشتا ہے اور اُن کی نداؤں کو جو دل کے اندر سے نکلتی ہیں سمعِ قبول سے سُنتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ندامت کے ساتھ خدا کو پکارا تو اُس نے اُن کو معاف کر دیا۔ حضرت نُوح علیہ السلام نے طوفانی عذاب کی درخواست کی تو پوری ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے نُبوّت اور برکت کی دعا کی تو قبول ہوئی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے سمندر کی تہہ میں سے خدا کو پکارا تو اُس نے سُنا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے خانوادۂ نبوّت کے لئے ایک وارث مانگا تو دیا گیا۔

آنحضرتؐ نے بھی بارگاہِ الٰہی میں دعائیں مانگیں، حاجت مندیوں میں اس کے آگے ہاتھ پھیلائے، تنہائیوں میں اس کی رفاقت چاہی، بے کسیوں میں اس کی نصرت مانگی، فقر و فاقہ میں اُس کے خزانۂ غیب سے مدد طلب کی، حق کی اشاعت میں اس کی اعانت کی درخواست کی، نیک بندوں کے حق میں اپنے آپؐ کو اس کے سامنے شفیع بنایا، شریروں کے دفعِ شر کے لئے اس کی غیبی امداد کا سہارا ڈھونڈھا اور اُن میں سے ہر موقع پر آپؐ کے لئے

قبول واجابت کا دروازہ کھولا گیا۔

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ "آپؐ جب کبھی کسی کے حق میں دعا فرماتے تھے تو وہ نہ صرف اُسی کے بلکہ اُس کی اولاد در اولاد کے حق میں مستجاب ہوتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب کسی کے متعلق آپؐ رحمہ اللہ (یعنی خدا اس پر رحمت کرے) فرماتے تھے تو صحابہؓ سمجھ جاتے تھے کہ اس کو شہادت نصیب ہوگی[1] چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا یہاں تک کہ وہ بھی جو آپؐ کی دعوتِ حق کے سخت منکر تھے اس امر کا دل سے یقین رکھتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاؤں میں حیرت ناک تاثیر ہے۔ مکہ میں جب قحط پڑا تو ابو سفیان نے بھی بحالتِ کفر اسی آستانہ پر حاضر ہو کر دعائے رحمت کی درخواست کی[2] ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش کے حق میں جو آپؐ کی نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، جب آپؐ نے بددعا کی تو وہ خوف سے کانپ اُٹھے[3] یہ واقعات بہ تفصیل پہلے گذر چکے ہیں اس لئے یہاں موضوعِ سخن کی تقریب سے اختصار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا

قریش نے جب اسلام کی سخت مخالفت کی تو خدا نے اُن پر قحط کا عذاب بھیجا۔ اہلِ مکہ سخت مُصیبت میں مبتلا ہوئے۔ بالآخر سوا اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ اسی رحمتِ عالمؐ کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں۔ قریش کے بعض رئیسوں نے خدمتِ نبویؐ میں جا کر عرض کی کہ "اے محمدؐ! تمہاری قوم برباد ہو گئی۔ خدا سے دُعا کرو کہ وہ اس مُصیبت سے اس کو نجات دے"۔ رحمتِ عالمؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ دعا قبول ہوئی۔ خوب پانی برسا اور اہلِ مکہ کو

---

[1] مسند احمد بہ روایت حضرت حذیفہؓ [2] صحیح مسلم: باب غزوۂ خیبر۔ [3] صحیح بخاری و صحیح مسلم: تفسیر سورۂ دخان وغیرہ۔
[4] صحیح بخاری: آخر کتاب الوضوء و مسلم: باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔

قحط کے عذاب سے نجات ملی۔[1]

رؤسائے قریش کے حق میں بد دعا

آپؐ ایک دفعہ صحنِ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ بعض رؤسائے قریش نے عین حالتِ نماز میں آپؐ کی گردنِ مبارک پر نجاست ڈال دی۔ حضرت فاطمہؓ نے آکر جب یہ نجاست ہٹائی اور آپؐ نے سجدہ سے سر اُٹھایا تو نام بہ نام دعا مانگی کہ "خداوندا! اُن کو پکڑ"۔ چنانچہ سب کے سب بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔[2]

حضرت عمرؓ کا اسلام

ایک طرف قریش کے سربرآوردہ اصحاب اسلام اور داعیٔ اسلامؐ کی عداوت اور دشمنی کی کوششوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف داعیٔ اسلامؐ اُن کی ہدایت و رہنمائی کے پُر محبت ولولوں سے معمور تھا۔ ابوجہل و عمرؓ کہ دونوں آنحضرتؐ کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت اور مستقل تھے۔ اُن ہی کی ہدایت کا پُر شوق ارمان آپؐ کے قلبِ مبارک میں سب سے زیادہ تھا۔ جب تبلیغ و دعوت کے دوسرے حربے اُن پر کامیاب نہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے اُن سب سے کارگر حربہ کو اُن کے مقابلہ میں استعمال کیا جس کے وار کی کوئی روک نہیں ہو سکتی تھی۔ آپؐ نے دعا فرمائی کہ "خداوندا! ابوجہل و عمر میں جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو، اُسی سے اسلام کو معزز کر"۔[3] ابنِ ماجہ اور حاکم میں حضرت عائشہؓ سے

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان و صلوٰۃ الاستسقاء۔ [2] صحیح بخاری: غزوۂ بدر۔ [3] جامع ترمذی: مناقب عمرؓ بروایت ابنِ عمرؓ حدیث حسن غریب۔ ترمذی کے اسی باب میں اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت ابنِ عباسؓ سے بھی مروی ہے اس میں اس قدر اضافہ ہے کہ اس دعا کے دوسرے ہی دن حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے مگر اس روایت میں ایک راوی قابلِ اعتراض ہے۔ ترمذی کے علاوہ یہ روایت ابنِ سعد میں تین مختلف سلسلوں سے بسند حسن مذکور ہے (جلد سوم حصہ اوّل) حافظ ابنِ حجر نے اصابہ (ترجمہ عمرؓ) میں لکھا ہے کہ یہ روایت مسند ابو یعلی اور عبد بن حمید وغیرہ میں بھی ہے۔ خصائص سیوطی میں ہے کہ یہ روایت حاکم، طبرانی، ابنِ ماجہ اور صحیح ابنِ حبان میں بھی ہے۔

روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا تھا۔ اس دعا کو ابھی چند روز بھی نہیں گذرے تھے کہ حضرت عمرؓ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ کارسازِ قدرت نے اس دعاء کے قبول و تاثیر کا سامان کیونکر پیدا کیا؟ روایتوں میں اس کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہے۔ استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ جس طرح لکھا ہے وہ حرف حرف الفاروق کی نقل ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے لے کر جو سورہ پڑھی اور جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے وہ "سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ" یعنی سورۂ حدید تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بزار، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں یہ روایت بھی ہے۔ لیکن حد درجہ کمزور ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کا اسلام مکہ کا واقعہ ہے اور سورۂ حدید مدنی ہے۔ اس کو حضرت عمرؓ اُس وقت کیونکر پڑھ سکتے تھے۔ استاذ مرحوم نے الفاروق میں یہ واقعہ کتب رجال و تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ لیکن حدیث و سیر کی صحیح روایتوں میں یہ واقعہ دو صورتوں سے مذکور ہوا ہے ایک تو وہی مشہور صورت ہے کہ حضرت عمرؓ تلوار کمر سے لگا کر آنحضرتؐ کے قتل کے ارادہ سے نکلے تھے کہ راہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے حضرت عمرؓ کے ارادہ کا حال سُن کر کہا کہ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ غصہ میں اپنی بہن کے گھر گئے اور مار پیٹ کی۔ بالآخر اُنہوں نے قرآن کی ایک سورۃ بہن سے لے کر پڑھی اور وہ سورۂ طٰہٰ تھی۔ اور جب اس آیت پر پہنچے:

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○ (طٰہٰ : ۱۴)	میں ہوں خدا۔ کوئی خدا نہیں لیکن میں تو مجھ کو پوجو اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کرو۔

تو یہ اثر ہوا کہ دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پکار اُٹھے اور درِ اقدس پر حاضری کی درخواست کی۔ یہ روایت بہ سندِ ابنِ سعد، ابویعلی، دارقطنی، حاکم اور بیہقی میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے لیکن یہ حد درجہ کمزور ہے۔ یہ دو طریقوں سے مروی ہے اور اُن دونوں میں ایسے رُواۃ ہیں جو قبول کے لائق نہیں اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔

دوسری روایت مسند ابنِ حنبل میں[۲] خود حضرت عمرؓ سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک

---

[۱] طبع اوّل میں ہم نے اس واقعہ کو لکھا تھا کہ وہ "بہ سند صحیح" مذکور ہے مگر تحقیق سے یہ واقعہ اس مرتبۂ "صحیح" کا نہیں ثابت ہوا۔ دارقطنی نے اس روایت کو مختصراً لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں۔ (باب الطہارۃ للقرآن)۔ ذہبی نے مستدرک حاکم (جلد چہارم) کے استدراک میں لکھا ہے کہ یہ روایت واہی اور منقطع ہے اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان بصری کے حال میں، جو اس روایت کا ایک راوی ہے، لکھا ہے کہ اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا پورا قصہ بیان کیا ہے وھو منکرۃ جدًا (اور وہ نہایت ہی منکر ہے)۔ (کنز العمال (فضائل عمر بن الخطابؓ) میں بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں کے مشترک راوی اسحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان اور اسحاق بن ابراہیم الحسینی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں، اور یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ لیکن باایں ہمہ کہ یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے تاہم اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں اُن میں سے متعدد ٹکڑوں کی صحیح روایتوں سے تائید ملتی ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا اپنی بہن اور بہنوئی کو اُن کے مسلمان ہو جانے پر آزار دینا، (بخاری)، اسلام سعید بن زیدؓ اور آنحضرتؐ کا حضرت عمرؓ کے اسلام کے لئے دعائے خیر کرنا (ترمذی و حاکم) اور متعدد طریقوں سے ایک واقعہ کا ذکر ہونا گو وہ سب ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ اصلیت کا پتہ دیتا ہے۔ اس لئے ہم نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔

[۲] مسند احمد بن حنبل جلد اوّل۔ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن ابتدائی راوی کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں اس لئے اس میں انقطاع ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے اسلام کے بارے میں سب سے محفوظ روایت یہی ہے۔

شب میں آنحضرتؐ کے چھیڑنے کو نکلا۔ آپؐ بڑھ کر مسجدِ حرام میں داخل ہو گئے اور نماز شروع کر دی۔ اس وقت آپؐ نے سورۂ الحاقہ قرأت فرمائی۔ میں کھڑا سنتا رہا اور قرآن کے نظم اور اسلوب سے حیرت میں تھا۔ دل میں کہا۔ خدا کی قسم یہ شاعر ہے جیسا قریش کہا کرتے ہیں۔ ابھی یہ خیال تھا ہی کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ○ وَّمَا	یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے
هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا	اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔
تُؤْمِنُوْنَ ۙ○	تم بہت کم ایمان رکھتے ہو۔

(الحاقۃ: ۴۰-۴۱)

میں نے کہا یہ تو کاہن ہے۔ میرے دل کی بات جان گیا کہ اس کے بعد ہی یہ آیت پڑھی:

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا	یہ کاہن کا کلام بھی نہیں تم بہت
تَذَكَّرُوْنَ ؕ○ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ	کم نصیحت پکڑتے ہو۔ یہ تو جہانوں
الْعٰلَمِيْنَ ○	کے پروردگار کی طرف سے اترا

(الحاقۃ: ۴۲-۴۳) ہے۔

آپؐ نے یہ سورہ آخر تک پڑھا اور اُس کو سُن کر اسلام میرے دل میں پوری طرح گھر کر گیا۔

ابنِ اسحاق نے ان دونوں روایتوں کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر بغیر کسی سند کے اپنی سیرت میں لکھا ہے۔ اس لئے وہ اس باب میں سند کے قابل نہیں۔ حافظ ابنِ حجر نے اصابہ میں یہ دونوں روایتیں لکھ کر چھوڑ دی ہیں اور یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ان دونوں واقعوں میں سے مرجح کون ہے؟ اور اگر دونوں قابلِ قبول ہیں تو اُن کی ترتیب کیا ہے؟ میرا خیال

یہ ہے کہ اگر یہ دونوں واقعے صحیح ہیں تو اُن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے آپؐ کو نماز میں سورۂ الحاقہ پڑھتے سُنا اور اس سے اُن کو اسلام کی طرف میلان ہوا۔ جیسا کہ اُن کے اُس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوقع الاسلام فی قلبی کل موقع یعنی اسلام میرے دل میں پوری طرح بیٹھ گیا۔ تاہم چونکہ وہ طبعاً مستقل اور پختہ کار تھے اس لئے اپنے اسلام کا انہوں نے اعلان نہیں کیا بلکہ اس اثر کو وہ شاید روکتے رہے۔ لیکن اس کے بعد جب اُن کی بہن کا واقعہ پیش آیا اور سورۂ طٰہٰ پر نظر پڑی تو پھر دل پر قابو نہ رہا اور جوشِ حق کا چشمہ اُن کی زبان و دل سے بے اختیار اُبل پڑا اور فوراً درِ اقدس پر حاضری کی درخواست پیش کی۔ حضرت انسؓ کی اس روایت میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنا یہ شوق ظاہر کیا تو حضرت خبابؓ جو حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو سورۂ مذکور کی تعلیم دے رہے تھے اور حضرت عمرؓ کی آواز سُن کر گھر میں چھُپ گئے تھے، بے تامل[1] نکل کر سامنے آگئے اور بشارت دی کہ "اے عمرؓ! تو بید مژدہ! کہ جمعرات کی رات کو تمہارے حق میں آنحضرتؐ نے جو دعا کی تھی شاید اُس کے پورے ہونے کا دن آگیا۔ حضورؐ نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا! عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام (ابوجہل) سے اسلام کو عزت دے۔"

غور کرو کہ یہ دعائے نبویؐ کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا بلکہ اُن کی ذات سے اسلام کو وہ عزت نصیب ہوئی جس کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی دنیا کو اعتراف ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ گواہی دیتے ہیں کہ ما زلنا اعزۃ منذ اسلم عمرؓ (حضرت عمرؓ جب اسلام لائے ہم مسلمانوں کو عزت اور قوت حاصل[2] ہوگئی) اسلام کی اس عزت کو اگر سوانح فاروقی کے کارناموں میں تلاش کرو تو دعائے نبویؐ کے قبول و اجابت

---

[1] و [2] صحیح بخاری: جلد اوّل باب اسلام عمرؓ۔

پُر حیرت سماں نگاہوں کے سامنے سے گذر جائے گا۔

سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا دھنس جانا

جب آپؐ ہجرت کی غرض سے مدینہ کو روانہ ہوئے تو کفار کے جاسوسوں میں سراقہ نے آپؐ کا پیچھا کیا اور آپؐ سے اس قدر قریب آگیا کہ حضرت ابوبکرؓ گھبرا کے بول اٹھے کہ "ہم آلئے گئے"۔ آپؐ نے اُن کی دل دہی کی اور دُعا فرمائی جس کے اثر سے اُس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ تم دونوں نے مجھے بد دعا دی اب دعا کرو تو میں تمام لوگوں کو تمہارے تعاقب سے واپس لے جاؤں۔ آپؐ نے اُس کے لئے دعا فرمائی اور اُس نے اس مصیبت سے نجات پائی۔ وہاں سے واپس آیا تو تمام تعاقب کرنے والوں کو واپس لے گیا۔[1]

مدینہ کی آب وہوا کے لئے دُعا

مدینہ کی آب وہوا اچھی نہ تھی۔ وبا کا بھی اثر تھا۔ اکثر مہاجرین یہاں آکر بیمار پڑ گئے۔ اس حالت میں لوگوں کو بار بار اپنا وطن مکہ یاد آنے لگا۔[2] یہ دیکھ کر آنحضرتؐ نے دعا فرمائی کہ "الٰہی! مدینہ کو بھی ہمارے لئے ویسا ہی محبوب کر دے جیسا کہ ہم کو مکہ محبوب ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے۔ الٰہی! ہمارے صاع اور مُد میں برکت دے اور اس کو ہمارے لئے صحت بخش بنا دے اور یہاں کا بخار جحفہ میں منتقل کر دے"۔[3] یہ دعا حرف بہ حرف قبول ہوئی۔ مہاجرین کو اس شہر سے جو محبت ہو گئی وہ اُن کی زندگی کے واقعات سے ظاہر ہے۔ وہی ابوبکرؓ و بلالؓ جو چند روز میں یہاں سے گھبرا اُٹھے تھے اُس کے ایسے والہ و شیدا ہوئے کہ پھر مکہ کا نام بھی نہیں لیا اور آنحضرتؐ کو یہاں سے وبا کا دُور ہونا خواب میں دکھایا گیا۔[4]

---

[1] صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ۔ [2] صحیح بخاری: باب الہجرۃ و صحیح مسلم باب الترغیب فی سکنی المدینۃ و باب صیانۃ المدینۃ۔ [3] صحیح بخاری: باب الہجرۃ و صحیح مسلم باب الترغیب فی سکنی المدینۃ۔ [4] صحیح بخاری: کتاب الرؤیا و التعبیر۔

قحط کا دور ہونا اور پانی کا برسنا

ہجرت سے پہلے مکہ میں جب قحط پڑا تھا تو مسلمانوں نے نہیں کافروں نے جاکر آپؐ سے درخواست کی کہ دعا کیجئے۔ آپؐ نے دعا فرمائی تو پانی برسا۔[1] حضرت ابوطالب عمِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید اسی منظر کو دیکھ کر آپؐ کی مدح میں یہ شعر کہا تھا ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجھه ثمال الیتامیٰ عصمة للارامل

محمدؐ گورے رنگ والا ہے اُس کے چہرہ کے وسیلہ سے ابرِ باران کی سیرابی مانگی جاتی ہے یتیموں کی جائے پناہ اور بیواؤں کا بچاؤ ہے۔

حضرت ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ جب پانی برسنے کی دعا مانگتے تو میں آپؐ کے چہرۂ مبارک کو تکتا رہتا اور ابوطالب کا یہ شعر یاد آتا۔ آپؐ دعا مانگ کر منبر سے اُترنے بھی نہیں پاتے تھے کہ مدینہ کا ہر پرنالہ زور شور سے بہنے لگتا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے متعدد واقعے حضرت ابن عمرؓ کے سامنے گذرے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں جب قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے دعا مانگی، کہ "خداوندا! ہم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کو وسیلہ بنا کر تیرے سامنے پیش کرتے تھے تو تو ہم کو سیراب کرتا تھا۔[3]"

ایک دفعہ مدینہ میں خشک سالی ہوئی۔ آنحضرتؐ مسلمانوں کو لے کر نکلے اور کھڑے ہو کر بارگاہِ الٰہی میں دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دعا مانگی۔ پھر قبلہ رخ ہو کر چادر الٹی اور دو رکعت نماز پڑھی۔ ابر آیا، پانی برسا اور لوگ سیراب ہوئے۔[4]

دعائے نبویؐ سے پانی برسنے کا سب سے حیرت انگیز لیکن مستند تر واقعہ حسبِ

---

[1] صحیح بخاری: ابواب الاستسقاء۔ [2] صحیح بخاری وابنِ ماجہ: ابواب الاستسقاء۔ [3] صحیح بخاری: ابواب الاستسقاء۔ [4] بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ ابواب الاستسقاء۔

ذیل ہے جو متعدد طریقوں اور سلسلوں سے احادیث میں مذکور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار مدینہ اور اطراف مدینہ میں قحط پڑا۔ آنحضرتؐ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک شخص نے کہا "یارسول اللہؐ! مویشی ہلاک ہو گئے۔ لوگ بھوکوں مر گئے۔ خدا سے دعا فرمایئے کہ ہم کو سیراب کرے" آپؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ یہ اثر ہوا کہ پہلے تو آسمان آئینہ کی طرح صاف تھا اور اب ایک آندھی چلی۔ بادل امنڈ آئے اور آسمان کا دہانہ کھل گیا۔ لوگ مسجد سے نکلے تو پانی میں بھیگتے ہوئے مکان تک پہنچے۔ ایک ہفتہ تک متصل پانی برستا رہا یہاں تک کہ لوگ گھبرا اُٹھے اور دوسرے جمعہ کو اسی آدمی نے یا کسی اور نے کہا "یارسول اللہ! مکانات گر گئے۔ دعا کیجئے کہ خدا پانی کو روک لے" آنحضرتؐ مسکرائے اور دعا فرمائی۔ بادل پھٹ گئے اور مدینہ تاج کی طرح چمک اٹھا[1]

ابن ماجہ باب الاستسقاء میں اس قسم کے دو واقعے اور لکھے ہیں۔ اگر وہ اس واقعہ سے الگ ہیں تو اس قسم کے دو واقعوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

حضرت انسؓ کے حق میں دعائے برکت

آنحضرتؐ مدینہ میں تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ ان کو چادر میں لپیٹ کر لائیں اور آپؐ کی خدمت میں بطور خادم کے پیش کیا اور ان کے لئے دعاء کی درخواست کی۔ آپؐ نے ترقیٔ مال و اولاد کی دعا دی۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ "آج اس دعا کی برکت سے میرے پاس بہ کثرت دولت ہے اور میرے لڑکوں اور پوتوں کی تعداد سو کے قریب پہنچ گئی ہے[2]" اس دعا کا یہ اثر تھا کہ حضرت انس ابن مالکؓ کا ایک باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لاتا تھا اور اس میں

---

[1] صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ و ابواب الاستسقاء و صحیح مسلم: باب صلوٰۃ الاستسقاء بطرق متعددہ۔

[2] صحیح مسلم: فضائل انس بن مالکؓ۔

ایک پھول کا درخت تھا جس سے مشک کی بو آتی تھی۔[1]

حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعائے علم | ایک بار آپؐ قضائے حاجت کے لئے گئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے پہلے ہی سے وضو کا پانی بھر کے رکھ دیا۔ آپؐ نے ان کو تفقہ فی الدین کی دعا دی۔[2] چنانچہ ان کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ انہوں نے حبر الامۃ کا خطاب پایا۔

حضرت اُمِّ حرامؓ کے حق میں دعائے شہادت | ایک روز آپ امِّ حرامؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے آپؐ کو کھانا کھلایا اور سر سے جوئیں نکالنے لگیں۔ اسی حالت میں آپؐ کو نیند آگئی۔ پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے تو اُمِّ حرامؓ نے ہنسی کی وجہ پوچھی۔ آپؐ نے فرمایا "میری امت میں سے مجاہدین کا ایک گروہ میرے سامنے پیش کیا گیا جو بغرضِ جہاد دریا میں اس طرح سوار ہو کر چلے گا جس طرح تخت پر بادشاہ"۔ اُمِّ حرام نے درخواست کی کہ خدا سے دعا فرمایئے کہ میں بھی انہی میں سے ہوں چنانچہ آپؐ نے دعا فرمائی اور امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ان کو بحری جنگ کا شرف حاصل ہوا اور دریا سے نکل کر خشکی میں آئیں تو سواری سے گر کر درجۂ شہادت حاصل کیا۔[3]

ایک نوجوان کی ہدایت کے لئے دعا | حضرت ابوامامہ باہلیؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ ایک دن اصحابؓ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک نوجوان نے آکر کہا کہ یارسول اللہؐ! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ یہ سن کر چاروں طرف سے اس پر لوگوں نے ملامت شروع کی۔ آپؐ نے روکا۔ پھر اس نوجوان کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور دل دہی سے پوچھا کہ "تم اس فعل کو اپنی ماں کے لئے پسند کرو گے"؟ عرض کی "آپؐ پر قربان! نہیں یارسول اللہؐ!"

---

[1] ترمذی، مناقب انسؓ۔ [2] مسلم، فضائل عبداللہ بن عباسؓ۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الجہاد۔

فرمایا "تو اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے نہیں پسند کریں گے۔ تو کیا تم اپنی بیٹی کے لئے یہ پسند کرو گے؟" عرض کی "نہیں یا رسول اللہؐ!" فرمایا "تو اور لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے اس کو پسند نہ کریں گے۔ تو کیا اپنی بہن کے لئے یہ پسند کرو گے؟" گذارش کی "نہیں یا رسول اللہ!" فرمایا "تو اور لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے یہ پسند نہ کریں گے۔" پھر اسی طرح خالہ اور پھوپھی کے متعلق آپؐ نے پوچھا۔ اس نے وہی جواب دیا اور آپؐ بھی اسی طرح فرماتے گئے۔ اس کے بعد اُس پر ہاتھ رکھ کر دعا کی کہ "خداوندا! اس کے گناہوں کو بخش اور اس کے دل کو پاک اور اس کو عصمت عطا کر۔" ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان کا یہ حال تھا کہ وہ کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔[1]

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی شفایابی کے لئے دعا

حضرت سعد بن وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں آنحضرتؐ کی ہمرکابی میں مکہ گیا اور وہاں جا کر ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ یہاں تک کہ وصیت کی تیاری کی۔ آپؐ عیادت کو تشریف لائے تو عرض کی "یا رسول اللہؐ! میں اس سرزمین میں مرتا ہوں جس سے ہجرت کی تھی۔" آپؐ نے فرمایا "نہیں انشاء اللہ۔"[2] پھر تین دفعہ دعا کی کہ "الٰہی سعدؓ کو شفا دے، سعدؓ کو شفا دے، سعدؓ کو شفا دے۔"[3] چنانچہ ان کو شفا ہوئی اور آنحضرتؐ کے بعد چودہ پندرہ برس تک زندہ رہے اور لشکرِ عراق کے امیر مقرر ہوئے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مستجاب الدعوات ہونے کی دُعا

ان ہی حضرت سعد بن وقاصؓ کے حق میں آپؐ نے دعا فرمائی تھی کہ "خداوندا! ان کو مستجاب الدعوات بنا۔"[4] چنانچہ

---

[1] مسند احمد جلد پنجم۔ بسند صحیح و شعب الایمان بیہقی۔ [2] نسائی کتاب الوصیۃ۔ [3] صحیح مسلم: کتاب الوصیۃ۔

[4] ترمذی: مناقب سعد بن ابی وقاصؓ۔

اس کا یہ اثر تھا کہ وہ جس کو دعا دیتے تھے وہ یقیناً قبول ہو جاتی تھی۔ کوفہ کی امارت کے زمانہ میں بعض شریروں نے بارگاہِ فاروقی میں ان کی غلط شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے تحقیقِ حال کے لئے آدمی بھیجا۔ وہ ایک ایک مسجد میں جا کر لوگوں سے حضرت سعدؓ کے متعلق حالات دریافت کرتا پھرتا تھا۔ ایک محلہ کی مسجد میں ایک شخص نے جھوٹی گواہی دی کہ وہ نماز بھی ٹھیک نہیں پڑھاتے۔ یہ سن کر حضرت سعدؓ بے اختیار ہو گئے۔ فرمایا "خداوندا! اگر یہ جھوٹا ہو تو اس کو آزمائش میں ڈال"۔ اس شخص کا یہ حال ہو گیا تھا کہ بوڑھے ہو کر اس کی پلکیں لٹک آئی تھیں۔ تاہم بازاروں میں چھوکریوں کو چھیڑتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ سعدؓ کی بددعا مجھے لگ گئی۔[1] احادیث و سیر میں ان کی قبولیتِ دعا کے اور بھی واقعات مذکور ہیں۔

حضرت عروہؓ کے حق میں دعائے برکت ایک بار آپؐ نے حضرت عروہؓ کو ایک دینار دیا کہ اس کی ایک بکری خرید لائیں۔ انہوں نے اس سے دو بکریاں خرید کیں۔ ایک کو ایک دینار پر فروخت کر ڈالا اور آپؐ کی خدمت میں دوسری بکری اور دینار کو پیش کیا۔ آپؐ نے ان کو خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا کی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ اگر وہ مٹی بھی خریدتے تھے تو اس میں نفع ہوتا تھا۔[2]

ابو امامہ باہلیؓ کے حق میں دعائے سلامتی حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کہیں فوج بھیج رہے تھے۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کی کہ "یا رسول اللہؐ! میرے لئے دعا کیجئے کہ شہادت نصیب ہو"۔ فرمایا "خداوندا! ان کو سالم و غانم واپس لا"۔ چنانچہ ہم صحیح و سلامت مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔ پھر کہیں فوج جانے لگی۔ میں نے پھر وہی درخواست کی۔ آپؐ نے پھر وہی دعا دی اور پھر وہی ہوا۔ تیسری مرتبہ پھر یہی موقع پیش آیا۔ میں نے

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ۔ [2] صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ۔

عرض کی "یا رسول اللہؐ! میں نے دو دفعہ دعائے شہادت کے لئے درخواست پیش کی قبول نہ ہوئی۔ اب یہ تیسرا موقع ہے۔" آپؐ نے پھر وہی دعا دی اور وہی نتیجہ تھا۔[1]

حضرت ابوطلحہؓ کے حق میں برکتِ اولاد کی دُعا

حضرت ابوطلحہؓ کی بیوی نہایت ہوشمند اور اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ پر دل سے فدا تھیں۔ ایک دفعہ ان کا بچہ بیمار ہوا۔ حضرت ابوطلحہؓ گھر سے باہر ہی تھے کہ بچہ نے دم توڑ دیا۔ بیوی نے بچہ کو ایک گوشہ میں لٹا دیا۔ ابوطلحہؓ جب گھر واپس آئے تو بیوی سے دریافت کیا کہ بچہ کیسا ہے؟ نیک بخت نے جواب دیا کہ "وہ آرام پا گیا۔ ابوطلحہؓ سمجھے کہ وہ اچھا ہے۔ دونوں میاں بیوی ایک ہی بستر پر سوئے۔ ابوطلحہؓ صبح کو اٹھے۔ غسل کر کے مسجدِ نبویؐ میں نماز پڑھنے کو جانے لگے تو بیوی نے اصل حقیقت ظاہر کی۔ ابوطلحہؓ نے آکر آنحضرتؐ کو شب کا ماجرا سنایا تو فرمایا شاید کہ خدا نے آج شب کو برکت عطا کی ہو۔ چنانچہ اس شب کی برکت مقررہ مہینوں کے بعد پوری ہوئی۔[2] ایک انصاریؓ کہتے ہیں کہ برکت کا یہ اثر ہوا کہ میں نے ابوطلحہؓ کی تو اولادیں دیکھیں اور سب کی سب قرآن خواں تھیں۔[3]

حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے حق میں دعائے ہدایت

حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کافرہ تھیں۔ ابوہریرہؓ ان کو دعوتِ اسلام دیتے تھے لیکن وہ نہیں مانتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے حسبِ دستور دعوتِ اسلام دی تو انہوں نے آنحضرتؐ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابوہریرہؓ کو سخت تکلیف ہوئی۔ وہ روتے ہوئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس ناگوار واقعہ کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ میری والدہ کے لئے ہدایت کی دعا فرمائیے۔

---

[1] مسند احمد جلد پنجم و ابویعلیٰ و بیہقی۔ [2] صحیح مسلم: فضائل ابی طلحہؓ۔ [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من لم یظهر الحزن عند المصیبة۔

آپؐ نے دعا کی کہ "خداوندا! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت نصیب کر" حضرت ابوہریرہؓ کو اس دعا کے قبول ہونے کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ خوش خوش گھر واپس آئے۔ دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ ماں نے پاؤں کی آہٹ سنی تو کہا کہ دروازے پر ٹھہرے رہو۔ حضرت ابوہریرہؓ کو پانی گرنے کی آواز بھی محسوس ہوئی۔ جب وہ غسل کر کے کپڑے بدل چکیں تو دروازہ کھولا اور کلمۂ شہادت پڑھا۔ حضرت ابوہریرہؓ خوشی کے مارے اُلٹے پاؤں آنحضرتؐ کی خدمت میں واپس آئے اور آپؐ کو مژدہ سنایا۔ آپؐ نے خدا کا شکر کیا اور دونوں کو دعا دی۔[1]

اونٹ کا تیز ہو جانا ایک غزوہ میں حضرت جابرؓ کی سواری کا اونٹ اس قدر تھک گیا یا بیمار ہو گیا تھا کہ تقریباً چل نہیں سکتا تھا۔ آپؐ نے دیکھا تو دعا دی اور اب وہ اس قدر تیز ہو گیا کہ تمام اونٹوں کے آگے آگے رہتا تھا۔ آنحضرتؐ نے آکر پھر دریافت کیا کہ "اے جابر! اب کیا حال ہے"؟ عرض کی آپؐ کی دعاء کی برکت قبول ہوئی۔[2]

بیمار کا اچھا ہونا آپؐ ایک صحابی کی عیادت کو تشریف لے گئے جو ضعف سے چور ہو گئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم صحت کی حالت میں خدا سے کوئی دعا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا "ہاں میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے آخرت میں جو عذاب دینا ہے وہ دنیا ہی میں دیدے"۔ آپؐ نے فرمایا "سبحان اللہ! تم دنیا کے عذاب کے متحمل نہیں ہو سکتے تو تم نے یہ دُعا کیوں نہیں کی:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

خداوندا ہم کو دنیا و آخرت دونوں میں بھلائی دے اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

(البقرۃ: ۲۰۱)

---

[1] صحیح مسلم: فضائل ابی ہریرہؓ۔ [2] صحیح بخاری: کتاب الجہاد۔

اس کے بعد آپؐ نے درگاہِ خداوندی میں دعا کی اور خدا نے ان کو شفا عطا فرمائی۔[1]

سواری کی قوت آجانا حضرت جریرؓ ایک صحابی تھے جو گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ایک بار آپؐ نے ان کو ذی الخلیفہ کے بت خانے کے ڈھانے کے لئے بھیجنا چاہا۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے گھوڑے پر جم کر نہ بیٹھنے کی شکایت کی۔ آپؐ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا اور دعا دی کہ "خداوندا! اس کو گھوڑے پر بیٹھنے کی قوت دے اور اس کو ہادی و مہدی بنا" چنانچہ وہ گئے اور اس میں آگ لگا کر آئے۔[2]

ایک مغرور کا ہاتھ شل ہو جانا آپؐ کے سامنے ایک شخص نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا۔ آپؐ نے فرمایا "دائیں ہاتھ سے کھاؤ" اس نے غرور سے کہا "میں اس سے کھا نہیں سکتا" چونکہ اس نے غرور سے ایسا کہا تھا، آپؐ نے فرمایا "خدا کرے ایسا ہی ہو" چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ وہ دائیں ہاتھ کو اٹھا کر واقعی اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔[3]

قبیلۂ دوس کا مسلمان ہونا ایک بار حضرت طفیل دوسیؓ اپنے رفقاء کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "یا رسول اللہؐ! دوس کے قبیلہ نے دعوتِ اسلام کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپؐ اُس پر بد دعا فرمائیے" لیکن رحمتِ عالمؐ نے یہ دعا فرمائی:

اللّٰھم اھد دوسا وات بھم[4] — خداوندا دوس کو ہدایت دے اور ان کو لا۔

بالآخر یہ دعا قبول ہوئی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو کر حاضرِ خدمت ہوا۔

رفع بے پردگی کے لئے دعا ایک حبشیہ عورت نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الدعوات باب کراہۃ الدعا بتعجیل العقوبۃ فی الدنیا۔ [2] صحیح مسلم، فضائل جریر بن عبداللہ بجلیؓ۔ [3] صحیح مسلم، باب آداب الطعام والشراب واحکامھا۔ [4] صحیح بخاری، قصۂ دوس، کتاب الجہاد، صحیح مسلم فضائل عفار واسلم ودوس وغیرہا۔

کی کہ "مجھے صرع کا دورہ ہوتا ہے جس سے میں بے پردہ ہو جاتی ہوں۔ میرے لئے دعا فرمایئے" ارشاد ہوا "اگر صبر کرنا چاہو تو تمہیں جنت نصیب ہو گی اور اگر کہو تو میں دعا کروں کہ خدا تم کو صحت دے"۔ اس نے کہا "میں صبر کرتی ہوں۔ لیکن ستر عورت کے لئے دعا فرمایئے"۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے لئے دعا کی[1]

سلطنتِ کسریٰ کی تباہی پڑھ چکے ہو کہ آنحضرتؐ نے دعوتِ اسلام کے لئے جب کسریٰ کے پاس خط بھیجا تو اس نے خط کو چاک کر کے پھینک دیا۔ آنحضرتؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے اس کو بددعا دی کہ اس کے بھی پرزے پرزے اڑ جائیں[2]۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی سلطنت کے پرخچے اڑ گئے۔

دعائے برکت کا اثر آنحضرتؐ ہمیشہ فوج کو صبح تڑکے روانہ فرماتے تھے اور تمام اُمت کے لئے دعا کی تھی کہ "خداوندا! میری اُمت کو صبح کے سویرے میں برکت دے"۔ ایک تجارت پیشہ صحابیؓ نے اس پر عمل کیا اور اپنا سامانِ تجارت عموماً صبح سویرے روانہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس دعا کی برکت ظاہر ہوئی اور وہ اتنے دولت مند ہو گئے کہ ان کو اپنی دولت کے رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی[3]

طولِ عمر کی دعا اُمّ قیسؓ ایک صحابیہ تھیں۔ ان کا لڑکا مر گیا تو وہ اس قدر بدحواس ہو گئیں کہ غسل جنازہ دینے والے سے کہا کہ "میرے بچے کو ٹھنڈے پانی سے غسل نہ دو ورنہ مر جائے گا"۔ آنحضرتؐ کو اس کی خبر ہوئی تو مسکرائے اور ان کو طولِ عمر کی دعا دی۔ چنانچہ انہوں نے تمام عورتوں سے زیادہ عمر پائی[4]

---

[1] صحیح مسلم: باب ثواب المومن فیما یصیبہ من المرض (کتاب البر والصلۃ)۔ [2] صحیح بخاری: کتاب الجہاد۔ [3] ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ باب مایرجی من البرکۃ فی السحور و مسند احمد جلد سوم عن صخر الغامدی۔ [4] نسائی: کتاب الجنائز و ادب المفرد امام بخاری۔

ایک بچّہ کی ہدایت کے لئے دعا رافع بن سنان نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن بی بی نے جس کی گود میں ایک لڑکی تھی اس سعادتِ ابدی سے انکار کیا۔ اب اختلافِ مذہب کی بنا پر لڑکی کے بارے میں نزاع پیدا ہوا۔ بارگاہِ نبوّت میں مقدّمہ پیش ہوا۔ آپؐ نے دونوں کو الگ الگ بٹھایا اور کہا کہ لڑکی کو بلاتے جاؤ۔ دونوں نے بلایا تو لڑکی ماں کی طرف بڑھی۔ آپؐ نے اس حالت کو دیکھ کر دعا فرمائی کہ "خداوندا! اس کو ہدایت دے"۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ لڑکی کا رخ فوراً باپ کی طرف پھر گیا۔ یہ ابو داؤد کی روایت ہے[1]۔

ابنِ سعد نے اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابو سلمہؓ صحابی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بچّہ تھے۔ ان کے دادا اور نانا میں سے ایک کافر اور ایک مسلمان تھا۔ دونوں نے بچّہ کی تولیت کا دعویٰ کیا۔ آنحضرتؐ نے اس کا فیصلہ خود بچّہ کے اختیار پر رکھ دیا۔ پہلے تو بچّہ اپنے کافر رشتہ دار کی طرف چلا۔ آپؐ نے فرمایا "خدایا اس کو ہدایت دے"۔ فوراً بچّہ مسلمان عزیز کی طرف چلا گیا اور فیصلہ اسی کے حق میں رہا[2]۔

---

[1] ابو داؤد: کتاب الطلاق باب اذا اسلم الابوان مع من یکون الولد [2] ابن ماجہ، باب تخییر الصبی بین الابوین میں بھی یہ روایت ہے۔

اشیاء میں اضافہ

مسلمانوں کی ابتدائی زندگی جس فقر و فاقہ میں گذری تھی اس کا حال کتاب کے مختلف حصّوں میں پڑھ چکے ہو۔ کئی کئی دن گذر جاتے تھے کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی ایسی حالت میں اگر برکتِ الٰہی ان کو اپنا خاص مہمان نہ بنالیتی تو ان کا کیا حشر ہوتا؟ انجیل میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام نے تھوڑی سی روٹی اور مچھلی سے کئی سو آدمیوں کو شکم سیر کردیا اور یہ ان کا بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرتؐ کے دستِ مبارک اور فیضِ روحانی سے ایک دفعہ نہیں متعدّد دفعہ اس قسم کی برکات ظاہر ہوئی ہیں۔

تھوڑے سے کھانے میں ستّر اسّی آدمیوں کا سیر ہونا

ایک دن حضرت ابوطلحہؓ نے آنحضرتؐ کی آواز سے محسوس کیا کہ آپؐ بھوک کی شدّت سے ضعیف ہو رہے ہیں۔ گھر میں آئے اور بی بی اُمّ سلیم سے کہا کہ مجھ آنحضرتؐ کی ضعیف آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ بھوکے ہیں۔ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے جَو کی چند روٹیاں دوپٹے میں لپیٹ کر حضرت انسؓ کے ہاتھ آپؐ کی خدمت میں بھیجیں۔ وہ روٹیاں لے کر آئے تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضرت انسؓ سامنے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے پوچھا "کیا ابوطلحہؓ نے تمہارے ہاتھ کھانا بھیجا ہے؟" انہوں نے کہا "ہاں" آنحضرتؐ

تمام صحابہؓ کے ساتھ اُٹھے، اور حضرت ابو طلحہؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت انسؓ نے ان کو خبر کی تو انہوں نے بی بی سے کہا کہ آنحضرتؐ ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ اور ہمارے پاس کھلانے کا کوئی سامان نہیں۔ آنحضرتؐ ابو طلحہؓ کے ساتھ آئے اور اُمِّ سلمہؓ سے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو لاؤ۔ انہوں نے وہی روٹیاں پیش کیں جو حضرت انسؓ کے ہاتھ بھیجی تھیں۔ آنحضرتؐ کے حکم سے ان کو چورا کیا گیا۔ اور اُمِّ سلمہؓ نے گھی کا برتن انڈیل دیا جس نے سالن کا کام دیا۔ لیکن ان ہی روٹیوں میں یہ برکت ہوئی کہ آپؐ دس دس آدمیوں کو بُلا بُلا کے کھلاتے تھے اور وہ شکم سیر ہو ہو کے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ستر آدمی آسودہ ہو گئے[1]

چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا حضرت جابرؓ کے والد نے اپنے اوپر یہودیوں کا قرض چھوڑ کر وفات کی۔ قرضداروں نے تقاضا کیا تو حضرت جابرؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ والد نے اپنے اوپر قرض چھوڑ کر انتقال کیا ہے اور بجز کھجوروں کے میرے پاس ادا کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ صرف کھجوروں کی پیداوار سے کئی برس تک یہ قرض ادا نہیں ہو سکتا۔ آپؐ میرے ساتھ نخلستان میں تشریف لے چلیئے تاکہ آپؐ کے ادب سے قرضدار مجھ پر سختی نہ کریں۔ آپؐ ان کے ساتھ تشریف لائے اور کھجوروں کا جو ڈھیر لگا ہُوا تھا، اس کے گرد چکر لگا کر دُعا کی اور اسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اپنے اپنے قرض میں لیتے جاؤ۔ آپؐ کی دُعا کی تاثیر سے ان ہی کھجوروں میں یہ برکت ہوئی کہ تمام قرض ادا ہو گیا اور جس قدر کھجوریں قرضداروں کو دی گئی تھیں۔ اتنی ہی بچ رہیں[2]

کھانے میں حیرت انگیز برکت چونکہ اصحابِ صفہ بالکل محتاج تھے اور ان کی معاش کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے آپؐ نے ایک بار حکم دیا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کے کھانے

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ۔

کا سامان ہو وہ اصحاب صفہ میں سے ایک کو اور جن کے پاس چار آدمیوں کی غذا ہو، وہ دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور کھانا کھلائے۔ چنانچہ اس اصول کے موافق آنحضرتؐ کے حصہ میں دس اور حضرت ابوبکرؓ کے حصہ میں تین آدمی آئے۔ یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے گھر میں آئے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ ہی کے یہاں کھانا کھایا۔ اور آپؐ کے ساتھ عشا کی نماز پڑھی اس لئے کسی قدر رات گذر گئی۔ وہ گھر میں دیر کر کے آئے تو ان کی بیوی اُمِّ رومان نے کہا کہ مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں رہ گئے؟ انہوں نے کہا کیا تم نے ان کو کھانا نہیں کھلایا؟ وہ بولیں بغیر تمہارے ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نہایت برہم ہوئے اور ان لوگوں کو کھلانا شروع کیا۔ وہ لوگ جو لُقمہ اُٹھاتے تھے اس میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ جب وہ لوگ شکم سیر ہو کر کھا چکے تو بچا ہوا کھانا پہلے سے بھی زیادہ نکلا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس برکت کو دیکھ کر اُمِّ رومان کی طرف سے مسرّت سے دیکھا اور غصہ میں اگرچہ کھانے کی قسم کھا چکے تھے۔ لیکن قسم توڑنے کے لئے ایک لُقمہ اس میں سے کھایا اور تمام کھانا آنحضرتؐ کے گھر بھیج دیا۔ وہ کھانا آپؐ کے گھر میں صبح تک رہا۔ دوسرے روز آپؐ کی خدمت میں بارہ آدمی آئے۔ جن میں سے ہر ایک کے ساتھ کئی کئی آدمی خدا جانے کتنے تھے۔ آپؐ نے وہ کھانا ان کے پاس بھیج دیا۔ اور وہ لوگ بھی سیر ہو گئے۔[1]

گھی کی مقدار میں برکت | اُمِّ مالکؓ کا دستور تھا کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں ہمیشہ ایک برتن میں گھی ہدیۃً بھیجا کرتی تھیں۔ جب ان کے بچے سالن مانگتے اور گھر میں نہ ہوتا تو وہ اس برتن کو جس میں آنحضرتؐ کی خدمت میں گھی بھیجتی تھیں، اُٹھا لاتیں اور اس میں سے بقدر ضرورت گھی نکل آتا۔ ایک دن انہوں نے اس برتن کو نچوڑ لیا۔ پھر آپؐ کی خدمت میں آئیں

---

[1] بخاری باب علامات النبوۃ۔

تو آپؐ نے فرمایا: "اگر تم نے اس کو نچوڑ دیا ہوتا تو ہمیشہ اس میں سے گھی نکلا کرتا۔"[1]

جَو کی مقدار میں برکت ایک بار ایک شخص نے آپؐ سے غلّہ مانگا۔ آپؐ نے تھوڑے سے جَو دے دئیے۔ اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ وہ روز اپنے لئے، اپنی بی بی کے لئے، اپنے مہمان کے لئے اس میں سے صرف کرتا تھا اور اس میں کمی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن اس نے اس کو تولا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ آپؐ نے فرمایا "اگر تم اس کو نہ تولتے تو ہمیشہ ایک حالت میں قائم رہتا۔"[2]

کھانے میں حیرت انگیز اضافہ غزوۂ احزاب میں تمام مہاجرین اور انصار خندق کھود رہے تھے۔ حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ آنحضرتؐ سخت بھوکے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے ایک صاع جَو نکالا۔ اور گھر میں ایک بکری تھی۔ حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کیا اور بی بی نے آٹا گوندھا۔ گوشت دیگچی میں چڑھایا گیا تو حضرت جابرؓ آنحضرتؐ کو لینے کے لئے چلے۔ بی بی نے کہا کہ دیکھو آپؐ کے ساتھ لوگوں کو لاکر مجھے رسوا نہ کرنا۔ حضرت جابرؓ آئے اور چپکے سے آپؐ کے کان میں کہا کہ ہم نے کھانے کا انتظام کیا ہے۔ آپؐ چند اصحاب کے ساتھ تشریف لے چلیئے۔ لیکن آپؐ نے تمام اہل خندق کو پکارا کہ "آؤ جابرؓ نے دعوتِ عام کی ہے۔" اور حضرت جابرؓ سے کہا کہ "جب تک میں نہ آؤں چولہے سے دیگچی نہ اُتاری جائے اور روٹی نہ پکے۔" آنحضرتؐ تمام لوگوں کو لے کر روانہ ہُوئے۔ حضرت جابرؓ گھر میں آئے تو بی بی نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ انہوں نے کہا، میں کیا کروں، تم نے جو کہا تھا۔ میں نے اس کی تعمیل کردی۔ آپؐ آئے تو بی بی نے آپؐ

---

[1] صحیح مسلم باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسند احمد عن جابرؓ [2] صحیح مسلم باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسند احمد عن جابر۔

کے سامنے آٹا پیش کیا۔ آپؐ نے اس میں اپنا لعاب دہن ملا دیا اور برکت کی دُعا دی۔ پھر اسی طرح دیگچی میں بھی لعاب دہن ڈالا اور دعائے برکت کی۔ اس کے بعد آپؐ نے روٹی پکانے اور سالن نکالنے کا حکم دیا۔ کم و بیش ایک ہزار آدمی تھے۔ سب کھا کر واپس گئے۔ لیکن گوشت اور آٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی[1]۔

تھوڑے سے زادِ راہ میں غیر معمولی برکت

غزوۂ تبوک میں صحابہؓ کو بھوک کی اتنی تکلیف ہوئی کہ آنحضرتؐ نے سواریوں تک کے ذبح کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی۔ آپؐ بچا ہوا زادِ راہ سب سے طلب فرمائیں اور اس پر دعائے برکت کریں۔ ممکن ہے کہ خدا اس میں ان کا بھلا کر دے۔ آپؐ نے ایک چادر بچھوائی اور تمام فوج کا زادِ راہ جمع کرا دیا اور اس پر برکت کی دُعا کی۔ پھر تمام لوگوں سے فرمایا کہ اپنے اپنے برتن بھر لیں۔ لوگوں نے تمام برتن بھر لیے اور خوب سیر ہو کر کھایا، یہاں تک کہ کھانے سے بچ گیا[2]۔

تھوڑے سے زادِ راہ میں عظیم برکت

آنحضرتؐ ایک سفر میں تھے۔ صحابہ بھوک سے اس قدر بے تاب ہوئے کہ اونٹنیاں ذبح کرنا چاہیں۔ لیکن آپؐ نے تمام لوگوں کے زادِ راہ کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ایک چادر بچھائی گئی، اور اس پر تمام زادِ راہ ڈھیر کیا گیا۔ اس تمام سامان کی مجموعی مقدار نے صرف اس قدر زمین کا احاطہ کیا جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی اور اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی۔ لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا۔ اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے۔ کھانے کے بعد آپؐ نے پانی طلب فرمایا۔ ایک صاحب ایک برتن میں تھوڑا سا پانی لائے۔ آپؐ نے اس کو پیالہ میں انڈیل دیا اور چودہ سو آدمیوں

---

[1] صحیح بخاری، جلد دوم ذکر غزوۂ خندق۔ [2] صحیح مسلم، جلد اوّل، کتاب الایمان۔

نے اس سے وضو کیا۔[1]

آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت

آنحضرتؐ ایک سفر میں تھے۔ ایک سو تیس آدمیوں کی جماعت ساتھ تھی۔ آپؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کچھ کھانے کا سامان ہے؟ ایک شخص ایک صاع آٹا لایا اور وہ گوندھا گیا پھر ایک کافر بکریاں چراتا آیا۔ آپؐ نے اس سے ایک بکری خرید فرمائی اور ذبح کرنے کے بعد کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا اور ہر شخص کو تقسیم کی۔ گوشت تیار ہوا تو وہ پیالوں میں بھرا گیا اور سب کے سب کھا کر آسودہ ہو گئے۔ اور بچ گیا۔[2]

تھوڑے سے کھانے میں غیر معمولی برکت

حضرت انسؓ کی والدہ اُمِّ سلیمؓ نے ایک بار ایک قسم کا کھانا تیار کیا اور حضرت انسؓ کو بھیجا کہ آنحضرتؐ کو بلا لائیں۔ وہ گئے تو آپؐ نے پوچھا کہ میرے ساتھیوں کو بھی بلایا ہے؟ حضرت انسؓ نے گھر میں آکر پوچھا۔ تو حضرت ابو طلحہؓ نے آپؐ سے آکر کہا کہ وہ تو ذرا سی چیز ہے جس کو اُمِّ سلیمؓ نے تیار کیا ہے آپؐ تشریف لائے اور وہ کھانا سامنے رکھا گیا تو فرمایا کہ دس دس آدمیوں کو لاؤ۔ اس طرح چالیس آدمی دس دس کر کے آئے اور شکم سیر ہو کر کھایا۔ لیکن کھانے میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔[3]

قلیل تعداد میں کثیر برکت

آنحضرتؐ نے جب حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کیا تو حضرت انسؓ کی والدہ اُمِّ سلیمؓ نے تھوڑا سا حیس (ایک قسم کا کھانا ہوتا ہے) تیار کیا اور ایک طشت میں کر کے حضرت انسؓ کے ہاتھ آپؐ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت انسؓ

---

[1] صحیح مسلم، جلد دوم باب خلط الازواد اذا قلت۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الاطعمہ [3] صحیح بخاری جلد دوم۔ کتاب الاطعمہ۔

کھانا لے کر آئے تو آپؐ نے بہت سے اصحاب کو مدعو کیا۔ تقریباً تین سو آدمی جمع ہو گئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ دس دس آدمی حلقہ باندھ کے بیٹھ جائیں اور اپنے سامنے سے کھانا شروع کریں۔ تمام لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے۔ لیکن اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جس وقت میں نے طشت کو اُٹھا کر رکھا اس وقت کھانا زیادہ تھا یا جب لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔[1]

ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت سمرہ بن جندبؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ دس دس آدمی صبح سے شام تک آنحضرتؐ کے پاس ایک پیالہ سے متصل کھاتے رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس میں قدر بڑھتی کیونکر ہوتی جاتی تھی؟ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ "وہاں سے"۔[2]

دودھ کے پیالہ میں برکت ایک دن حضرت ابوہریرہؓ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کر راستہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا تو ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن اس کا مقصد اپنی حالتِ زار کی طرف توجہ دلانا چاہا تھا۔ وہ گذر گئے اور کچھ توجہ نہ کی۔ پھر حضرت عمر گذرے۔ انہوں نے اس غرض سے ان سے بھی ایک آیت پوچھی۔ لیکن انہوں نے بھی بے التفاتی کی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کا گذر ہوا اور آپؐ نے ان کے چہرے کو دیکھ کر اصل حقیقت معلوم کر لی اور ان کو پکارا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے لبیک کہا اور ساتھ ہو لیے۔ آپؐ گھر میں داخل ہوئے تو دودھ کا پیالہ بھرا ہوا نظر آیا۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ ہدیۃً آیا ہے۔ آپؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حکم دیا کہ اصحابِ صفہ کو بلا لائیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کو یہ

---

[1] صحیح مسلم جلد اوّل، کتاب النکاح۔ [2] ترمذی باب ماجاء فی آیات نبوت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

ناگوار گذرا کہ اس دودھ کا سب سے زیادہ مستحق تو میں تھا لیکن آپؐ کی تعمیلِ ارشاد سے چارہ نہ تھا۔ مجبوراً اصحابِ صفہؓ بلا لیئے گئے اور سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ آپؐ کے حکم سے حضرت ابو ہریرہؓ نے سب کو پلانا شروع کیا۔ جب سب کے سب سیراب ہو گئے تو آنحضرتؐ نے پیالہ ہاتھ پر رکھا اور ابو ہریرہؓ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا اب صرف ہم اور تم باقی ہیں آؤ بیٹھو اور پینا شروع کرو۔ آپؐ ان کو متصل پلاتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ خود بول اُٹھے کہ اب گنجائش نہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے خود پیالہ لیا اور جو کچھ بچ گیا تھا، بسم اللہ کہہ کر پی گئے۔[1]

بکری کے دست میں برکت | ایک صحابیؓ نے آپؐ کے لئے گوشت پکایا۔ چونکہ آپؐ کو بکری کا دست نہایت مرغوب تھا۔ انہوں نے آپؐ کو دونوں دست دیئے۔ جب آپؐ ان کو تناول فرما چکے تو پھر دست مانگا۔ انہوں نے کہا "یا رسول اللہؐ! بکری کے کتنے دست ہوتے ہیں"؟ آپؐ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر تم خاموش رہتے تو میں جس قدر دست مانگتا تم مجھے دیتے رہتے۔"[2]

بکری کے تھنوں میں برکت | حضرت مقدادؓ سے روایت ہے کہ میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ سخت عُسرت اور فاقہ زدگی کی حالت میں آیا اور تمام صحابہؓ کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کیا۔ لیکن کسی نے ہماری کفالت منظور نہیں کی۔ بالآخر ہم سب آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ ہم کو گھر لے گئے۔ وہاں تین بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان کا دودھ دوہ کر پیا کرو۔ چنانچہ ہم سب دودھ دوہ کے

---

[1] صحیح بخاری، جلد دوم کتاب الرقائق ۔ [2] شمائل ترمذی، باب صفۃ ادام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اپنا حصّہ پی لیتے اور آنحضرتؐ کا حصّہ رکھ دیتے تھے۔ آپؐ رات کو آتے تو پہلے نرم آواز میں سلام کرتے۔ پھر مسجد میں آکر نماز پڑھتے۔ اس کے بعد اپنا حصّہ دودھ کا پیتے۔ ایک دن جبکہ میں اپنے حصّہ کا دودھ پی چکا تھا، شیطان نے مجھ کو دھوکا دیا کہ آنحضرتؐ انصار کے یہاں سے آتے ہیں وہ آپؐ کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں اور آپؐ اُن کو تناول فرماتے ہیں۔ آپؐ کو اس دودھ کی ضرورت نہیں۔ میں اُس کے دھوکے میں آگیا اور تمام دودھ اُٹھا کر پی گیا۔ جب میرے پیٹ میں گنجائش نہ رہی تو شیطان یہ کہہ کر چلتا ہوا کہ کم بخت تو آنحضرتؐ کا حصّہ پی گیا۔ جب آپؐ تشریف لائیں گے اور اپنے حصّہ کو نہ پائیں گے تو تجھ کو بددُعا دیں گے اور تیرے دین و دنیا سب برباد ہو جائیں گے۔" چنانچہ اس ڈر سے میری آنکھوں کی نیند اُڑ گئی، آپؐ تشریف لائے حسبِ معمول سلام کیا اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد دودھ کو کھولا، تو آپؐ کا حصّہ غائب تھا۔ آپؐ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور میں سمجھا کہ آپؐ اب مجھ پر بددُعا فرمائیں گے اور میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ لیکن آپؐ نے یہ دُعا فرمائی "خداوندا! جس شخص نے مجھ کو کھلایا، اس کو کھلا، اور جس نے مجھے پلایا، اسے پلا۔" اب میں چادر لپیٹ کے اُٹھا۔ ہاتھ میں چھُری لی کہ ان بکریوں میں جو سب سے زیادہ فربہ ہو اس کو ذبح کروں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا ہے۔ اب میں نے ایک برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا، جس کے متعلق آنحضرتؐ کے اہل و عیال کو یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ کبھی اس قدر دودھ ہوگا کہ اس میں دوہا جائے گا۔ لیکن میں نے اس میں دودھ دوہا تو وہ بھر گیا اور اوپر پھین نظر آنے لگا۔ میں نے دودھ کو آپؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا کیا تم اپنا حصّہ پی چکے، میں نے کہا آپؐ پی لیجئے۔ آپؐ نے پی کر مجھے دودھ عنایت فرمایا۔ میں نے عرض کی کہ آپؐ نوش جان فرمائیے۔ آپؐ نے پی لیا اور مجھے عنایت فرمایا۔ چنانچہ جب معلوم ہوا کہ آپؐ سیر ہو گئے اور آپؐ کی دُعا برکت میں میں شامل ہو

گیا، تو میں ہنستے ہنستے زمین پر گر پڑا اور آپؐ کی خدمت میں اوّل سے آخر تک تمام واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔[1] "یہ خداوند تعالیٰ کی رحمت ہے۔ تم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کیوں نہیں جگایا کہ وہ بھی پیتے"۔ میں نے کہا کہ جب میں نے آپؐ کے ساتھ پی لیا تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ کسی اور نے پیا یا نہیں۔

ایک وسق جَو کی برکت | حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی تو کچھ وسق (ایک پیمانہ) جَو کے سوا کچھ گھر میں نہ تھا۔ تو میں نے اس کو کھانا شروع کیا، تو وہ ختم ہی ہونے پر نہیں آتا تھا۔ ہم نے اس کو تولا تو پھر ختم ہو گیا۔ یعنی اس کی وہ برکت جاتی رہی۔[2]

توشہ دان کا ہمیشہ بھرا رہنا | حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ مجھ پر اسلام میں تین مصیبتیں سب سے سخت پڑیں۔ پہلی آنحضرتؐ کی وفات، دوسری حضرت عثمانؓ کی شہادت، تیسری میرے توشہ دان کا جاتے رہنا۔ لوگوں نے پوچھا "کیسا توشہ دان؟" انہوں نے کہا۔ آپؐ ایک غزوہ میں تھے۔ رسد ختم ہو گئی تھی۔ آپؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ابوہریرہؓ کچھ تمہارے پاس ہے؟ میں نے عرض کی کہ کچھ کھجوریں ہیں۔ ارشاد ہوا "وہ لے آؤ"۔ میں لایا تو آپؐ نے ان کو دسترخوان پر پھیلا دیا۔ اکیس کھجوریں تھیں۔ آپؐ ایک ایک کھجور لے کر اور اس پر خدا کا نام پڑھ کر رکھتے جاتے تھے۔ پھر آپؐ نے سب کو ملا دیا، اور حکم دیا کہ دس دس آدمی آ کر شریک ہوں۔ چنانچہ اس طرح لوگ آتے گئے اور پوری فوج سیر ہو گئی اور کچھ کھجوریں بچ گئیں۔ میں نے عرض کی "یا رسول اللہؐ! ان پر میرے لئے برکت کی دعا فرمائیے"۔ آپؐ نے دعا کی۔ میں نے ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لیا۔ ان کی برکت یہ تھی کہ جب میں ہاتھ ڈالتا تھا، اس میں سے کچھ کھجوریں نکل آتی تھیں اور پچاس وسق تو میں نے اس میں سے راہِ خدا میں خیرات کی حضرت

---

[1] صحیح مسلم، جلد دوم، باب اکرام الضیف۔ [2] صحیح بخاری و مسلم۔

ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ تک میں اس میں سے کھاتا رہا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ہنگامہ میں جہاں اور چیزیں گئیں توشہ دان بھی جاتا رہا۔[1]

تھوڑی کھجوروں میں برکت | حضرت دکینؓ اور نعمان بن مقرنؓ صحابی کہتے ہیں کہ ہم لوگ چار سو چودہ آدمی خدمتِ نبویؐ میں ایک ساتھ حاضر ہوئے اور ہم سب نے کھانے کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ ان کو کھانا کھلاؤ۔ انہوں نے عرض کی "یا رسول اللہؐ! میرے پاس تو اسی قدر ہے جو بال بچوں کو کافی ہو"۔ ارشاد ہوا "جاؤ ان کو کھلا دو"۔ عرض کیا "جیسا حکم ہو۔ تعمیل میں عذر نہیں"۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ ہم کو لے کر چلے اور ایک جگہ لاکر بٹھایا اور جو کچھ کھجوریں تھیں، وہ سامنے لاکر رکھ دیں اور ان میں یہ برکت نظر آئی کہ ہم سب سیر ہو گئے۔ لیکن کھجوروں میں کمی نہیں آئی۔[2]

---

[1] مسند احمد، جامع ترمذی، ابنِ سعد، ابنِ حبان، بیہقی۔ [2] مسند احمد عن دکینؓ و ابو داؤد ابنِ حبان و ابنِ سعد عن نعمان بن مقرن۔

پانی جاری ہونا

عرب کے خشک و ریگستانی ملک میں سب سے کمیاب پانی کا ایک چشمہ ہے۔ دنیا کے فاتحوں اور کشور کشاؤں کے حملوں سے یہ ملک جن اسباب کی بنا پر ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ اُن میں سے ایک قوی سبب اس میں پانی کے وجود کی کمیابی بھی ہے۔ چنانچہ یونانیوں رومیوں اور ایرانیوں کی ہمتیں اسی لئے اس صحرائے لق و دق میں آباد قبائل کے فتح سے قاصر رہیں۔ غور کرو کہ اسلام کا فاتحانہ لشکر بھی اگر نبوت کی برکاتِ الٰہی کے یہ چشمے اس کے ساتھ ساتھ نہ ہوتے، تو اس مشکل کو وہ کبھی حل کر سکتا تھا؟

انبیائے عالمؑ میں صرف ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے، جن کے لئے ایک دفعہ چٹان کی رگیں پانی کی سوتیں بنیں۔ لیکن رسولِ عربؐ کے لئے مشکیزہ کا چمڑا، گوشت و پوست کی انگلیاں، خشک چشموں کے دہانے، سُوکھے ہوئے کنوؤں کی سوتیں، دہانِ مبارک کی کُلیاں متعدد دفعہ پانی کا خزانہ ثابت ہوئیں

مشکیزہ سے پانی اُبلنا ایک دفعہ آپؐ سفر میں تھے۔ صبح کو آنکھ کھُلی اور آپؐ نے نماز پڑھانی شروع کی تو ایک صحابیؓ جماعت سے الگ ہو گئے۔ آپؐ نے شریکِ جماعت نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جنابت کا عذر کیا۔ چونکہ پانی نہ تھا اس لئے اُن کو آپؐ

نے تیمّم کا حکم دیا اس کے بعد آپؐ نے چند صحابہؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا۔ وہ لوگ چلے تو ایک عورت ملی جو اونٹ پر دو مشکیزوں میں پانی لاد کر لئے جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس چشمہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا، اس جگہ پانی نہیں ہے۔ پھر ان لوگوں نے دریافت کیا کہ تمہارے قبیلہ اور چشمہ کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے؟ اس نے ایک دن اور ایک رات کی مسافت بتائی۔ وہ لوگ اس کو آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے اور آنحضرتؐ نے ہاتھ سے مشکیزوں کو چھو دیا۔ آپؐ کے دستِ مبارک کی برکت سے اس پانی کی مقدار میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ چالیس آدمیوں نے اس سے خوب سیراب ہو کر پانی پیا اور اپنے اپنے تمام مشکیزے اور برتن بھر لئے۔ اس کے بعد آپؐ نے کھجور اور روٹی کے ٹکڑے جمع کرا کے اس عورت کو دیئے۔ وہ اپنے گھر آئی تو حیرت و استعجاب سے لبریز تھی۔ اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ میں نے سب سے بڑے ساحر کو یا اس کے معتقدین کے خیال میں ایک پیغمبر کو دیکھا۔ آخر اسی خاتون کے اثر سے یہ پورا قبیلہ مع اس عورت کے مسلمان ہو گیا۔[1]

انگلیوں سے پانی جاری ہونا ایک دن آپؐ مقام زوراء میں تھے۔ عصر کا وقت آ گیا۔ تو صحابہؓ نے پانی کی جستجو شروع کی۔ لیکن صرف آنحضرتؐ کے لئے پانی ملا۔ جب آپؐ کی خدمت میں پانی کا برتن پیش کیا گیا تو آپؐ نے اس پر اپنا ہاتھ ڈال دیا اور انگلیوں سے پانی کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ یہاں تک کہ تقریباً تین سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا۔[2]

پانی کا بڑھ جانا آپؐ صحابہؓ کے ساتھ کسی سفر میں تھے۔ نماز کا وقت آیا تو صحابہؓ نے پانی تلاش کیا۔ لیکن کہیں نہ ملا۔ ایک صحابیؓ پیالہ میں تھوڑا سا پانی لائے۔ پہلے آنحضرتؐ نے اس سے وضو کیا۔ پھر پیالے پر آپؐ نے انگلیاں پھیلا دیں۔ پانی کی مقدار میں اس قدر برکت

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [2] صحیح بخاری صحیح مسلم و جامع ترمذی باب معجزات۔

ہوئی کہ تقریباً ستر آدمیوں کی وضو کے لئے کافی ہوا۔[1]

انگلیوں کی برکت | ایک بار نماز کا وقت آیا تو جن لوگوں کا گھر مسجد کے قریب تھا، وہ گھر کے اندر وضو کرنے کے لئے چلے گئے۔ لیکن بقیہ لوگ بے وضو رہ گئے۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک برتن میں وضو کا پانی پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالنا چاہا تو اس کا دہانہ اس قدر تنگ نکلا کہ آپؐ کی ہتھیلیاں اس کے اندر نہ پھیل سکیں۔ اس لئے آپؐ نے اپنی انگلیاں اس کے اندر ڈالیں اور وہ پانی تقریباً اسی آدمیوں کے وضو کے لئے کافی ہوا۔[2]

انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا | صلح حدیبیہ کے دن صحابہؓ پیاس سے بے تاب ہوئے۔ آنحضرتؐ کے سامنے صرف چمڑے کے ایک برتن میں پانی تھا۔ آپؐ نے اس سے وضو کرنا شروع کیا، تو تمام صحابہؓ آپؐ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھے۔ آپؐ نے اس بے تابی کی وجہ پوچھی، تو لوگوں نے کہا کہ ہماری ضروریات کے لئے صرف یہی پانی تھا۔ آپؐ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی جاری ہوا۔ چودہ پندرہ سو آدمی ساتھ تھے، سب نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہو کر پانی پیا۔[3]

کلّی سے پانی بڑھ جانا | دوسری روایت ہے کہ صحابہؓ اس دن اس کنویں پر ٹھہرے جس کا نام حدیبیہ تھا اور اس کا تمام پانی اولیچ لیا، یہاں تک کہ کنویں کے اندر ایک قطرہ پانی نہ رہا۔ آنحضرتؐ کو معلوم ہوا تو کنویں کے کنارے بیٹھ گئے اور تھوڑا سا پانی منہ میں لے کر اس میں کلّی کر دی۔ تھوڑی دیر میں اس قدر ابلا کہ تمام صحابہؓ اور صحابہؓ کے تمام اونٹ سیراب ہو گئے۔[4]

[1] صحیح بخاری و مسلم، باب معجزات و مسند احمد عن انس ابن مالکؓ۔ [2] صحیح بخاری باب معجزات [3] صحیح بخاری باب معجزات [4] صحیح بخاری باب معجزات۔

ہاتھ منہ دھونے کی برکت غزوۂ تبوک کے سفر میں دو دو وقت کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتے جا رہے تھے۔ ایک دن عشا اور مغرب کی نماز ایک ساتھ ادا کی۔ پھر فرمایا۔ کل تم لوگ دوپہر کے وقت تبوک کے پاس پہنچو گے۔ لیکن جب تک میں نہ آلوں کوئی شخص اس کے پانی میں ہاتھ نہ لگائے۔ لوگ پہنچے تو نہر تسمہ کی طرح تنگ اور باریک نظر آئی۔ آنحضرتؐ کے حکم سے لوگوں نے پانی کو اولیچنا شروع کیا۔ پانی ایک گڑھے میں جمع ہو گیا۔ تو آنحضرتؐ نے اس میں مُنہ ہاتھ دھوئے۔ پھر وہ پانی نہر میں ڈال دیا گیا تو وہ پانی سے اُبل گئی[1]

انگلیوں کی برکت آپؐ نے ایک سفر میں حضرت جابرؓ سے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ انہوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈھا۔ پانی نہیں ملا۔ انصار میں ایک شخص تھے جو خاص طور پر آنحضرتؐ کے لئے پانی ٹھنڈا کر کے رکھتے تھے۔ حضرت جابرؓ نے آپؐ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی تو آپؐ نے اُن کو ان انصاری کے پاس بھیجا۔ لیکن ان کے پاس بھی اس قدر کم پانی ملا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصّہ میں جذب ہو کر رہ جاتا۔ حضرت جابرؓ نے آنحضرتؐ کو اس کی خبر دی تو آپؐ نے اس برتن کو منگا بھیجا۔ اور ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا۔ اور اس کو طشت کے اندر رکھ کے حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کر کے ہاتھ پر پانی گرائیں۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا تو پہلے آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی اُمنڈا۔ پھر طشت بھر گیا، یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا[2]

انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ایک

---

[1] صحیح مسلم، باب معجزات النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم [2] صحیح مسلم، باب حدیث جابر الطویل۔

بارعصر کا وقت آگیا۔ صرف تھوڑا سا بچا ہوا پانی رہ گیا تھا۔ آپؐ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے اندر سے پانی جوش مارنے لگا۔ یہاں تک کہ چودہ سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہوئے۔[1]

تھوڑے پانی میں کثیر برکت ایک بار آپؐ سفر میں تھے۔ صبح کے وقت قافلہ سے الگ ہو کر سو گئے اور چند اشخاص سے جو ساتھ تھے کہہ دیا کہ نماز کا خیال رکھنا۔ لیکن سب کے سب سو گئے اور سب سے پہلے آنحضرتؐ بیدار ہوئے تو دن نکل چکا تھا۔ اب سب کے سب گھبرا کے اُٹھے تو آپؐ نے کوچ کرنے کا حکم دیا۔ دن چڑھا تو آپؐ نے سواری سے اُتر کر وضو کیا۔ تھوڑا سا پانی جو بچ رہا تھا اس کی نسبت ابو قتادہؓ سے فرمایا کہ اس کو محفوظ رکھنا۔ اس سے ایک عظیم الشان نشان ظاہر ہوگا۔ جب آفتاب خوب بلند ہو چکا تو آپؐ قافلہ سے جا ملے لوگوں نے کہا کہ "یا رسول اللہؐ! پیاس نے ہم کو مار ڈالا۔" آپؐ نے فرمایا "تم لوگ تباہ نہیں ہو سکتے۔" یہ کہہ کر اپنے وضو کا بچا ہوا پانی ابو قتادہؓ سے طلب کر کے لوگوں کو پلانا شروع کیا اور تمام لوگ سیراب ہو گئے۔[2]

انگلیوں سے پانی اُبلنا حبان بن بح الصدائیؓ کا بیان ہے کہ میری قوم حالتِ کفر میں تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ ان کے لئے فوجی تیاریاں فرما رہے ہیں۔ میں آیا اور آپؐ کو اطلاع دی کہ میری قوم مسلمان ہے۔ پھر میں نے رات بھر آپؐ کے ساتھ سفر کیا۔ جب صبح ہوئی تو میں نے اذان دی۔ آپؐ نے پانی کا برتن مجھے عطا فرمایا۔ میں نے اس سے وضو کیا۔ پھر آپؐ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی اُبلنے لگا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ جو شخص چاہے اُس سے وضو کرے۔[3]

---

[1] صحیح بخاری، جلد دوم کتاب الاشربہ۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب قضاء الصلوٰۃ الفائتۃ [3] مسند احمد بن حنبل، جلد چہارم۔

ایک اور واقعہ | حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ معجزات کو برکت سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ہم لوگ آنحضرتؐ کے ساتھ سفر میں تھے۔ پانی کی کمی کی شکایت ہوئی تو آپؐ نے بچے ہوئے پانی کو طلب فرمایا۔ وہ ایک برتن میں آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا اور آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈال کر فرمایا کہ "وضو کے مبارک پانی کی طرف دوڑو۔ خدا کی طرف سے برکت ہوگی"۔ میں نے دیکھا تو آپؐ کی انگلیوں کے درمیان پانی اُبل رہا تھا۔[1]

یہ واقعات جو مختلف عنوانوں میں بیان کیے گئے ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ایک ہی واقعہ کی متعدد حکایتیں ہوں۔ لیکن چونکہ ہر ایک کے ساتھ خصوصیات میں کچھ فرق و امتیاز محسوس ہوا، اس لئے ان کو مستقل واقعات کی صورت دے دی گئی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: باب علامات النبوۃ۔

اِطّلاعِ غیب

فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن: ۲۶-۲۷)

(اللہ تعالیٰ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے)

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار بے نقاب کیا ہے کہ "غیب کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں" چنانچہ قرآن مجید میں اسی معنی کی بکثرت آیتیں ہیں اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ علمِ غیب کی صفت سے خدا کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا جا سکتا:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ	کہدے (اے پیغمبر) کہ غیب تو خدا ہی کے
(یونس: ۲۰)	لئے ہے۔
قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ	کہدے (اے پیغمبر) کہ خدا کے سوا
الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ	آسمان وزمین میں کوئی غیب نہیں
(النمل: ۶۵)	جانتا۔

یعنی خدا کے سوا کسی مخلوق کو غیب کا ذاتی علم نہیں اور نہ غیب کی باتیں خدا نے آسمان وزمین میں کسی مخلوق کو بتائی ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن تمام انبیاءؑ کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ	جس دن خدا تمام پیغمبروں کو جمع کرے گا اور
مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ	کہے گا کہ تم کو کیا جواب دیا گیا وہ کہیں گے

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ (المائدہ : ۱۰۹)

کہ ہم کو کچھ علم نہیں غیب کی باتوں کا پورا جاننے والا تو ہی ہے۔

آنحضرتؐ جو اعلم الانبیاء تھے ان کو یہ اقرار کرنے کا حکم ہوتا ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (الانعام : ۵۰)

کہدے (اے پیغمبر) کہ میں نہیں کہتا کہ خدا کے تمام خزانے میرے قبضہ میں ہیں، اور یہ بھی کہدیتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں نہیں جانتا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ط اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (الاعراف : ۱۸۸)

کہدے اے پیغمبر! کہ میں اپنے آپ کے لئے کسی نفع وضرر پر قادر نہیں ہوں لیکن یہ کہ خدا جو چاہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو بہت سے فائدے اٹھا لیتا اور مجھ کو کبھی مصیبت نہ پیش آتی۔ لیکن میں تو ایمان دار قوم کو ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔

ان آیتوں نے صاف کھول دیا ہے کہ آنحضرتؐ کو نہ غیب کا ذاتی علم تھا اور نہ تمام غیب کی باتیں آپؐ کو بتائی گئی تھیں۔ البتہ خدائے تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو کچھ چاہا اور پسند کیا آنحضرتؐ کو وقتاً فوقتاً اس سے مطلع فرماتا رہا۔ چنانچہ صاف ارشاد ہوا:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ (البقرۃ : ۲۵۵)

وہ (یعنی مخلوقاتِ الٰہی) خدا کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اُتنے کا جتنے کا خدا چاہے۔

سورۂ جنّ میں فرمایا:

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

(الجن: ۲۶-۲۷)

اللہ تعالےٰ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ص

(آل عمران: ۱۷۹)

اور خدا غیب کی باتیں تم کو نہیں بتا سکتا۔ لیکن وہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے (اس کے لئے) چن لیتا ہے۔

امورِ غیب میں سے قیامت کے متعلق تصریح کر دی گئی ہے کہ اس کا علم کسی کو عطا نہیں ہوا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ط قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ج لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ط ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ط يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ط قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(اے پیغمبر) لوگ تجھ سے قیامت کی نسبت پوچھتے ہیں کہ وہ کب لنگر انداز ہوگی۔ کہدے کہ اس کا علم تو صرف میرے پروردگار ہی کو ہے۔ وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ وہ وقت آسمان وزمین میں بڑا بھاری ہوگا۔ وہ دفعتہً آجائے گا۔ تجھ سے وہ قیامت کا حال اس طرح پوچھتے ہیں کہ گویا وہ تجھے معلوم ہے اور تو چھپاتا ہے۔ کہدے کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس

ہے لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔ (الاعراف : ۱۸۷)

صحاح میں حضرت جبریلؑ کے ایک مسافر کی صورت میں آنے کی جو روایت ہے اور جس میں انہوں نے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق آنحضرتؐ سے سوالات پوچھے ہیں اور آپؐ نے اُن کے جوابات دئے ہیں، اس کے آخر میں وہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب ہوگی؟ اس کے جواب میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

ما المسئول عنها باعلم من	جس سے پوچھتے ہو وہ پوچھنے والے
السائل وساحدثك عن اشراطها۔	سے اس باب میں زیادہ علم نہیں رکھتا
(صحیح بخاری و مسلم کتاب الایمان)	ہاں میں اس کی علامتیں بتادوں گا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ جو تم سے یہ کہے کہ آنحضرتؐ غیب کی باتیں جانتے تھے وہ جھوٹا ہے۔ قرآن نے صاف کہدیا ہے:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ	کسی نفس کو یہ علم نہیں کہ کل وہ
غَدًا	کیا کرے گا[1]

(لقمٰن : ۳۴)

ایک دفعہ چند لڑکیاں آپؐ کے سامنے بیٹھی کچھ گا رہی تھیں۔ گاتے گاتے ایک نے ان میں سے کہا:

وفینا نبی یعلم ما فی غد	ہم میں ایک نبی ہے جو کل کی ہونے والی بات جانتا ہے

آنحضرتؐ نے اس سے منع فرمایا[2]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ غیب کی کنجی پانچ باتیں ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی[3]:-

---

[1] صحیح بخاری: تفسیر سورۂ لقمان۔ [2] صحیح بخاری: کتاب النکاح۔ [3] صحیح بخاری: تفسیر سورۂ لقمان۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ	خدا ہی کے پاس اُس آنے والی گھڑی
يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ	کا علم ہے۔ وہی پانی برساتا ہے۔ وہی جانتا
وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ	ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے ؛
غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ	کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا
اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ	اور نہ یہ کوئی جانتا ہے کہ کس سرزمین
(لقمٰن: ۳۴)	میں وہ مرے گا۔

یہی روایت بخاری کے دوسرے باب میں اس طرح ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ حاملہ عورت کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ اور نہ خدا کے سوا کوئی یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا؛ اور نہ خدا کے علاوہ کسی کو اس کا علم ہے کہ پانی کب برسے گا۔ اور نہ بجز خدا کے کسی کو اس کی خبر ہے کہ وہ کہاں مرے گا۔[1]

بہر حال ان مخصوص باتوں کے علاوہ جن کا علم صرف عالم الغیب کو ہے اپنے غیب کی باتوں میں جن باتوں کو وہ مناسب سمجھتا تھا، آنحضرتؐ کو وقتاً فوقتاً ان کی اطلاع دیتا تھا۔ سورۂ ہود میں بعض انبیاءؑ کے تذکرہ کے بعد خدا فرماتا ہے :

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ	یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف
اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا	وحی کر رہے ہیں۔ نہ تو ان کو جانتا
قَوْمُكَ	تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

(هُود : ۴۹)

خود آنحضرتؐ کے متعلق ارشاد ہوا :

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الرد علی الجہمیۃ، باب عالم الغیب۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ۝

(التکویر : ۲۴)

یعنی آپؐ کو امورِ غیب میں سے جس کی تعلیم دی جاتی ہے آپؐ اپنی اُمت کو اس کے بتانے میں بخل نہیں فرماتے۔

ایک دفعہ آنحضرتؐ کے عہد میں سورج کو گرہن لگا تھا۔ آپؐ نے صحابہؓ کے ساتھ نمازِ کسوف ادا فرمائی تھی اور نماز کے بعد ایک نہایت بلیغ و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا:

یا امة محمدٍ واللہ لو تعلمون ما اعلمت فضحکتم قلیلا و لبکیتم کثیرًا۔

(صحیح بخاری باب الصدقة فی الکسوف و تفسیر سورہ مائدة)

اے گروہ محمدؐ! خدا کی قسم اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔

ایک دفعہ نماز کے بعد آپؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

ھل ترون قبلتی ھھنا فو اللہ ما یخفیٰ علی خشوعکم و لا رکوعکم انی لاراکم من وراء ظھری۔

(صحیح بخاری باب عظة امام الناس)

تم دیکھتے ہو کہ میرا رُخ اِدھر ہے لیکن خدا کی قسم مجھ سے (نماز میں) نہ تمہارا خشوع اور نہ تمہارا رکوع پوشیدہ رہتا ہے۔ میں تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

انی لاراکم من ورائی کما اراکم۔

میں جس طرح تم کو دیکھ رہا ہوں اسی طرح

(صحیح بخاری باب عظۃ امام الناس) میں تم کو پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

احادیث میں متعدد صحابہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے۔ بعض صاحبوں نے کچھ سوالات کئے جن کو آپؐ نے پسند نہیں کیا۔ آپؐ کو جوش آگیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ سلونی عما شئتم (جو چاہو مجھ سے دریافت کرلو)۔ ایک شخص نے اُٹھ کر کہا۔ "یارسول اللہؐ! میرا باپ کون ہے؟" فرمایا "حذافہ"۔ دوسرے نے اٹھ کر کہا اور میرے باپ کا نام کیا ہے؟ فرمایا "سالم غلام شیبہ"۔ اور بار بار آپؐ فرماتے جاتے تھے "پوچھو مجھ سے، پوچھو مجھ سے" یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور عرض کیا۔ یارسول اللہؐ! ہم کو اللہ اپنا پروردگار، محمدؐ اپنا رسول اور اسلام اپنا دین پسند ہے[1]۔

صحابہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے صبح کی نماز پڑھ کر تقریر شروع کی۔ یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر عصر تک پھر تقریر کی۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی۔ اس سے فارغ ہو کر غروب آفتاب تک پھر تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طویل خطبہ میں آنحضرتؐ نے لوگوں کو جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا یعنی آغازِ آفرینش سے لے کر قیامت تک کے واقعات پیدائشِ عالم، علاماتِ قیامت، فتن، حشر و نشر سب کچھ سمجھایا۔ صحابہؓ کہا کرتے تھے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ بہت کچھ بھول گئے۔ بعضوں کو بہت کچھ یاد ہے۔ ان واقعات میں سے کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے تو ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی شخص کی صورت ذہن سے اُتر جاتی ہے پھر اس کو دیکھ کر یاد آجاتی ہے[2]۔

نجاشی شاہِ حبش جس کے سایۂ حکومت میں جاکر مسلمانوں نے پناہ لی تھی اور جس نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا تھا، جس دن اس نے حبش میں وفات پائی۔ آنحضرتؐ نے

---

[1] صحیح بخاری: کتاب العلم باب الغضب فی الموعظۃ والتعلیم۔ [2] صحیح مسلم: باب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یکون الی قیام الساعۃ۔

صحابہؓ کو اس سانحہ کی اطلاع دی۔ آپؐ نے فرمایا کہ آج تمہارے بھائی نجاشی نے وفات پائی اور اس کے بعد اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔[1]

۸ھ میں جب غزوۂ موتہ پیش آیا ہے تو آپؐ نے فوج کا علم زید بن حارثہؓ کو عنایت کیا اور فرمایا کہ جب زید شہید ہوں تو یہ امانت جعفرؓ کے سپرد کی جائے۔ جب وہ بھی جاں بحق ہوں تو عبداللہ بن رواحہؓ اس خدمت کو انجام دیں اور جب وہ بھی کام آجائیں تو مسلمان اپنے مشورہ سے جس کو چاہیں اپنا سردار بنائیں۔ یہ افسری اور سرداری کے متعلق ترتیبی بیان درحقیقت واقعہ کا اظہار تھا۔ میدانِ جنگ میں پہلے حضرت زیدؓ نے شہادت پائی ان کی جانشینی حضرت جعفرؓ نے کی۔ وہ بھی جب علمِ نبوت پر قربان ہو چکے تو خود عبداللہ بن رواحہؓ نے پیش قدمی کی۔ جب وہ بھی نثار ہو گئے تو مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اپنا افسر بنایا۔ چونکہ اس جنگ میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ تھا اس لئے مسلمانوں کو بڑا اضطراب تھا۔ عین اس وقت جب مدینہ سے کوسوں دور شام کی سرحد پر یہ خونی مناظر درپیش تھے۔ آنحضرتؐ مسجد نبوی میں منبر پر تشریف فرما تھے۔ دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور فرما رہے تھے "علم کو زیدؓ نے لیا وہ شہید ہوئے۔ پھر حضرت جعفرؓ نے لیا وہ بھی جاں بحق ہوئے تو عبداللہ بن رواحہؓ نے لیا۔ انہوں نے بھی شہادت پائی تو خالد بن ولیدؓ نے لیا اور ان کو فتح دی گئی۔"[2]

ایک غزوہ میں ایک شخص نہایت جانبازانہ حملے کر رہا تھا۔ صحابہؓ نے دیکھا تو اس کی بڑی تعریف کی۔ لیکن آنحضرتؐ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ "یہ جہنمی ہے"۔ صحابہؓ کو اس پر تعجب ہوا اور ایک صحابیؓ اس کے پیچھے ہو لئے۔ ایک موقع پر اس کو سخت زخم لگا اور

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الجنائز و صحیح مسلم۔ [2] صحیح بخاری: کتاب الجنائز و باب علامات النبوۃ فی الاسلام و غزوۂ موتہ۔

اس نے بے صبری کی حالت میں خودکشی کرلی۔ وہ صحابیؓ خدمتِ مبارک میں دوڑے ہوئے آئے اور کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا کہ "کیا واقعہ ہے"؟ انہوں نے عرض کیا کہ ابھی حضورؐ نے ایک شخص کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ جہنمی ہے۔ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک زخم کے صدمہ سے اس نے خودکشی کرلی ہے"۔[1]

ایک غزوہ میں ایک شخص شریک تھا۔ وہ قتل ہوا کسی نے آکر خبر دی کہ یا" رسول اللہؐ! فلاں شخص شہید ہوگیا"۔ فرمایا کہ "یہ ناممکن ہے۔ شہادت اس کے لئے کہاں میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ مالِ غنیمت میں سے اس نے ایک عبا چرائی تھی"۔[2]

مسلمانوں نے ۸ھ میں طائف کا محاصرہ کیا (آنحضرتؐ کو معلوم ہو چکا تھا کہ طائف کی فتح اس محاصرہ سے مقدر نہیں۔ اس لئے) ایک روز آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کل انشاءاللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر کوچ کریں گے۔ لوگوں کو اتنی محنت و زحمت کے بعد حصولِ فتح کے بغیر واپسی شاق ہوئی اور انہوں نے کہا ہم فتح حاصل کئے بغیر چلے جائیں۔ آپؐ نے فرمایا" اچھا کل پھر قسمت آزمائی کرلو"۔ چنانچہ دوسرے دن مسلمان لڑے تو ان کو زیادہ نقصانات پہنچے۔ شام ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "کل انشاءاللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے"۔ مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا اور آپؐ مسکرا دئے[3]۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ تمہیں میری طرح حقیقتِ حال کا علم نہ تھا۔

عمیر بن وہب اسلام کا سخت دشمن تھا۔ وہ اور صفوان بن امیہ دونوں خانۂ کعبہ میں

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الجہاد و باب العمل بالخواتیم۔ [2] جامع ترمذی: باب ماجاء فی الغلول۔ [3] صحیح بخاری و مسلم: غزوۂ طائف۔

بیٹھ کر بدر کے مقتولین پر ماتم کر رہے تھے اور بالآخران دونوں میں پوشیدہ طور سے یہ سازش قرار پائی کہ عمیر مدینہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے سے قتل کر آئے۔ اور اگر وہ مارا گیا تو صفوان اس کے تمام قرض اور گھر کے مصارف اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے گا۔ عمیر یہاں سے اٹھ کر گھر آیا اور تلوار کو زہر میں بجھا کر مدینہ کو چل کھڑا ہوا۔ مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھ لیا۔ وہ اس کو پکڑ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے۔ آپؐ نے پوچھا کہ "عمیر! یہاں کس ارادہ سے آئے ہو"؟ اس نے کہا "اپنے بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں"۔ فرمایا "کیوں نہیں! کیا تم نے اور صفوان نے خانۂ کعبہ میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی ہے"؟ عمیر یہ راز کی بات سن کر سناٹے میں آگیا اور اس کو سخت تعجب ہوا اور بے اختیار بول اٹھا کہ محمدؐ! بیشک تم خدا کے پیغمبر ہو۔ خدا کی قسم میرے اور صفوان کے سوا کسی تیسرے کو اس معاملہ کی خبر نہ تھی[1]

حضرت وابصہ اسدیؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اس غرض سے حاضرِ خدمت ہوا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کروں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں آپؐ نے فرمایا "وابصہ! میں تمہیں بتاؤں کہ تم کیا پوچھنے آئے ہو"؟ عرض کی "ارشاد ہو"۔ فرمایا "تم نیکی اور گناہ کی حقیقت پوچھنے آئے ہو"۔ عرض کی "قسم اُس ذات کی جس نے آپؐ کو بھیجا آپؐ نے سچ فرمایا"۔ ارشاد ہوا "نیکی وہ ہے جس کے کرنے کے خیال سے تمہارے دل میں انشراح اور خوشی پیدا ہو۔ اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے اگرچہ لوگوں نے اس کے کرنے کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے دیا ہو[2]"۔

---

[1] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر۔ [2] مسند ابنِ حنبل حدیث وابصۃ الاسدیؓ و ابویعلی و بیہقی و ابونعیم فی حلیۃ الاولیا، ذکر وابصہ بن معبدؓ، الجہنی و بزار۔

ایک دفعہ ایک صحابیہؓ نے آپؐ کی دعوت کی۔ بکری ذبح کی اور آپؐ کو اور دیگر رفقاء کو کھانا کھانے کے لئے بلایا۔ آپؐ تشریف لے گئے اور گوشت کا ایک لقمہ اُٹھا کر ابھی چکھا ہی تھا کہ فرمایا "یہ بکری اپنے مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے"۔ داعیہؓ نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہؐ! آلِ معاذ اور ہمارے خاندان میں پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہماری چیز بے تکلف لیتے ہیں اور ہم ان کی چیز"۔[1] دوسری روایت میں ہے کہ اس نے جواب دیا کہ "ہاں یا رسول اللہؐ! میں نے اپنی پڑوسن سے یہ بکری مانگی۔ اس نے اپنے شوہر سے پوچھے بغیر دے دی"۔

غزوۂ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپؐ کی دعوت کی۔ کھانے میں بکری کا گوشت تھا۔ آپؐ نے چند رفقاء کے ساتھ اس کو کھانا چاہا۔ ابھی پہلا ہی لقمہ اُٹھایا تھا کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "ہاتھ روک لو۔ اس گوشت میں زہر ملایا گیا ہے"۔ اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ خیبر کے تمام یہودیوں کو جمع کیا جائے۔ جب وہ جمع ہو چکے تو آپؐ نے دریافت کیا کہ "جو کچھ میں پوچھوں گا سچ سچ بتاؤ گے"؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا "تمہارے باپ کا کیا نام ہے"؟ انہوں نے کچھ بتایا۔ آپؐ نے فرمایا تم جھوٹے ہو۔ تمہارے باپ کا یہ نام ہے۔ اس امتحان کے بعد آپؐ نے دریافت فرمایا "کیا تم نے بکری کے گوشت میں زہر ملایا تھا"؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ آپؐ کو کیونکر معلوم ہوا"؟ فرمایا کہ بکری کے اس دست نے مجھ سے کہا۔[2]

حضرت صہیب بن سنانؓ جو صہیب رومی کر کے مشہور ہیں جس شب کو آنحضرتؐ نے

---

[1] سنن نسائی و حاکم فی المستدرک عن جابر۔ [2] سنن ابی داؤد؛ کتاب الریات و دارمی: باب کلام الموتیٰ و بیہقی۔

ہجرت فرمائی، انہوں نے بھی ہجرت کرنی چاہی۔ لیکن کفار نے ان کو روک دیا۔ وہ رات بھر کھڑے رہے اور بیٹھنے کا نام بھی نہیں لیا۔ کفار نے ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہا کہ چلو اس کو تو پیٹ کے عارضہ نے خود ہی مجبور کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ انہوں نے نگہبانوں سے اپنے کو آزاد پاکر مدینہ کا راستہ لیا۔ کافروں نے ان کو پکڑ لیا۔ آخر کچھ زر و نقد دے کر ان سے رہائی حاصل کی۔ آنحضرتؐ نے ان کو دیکھنے کے ساتھ فرمایا "اے ابو یحییٰ! تمہاری خرید و فروخت بڑے نفع کی رہی"۔ حضرت صہیبؓ نے عرض کی "یا رسول اللہؐ مجھ سے پہلے کوئی یہاں آیا نہیں جو اس راز کی آپؐ کو خبر کرتا۔ یہ یقیناً آپؐ کو بذریعۂ وحی معلوم ہوا"۔[1]

حضرت حذیفہؓ کی والدۂ مکرمہ نے ایک دن اپنے بیٹے پر عتاب کیا کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں اتنے دن ہو گئے، کیوں نہ گئے؟ انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ آج جا کر اپنی اور آپ کی مغفرت کی دعا کراؤں گا۔ چنانچہ وہ مغرب کی نماز میں جا کر حاضر ہوئے۔ عشا کی نماز کے بعد جب آپؐ واپس ہوئے تو یہ بھی پیچھے چلے۔ آپؐ نے آواز پہچان کر فرمایا "کون حذیفہؓ! خدا تمہاری اور تمہاری ماں کی مغفرت کرے"۔[2] گویا سوال سے پہلے ہی حذیفہؓ کی درخواست سمعِ اقدس تک پہنچ چکی تھی۔

صحابہؓ کو آپؐ کی اس قوتِ اطلاع کا اس قدر یقین تھا کہ جب تک آنحضرتؐ زندہ رہے صحابہؓ کو اپنے ایک ایک عمل کا خوف لگا رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ خدا آپؐ کو اس سے باخبر کر دے یہاں تک کہ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی زندگی میں ہم لوگ اپنی بیویوں سے بھی کھل کر ملتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری نسبت قرآن میں کچھ نازل ہو جائے تو رسوائی ہو۔[3] علاوہ ازیں منافقین کے تمام اندرونی حالات اور ناموں سے بھی آپؐ کو ایک ایک کر کے واقفیت تھی۔[4]

---

[1] مستدرک حاکم جلد ثالث بروایت صحیح ذہبی نے بھی اس کی تصریح کی ہے، ذکر ہجرۃ صہیبؓ۔ [2] جامع ترمذی، مناقب حسینؓ۔ [3] صحیح بخاری، مسند احمد جلد دوم۔ [4] صحیح بخاری۔

اہلِ کتاب کے سوالات کا جواب دینا

یہ دوست دشمن اور موافق و مخالف سب کو معلوم ہے کہ آنحضرتؐ لکھے پڑھے نہ تھے۔ یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں سے آپؐ کو تعلیمی واقفیت نہ تھی۔ توراۃ و انجیل اور علمائے یہود و نصاریٰ نے ان کی شرحوں میں یا اپنی دوسری مذہبی تصنیفات میں جو کچھ لکھا تھا، آنحضرتؐ نے ان کا ایک صفحہ بھی ملاحظہ نہیں فرمایا تھا اور یہی آخری چیزیں اسوقت یہود و نصاریٰ کے ایمان و عقائد کا جزو ہو گئی تھیں اور عوام میں ان ہی کتابوں کو مقبولیت حاصل تھی۔ باایں ہمہ آپؐ کا ان کے سوالات کا صحیح جواب دینا آپؐ کی روحانی تعلیم کی کھلی شہادت ہے۔

مکہ میں جب آنحضرتؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کفارِ عرب کو عموماً آپؐ کے اس دعویٰ پر یقین نہیں آیا۔ اس لئے انہوں نے معجزات طلب کئے اور جب وہ دکھائے گئے تو اُن کو سحر اور جادو کہنے لگے۔ پھر ان کو خیال آیا کہ یثرب، خیبر اور شام میں جا کر یہودیوں سے ملیں اور ان سے پوچھ کر چند ایسے سوالات دریافت کریں جن کے جوابات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مانگے جائیں، اور چونکہ وہ لکھے پڑھے نہیں ہیں اور مکہ میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کو اُن کے جوابات بتا سکے گا، اس لئے وہ ان کے جوابات نہ دے سکیں گے اور اس طرح اس مدعیِ نبوت کی قلعی کھل جائے گی اور اس کا کذب سب پر واضح ہو جائے

گا۔ اس خیال کی بنا پر وہ یہودیوں سے جا کر ملے۔ اُن سے آپؐ کے حالات بیان کئے اور آپؐ سے پوچھنے کے لئے ان سے چند سوالات مانگے۔ چنانچہ انہوں نے چند سوالات دئے کہ یہ جا کر اُس سے پوچھو۔ اگر وہ پیغمبر نہ ہوگا تو ہرگز اِن کا جواب نہ دے سکے گا۔

یہ تین تاریخی سوالات تھے۔ اصحاب کہف کا حال، حضرت موسیٰ اور خضر علیہم السلام کی ملاقات کا واقعہ اور ذوالقرنین کا قصہ۔ اللہ تعالےٰ نے یہ تینوں قصے وحی کے ذریعہ سے آنحضرتؐ کو بتا دئے اور آپؐ نے ان کو پڑھ کر کفار کو سنایا۔ چنانچہ سورہ کہف میں یہ تینوں قصے مذکور ہیں اور آخری قصہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ کفار کے سوال کے جواب میں ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ	اور کفار تجھ سے (اے پیغمبرؐ) ذوالقرنین کا
قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ○	حال دریافت کرتے ہیں کہدے کہ میں اس کا
(الکہف : ۸۳)	تھوڑا ذکر تم کو سناتا ہوں۔

آنحضرتؐ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے جو گویا یہودیوں ہی کا شہر تھا تو انہوں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس مدعیٔ نبوتؐ کے دعوائے نبوّت کا امتحان ان ہی کتابی سوالات سے لیا جائے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ ہماری کتابوں سے واقف نہیں۔ اس لئے وہ ان کے صحیح جوابات نہ دے سکے گا اور اگر اُس نے یہ کہہ دیا کہ یہ سوالات یا جن کتابوں میں وہ سوالات مذکور ہیں، وہ غیر معتبر ہیں، تو ان سوالوں اور کتابوں کا اثر یہود میں اِس قدر ہے کہ ان کی تکذیب سے خود محمدؐ کی جہالت اور کذبِ دعویٰ (نعوذ باللہ) کا پردہ فاش ہو جائے گا۔ لیکن اتنے بڑے مجمع میں سب لوگ بدنیت ہی نہ تھے۔ بلکہ ان میں بعض لوگ نیک نیت بھی تھے اور وہ نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ ہماری کتابوں میں جو مخفی اسرار لکھے ہوئے ہیں ان کو پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرتؐ مدینہ منوّرہ آئے۔ تو عبداللہ بن سلامؓ مدینہ کے ایک مشہور یہودی عالم آپؐ سے ملنے آئے اور کہا کہ میں آپؐ سے تین سوال کروں گا۔ جن کا جواب پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ بتائیے۔ کہ قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟ اور اہل جنت کی پہلی غذا کیا ہوگی؟ اور بچہ کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے مشابہ کیوں ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ "قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے ہنکا کر مغرب کی طرف لے جائے گی اور اہلِ جنت کی پہلی غذا مچھلی کا جگر ہے اور ماں یا باپ سے بچّہ کی مشابہت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب باپ کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو بچہ باپ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب ماں کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو ماں سے مشابہ ہوتا ہے۔ عبداللہ بن سلامؓ نے یہ جواب سُن کر کہا کہ "میں آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں"۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک یہودی عالم خدمتِ والا میں حاضر ہوا اور کہا کہ "اے محمدؐ! میں تم سے چند سوالات کروں گا۔ تم جواب دو"۔ آپؐ نے فرمایا کہ "میرے جواب سے تم کو فائدہ ہوگا"۔ اس نے کہا۔ سنو! یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن جس وقت آسمان اور زمین بدلے جائیں گے لوگ کہاں ہوں گے؟ فرمایا "پُل کے پیچھے تاریکی میں"۔ دوسرا سوال اُس نے کیا کہ سب سے پہلے جنت میں جانے کی کس کو اجازت ملے گی؟ جواب دیا "ان غریبوں کو جو راہِ حق میں گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں"۔ اس نے کہا "اب میں تم سے وہ بات پوچھتا ہوں جس کا جواب روئے زمین پر صرف پیغمبر یا پیغمبر کے علاوہ ایک ہی دو آدمی دے سکتے ہیں۔ بتاؤ کہ بچہ کبھی لڑکی اور کبھی لڑکا کیوں ہوتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا "مرد کا نطفہ سپید اور عورت کا زرد ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو

اگر مرد کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور جب عورت کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ لڑکی ہوتی ہے"۔ یہودی نے یہ جواب سن کر کہا کہ بیشک تم نبی ہو اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ آپؐ نے فرمایا "یہ جوابات مجھ کو خدا نے القا کئے۔ مجھے پہلے سے معلوم نہ تھے۔

مسند ابو داؤد طیالسی میں ہے کہ ایک دفعہ چند یہودی خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا کہ "ہم آپؐ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا جواب پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا"۔ آپؐ نے فرمایا "جو تم چاہو پوچھ سکتے ہو۔ لیکن وعدہ کرو کہ اگر میں نے ایسے جوابات دئے جن کو تم نے صحیح سمجھا تو کیا اسلام قبول کر لو گے"؟ انہوں نے کہا "ہاں ہم کو یہ شرط منظور ہے"۔ آپؐ نے فرمایا "اچھا پوچھو کیا پوچھتے ہو"۔ انہوں نے کہا کہ "چار سوالوں کے جواب دیجئے۔ پہلا یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تورات کے اترنے سے پہلے جو کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اس کا کیا واقعہ ہے؛ دوسرا یہ کہ ایک ہی نطفہ کبھی نر اور کبھی مادہ کیوں کر ہو جاتا ہے؛ تیسرا یہ کہ تورات میں نبی امی کی کیا پہچان بتائی گئی ہے اور چوتھا یہ کہ فرشتوں میں سے تمہارا دوست یا نگہبان کون ہے"؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ تم کو اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی۔ تم یہ جانتے ہو کہ ایک دفعہ یعقوب علیہ السلام سخت بیمار پڑے تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو کھانے اور پینے کی جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے وہ چھوڑ دوں گا۔ ان کو کھانے میں سب سے زیادہ اونٹ کا گوشت اور پینے میں اونٹ کا دودھ پسند تھا چنانچہ صحت کے بعد انہوں نے اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑ دیا۔ یہودیوں نے کہا "خدایا سچ ہے"۔ آپؐ نے فرمایا "خدایا گواہ رہ"۔ پھر فرمایا میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی، تم کو یہ معلوم ہے کہ مرد کا نطفہ گاڑھا اور سپید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور زرد۔ ان میں جو جنس غالب ہوتی ہے وہ نطفہ بھی خدا کے حکم سے

وہی ہو جاتا ہے اور اسی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا "خدایا درست ہے"۔ آپؐ نے فرمایا "خدایا گواہ رہ" پھر فرمایا "میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل کی، تم کو یہ معلوم ہے کہ اس نبی کی آنکھیں سوئیں گی اور دل نہیں سوئے گا"۔ انہوں نے کہا "خدایا ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا "خدایا گواہ رہ"۔ یہودیوں نے کہا اچھا یہ بتائیے کہ فرشتوں میں آپؐ کا رفیق کون ہے؟ اسی جواب کے معلوم کرنے کے بعد ہم آپؐ کے ساتھ ہو جائیں گے یا آپؐ سے الگ ہو جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا "میرا رفیق جبریلؑ ہے اور دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہوا جس کا وہ رفیق نہ ہو"۔ یہودیوں نے کہا "تو ہم پھر آپؐ کے ساتھ نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ہمارا دشمن ہے"۔

صحیح بخاری باب التفسیر (بنی اسرائیل) میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ آنحضرتؐ کے ساتھ ایک کھیت میں جا رہا تھا کہ راہ میں چند یہودی ملے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کچھ پوچھنا چاہیئے بعضوں نے کہا اس کی ضرورت نہیں، شاید وہ کوئی ایسا جواب دیں جو تم کو ناگوار ہو۔ بالآخر انہوں نے طے کیا کہ بہرحال کچھ پوچھنا چاہیئے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بتاؤ روح کیا چیز ہے؟" آنحضرتؐ خاموش ہو گئے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ جب وحی نازل ہو چکی تو آپؐ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی:۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ	وہ پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے اے پیغمبر
الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم	کہدے کہ روح میرے پروردگار کی
مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝	ایک بات ہے اور تم کو علم کا بہت
(بنی اسرائیل: ۸۵)	کم حصہ دیا گیا ہے۔

جامع ترمذی (تفسیر بنی اسرائیل)، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت صفوان بن عسال مرادیؓ روایت کرتے ہیں کہ دو یہودی راستہ میں جا رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ پوچھیں۔ دوسرے نے کہا کہ اس کو پیغمبر نہ کہو تم کو وہ اپنی نسبت پیغمبر کہتے سُنے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ اس کے بعد وہ دونوں آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے اور آکر پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو نو احکام ملے تھے، وہ کیا تھے؟ آپؐ نے فرمایا وہ یہ تھے کہ شرک نہ کرو، زنا نہ کرو۔ ناحق قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، بیگناہ کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، پاک دامن عورت پر بہتان نہ باندھو، اور میدان جنگ میں فرار نہ کرو۔ (راوی کو اس نویں حکم میں شک ہے) پھر فرمایا اور تمہارے لئے اے یہود خاص حکم یہ ہے کہ سبت مناؤ۔ ان دونوں نے یہ جواب سن کر آپؐ کے دست و پائے مبارک کو بوسے دئے اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپؐ پیغمبر ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ انہوں نے کہا کہ داؤدؑ نے دعا کی تھی کہ اس کی نسل میں ہمیشہ پیغمبر ہوا کرے گا اور اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہم ڈرتے ہیں کہ یہود ہم کو مار ڈالیں۔

اخبارِ غیب

یا

پیشین گوئی

فطرتِ بشری کے عجز اور بیچارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے۔ انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحرِ ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لئے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو۔ اس کی آزمائش اور امتحان کے لئے اِسی بحرِ بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دیدے۔ چنانچہ یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوّت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیلِ بیّن اور حجتِ قائمہ ہے۔ بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف نبوّت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ ان کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی "پیشین گو" ہے۔ عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں میں "نبی" یا "نابی" جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے اس کے لغوی معنی مخبر اور پیشین گو کے ہیں اور نبوّت کے معنی مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں۔ اسی لئے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسی قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہانِ نادیدہ کا مخبر ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے عرب کی یہ کیفیت تھی کہ تمام عرب کاہنوں کے جال میں گرفتار تھا۔ عرب کے تمام مشرکانہ معابد کاہنوں کے دارالسلطنت تھے جن میں بیٹھ کر وہ عرب کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے تھے۔ مشہور کاہنوں کے پاس لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے اور ان سے مستقبل اور غیب کی باتیں دریافت کرتے تھے۔ وہ ایک قسم کی مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں اُن کو غیب کی اور مستقبل کی باتیں بتاتے تھے۔ آنحضرتؐ جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے تو اُن کے لئے ثبوتِ نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی ہو سکتی تھی۔ آنحضرتؐ نے بیسیوں پیشین گوئیاں کیں اور مستقبل کے واقعات اور باتوں کو رائی العین کی طرح پیش فرمایا اور وہ سب کی سب بے کم و کاست پوری اتریں۔

آنحضرتؐ سے ان پیشین گوئیوں کا صدور مختلف حالتوں میں ہوا اور آپؐ کو اُن کی اطلاع مختلف صورتوں میں دی گئی۔ مثلاً کبھی قرآن مجید کی وحی کی صورت میں کبھی عالمِ خواب میں اور کبھی زبانِ صداقت نشان کے عام الفاظ میں جس میں طریقۂ اطلاع کا اظہار نہیں ہے۔ قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ خواب کی پیشین گوئیوں کا تذکرہ کچھ عالمِ رؤیا کے بیان میں آچکا ہے۔ باقی پیشین گوئیاں سطور ذیل میں تحریر ہیں:۔

فتوحاتِ عظیمہ کی اطلاع اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ چند مہینے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں یہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت کو اُلٹ دیں گے۔ لیکن پیغمبرِ صادقؐ نے اُسی وقت بشارت سنائی کہ "مسلمانو!

تم عنقریب قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ مداین تمہارے ہاتھوں میں آئے گا۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے دستِ تصرّف میں ہوں گے۔ مصر تمہاری حکومت میں داخل ہو گا۔ تم سے اور ترکوں سے جن کی چھوٹی آنکھیں اور چوڑے چہرے ہوں گے (ترکستانی و منغولی ترک) جنگ ہو گی۔[1]" دنیا ان میں سے کس واقعہ کی تردید کر سکتی ہے؟

یہ پیشین گوئیاں الگ الگ بھی کی گئی ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے اس وقت کی گئیں جب مسلمان مدینہ میں محصور ہو رہے تھے اور تمام عرب مدینہ کو گھیرنے کے لئے اُمنڈا چلا آرہا تھا اور مسلمان ہر آن اپنی موت کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر جب خندق کھودتے ہوئے ایک سخت پتّھر حائل ہو گیا تھا اور صحابہؓ اس کے توڑنے سے عاجز ہو چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجز نما ضربِ خارا شگاف سے پتّھر کے ٹکڑے کر دئے تھے تو آپؐ نے تین ضربیں ماری تھیں اور ہر ضرب کے بعد ایک چنگاری سی اُڑتی تھی اور آپؐ ہر بار نعرہ لگاتے تھے:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ	اور تیرے پروردگار کی باتیں سچائی اور
عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ	انصاف سے پوری ہوئیں اُس کی باتوں
هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○	کو کوئی بدل نہیں سکتا اور وہی سُننے والا
(الانعام: ۱۱۵)	اور جاننے والا ہے۔

بعض صحابہؓ نے حقیقت دریافت کی۔ فرمایا "جب میں نے پہلی ضرب ماری تو کسریٰ کے شہر اور ان کے اردگرد میرے سامنے کر دئے گئے یہاں تک کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے اُن کو دیکھا۔" حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہؐ! دعا کیجئے کہ وہ فتح ہوں۔ آپؐ

---

[1] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام میں یہ حدیثیں ہیں۔

نے دعا فرمائی، پھر فرمایا" دوسری ضرب میں قیصر کے شہر اور اس کے آس پاس کے مقامات دیکھے"۔ حاضرین نے پھر عرض کی یا رسول اللہ! ان کی فتح کی بھی دعا فرمائیے۔ آپؐ نے دعا کی۔ پھر ارشاد ہوا کہ" تیسری ضرب میں حبشہ کے شہر اور گاؤں نگاہوں کے سامنے آئے"۔ پھر فرمایا" حبشہ والے جب تک تم سے تعرض نہ کریں تم بھی تعرض نہ کرو اور ترکوں کو اس وقت تک چھوڑ دو جب تک وہ تمہیں چھوڑیں"[1]۔

یہ پیشین گوئی تو تمثیلی شکل میں تھی۔ آنحضرتؐ نے کھلے اور صریح الفاظ میں بھی بشارت سُنادی تھی۔ فرمایا" تم لوگ جزیرۂ عرب میں لڑو گے اور خدا فتح دے گا۔ پھر فارس سے لڑو گے اور فتح ہو گی۔ پھر روم سے لڑو گے اور فتح ہو گی"[2]۔

قیصر و کسریٰ کی بربادی کی خبر عین اس وقت جب کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں پورے جاہ و جلال سے دنیا پر حکمران تھیں اور بظاہر ان کی بربادی کا کوئی سامان نہ تھا کہ مکّہ کے منادیٔ حقؐ نے یہ پیشین گوئی کی اذا ھلك کسری فلا کسریٰ بعدہ واذا ھلك قیصر فلا قیصر بعدہ[3] (جب کسریٰ ہلاک ہو گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہو گا اور جب قیصر ہلاک ہو گا تو پھر دوسرا قیصر نہ ہو گا)۔ نہ صرف تاریخ بلکہ آج بھی دنیا کا مشاہدہ اس آواز کی صداقت سے معمور ہے۔ ایرانی مجوسیوں کی شہنشاہی کی شکست کے بعد کیا پھر کسی ایرانی مجوسی شہنشاہ کا تاجِ خسروی کسی نے دیکھا اور رومی شہنشاہی کی بربادی کے بعد رومی قوم کا وجود بھی اس سطحِ زمین پر کہیں نظر آیا؟

ساز و سامان کی بشارت حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ میرے گھر تشریف لائے اور دریافت کیا کہ کیا قالین ہے؟ عرض کی" ہمارے پاس قالین کہاں؟" ارشاد

---

[1] سنن نسائی کتاب الجہاد [2] صحیح مسلم کتاب الفتن [3] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ و صحیح مسلم وغیرہ۔

فرمایا کہ "ہاں عنقریب تم قالینوں اور عمدہ فرشوں پر بیٹھو گے"۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ وہ دن آیا جب ہم قالینوں پر بیٹھے۔ اب میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ قالین ہٹالے جاؤ تو وہ کہتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے[1]

امن وامان کی بشارت عدی بن حاتمؓ کا بیان ہے کہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھا کہ دو شخص آئے۔ ایک نے بھوک کی اور دوسرے نے رہزنی کی شکایت کی۔ آپؐ نے عدیؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "کیوں عدیؓ! تم نے حیرہ کو دیکھا ہے؟" انہوں نے کہا "دیکھا تو نہیں ہے لیکن اس کو جانتا ہوں"۔ آپؐ نے فرمایا: "اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک ہودج نشین عورت چل کر خانۂ کعبہ کا طواف کرے گی اور اُس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کا خزانہ فتح کر لیا گیا! اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا چاندی لے کر نکلے گا کہ کسی کو خیرات دے۔ لیکن دولت کی کثرت کا یہ عالم ہوگا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا"۔ عدیؓ کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ آخر قبیلۂ طے کے وہ ڈاکو کیا ہو جائیں گے جنہوں نے تمام ملک میں آگ لگا رکھی ہے۔ لیکن خود عدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھ لیا کہ حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تنہا چل کر آتی ہے اور خانۂ کعبہ کا طواف کر کے واپس جاتی ہے اور اُس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ اُن کا بیان ہے کہ جن لوگوں نے کسریٰ کا خزانہ فتح کیا ان میں میں بھی تھا۔ صرف تیسری پیشین گوئی میرے سامنے پوری ہونے سے رہ گئی ہے۔ جو لوگ زندہ رہیں گے وہ اس کو بھی پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیں گے[2]۔ چنانچہ راویوں کا بیان ہے کہ بنی اُمیہ کی سلطنت کے زمانہ میں یہ واقعہ بھی بعینہٖ گزرا۔

---

[1] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ۔ [2] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ۔

ابوصفوان کے قتل کی خبر ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو مدینہ منوّرہ کا دارالامان مل گیا اور اسلام روز بروز ترقی کرنے لگا تو یہ دیکھ کر قریش کے سردار مدینہ پر حملہ کی تدبیریں سوچنے لگے۔

اسی اثنا میں انصار کے ایک رئیس سعدؓ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے اور ابوصفوان (امیہ) کے گھر جاکر مہمان ہوئے۔ ابوصفوان ایک دفعہ موقع پر ان کو طواف کرانے لایا۔ وہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوجہل نکل آیا اس نے کہا "تم مکہ آکر بے خوف وخطر کعبہ کا طواف کرتے ہو۔ حالانکہ تم نے بے دینوں (مسلمانوں) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور سمجھتے ہو کہ خدا و رسول کی تم نُصرت کر رہے ہو۔ خدا کی قسم اگر ابوصفوان کے ساتھ تم نہ ہوتے تو یہاں سے سلامت گھر نہ جا سکتے"۔ حضرت سعد نے ڈانٹ کر جواب دیا کہ "اگر تم ہم کو طواف نہ کرنے دوگے تو ہم تمہارا قافلۂ تجارت مدینہ کے راستہ سے گزرنے نہ دیں گے"۔ صفوان نے کہا کہ "اے سعدؓ ان سے سخت لہجہ میں گفتگو نہ کرو۔ یہ اس وادی کے سردار ہیں"۔ حضرت سعدؓ نے کہا "اے صفوان اپنی طرف داری رہنے دو۔ میں نے آنحضرتؐ سے سُنا ہے کہ تم عنقریب مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے جاؤ گے"۔ ابوصفوان نے کہا "کیا وہ یہاں آکر مجھے ماریں گے"۔ انہوں نے جواب دیا۔ یہ "مجھے نہیں معلوم"۔ یہ سن کر ابوصفوان کے بدن پر رعشہ پڑ گیا۔ وہ گو کافر تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ دہنِ رسالتؐ سے آج تک کوئی غلط بات نہیں نکلی۔ چنانچہ اس کے بعد بدر کی لڑائی کا موقع پیش آیا تو اس کی بیوی نے جانے سے روکا اور سعدؓ کی پیشین گوئی یاد دلائی۔ ابوصفوان نے بھی ڈر کر اس فوج میں شرکت سے انکار کر دیا لیکن ابوجہل اس کو سمجھا بجھا کر لے گیا۔ بالآخر اسی کارزار میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔[1]

---

[1] صحیح بخاری، آغاز کتاب المغازی۔

نام بنام مقتولینِ بدرؓ کی خبر بدر کا معرکہ جب پیش آنے والا تھا۔ آنحضرتؐ صحابہؓ کو لے کر میدان میں گئے اور بتایا کہ یہ فلاں کافر کی قتل گاہ ہے۔ یہ ابوجہل کا مقتل ہے۔ یہاں قریش کا وہ بڑا سردار مارا جائے گا۔ یہ عجیب و غریب پیشین گوئی تھی تین سو ساڑھے تین سو نیم مسلّح بے سروسامان سپاہیوں کا افسر ایک ہزار سے زیادہ سپاہیوں کی غرقِ آہن، باساز و سامان فوج کی شکست اور افسروں کے قتل و موت کا اعلان کر رہا تھا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہر سردار قریش کے لئے آپؐ نے جو جگہ مقرر فرما دی تھی وہیں اُس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پائی گئی۔[1]

فاتحِ خیبر کی تعیین خیبر میں یہودیوں کے متعدد مستحکم اور مضبوط قلعے تھے ہر روز مسلمان افسر علم و فوج لے کر جاتے تھے اور زور آزمائی کرتے تھے اور شام کو ناکام واپس آتے تھے۔ ایک دن آپؐ نے فرمایا کہ کل علم میں اُس کے ہاتھوں میں دوں گا جس کو خدا اور اس کا رسول پیار کرتا ہے اور اُسی کے ہاتھ پر کل فتح ہوگی۔ اسلام کی صف میں ہر حوصلہ مند شمشیر زن نے کل کی توقع پر بیقراری میں رات بسر کی۔ کوکبۂ صبح جب طلوع ہوا تو حضرت علیؓ پردۂ غبار سے نمودار ہوئے۔ حضرتِ ممدوح کو آشوبِ چشم تھا۔ اس لئے وہ ساتھ نہ آسکے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ میں علم دیا اور خیبر کا میدان اُسی دن اُن کے ہاتھوں سے سر ہوا۔[2]

حضرت فاطمہ زہراؓ کی وفات کی اطلاع آنحضرتؐ نے اپنے مرض الموت میں ایک دفعہ حضرت فاطمہ زہراؓ کو اپنے پاس بلایا اور اُن کے کان میں کوئی بات کہی کہ وہ رونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن سے ایک اور بات کہی تو وہ ہنسنے لگیں۔ حضرت

---

[1] صحیح مسلم، غزوۂ بدر۔ [2] صحیح بخاری۔ فتحِ خیبر۔

عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا، اور اُن سے اِس کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ "میں رسول اللہؐ کا راز ظاہر نہیں کر سکتی۔ جب آپؐ کی وفات ہو گئی تو حضرت عائشہؓ نے دوبارہ ان سے دریافت کیا، حضرت فاطمہؓ نے کہا "ہاں اب میں بتا سکتی ہوں۔ حضورؐ نے پہلے مجھ سے یہ فرمایا کہ میں اسی بیماری میں انتقال کروں گا اور پھر فرمایا اے فاطمہؓ، میرے اہلِ بیت میں سب سے پہلے تم آکر مجھ سے ملو گی۔[1] یہ دونوں باتیں صحیح ہوئیں۔ آپؐ نے اسی مرض میں وفات پائی اور آپؐ کی وفات کے تقریباً چھ ہی مہینوں کے بعد حضرت فاطمہ زہراؓ بھی اِس دنیا سے چل بسیں۔

خود اپنی وفات کی اطلاع آنحضرتؐ نے جس سال وفات پائی ہے، آپؐ نے اُسی سال اِس دنیا سے اپنی تشریف بری کا عام اعلان کر دیا تھا۔ حجۃ الوداع سے پہلے معاذؓ کو داعیٔ اسلام بنا کر یمن بھیجا تھا۔ اُن کو رخصت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا "معاذؓ اب اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو گے۔ واپس آؤ گے تو میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو گے۔" یہ سن کر وہ رونے لگے۔[2] حجۃ الوداع کے خطبہ میں ہزاروں مسلمانوں کے روبرو آپؐ نے فرمایا "شاید کہ آئندہ سال تم مجھے نہ پا سکو گے۔" مرض الموت سے کچھ دن پیشتر فرمایا کہ "خدا نے اپنے بندہ کو دنیا اور آخرت کی زندگی کا اختیار دیا تو اُس نے آخرت کی زندگی پسند کی۔"[3]

فتحِ یمن کی خبر یمن ۸ھ میں فتح ہوا مگر آنحضرتؐ نے اس کی فتح اور وہاں کے مسلمانوں کی دور دراز ملکوں میں ہجرت کی خبر پہلے ہی دے دی تھی۔ آپؐ نے فرمایا تھا

---

[1] صحیح مسلم، باب الفضائل و صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] مسند ابنِ حنبل، جلد پنجم۔ [3] صحیحین مناقب ابی بکرؓ۔

یمن فتح کیا جائے گا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اہل وعیال اور جو اُن کا کہا مانیں گے اُن کو لے کر آئیں گے حالانکہ مدینہ ہی کا قیام اُن کے لئے بہتر ہوتا، اگر وہ جانتے"[1] آخر یمن خود آپؐ کی زندگی ہی میں فتح ہوا اور آپؐ کے بعد وہاں بغاوت ہوئی تو عہدِ صدیقی میں دوبارہ فتح ہوا اور وہاں سے لوگ نکل نکل کر ایک طرف مشرق میں خُراسان اور ترکستان تک اور دوسری طرف مغرب میں افریقہ اور اسپین تک پھیل گئے اور پھر ان تمام ملکوں میں یمنی اور حجازی قبائل کی باہمی خانہ جنگی کے باعث تباہی تاریخ کے مشہور و معروف واقعات ہیں۔

فتحِ شام کی خبر پھر فرمایا" اور شام مفتوح ہوگا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اپنے اہل وعیال اور ہمراہیوں کو لے کر آئیں گے اور مدینہ ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ جانتے"[2] امام احمد نے مسند میں روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "عنقریب تم لوگ شام کی طرف ہجرت کرو گے تو وہ تمہارے لئے فتح کر دیا جائے گا"[3] معلوم ہے کہ شام فتح ہونے کے ساتھ وہ عربوں کا مسکن بن گیا اور آج بھی ان کی آبادی وہاں سب سے زیادہ ہے۔

فتحِ عراق کی خبر پھر ارشاد ہوا کہ عراق مفتوح ہوگا اور لوگ وہاں بھی اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اہل وعیال کو لے کر آئیں گے، حالانکہ مدینہ اُن کے لئے بہتر تھا اگر وہ سمجھتے"[4] فتحِ عراق کی بشارت کی بعض اور روایتیں بھی ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج و موطا مالک و عبدالرزاق و ابن خزیمہ و ابن حبان [2] صحیح مسلم و موطا مالک و عبدالرزاق و ابن خزیمہ و ابن حبان [3] مسند ابنِ حنبل، روایت معاذؓ [4] صحیح مسلم، کتاب الحج و موطا امام مالک۔

خوزستان اور کرمان کی فتوحات اور ترکوں سے جنگ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "قیامت سے پہلے تم لوگ ایسے لوگوں سے لڑو گے جن کے جوتے بال کے ہوں گے۔"[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جب تک تم خوزو کرمان کے عجمیوں سے نہ لڑو گے جن کے چہرے سُرخ، ناکیں چپٹی، آنکھیں چھوٹی ہوں گی۔ ان کے چہرے ہتوڑوں سے پیٹی ہوئی ڈھالوں کے مانند ہوں گے (یعنی چوڑے چپٹے) اور ان کے جوتے بال کے ہوں گے۔"[2] اور روایتوں میں یہ الفاظ ہیں: "اُس وقت تک قیامت نہ آئے گی، جب تک مسلمان ترکوں سے نہ لڑلیں، جن کے چہرے چپٹے ہوں گے، جن کے لباس بال کے ہوں گے اور بال ہی کے (موزے یا جوتے) پہن کر وہ چلتے ہوں گے۔"[3] یہ تمام پیشین گوئیاں پہلی ہی صدی کے آخر تک پوری ہوگئیں۔

فتحِ مصر کی بشارت اور ایک واقعہ کا حوالہ

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "تم عنقریب مصر فتح کرو گے جہاں کا قیراط مشہور ہے۔ جب اس کو فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا کیونکہ تمہارے ان کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ماں ہاجرہؑ مصر کی تھیں)، اور جب تم دیکھنا کہ وہاں ایک اینٹ بھر جگہ کے لئے دو آدمی لڑتے ہوں تو وہاں سے نکل جانا۔ خود حضرت ابوذرؓ نے بعینہٖ ایسا ہی دیکھا اور وہاں سے واپس چلے آئے۔"[4]

---

[1] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] صحیح بخاری، باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

[3] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی السلام [4] صحیح مسلم، باب الوصیۃ باہل مصر، کتاب فضائل الصحابہ، مسند احمد جلد پنجم (عن ابی ذرؓ) و مسند ابی عوانہ و ابنِ حبان۔

غزوۂ ہند کی خبر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان یہ سن کر خوش ہوں گے کہ آنحضرتؐ نے اپنی زبانِ قدسی بیان سے ہندوستان میں اسلام کے داخل اور غالب ہونے کی خوشخبری سنائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا "میری امت کے دو گروہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ آتشِ دوزخ سے بچائے گا۔ ایک وہ جو ہندوستان کے غزوہ میں شریک ہوگا" دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے (مسلمانوں سے) ہندوستان کے غزوہ کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو اس کی راہ میں اپنی جان و مال قربان کر دوں گا۔ تو اگر میں اس میں شہید ہوا تو بہترین شہید ٹھہراوں گا اور اگر زندہ لوٹا تو میں آتشِ دوزخ سے آزاد ابوہریرہؓ ہوں گا"[1] یہ پیشین گوئیاں امام نسائی المتوفی ۳۰۲ھ کی سنن میں ہیں جو سلطان محمود کے حملۂ ہندوستان (۳۹۲ھ) سے تقریباً سو برس پہلے لکھی گئی ہے۔

بحرِ روم کی لڑائیاں بحرِ روم جس کو بحرِ اخضر اور بحرِ متوسط (میڈیٹیرین سی) بھی کہتے ہیں یورپ اور ایشیا کی اور اب گویا اسلام اور عیسائیت کی حدِ فاصل ہے اور اُس زمانہ میں یہ رومیوں کی بحری قوت کی جولان گاہ تھا۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ خوابِ راحت سے مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے اور فرمایا "اس وقت خواب میں میری امت کے کچھ لوگ تختِ شاہی پر بادشاہوں کی طرح بیٹھے ہوئے دکھائے گئے۔ یہ بحرِ اخضر میں (جہاد کے لئے) اپنے جہاز ڈالیں گے"[2] یہ بشارت سب سے پہلے امیر معاویہؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور دیکھا گیا کہ دمشق کی سرزمین پر اسلام میں سب سے پہلے تختِ شاہی بچھایا جاتا ہے اور دمشق

---

[1] یہ دونوں روایتیں سنن نسائی، کتاب الجہاد میں ہیں [2] صحیح بخاری باب الرویا فی النہار، صحیح مسلم باب غزوۃ البحر کتاب الامارۃ و ابوداؤد کتاب الجہاد۔

کا شہزادہ یزید اپنی سپہ سالاری میں مسلمانوں کا پہلا لشکر لے کر بحرِ اخضر میں جہازوں کے بیڑے ڈالتا ہے اور دریا کو عبور کر کے قسطنطنیہ کی چہار دیواری پر تلوار مارتا ہے۔

بیت المقدس کی فتح بیت المقدس اسلام کا دوسرا قبلہ ہے اور اس کی تولیت امتِ محمدیہ کا حق تھا۔ آنحضرتؐ نے صحابہؓ کو اس تولیت کی بشارت دیدی تھی اور فرمادیا تھا کہ میری موت کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا۔ عوف بن مالک اشجعیؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "قیامت سے پہلے چند واقعے گن رکھو (اول) میری موت پھر بیت المقدس کی فتح"[1] اس کے بعد آپؐ نے چار اور باتیں بیان فرمائیں۔ یہ بشارت حضرت عمرؓ کے عہد میں ۱۶ھ میں پوری ہوئی۔

فتحِ قسطنطنیہ کی بشارت فتحِ قسطنطنیہ کی متعدد بشارتیں ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ تم لوگ یقیناً آیندہ قیصر کے خزانوں پر متصرف ہوگے"[2] اور فرمایا "میری امت کی ایک جماعت بحرِ اخضر (بحر روم جس کے ساحل پر قسطنطنیہ ہے) میں سوار ہوگی"[3] مسلمانوں کی پہلی جماعت اسی قسطنطنیہ کی فتح کے لئے اس دریا میں سوار ہوئی۔ آثارِ قیامت کے سلسلہ میں فرمایا "یہ ہوگا، یہ ہوگا، پھر تم قسطنطنیہ فتح کروگے"[4] ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "تم لوگ بے شبہ قسطنطنیہ فتح کروگے تو اس کا حاکم (مسلمان) کتنا اچھا حاکم ہوگا اور وہ فتح کرنے والی فوج کیسی اچھی فوج ہوگی"[5] مسلمان خلفاء اور سلاطین میں سے ہر باہمت نے اس کو پورا کرنے کے لئے قسمت آزمائی کی مگر ازل سے یہ سعادت سلطان محمد فاتح کی قسمت میں آچکی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری، باب الجزیہ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم [3] صحیح بخاری، باب رکوب البحر و علامات النبوۃ و باب الرویا فی المنام۔ [4] صحیح مسلم و ترمذی، کتاب الفتن۔ [5] مسند احمد (عن ابی عبداللہ بن ابی لبیر المخشمی و حاکم و ابن ابی شیبہ۔

فتح روم کا اشارہ جس طرح قسطنطنیہ مشرقی رومی سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ رومیہ (روم) مغربی رومی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور جو اب اٹلی کا پایۂ تخت ہے۔ یہ مغربی عیسائیوں کا مقدس شہر ہے۔ گو صاف اور صریح الفاظ میں نہیں لیکن اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو اس کی فتح کی بشارت دی تھی۔ چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اسپین اور مغرب کے مسلمانوں نے اس کے میناروں کے اوپر بھی اسلام کا علم ایک دفعہ بلند کر دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے کسی نے پوچھا کہ پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ۔ انہوں نے اپنی یادداشت کے کاغذوں کو دیکھ کر جواب دیا کہ ہم لوگ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے اردگرد حاضر تھے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ؟ فرمایا "نہیں پہلے ہرقل کا شہر فتح ہوگا"[1] آنحضرتؐ نے رومیہ کے متعلق جو زیادہ وضاحت نہیں فرمائی اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ مسلمانوں کی حکومت کا وہاں فتح کے بعد قسمت الٰہی میں باقی رہنا منظور نہ تھا۔

فاتح عجم کا اشارہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ کی ہم رکابی میں مکہ معظمہ گئے تھے۔ وہاں جاکر وہ اس قدر سخت بیمار پڑے کہ اُن کو اپنی زندگی کی امید نہ رہی۔ آنحضرتؐ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو ان کا اضطراب دیکھ کر اُن کی تسلی دی اور اُن کے حق میں دعا کی اور فرمایا کہ "تم اگر خدا نے چاہا تو ابھی نہیں مروگے، تم کو اگر خلوص سے کام کروگے تو درجۂ عظیم ملے گا۔ بہتیرے لوگوں کو تم سے فائدہ اور بہتوں کو تم سے نقصان پہنچے گا"[2] یہ حضرت سعدؓ کی عجمی فتوحات کی بشارت تھی کہ حضرت سعدؓ

---

[1] مسند احمد، جلد چہارم (عن ابی قبیل التابعی عن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ۔ [2] صحیح بخاری، باب البحرۃ وصحیح بخاری ومسلم وابوداؤد ونسائی باب الوصایا۔

نے بیسہ سالارِ اسلام بن کر بڑا درجہ پایا اور چند سال میں کسریٰ کا تاج و تخت چھین لیا اور اس طرح مسلمانوں کو ان کی ذات سے فائدۂ عظیم اور مجوسیوں کو نقصانِ عظیم پہنچا۔

مرتدین کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں عرب کے متعدد اطراف میں دعویدارانِ کاذب پیدا ہو گئے اور بہت سے لوگ جو اسلام کا کلمہ پڑھ چکے تھے، ان کے ساتھ ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اس واقعہ کی پہلے ہی اطلاع دے دی تھی۔ فرمایا کہ "حوضِ کوثر پر بہت سے لوگ آئیں گے۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں لیکن فرشتے ان کو دھکے دے کے نکال دیں گے اور کہیں گے کہ یا رسول اللہ! آپؐ کو معلوم نہیں کہ یہ آپؐ کے بعد بدل گئے تھے۔"[1]

حضرت زینبؓ کی وفات کی اطلاع آنحضرتؐ نے ازواجِ مطہراتؓ کو اطلاع دی تھی کہ تم میں سب سے پہلے مجھ سے آکر وہ ملے گی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہوگا۔ ازواجِ مطہرات کو آنحضرتؐ کی ذاتِ مبارک سے جو محبت تھی اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس پیشین گوئی کے مطابق وہ اپنے اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "ہم میں سے جب سب سے پہلے حضرت زینبؓ نے وفات پائی تو ہم سمجھتے کہ ہاتھ کی لمبائی سے حضورؐ کا کیا مقصد تھا۔ (ہاتھ کا لمبا ہونا عربی میں کشادہ دستی اور فیاضی سے کنایہ ہے) زینبؓ ہم سب میں سب سے زیادہ کشادہ دست تھیں۔"[2]

امِ ورقہؓ کو شہادت کی خوشخبری اُمِ ورقہؓ ایک صحابیہ تھیں۔ آنحضرتؐ نے جب بدر کا ارادہ کیا تو انہوں نے درخواست کی کہ "یا رسول اللہؐ! مجھ کو بھی اس میں شرکت کی اجازت دیجئے شاید کہ خدا مجھے شہادت نصیب کرے۔" فرمایا "تم اپنے گھر ہی میں

---

[1] صحیحین، حدیثِ کوثر [2] صحیح مسلم، فضائل حضرت زینبؓ۔

رہو۔ تمہیں شہادت نصیب ہو گی۔" چنانچہ وہ زندگی ہی میں اس پیشین گوئی کے مطابق شہیدہ کہلاتی تھیں۔ ان کے پاس ایک غلام اور ایک لونڈی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان دونوں نے مل کر ایک رات ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس طرح اطلاعِ نبویؐ کے مطابق انہوں نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی۔[1]

خلفاء کی بشارت حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "بنی اسرائیل کی سرداری اور نگہبانی انبیاء کرتے ہیں۔ جب کوئی نبی مرتا تھا تو دوسرا نبی اس کا قائم مقام ہوتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلفاء رہوں گے اور بہت ہوں گے۔"[2]

بارہ خلفاء آپؐ کے بعد بارہ خلفاء کے ہونے کی بشارتیں حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہیں۔ صحیح مسلم[3] میں یہ الفاظ ہیں "اس وقت تک یہ اسلامی حکومت اچھی رہے گی جب تک اس پر بارہ آدمی حکومت کریں گے۔" "یہ حکومت اس وقت تک ختم نہ ہو گی جب تک اس پر بارہ خلیفہ حکمراں نہ ہو لیں۔" "بارہ خلیفوں تک اسلام معزز اور محفوظ رہے گا۔" "میرے بعد قریش میں سے بارہ خلیفہ ہوں گے پھر جھوٹے لوگ ہوں گے۔" ابوداؤد (کتاب المہدی) میں یہ الفاظ ہیں "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ اس میں بارہ خلیفہ گزر جائیں۔ ان سب پر تمام امت مجتمع ہو گی۔" علمائے اہل سنت میں سے قاضی عیاض اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفاء میں سے بارہ وہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی اور وہ متقی تھے۔ حافظ ابنِ حجر، ابوداؤد کے الفاظ کی بنا پر خلفائے راشدین اور بنی امیہ میں

---

[1] سنن ابی داؤد باب الامامۃ وابن راہویہ۔ [2] صحیح مسلم کتاب الامارۃ۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ۔

سے ان بارہ خلفاء کو گنا تے ہیں جن کی خلافت پر تمام امّت کا اجتماع رہا۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز، یزید ثانی، ہشام[1]۔ شیعہ فرقہ تو اس حدیث کی تشریح میں اپنے بارہ اماموں کو پیش کر دے گا۔

خلافتِ راشدہ کی مدّت فرمایا "خلافت (یعنی خلافتِ راشدہ) میرے بعد تیس برس ہوگی۔ پھر بادشاہی ہو جائے گی[2]" یہ تیس سال کی مدّت حضرت علیؓ کی خلافت پر تمام ہوتی ہے:۔

خلیفہ کا نام	خلافت کی مدّت	خلیفہ کا نام	خلافت کی مدّت
حضرت ابوبکرؓ	۱۱ھ ۔ ۱۳ھ	حضرت عثمانؓ	۲۳ھ ۔ ۳۵ھ
حضرت عمرؓ	۱۳ھ ۔ ۲۳ھ	حضرت علیؓ	۳۵ھ ۔ ۴۰ھ

شیخین کی خلافت کی پیشین گوئی آنحضرتؐ نے گو صریح اور صاف الفاظ میں اپنے جانشینوں کی تعیین نہیں فرمادی تھی مگر آپؐ کو یہ علم بخشا جا چکا تھا کہ حالات اس طرح رونما ہوں گے۔ ایک دفعہ آپؐ نے بیان فرمایا کہ "میں سویا تھا کہ میں نے اپنے آپؐ کو ایک کنویں کی جگت پر دیکھا جس پر ڈول پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے اتنے ڈول پانی نکالے جتنے خدا نے چاہے۔ پھر اس ڈول کو ابوقحافہ کے بیٹے ابوبکرؓ نے لیا۔ انہوں نے بھی اس سے ایک ڈول پانی کھینچا، مگر ان کے کھینچنے میں کسی قدر ضعف تھا۔ خدا ان کو معاف کرے۔ پھر یہ ڈول ایک بڑا سا ڈول بن گیا تو خطاب کے بیٹے (عمرؓ)

---

[1] مقدمہ تاریخ الخلفاء سیوطی [2] جامع ترمذی، کتاب الفتن، سنن ابی داؤد، حاکم، نسائی، بیہقی۔

نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس طرح کھینچا کہ کسی طاقت ور آدمی کو میں نے ان کے برابر کھینچتے نہیں دیکھا یہاں تک کہ حوض لبالب بھر گیا اور پینے والوں کا چاروں طرف سے ہجوم ہو گیا۔"[1]

یہ خلافتِ صدیقی و فاروقی کی تمثیلی پیشین گوئی ہے جس کی آیندہ واقعات نے حرف بحرف تصدیق کی۔

مسلمانوں کو دولت کی کثرت اور فتنوں کے ظہور سے آگاہ کرنا

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جن فتنوں کا آغاز ہوا اور مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں پیش آئیں ان کا پورا پورا علم آپؐ کو عطا ہوا تھا اور اسی لئے آپؐ نے بار بار مسلمانوں کو اس سے متنبہ کر دیا تھا۔ ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ شہر کے باہر تھے۔ آپؐ نے ہمراہیوں سے پوچھا کہ "مجھ کو جو نظر آ رہا ہے وہ تم دیکھ رہے ہو؟" سب نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں پر بارش کی طرح فتنے برس رہے ہیں۔"[2] دوسری دفعہ فرمایا "خدا کی قسم مجھ کو تم پر فقر و فاقہ کا خوف نہیں بلکہ دولت کا خوف ہے کہ جس طرح تم سے پہلوں پر دنیا پھیلا دی گئی تھی، تم پر بھی نہ پھیلا دی جائے تو تم اس میں آپس میں رشک و حسد کرنے لگو اور جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو غافل کر دیا تم کو بھی غافل کر دے۔"[3] ایک اور موقع پر ارشاد ہوا "دیکھو میرے بعد ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔" ایک دفعہ ارشاد ہوا "ایک زمانہ آئیگا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، کتاب الرویا۔ صحیح مسلم، مناقب آخری فقرے حتی ضرب الناس بعطن کا مرادی ترجمہ ہے۔ لفظی نہیں (دیکھو فتح الباری جلد دوازدہم [2] صحیح بخاری کتاب الفتن و حجۃ الوداع [3] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الفتن۔

کہ تمہارے سامنے دن کو ایک کھانے کا پیالہ اور رات کو دوسرے کھانے کا پیالہ آئے گا اور کعبہ کے پردوں کی طرح (بیش قیمت اور عمدہ) تمہارے لباس ہوں گے۔" حاضرین نے عرض کی "یارسول اللہؐ! ہم اس حالت میں اچھے ہیں یا اُس حالت میں اچھے رہیں گے؟" فرمایا "نہیں تم اس حالت میں اچھے ہو کہ تم سب باہم ایک دوسرے سے محبت اور پیار کرتے ہو اور اُس وقت تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹو گے۔"[1] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ مجلس میں رونق افروز تھے۔ فرمایا کہ "میرے بعد اختلاف اور فتنہ ہو گا۔" لوگوں نے عرض کی کہ "یارسول اللہؐ! تو اس وقت ہم کو کیا حکم ہے"؟ فرمایا کہ امیر اور اس کے رفقاء کا ساتھ دینا۔[2] ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا "عنقریب میرے بعد کچھ فتنے پیدا ہوں گے۔ جن میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہو گا۔"[3]

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد فتنوں کا ظہور ہو گا

خلافتِ راشدہ کے عہد میں جو فتنے برپا ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اطلاع آنحضرتؐ کو پہلے ہی دیدی تھی اور آپؐ نے ان کو بعض صحابہؓ کو بتا دیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ حضورؐ نے فتنہ کی نسبت جو فرمایا تھا وہ کس کو زیادہ یاد ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا مجھے یاد ہے۔ انسان کو اہل و عیال اور دولت و مال میں جو فتنہ پیش آتا ہے وہ نماز، صدقہ اچھی باتوں کے کہنے اور بُری باتوں سے روکنے سے دور ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا

---

[1] مسند احمد، حدیث طلحہ (النفری) و مستدرک حاکم [2] مستدرک حاکم جلد سوم۔ ذہبی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [3] صحیح بخاری کتاب الفتن۔

میں اس کی نسبت نہیں پوچھتا۔ میں اس فتنہ کو پوچھتا ہوں جو سمندر کی موجوں کی طرح لہریں لے گا۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا "اے امیر المومنین! اس فتنہ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کہ اس کے اور آپ کے درمیان ایک بند دروازہ ہے"۔ دریافت فرمایا کہ کیا یہ دروازہ کھول دیا جائے گا یا توڑ دیا جائے گا؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا "توڑ دیا جائے گا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو یہ دروازہ کبھی بند نہ ہو سکے گا؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ وہ دروازہ کون تھا؟ انہوں نے جواب دیا "ہاں بیشک اُن کو اس کا اُسی طرح علم تھا جس طرح اس بات کا علم ہے کہ آج کے بعد کل آئے گی"۔ راوی کہتا ہے "میں لحاظ سے نہ پوچھ سکا کہ وہ دروازہ کون تھا"۔ اس لئے مسروق (تابعی) سے کہا کہ وہ حضرت حذیفہؓ سے اس کو دریافت کریں۔ مسروق نے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ "وہ دروازہ خود حضرت عمرؓ کا وجود تھا"[1] یہ دروازہ جب سے ٹوٹا کس کو معلوم نہیں کہ اسلام پر فتنوں کا سیلاب امنڈ آیا۔

فتنے مشرق کی جانب سے اٹھیں گے مستند اور معتبر حدیثوں میں پوری تصریح کے ساتھ بروایاتِ کثیرہ مذکور ہے[2] کہ اسلام میں فتنوں کا آغاز مشرق کی طرف سے ہو گا۔ آپؐ نے انگلی سے اشارہ کر کے بار بار فرمایا کہ اِدھر سے جدھر شیطان کی سینگیں یعنی سورج کی کرنیں نکلتی ہیں۔ یہ اشارہ عرب سے مشرق کی جانب تھا۔ یعنی عراق کی طرف۔ دیکھو حضرت عمرؓ کا قاتل عجمی تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد کا فتنہ عراق ہی سے اُٹھ کر مصر تک پھیلا۔ جنگِ جمل اسی سرزمین پر ہوئی۔ حضرت علیؓ یہیں شہید ہوئے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفتن [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الفتن وغیرہ۔

امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگِ صفین یہیں پیش آئی۔ خوارجِ اسلام کا پہلا گمراہ کن فرقہ یہیں سے نکلا۔ جبریہ اور قدریہ وغیرہ اسلام کے دیگر فرقوں کی یہ بدعتیں جنہوں نے اسلامی عقائد کی سادگی کو پارہ پارہ کر دیا، یہیں پیدا ہوئے۔ جگر گوشۂ رسول اور خانوادۂ نبوت کا قافلہ یہیں فرات کے کنارہ لٹا۔ مختار نے ادعائے کاذب کا فتنہ یہیں پیدا کیا۔ شیعیت جس نے اسلام کو دو حصوں میں منقسم کیا، یہیں کی پیداوار ہے۔ حجاج کی سفاکیاں اسی سرزمین پر ہوئیں۔ ترک و تاتار کی غارتگریوں کے نتائج جنہوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت اور عرب و خلافتِ عربی کا تار تار الگ کر دیا، یہیں رونما ہوئے حتی کہ اس جنگِ عظیم میں بھی واحد اسلامی طاقت کے ساتھ غدّاری کے نتائج بھی اولاً یہیں ظاہر ہوئے اور اس کے اثرات بعد کو اور اطراف میں بھی رونما ہوئے۔

حضرت عثمانؓ کو فتنہ کی اطلاع آنحضرتؐ مدینہ کے ایک باغ میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ دروازہ کھلوا کر آئے تو آپؐ نے ان کو جنت کی بشارت دی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ آئے اور آپؐ نے ان کو جنت کا مژدہ سنایا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ آئے تو آپؐ نے ان کو جنت کی بشارت کے ساتھ فتنہ و امتحان سے دوچار ہونے کی بھی اطلاع دی۔ چنانچہ ان کو اپنے زمانۂ خلافت میں یہ فتنہ و امتحان پیش آیا اور شہادت نصیب ہوئی۔[1] حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بھی روایتیں ہیں۔

حضرت عمرؓ اور عثمانؓ شہید ہوں گے ایک دفعہ مکہ معظمہ میں کوہِ ثبیر یا کوہِ اُحد پر آنحضرتؐ تشریف فرما تھے۔ آپؐ کی رفاقت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی تھے کہ دفعتہً پہاڑ کو جنبش ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: "اے ثبیر! ٹھہر جا کہ تیری پشت

---

[1] صحیح مسلم، فضائل عثمانؓ۔

پر ایک پیغمبر، ایک صدیق اور دو شہید ہیں"۔ پیغمبر اور صدیق کو تو سب جانتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ دو شہید کون تھے۔[1]

حضرت علی مرتضیٰؓ کی مشکلات اور شہادت

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے اُن سے فرمایا کہ "تم سے اُمت میرے بعد بے وفائی کرے گی"۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "اے علیؓ خبردار! کہ تم کو میرے بعد مصیبت پیش آئے گی"۔ حضرت علیؓ نے استفسار کیا "کیا یہ مصیبت میری سلامتیٔ دین کے ساتھ پیش آئے گی؟" فرمایا "ہاں تمہاری سلامتیٔ دین کے ساتھ"۔ حضرت علیؓ اور بعض صحابہؓ ایک سفر میں ایک موقع پر آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھے۔ آپؐ نے فرمایا "میں بتاؤں کہ دو سب سے بدبخت انسان کون ہیں"؟ لوگوں نے عرض کی "ہاں یا رسول اللہؐ! بتائیے"۔ فرمایا "ایک ثمود کا سُرخ رنگ بدبخت جس نے ناقۂ ثمود کو قتل کیا۔ دوسرا وہ جو اے علیؓ! تمہارے یہاں پر اگردن کی طرف اشارہ کیا، تلوار مارے گا"۔[2]

جنگِ جمل کی خبر

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے درمیان جو اتفاقی لڑائی بصرہ میں پیش آگئی تھی اس کو جنگِ جمل کہتے ہیں۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ ازواجِ مطہرات کے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے کسی پر حوأب کے کتے بھونکیں گے"۔ (حوأب عراق میں ایک تالاب کا نام ہے) حضرت عائشہؓ جب اصحابِ جمل کے

---

[1] صحیح بخاری، مناقب ابی بکرؓ و صحیح ترمذی، مناقب عثمانؓ بروایت حسن و سنن نسائی و دار قطنی۔

[2] یہ تینوں روایتیں مستدرک حاکم میں ہیں۔ امام ذہبی نے پہلی روایت کو مطلق صحیح، دوسری کو بشرطِ بخاریؒ مسلم صحیح اور تیسری کو بشرطِ مسلم صحیح کہا ہے (جلد سوم)۔

ساتھ روانہ ہوئیں اور حوأب کے تالاب پر پہنچیں اور کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو اُن کو آنحضرتؐ کی پیشین گوئی یاد آئی۔[1]

حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی جنگ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت تک قیامت نہ آئے گی، جب تک دو ایسے گروہ باہم جنگ آزما نہ ہوں گے جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ایک ہی ہوگا۔[2] علماء کا بیان ہے کہ یہ پیشین گوئی حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں پر صادق آتی ہے۔[3]

حضرت عمارؓ شہید ہوں گے آپؐ نے غزوۂ خندق میں حضرت عمارؓ کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر فرمایا "افسوس تجھ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا"۔[4] یہ پیشین گوئی متعدد صحابہؓ سے منقول ہے۔ حضرت عمارؓ، حضرت علیؓ کی معیت میں امیر معاویہؓ کے ساتھیوں کے ہاتھ سے جنگِ صفین میں شہید ہوئے۔

امام حسنؓ کی مصالحت ایک دفعہ آپؐ حضرت امام حسنؓ کو لے کر گھر سے باہر نکلے اور ان کو گود میں لے کر منبر پر چڑھے۔ پھر فرمایا کہ "میرے اس فرزند کے ذریعہ سے خدا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان مصالحت کرا دے گا"۔[5] چنانچہ یہ پیشین گوئی حضرت علیؓ کی شہادت کے چھ مہینے بعد پوری ہوئی اور طرفدارانِ علیؓ اور حامیانِ معاویہؓ میں بعض شرائط پر صلح ہو گئی۔

نوخیز حکمرانِ قریش کے ہاتھوں اسلام کی تباہی آنحضرتؐ نے جن مخصوص اصحاب کو اسلام کے مستقبل سے باخبر کر دیا تھا۔ ان میں ایک حضرت ابوہریرہؓ بھی تھے۔ وہ کہتے

---

[1] مسند ابنِ حنبل جلد ششم۔ [2] صحیح مسلم کتاب الفتن۔ [3] دیکھو شرح مسلم۔ [4] صحیح مسلم، کتاب الفتن۔
[5] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام و صحیح مسلم و ترمذی باب المناقب و حاکم ترجمۂ امام حسنؓ جلد سوم۔

تھے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "میری امّت کی بربادی قریش کے چند نوخیزوں کے ہاتھ سے ہوگی" حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ "اگر میں چاہوں تو سب کو نام بنام گنا دوں"[1] یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد کا سیاسی طوفان ان کی شہادت پر، پھر جمل کی لڑائی یہ سب چند نوخیز قریشی رئیس زادوں کی بے جا اُمنگوں کے نتائج تھے جیسا کہ عام تاریخوں میں مسطور ہے۔ اور صحیح بخاری میں ہے کہ راوی کہتا ہے کہ ہم نے شام جاکر بنی مروان کو دیکھا تو اُن کو اسی طرح نوخیز نوجوان پایا۔[2]

یزید کی تخت نشینی کی بلا اسلام پر

امیر معاویہؓ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کی بجائے یزید تخت نشین ہوا اور یہی اسلام کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی ادبار ونکبت کی اولیں شب ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے متعدد روایتیں ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ آنحضرتؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ ۶۰ھ کے شروع ہونے سے اور لڑکوں کی حکومت سے پناہ مانگا کرو اور دنیا ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ اس پر ایسے ایسے لوگ حکمراں نہ ہولیں۔[3] حاکم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا عربوں پر افسوس اس مصیبت سے جو ۶۰ھ کے آغاز پر قریب آئے گی۔ امانت لوٹ کا مال اور صدقہ و خیرات جرمانہ اور تاوان سمجھا جائے گا اور گواہی پہچان سے دی جائے گی اور فیصلے ہوا و ہوس سے ہوا کریں گے۔ بیہقی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ مدینہ کے بازار میں یہ کہتے جاتے تھے کہ "خداوند! میں ۶۰ھ اور لڑکوں کی حکومت کا زمانہ نہ پاؤں"۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی اور ۵۹ھ میں انہوں نے وفات پائی۔[4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفتن۔ [2] صحیح بخاری، اوائل کتاب الفتن۔ [3] مسند احمد احادیث ابی ہریرہؓ۔

[4] یہ روایتیں خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں۔

امام حسینؓ کی شہادت حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی متعدد پیشین گوئیاں حاکم بیہقی، ابنِ راہویہ اور ابونعیم وغیرہ میں مذکور ہیں۔ مگر اصولاً ان روایات کا درجہ بلند نہیں تاہم اتنی بات مجملاً ثابت ہوتی ہے کہ آپؐ کو اس واقعہ کا علم ضرور عطا کیا گیا تھا۔ اور آپؐ نے اہلِ بیت کو اس کے متعلق کوئی خاص اطلاع دی تھی۔ اس باب میں بہترین حدیث حاکم کی یہ روایت ہے جس کو اس نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے کہ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو اطلاع دی تھی کہ میں نے یحییٰ (پیغمبر) کا بدلہ ستر ہزار سے لیا تھا اور میں تیرے نواسے کا بدلہ ستر اور ستر ہزار سے لوں گا۔" حافظ ذہبی نے اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے[1] لیکن روایت خود اس کا اشارہ کرتی ہے۔ کہ اس سے پہلے حضرت حسینؓ کی شہادت کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ یہ اطلاعِ الٰہی حرف بحرف صحیح ہوئی۔ امام موصوف کی شہادت کے بعد مختار کے ہاتھوں قاتلین حسینؓ سے اسی قدر انتقام لیا گیا۔

خوارج کی اطلاع حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ قبیلۂ بنو تمیم کا ایک آدمی آیا اور کہا کہ "یارسول اللہؐ! انصاف سے مال تقسیم فرمائیے"۔ آپؐ نے فرمایا "میں نہ انصاف کروں گا تو کون کرے گا"۔ اس کی گستاخی پر حضرت عمرؓ سخت برہم ہوئے اور آنحضرتؐ سے عرض کی کہ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں۔ آپؐ نے فرمایا "جانے دو اس کے ایسے رفقا ہوں گے جن کی نماز روزہ کے مقابل تم کو اپنی نماز اور روزے حقیر معلوم ہوں گے۔ وہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں گے۔ لیکن گلے کے نیچے نہ اترے گا۔ مذہب کے دائرہ سے اس طرح

---

[1] مستدرک حاکم، جلد سوم۔

نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانہ کے پار نکل جاتا ہے۔ اس گروہ کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک سیاہ فام شخص پیدا ہوگا جس کے دونوں بازوؤں میں عورت کے سینہ کی طرح گوشت لٹکتا ہوگا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے اس گروہ سے جنگ کی اور میں ان کے ساتھ موجود تھا۔ اس سیاہ فام کی تلاش کی گئی تو آنحضرتؐ نے جو علامات بتائی تھیں، وہ اُن کے ساتھ متصف نکلا۔[1]

مختار اور حجّاج کی اطلاع آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ قبیلۂ ثقیف میں دو شخص پیدا ہوں گے جن میں ایک کذّاب دوسرا مبیر یعنی ہلاک کرنے والا ہوگا۔ چنانچہ جب حجّاج ثقفی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو پھانسی دی اور ان کی والدہ حضرت اسماءؓ کو بلایا تو انہوں نے جانے سے انکار کیا۔ بار بار کے انکار کے بعد حجّاج خود اُن کے پاس آیا۔ بہت سے سوال و جواب کے بعد انہوں نے کہا کہ "قبیلۂ ثقیف کے دو شخصوں کے متعلق آنحضرتؐ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان میں کذّاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور مبیر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو۔" یہ سُن کر حجّاج چپ چاپ اُلٹے پاؤں واپس گیا۔[2]

حجاز میں ایک آگ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک حجاز میں ایک ایسی آگ نہ نکلے جس کی روشنی بُصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن نہ کر دے۔" یہ روایت صحیح مسلم[3] اور حاکم میں ہے۔ امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ آگ ہمارے زمانہ میں ۶۵۴ھ میں مدینہ میں ظاہر ہوئی اور آگ اس قدر بڑی تھی کہ مدینہ کے مشرقی پہلو سے لے کر پہاڑی تک پھیلی تھی۔ اس کا حال شام

---

[1] صحیح بخاری، جلد اوّل۔ باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] مسلم کتاب الفضائل، باب ذکر کذّاب و مبیر ھا۔ [3] کتاب الفتن۔

اور تمام شہروں میں بتواتر معلوم ہوا۔ اور ہم سے اس شخص نے بیان کیا جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا۔ ابو شامہ ایک اور معاصر مصنّف کا بیان ہے کہ "ہمارے پاس مدینہ سے خطوط آئے جن میں لکھا تھا کہ چہار شنبہ کی رات کو جمادی الثانیہ کی تیسری تاریخ کو مدینہ میں ایک سخت دھماکہ ہوا۔ پھر بڑا زلزلہ آیا جو ساعت بساعت بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ پانچویں کو بہت بڑی آگ پہاڑی میں قریظہ کے محلّہ کے قریب نمودار ہوئی جس کو ہم مدینہ کے اندر اپنے گھروں سے اس طرح دیکھتے تھے کہ گویا وہ ہمارے قریب ہی ہے اور ترائیاں بہہ نکلیں اور ہم اس کو دیکھنے کو چڑھے تو دیکھا کہ پہاڑ آگ بن کر بہہ رہے ہیں اور اِدھر اُدھر شعلہ بن کر جا رہے ہیں۔ آگ کے شعلے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ محلوں کے برابر برابر چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ یہ آگ مکّہ معظمہ اور صحرا سے بھی نظر آتی تھی۔ لوگ گھبرا کر روضۂ نبوی میں دعا و استغفار کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ یہ حالت ایک مہینہ سے زیادہ رہی[۲]۔ علّامہ ذہبی اس واقعہ کے متعلّق لکھتے ہیں کہ "اسی سال (۶۵۴ھ) میں مدینہ میں آگ نکلی جو ان بڑی نشانیوں میں سے تھی جن کی آنحضرتؐ نے خبر دی تھی۔ اس آگ میں اس شدّت اور روشنی کے باوجود گرمی نہ تھی اور چند روز رہی۔ اہلِ مدینہ کا خیال تھا کہ قیامت آگئی تو اُنہوں نے خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کیا[۳]۔ اس آگ کا حال بتواتر معلوم ہے۔ حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ متعدد لوگوں جو بُصریٰ میں اُس وقت موجود تھے، یہ شہادت منقول ہے کہ اُنہوں نے رات کو اِس کی روشنی میں بُصری کے اونٹوں کی گردنیں دیکھیں[۴]۔

---

[۱] شرحِ مسلم، نووی جلد دوم۔ [۲] تاریخ الخلفاء بحوالہ ابو شامہ واقعات ۶۵۴ھ۔ [۳] مختصر تاریخِ اسلام، ذہبی جلد دوم۔ [۴] تاریخ الخلفاء، واقعات ۶۵۴ھ۔

ایک صدی یا ایک دور کے بعد انقلاب

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اخیر زندگی میں آنحضرتؐ نے نماز عشا کے بعد حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا "آج اس شب میں میں تم کو بتاؤں کہ اس سے سو برس بعد آج کے لوگوں میں سے کوئی بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔" راوی کہتا ہے کہ اس سے آپؐ کا مقصود ایک دور (قرن) کا ختم ہو جانا تھا۔ حضرت جابرؓ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے آپؐ نے فرمایا کہ "تم قیامت کی نسبت دریافت کرتے ہو اس کا علم تو خدا کو ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں آج روئے زمین پر کوئی سانس لینے والی جان نہیں جو سو برس بعد زندہ رہے گی۔"[1] اس سے مقصود صحابہؓ کے خیر و برکت کے دور کا اختتام تھا۔ ابو الطفیلؓ صحابی سب سے اخیر میں مرے ہیں۔ ان کا بیان تھا کہ اب میرے سوا کوئی باقی نہیں جس نے جمالِ محمدیؐ سے آنکھیں روشن کیں۔ یہ ابو الطفیلؓ پوری صدی کے اختتام پر رحلت گزیں ہوئے۔

چار دوروں کے بعد پورا انقلاب

متعدد راویوں نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے علی الاعلان فرمایا کہ "بہترین دور (قرن) وہ ہے جس میں میں ہوں۔[2] پھر اس دور کے لوگ جو میرے بعد ہیں۔ پھر اُس دور کے لوگ جو اُن کے بعد ہیں۔ پھر اُس دور کے لوگ جو اُن کے بعد ہیں۔ پھر ایسے لوگ ہوں گے جو گواہی کے لئے بلائے نہیں جائیں گے خود جا کر گواہی دیں گے، خیانت کار ہوں گے امین نہ ہوں گے، نذر مانیں گے لیکن ایفا نہ کریں گے۔" پہلا دور عہدِ نبویؐ ہے۔ دوسرا دور صحابہؓ

---

[1] یہ تمام حدیثیں صحیح مسلم، باب فضل صحابہؓ میں ہیں اور پہلی روایت ابو داؤد کتاب الملاحم میں بھی مذکور ہے۔ [2] صحیح مسلم، فضل صحابہؓ و مسند احمد حدیث ابن مسعودؓ۔

کا ہے۔ تیسرا تابعین کا اور چوتھا تبعِ تابعین کا۔ یہ چار عہد اسلام کے روحانی، دینی، اخلاقی مناقب و مکارم کا اور صلحائے امّت، ائمۂ دین اور علمائے خیر کے پے در پے ظہور اور وجود کا اور خالص مذہبی علوم کی نشو و نما، ترتیب و تدوین اور نشر و اشاعت کے ہیں۔ اس کے بعد ہی بدعات کا سیلاب امنڈتا ہے۔ علمائے سوٗ اور امرائے جور پیدا ہوتے ہیں۔ فرقہ باطلہ کا ظہور ہوتا ہے۔ فقہا میں جمود آتا ہے۔ علماء میں ہوا و ہوس راہ پاتی ہے۔ ہند، فارس اور یونان کے فلسفیانہ خیالات مسلمانوں میں رائج ہوتے ہیں۔ اسلام کے اعتقادی و عملی قویٰ سست ہو جاتے ہیں اور تمام نظام ابتر ہو جاتا ہے۔

مدعیانِ کاذب صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "قیامت سے پہلے تیس کاذب و دجّال پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے"[1] ایسے مدعیانِ کاذب کی تعداد اگر مسیلمہ کے وقت سے لے کر آج تک کی تاریخوں سے چن کر الگ کی جائے تو قریب قریب تیس کے پہنچ جائے گی جن میں سے دو ہندوستان اور ایران میں ابھی ابھی گزرے ہیں وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

منکرینِ حدیث ابو داؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے (غرور کی شان) سے بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا یا جس سے میں نے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب (فتن، و ابوداؤد (ملاحم) کے علاوہ مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ اور ابو یعلیٰ، بزار اور طبرانی میں حضرت عبداللہ زبیرؓ سے اسی قسم کی روایت ہے۔

منع کیا، وہ اس سے بیان کیا جائے تو کہے کہ "ہم نہیں جانتے جو ہم نے قرآن میں پایا اسی کو مانتے ہیں"[1] بیہقی میں اس سے زیادہ صاف الفاظ ہیں۔ دورِ اوّل میں اگر یہ پیشین گوئی معتزلہ پر صادق آسکتی تھی تو اب آج کل مصر و ہند کے ان اشخاص پر پوری طرح صادق آتی ہے جو خود کو اہل القرآن کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔

تجارت کی کثرت اور اس میں عورتوں کی شرکت

قیامت کے آثار اور نشانیوں میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "قیامت سے پہلے خصوصیت کا سلام ہوگا اور تجارت کی کثرت ہوگی"[2] یہاں تک کہ عورت بھی اپنے مرد کا ہاتھ اس میں بٹایا کرے گی"۔ کیا اس موجودہ دورِ تمدن سے بڑھ کر اس پیشین گوئی کی صداقت کا کوئی اور زمانہ ہوگا؟ آج سے زیادہ کبھی تجارت کی گرم بازاری تھی اور عورتیں کبھی اس سے پہلے اس بے باکی سے مردوں کے دوش بدوش ہو کر اس پیشہ میں در آئی تھیں؟

اہل یورپ کی کثرت

آپؐ نے صحابہؓ کے سامنے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ قیامت جب آئے گی تو روم سب سے زیادہ ہوں گے[3] عربوں کے محاورہ میں روم سے مقصود اہلِ فرنگ یعنی اہلِ یورپ ہیں۔ آج اہلِ یورپ کی یہ کثرت ہے کہ اس وقت ان کے وجود سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں اور ان کی قوت و طاقت کا دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پیشین گوئی آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی گئی تھی اور آج اس کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے۔

---

[1] سنن ابی داؤد و باب لزوم السنۃ۔ [2] مسند احمد جلد اوّل ادب المفرد امام بخاری، باب تسلیم الخاصہ و مستدرک حاکم و بزار و طبرانی۔ [3] صحیح مسلم کتاب الفتن۔

سود کی کثرت پہلے وہی لوگ سود کھاتے تھے اور کھا سکتے تھے جو براہِ راست اس کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن آپؐ نے پیشین گوئی کی تھی کہ "ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو سود نہ کھائے گا۔ اگر وہ براہِ راست نہیں کھائے گا تو اس کا غبار یا دھواں بھی اڑ کر اس تک ضرور پہنچے گا"[1] کیا آج وہی زمانہ بعینہٖ نہیں ہے۔ آج کی تجارت اور سوداگری تمام تر سود پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کی ہر چیز جو بازار سے خریدی جاتی ہے وہ بیسیوں سودی معاملوں سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے۔ تمام وہ لوگ جن کی معیشت سرکاری نوکری ہے اور اکثر غیر سرکاری نوکر بھی بینک کے جمع شدہ روپوں سے معاوضہ حاصل کرتے ہیں اور امراء اور اہلِ دولت بھی اپنا سرمایہ امانتی منافع سے وصول کرتے ہیں۔ غرض آج دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں کہی جا سکتی ہے جو تمام تر سود سے پاک اور مبرا ہو اور یہ یورپ کے تمدن کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ عالمگیر اثر ہے۔ یہ عظیم الشان پیش گوئی کتنی بڑی صداقت پر مبنی ہے اور جس کو کبھی کوئی انسان صرف قیاس سے اس بلند آہنگی کے ساتھ دنیا کو نہیں سنا سکتا تھا۔

یہودیوں سے جنگ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرتؐ نے خبر دی تھی کہ مسلمانوں اور یہودیوں میں ایک عظیم الشان جنگ ہوگی۔ یہودی شکست کھا کر چٹانوں اور درختوں کے پیچھے چھپیں گے تو وہاں بھی ان کو پناہ نہ ملے گی اور اُن میں سے آواز آئے گی کہ "اے مسلمان دیکھ! یہ یہودی چھپا ہے"[2] اس حدیث کو پڑھتے ہوئے پہلے دل میں خطرہ گزرتا تھا کہ الٰہی! یہودیوں میں نہ تو قوت ہے نہ کوئی ان کی سلطنت ہے نہ مسلمانوں

---

[1] ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ، باب الربوا، مسند احمد عن ابی ہریرہؓ [2] صحیح مسلم، باب الفتن۔

کے درمیان کہیں ان کی بڑی آبادی ہے، یہ لڑائی کیوں کر پیش آئے گی، مگر پچھلی جنگ نے اپنے نتیجہ کے طور پر فلسطین میں جو صورتِ حال نمایاں کر دی ہے اور عہد نامہ بالفور نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور صیہونی تحریک نے فلسطین کو خالص یہودی ملک بنانے اور بالآخر وہاں یہودی سلطنت قائم کرنے کا جو تہیہ کیا ہے اس نے مخبر صادق علیہ السلام کی پیشین گوئی کی صداقت کے منظر کو آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے۔

حجاز کا انقطاع مصر شام اور عراق سے

صحیح مسلم میں ہے[1] کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "عراق نے اپنا نقرئی سکہ (درہم) اور غلّہ کا پیمانہ (قفیز) روک دیا۔ شام نے اپنے غلّہ کا پیمانہ (مُدّ) اور اپنا طلائی سکہ (دینار) روک دیا اور مصر نے اپنے غلّہ کا پیمانہ (اردب) اور اپنی اشرفی روک دی۔ اور تم وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے۔ وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے۔ وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے۔" حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ اس حدیث کے ارشاد نبویؐ ہونے پر ابوہریرہؓ کا گوشت اور خون گواہی دیتا ہے۔

اس حدیث میں درحقیقت دو پیشین گوئیاں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان ان ممالک کو فتح کریں گے اور حجاز کے تعلقات وہاں سے قائم ہوں گے اور اس خشک اور بنجر خطّہ کی پرورش ان ہی ہمسایہ علاقوں سے ہو گی اور پھر وہ زمانہ آئے گا جب یہ علاقے الگ ہو جائیں گے اور حجاز پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا اسلام سے پہلے یا اسلام کے آغاز میں تھا۔ پہلی پیشین گوئی تو حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور اس وقت سے لے کر تیرہ سو برس تک برابر یہ حالت قائم رہی۔ حجاز کے لئے ہر قسم کا سامان ان

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن۔

ہی ممالک کی پیداوار سے آتا تھا۔ مصر و شام سے برابر غلّہ قانوناً بھیجا جاتا تھا۔ سالانہ نذرانے تقسیم ہوتے تھے۔ بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں۔ لیکن ہمارے خیال میں اس دوسری پیشین گوئی کا محل اس زمانہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ تیرہ سو برس کے اندر کبھی ایسا زمانہ پیش نہیں آیا جب حجاز، عراق و شام اور مصر سے دفعتہً منقطع ہو گیا ہو۔ آج حجاز کی وہی حالت نہیں جو اسلام سے پہلے یا آغازِ اسلام میں تھی، جب عراق پر ایرانی اور شام و مصر پر رومی حکمران تھے اور خود عرب کے صوبے پراگندہ اور بے نظام تھے اور ہر قطعہ پر ایک حاکم فرمانروا تھا؛ آج عراق و مصر و فلسطین و بحرین وغیرہ پر انگریز اور شام پر فرانسیسی حکمران ہیں، عرب کے تمام صوبے پراگندہ اور بے نظام ہیں اور ہر خطّہ پر ایک مستقل فرمانروا ہے اور باہمی آتشِ جنگ و جدل برپا ہے۔ ایک کو دوسرے کی ماتحتی سے عار ہے، عراق کا غلّہ اور نذرانہ بند ہے۔ شام کی موقوفہ جائدادیں فرانسیسیوں نے ضبط کر لیں اور آپ نے گزشتہ سال سن لیا کہ مصر نے حجاز کے غلّہ اور اشرفیوں کا وہ نذرانہ بند کر دیا جو عہدِ فاروقؓ سے اب تک کبھی بند نہیں ہوا تھا۔

اہل یورپ سے شام میں جنگ صحیح مسلم وغیرہ میں فتن اور آثارِ قیامت کے سلسلہ میں متعدد حدیثیں ایسی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے صاف و صریح الفاظ میں اپنی امّت کو یہ اطلاع دی کہ آخر زمانہ میں دجّال کے ظہور اور نزول مسیح علیہ السلام سے پہلے ملکِ شام میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان عظیم الشان خونی معرکے پیش آئیں گے۔ گو اس ملک میں ان دونوں کے درمیان صلیبی جنگوں نے اس قسم کے سیکڑوں خونی معرکے پیش کئے ہیں، مگر جنگِ عظیم نے شام کی جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اُس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات آنے والے خونی معرکوں کی تقریب و تمہید ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف تمام دنیا کی قومیں اُٹھ کھڑی ہوں گی

ابو داؤدؒ اور بیہقی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی (یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں گی) جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ پر گرتے ہیں"۔ حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ یارسول اللہؐ! کیا یہ اس لئے کہ اس زمانہ میں ہم مسلمانوں کی تعداد کم ہو جائے گی؟ فرمایا "نہیں! تمہاری تعداد اُن دنوں بہت بڑی ہوگی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس وخاشاک ہوتا ہے (کہ سیلاب ان کو بہائے لئے جاتا ہے) اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا"۔ کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہؐ! وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا "دنیا (فوائد دنیا) کی محبت اور موت سے کراہت"۔ موجودہ دنیائے اسلام کی پیش نظر تاریخ میں کیا حرف حرف اس کی تصدیق نہیں[1]

---

[1] کتاب الملاحم۔

معجزات نبویؐ
کے متعلق
غیر مستند روایات

آنحضرتؐ کے معجزات کے متعلق جو جھوٹی اور بے سروپا روایتیں مسلمانوں میں مشہور ہوگئی ہیں، ضرورت نہ تھی کہ اس کتاب میں ان کو کسی حیثیت سے جگہ دی جائے مگر چونکہ عام ناظرین کے دلوں میں اُن کو اس کتاب میں نہ پاکر مختلف قسم کے شبہے پیدا ہوں گے اس لئے صرف اُن کی تسکین اور کشفِ حقیقت کی خاطر ان روایتوں سے بھی اس کتاب میں تعرّض کرنا ضروری پڑا۔ یہ روایتیں زیادہ تر کتب دلائل میں ہیں۔ یعنی ان کتابوں میں ہیں جن کو لوگوں نے عام حدیث کی کتابوں سے الگ کرکے صرف آنحضرتؐ کے معجزات کے ذکر و تفصیل میں لکھا ہے۔

یہی کتابیں ہیں جنہوں نے معجزات کی جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا انبار لگا دیا ہے اور ان ہی سے میلاد و فضائل کے تمام کتابوں کا سرمایہ مہیّا کیا گیا ہے۔ خوش اعتقادی اور عجائب پرستی نے ان غلط معجزات کو اس قدر شرفِ قبول بخشا کہ ان کے پردہ میں آپؐ کے تمام صحیح معجزات چھپ کر رہ گئے اور حق و باطل کی تمیز مشکل ہوگئی۔ حالانکہ اس تمام ذخیرہ سے کتب صحاح اور خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں۔ لیکن تیسری اور چوتھی صدی میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ اس درجہ بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئیں کہ محدّثین ثقات

نے ان کو بیشتر ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ کتبِ دلائل کے ان مصنّفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا۔ تاکہ خاتم المرسلینؐ کے فضائل و مناقب کے ابواب میں معتدبہ اضافہ ہو سکے۔ بعد کو جو احتیاط پسند محدّثین آئے، مثلاً زرقانی وغیرہ، وہ ان روایات کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تردید اور تضعیف بھی کرتے گئے۔ لیکن جو چیز اس وسعت کے ساتھ پھیل گئی ہو، جو اسلامی لٹریچر کا ایک جُزو بن گئی ہو، جو اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو، اس کے لئے صرف اس قدر کافی نہیں، بلکہ وہ مزید تنقید کی محتاج ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ ہمارے ملک میں میلاد کی مجلسوں میں جو بیانات پڑھے جاتے ہیں، وہ تمام تر ان ہی بے بنیاد روایتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

اس تنقید کے تین حصّے ہو سکتے ہیں۔ اصولِ روایت کی بنا پر ان کتابوں اور محدّثین میں اُن کے مصنّفول کا درجہ کیا ہے؟ ان کتابوں میں جو غلط، موضوع اور ضعیف معجزات مذکور ہیں، اُن کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ ان کتابوں کے خاص خاص مشہور اور زبان زد معجزات کی روایتی حیثیت کیا ہے؟

کتبِ دلائل اور ان کے مصنّفین کا درجہ

علمائے اسلام نے روایات کی تنقید اور اُن کے اصول کے منضبط کرنے میں جو کوششیں کی ہیں اور جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی پوری تفصیل کتاب کے مقدّمہ میں گذر چکی ہے۔ اِسی سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً آ گئی ہے کہ ان روایات کی جانچ اور تنقید میں جن کا تعلق احکامِ فقہی سے ہے۔ محدّثین نے جو سختی اور شدّت اختیار کی ہے، وہ مناقب اور فضائل کے باب میں نہیں کی ہے۔ چنانچہ علمِ حدیث کے بڑے بڑے اماموں نے علانیہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ آیاتِ قرآنی کے الگ الگ فضائل، نام بنام تمام خلفاء کے مناقب، مقامات اور شہروں کے محامد، اعمالِ انسانی کے مبالغہ آمیز ثواب وعقاب کے بیانات، آنحضرتؐ کے متعلق کاہنینِ عرب کی پیشگوئیاں اور اشعار اور عجیب وغریب غیر صحیح فضائل، معجزات اور برکات وغیرہ کا بے پایاں ذخیرہ روایات میں موجود اور کتابوں میں مدوّن ہے۔

یہ روایات زیادہ تر تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتبِ حدیث میں پائی جاتی ہیں تیسرے درجہ میں بقول شاہ ولی اللہ صاحب یہ کتابیں موجود ہیں۔

مسند ابو یعلی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند طیالسی، بیہقی، طحاوی، اور طبرانی کی تصنیفات، ان میں سچی، جھوٹی، اچھی، بُری، قوی، ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پہلو بہ پہلو درج ہیں اور چوتھے درجہ میں وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفین صدیوں کے بعد پیدا ہوئے۔ انہوں نے چاہا کہ اوّل اور دوم درجوں میں جو روایتیں داخل نہیں کی گئی تھیں ان کو ایک جگہ جمع کر دیں۔ یہ روایتیں اُن لوگوں کی زبانوں پر تھیں جن کی روایتوں کو حدیث کے اماموں نے قلم بند کرنا پسند نہیں کیا تھا اور قصہ گو واعظین محض ان سے رونقِ محفل کا کام لیتے تھے۔ اسرائیلیات، اقوالِ حکماء۔ اشاراتِ حدیث، قصص وحکایات اور روایاتِ نامعتبر کو انہوں نے حدیث کا درجہ دے کر کتابوں کے اوراق میں مدوّن کر دیا۔ کتاب الضعفاء لابنِ حبان، کامل لابن عدی اور خطیب، ابونعیم، جوزقانی، ابنِ عساکر، ابنِ نجّار اور دیلمی کی تصنیفات کا اسی طبقہ میں شمار ہے۔

اس تفصیل کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں "صرف اوّل اور دوم درجہ کی کتابوں یعنی صحاح ستّہ پر محدثین کا اعتماد ہے اور ان ہی پر ان کا مدار ہے۔ تیسرے طبقہ کی

لہ حجۃ اللہ البالغہ باب طبقات کتب الحدیث۔

کتابوں سے وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو فن کے ناقد اور جوہری ہیں اور جن کو اسماء الرجال پر عبور اور علل حدیث سے واقفیت ہے، غرض جو صحیح اور غلط اور خطا و صواب میں امتیاز کامل رکھتے ہیں۔ چوتھے طبقہ کی کتابوں کو جمع اور تدوین کرنا اور ان کو کام میں لانا متاخرین کی ایک قسم کی بے فائدہ کی کاوش فکر ہے۔

آنحضرتؐ کی آیات و معجزات پر جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن میں سے کچھ تیسرے طبقہ میں اور بقیہ تمام تر چوتھے طبقہ کی کتابوں میں داخل ہیں۔ متاخرین نے عام طور سے یہ سرمایہ جن کتابوں سے حاصل کیا ہے وہ طبری، طبرانی، بیہقی، دیلمی، بزار اور ابونعیم اصفہانی کی تصنیفات ہیں۔ حافظ قسطلانی نے ان ہی روایات کو تمیز اور نقد کے بغیر مواہب لدنیہ میں داخل کیا اور معین فراہی نے ان کو معارج النبوۃ میں فارسی زبان میں اس آب و رنگ سے بیان کیا کہ یہ روایتیں گھر گھر پھیل گئیں اور عوام نے اِس شیفتگی اور وارفتگی کے ساتھ ان کو قبول کیا کہ اصلی اور صحیح معجزات اور آیات بھی اس پردہ میں چھپ کر رہ گئے۔

مواہب لدنیہ اور معارج النبوۃ وغیرہ کا سرمایہ جن کتابوں سے ماخوذ ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں: کتاب الطبقات لابن سعد، سیرۃ ابن اسحاق، دلائل النبوۃ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ، دلائل النبوۃ ابواسحٰق حربی المتوفی ۲۸۵ھ، شرف المصطفٰے ابوسعید عبدالرحمٰن بن حسن اصفہانی ۳۰۷ھ، تاریخ و تفسیر ابوجعفر بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ، مولد یحییٰ بن عائذ، دلائل النبوۃ جعفر بن محمد مستغفری المتوفی ۴۳۲ھ، دلائل النبوۃ ابوالقاسم اسمٰعیل اصفہانی المتوفی ۵۳۵ھ تاریخ دمشق ابن عساکر المتوفی ۵۷۱ھ۔ لیکن متاخرین میں ان روایات کا سب سے بڑا خزانہ یہ دو کتابیں ہیں۔ کتاب الدلائل ابونعیم اصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ اور کتاب الدلائل

امام بیہقی المتوفی ۴۳۰ھ۔

ان بزرگوں کے بذاتِ خود معتبر اور مستند ہونے میں کسی کو کلام ہے۔ جو کچھ کلام ہے وہ اس میں ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے راویوں سے ہر قسم کی روایتیں نقد اور تمیز کے بغیر اخذ کیں اور ان کو کتابوں کے اوراق میں مدوّن کر دیا اور عام لوگوں نے ان مصنفین کی عظمت اور جلالت کو دیکھ کر ان روایتوں کو قبول کر لیا۔ حالانکہ ان میں نہ صرف ضعیف اور کمزور بلکہ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں۔ اور اُن کے سلسلۂ روایت میں ایسے راوی آتے ہیں جن کو محدّثین کے دربار میں صفِّ نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ ان مصنفین نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ ہر قسم کا سلسلۂ روایت لکھ دیا گیا ہے اور لوگ اس سلسلۂ روایت کو دیکھ کر صحیح اور غلط، سچی اور جھوٹی روایت کا خود فیصلہ کریں گے ان روایتوں کی تدوین میں ضروری احتیاطیں مدّ نظر نہیں رکھیں۔ یا یوں کہو کہ عشقِ نبویؐ نے فضائل و مناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا۔ حالانکہ خود اسی جذبۂ عشق اور اسی ولولۂ شوق نے ثقات محدّثین اور علمِ حدیث کے اکابر کو روایتوں اور راویوں کے نقد اور بحث میں اس قدر سخت گیر بنا دیا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی تحقیق اور کاوش کے بغیر آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرنا گناہِ عظیم سمجھتے تھے اور من کذب علی متعمدًا کی دار و گیر سے ہمیشہ ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے۔ محدّث ابن مندہ نے کتاب الدّلائل کے مصنّف حافظ ابونعیم اصفہانی کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ علّامہ ذہبی میزان الاعتدال میں ان دونوں معاصرین کے درمیان محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لا اعلم لهما ذنبا اكثر من — مجھے ان دونوں کا اس سے زیادہ کوئی

روایتھما الموضوعات ساکتین عنھا،

گناہ معلوم نہیں کہ وہ موضوع روایتوں کو خاموشی کے ساتھ روایت کر جاتے ہیں۔

(ترجمہ ابونعیم)

لیکن ثقاتِ محدّثین کی بارگاہ میں یہ کوئی معمولی گناہ ہے؟ یہی اُن کی خاموشی خدا انہیں معاف کرے آج ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی گمراہی کی بنیاد بن گئی ہے۔

اس سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے علمائے رجال نے زیادہ تر اُن راویوں کی بحث و تدقیق کی ہے جو پہلی تین صدیوں میں تھے۔ اس لئے چوتھی اور پانچویں صدی کے رُواۃ اور رجال کے نام و نشان ہماری موجودہ اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں۔ اگر تراجم والنساب میں اُن کے کچھ حالات مل جاتے ہیں تو محدّثانہ حیثیت سے اُن پر نقد و تبصرہ نہیں ملتا۔ اس لئے ان بزرگوں کے شیوخ اور راویوں میں مجہول الحال اشخاص کی بھی کمی نہیں۔ اس بنا پر ان کتابوں کی روایتوں کی تنقید کرنا نہایت مشکل ہے۔

اسلام میں میلاد کی مجلسوں کا رواج غالباً چھٹی صدی سے ہوا ہے[1] تتبع سے یہ ثابت ہوا کہ ان روایتوں کا بڑا حصّہ ان ہی کتابوں کے ذریعہ سے پھیلا ہے جو ان مجالس کی غرض سے وقتاً فوقتاً لکھی گئیں اور جن کے بکثرت حوالے مواہبِ لدنیہ میں جابجا آتے ہیں۔

علّامہ سیوطی کی خصائص کبریٰ جو حیدر آباد میں چھپ گئی ہے، معجزات کے موضوع

---

[1] الملک المظفر شاہ اربل (مولود ۵۴۹ھ متوفی ۶۳۳ھ) جیسا کہ ابن خلکان نے اس کے حال میں لکھا ہے، مولد شریف بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منایا کرتا تھا۔ یہ جنگ صلیبی کا زمانہ تھا۔ اس کے لئے ابنِ دحیہ المتوفی ۶۳۳ھ نے ۶۰۴ھ میں کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر تصنیف کی۔

پر سب سے زیادہ مبسوط ہے اور جامع تالیف ہے۔ علامہ ممدوح نے صحاح ستہ کے علاوہ احمد سعید ابن منصور، طیالسی، ابن ابی شیبہ، حاکم، ابو یعلی، بلکہ ان سے بھی فروتر، بیہقی، ابو نعیم، بزار، ابن سعد، طبرانی، دارمی، بلکہ غیر محتاط مصنفول مثلاً ابن ابی الدنیا، ابن شاہین، ابن ابی النجار ابن مندہ، ابن مردویہ، ابن عساکر، دیلمی، خوائطی، خطیب وغیرہ کی کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا۔ قوی اور ضعیف اور صحیح وغلط ہر قسم کے واقعات کا انبار لگا دیا۔ تاہم مصنف کو یہ فخر ہے، جیسا کہ دیباچہ میں تصریح ہے کہ اس تالیف میں موضوع اور بے سند روایتوں سے اگرچہ احتراز کیا گیا ہے، لیکن ضعیف روایتیں جن کی سندیں ہیں وہ داخل کر لی گئی ہیں۔

غور کے قابل امر یہ ہے کہ بلا امتیاز بھلی بری کسی سند کا موجود ہونا روایت کی معتبری کی حجت کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ یہ ہے کہ کتاب میں صحیح وغلط، قوی اور ضعیف مشہور ومنکر ہر قسم کی روایتوں کو ان کے درجہ اور مرتبہ کے ذکر کے بغیر پہلو بہ پہلو وہ لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس لئے عام ناظرین کو یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس انبار خانہ میں جہاں جواہرات کا خزانہ ہے۔ وہیں خزف ریزوں کا بھی ڈھیر لگا ہے۔ پوری کتاب میں شاید دس بیس مقام سے زیادہ نہیں جہاں سے مصنف نے اپنی روایتوں کے درجۂ استناد کا پتہ دیا ہو۔ اس سے زیادہ یہ کہ بعض واقعات کے متعلق باوجود ان کی شدید روایت پرستی کے ان کو بہ تحقیق معلوم تھا کہ یہ صحیح نہیں تاہم چونکہ وہ پہلی کتابوں میں مندرج تھے، ان کی نقل سے احتراز نہیں کیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے موقع پر عام کتب میلاد میں جو عجیب وغریب واقعات مذکور ہیں ان کو تمامہا دلائل ابو نعیم سے نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں

هٰذا الاثر والاثران قبله فيها	اس روایت اور اس سے پہلے دو
نكارة شديدة ولم اورد في كتابي	روایتوں میں سخت نامعتبر (منکر) باتیں

هٰذا اشد نکارۃ منها ولم تکن	ہیں۔ اور میں نے اپنی کتاب میں اس
نفسی تطیب بایرادها لکن	سے زیادہ ناقابل اعتبار روایتیں نہیں
تبعت الحافظ ابا نعیم فی ذٰلك۔	لکھیں۔ میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا
الخصائص الکبری جلد اوّل	تھا۔ حافظ ابونعیم کی پیروی کر کے لکھ دیا

ایک اور جگہ خطیب کی ایک کتاب سے وفدِ نجران کے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اس روایت کو بے اعتبار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

و اخرج الخطیب فی المتفق و	خطیب نے المتفق والمفترق میں ایسی
المفترق بسند فیه مجاهیل۔	سند سے جس میں مجہول الحال راوی ہیں
	بیان کیا ہے

ایک اور مقام پر ایک گدھے کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جو گدھے کی صورت میں ایک جن تھا اور آپؐ کی سواری میں آنے کا مشتاق تھا۔ یہ لوگوں کے گھروں میں جاکر اشارہ سے ان کو بلا لاتا تھا۔ یہ عجیب جانور آپؐ کو خیبر میں ملا تھا۔ اس نے آنحضرتؐ کو یہودیوں کے مظالم کی داستان سنائی اور جب آپؐ نے وفات پائی تو فرطِ غم سے اپنے کو کنویں میں گرا کر جان دے دی۔ حافظ سیوطی نے ابنِ عساکر سے یہ واقعہ خصائص میں نقل کیا ہے۔ اور اس پر بے تعرض کئے گزر گئے ہیں۔ حالانکہ بعینہٖ اس واقعہ کے متعلق ابن حبان کے حوالہ سے اپنی دوسری تصنیف اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ سرتاپا موضوع ہے"

محدّث صابونی نے معجزہ کی ایک روایت لکھ کر پھر خود ہی اس پر جرح کی ہے کہ اس کی سند اور متن دونوں غریب ہیں۔ بایں ہمہ وہ اس کے متعلق آخری رائے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ

هو فی المعجزات حسن	معجزات میں وہ حسن (اچھی)
(زرقانی جلد اوّل وخصائص سیوطی	ہے۔
جلد اوّل)	

اس پر علّامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں۔

لان عادۃ المحدثین التساھل	یہ اس لئے کہ محدثین کی عادت ہے
فی غیر الاحکام والعقائد۔	کہ عقائد اور احکام کے علاوہ دیگر
(شرح مواہب جلد اوّل)	روایتوں میں نرمی برتتے ہیں۔

لیکن کیا یہ اصول صحیح ہے؟ اور من کذب علیّ متعمداً کی تہدید سے خالی ہے؟ معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپؐ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہہ سے پاک ہو۔ جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابنِ جماعۃ، طیبی، بلقینی اور علامہ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تصریح کی ہے[1]

معجزات کے متعلق غلط اور موضوع روایتوں کے پیدا ہونے کے اسباب

۱۔ ان روایتوں کے پیدا ہونے کا بڑا سبب یہ ہے کہ مقبولیتِ عام کی بنا پر یہ کام واعظوں اور میلاد خوانوں کے حصّہ میں آیا۔ چونکہ یہ فرقہ علم سے عموماً محروم ہوتا ہے اور صحیح روایات تک اس کی دسترس نہیں ہوتی اور اُدھر گرمیِ محفل اور شورِ احسنت کے لئے اس کو دل چسپ اور عوام فریب باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لئے لامحالہ اُن کو اپنی قوّتِ اختراع پر زور دینا پڑا۔ اُن میں جو کسی قدر محتاط تھے، انہوں نے ان کو لطائف صوفیانہ اور مضامین

---

[1] دیکھو موضوعات ملا علی قاری۔

[illegible] میں ادا کیا۔ سُننے والوں نے ان کو روایت کی حیثیت دے دی یا بعد کو ان ہی بیانات نے روایت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور جو نڈر اور بے احتیاط تھے، انہوں نے یہ پردہ بھی نہیں رکھا۔ بلکہ ایک سند جوڑ کر انہوں نے براہِ راست اس کو حدیث و خبر کا مرتبہ دے دیا۔ حافظ سیوطی علامہ ابنِ جوزی کی کتاب الموضوعات کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

احدھما القصاص و معظم	جھوٹی حدیثیں بنانے والوں میں ایک
البلاء منہم یجری لانہم یریدون	واعظوں کا گروہ ہے اور سب سے بڑی
احادیث تنفق و ترقق والصحاح	مصیبت ان ہی سے پیش آتی ہے۔ کیونکہ
یقل فیہ ھٰذا ثم ان الحفظ	وہ ایسی حدیثیں چاہتے ہیں جو مقبولِ عام
یشق علیھم و یتفق عدم الدین	اور مؤثر ہو سکیں۔ اور صحیح حدیثوں میں یہ
وھم یحضرھم جھال۔	بات نہیں۔ اس کے علاوہ صحیح حدیثوں کا یاد
	رکھنا ان کو مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ان
	میں دینداری نہیں ہوتی اور ان کی محفلوں میں
	جاہلوں ہی کا مجمع ہوتا ہے۔

چنانچہ فضائل و مناقب، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، وقائع میلاد اور معجزات و دلائل کا جو جعلی دفتر پیدا ہو گیا ہے، وہ زیادہ تر ان جاہلوں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔

علامہ ابنِ قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ تاویل مختلف الحدیث میں جو اب مصر میں چھپ گئی ہے، کہتے ہیں کہ احادیث و روایات میں فساد تین راستوں سے آیا۔ منجملہ اُن کے ایک راستہ واعظین ہیں

والقصاص فانھم یمیلون	اور واعظین کیونکہ وہ عوام کا رُخ اپنی

وجوہ العوام الیہم ویستدرون ما عندھم بالمناکیر والغرائب والاکاذیب من الاحادیث و من شان العوام العقود عند القصاص ما کان حدیثہ عجیباً خارجاً فطر العقول او کان رقیقاً یحزن القلوب و یستغزر العیون۔

طرف پھیرنا چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس کو لغو، منکر اور عجیب و غریب باتیں بیان کرکے وہ وصول کرتے ہیں۔ اور عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ اسی وقت تک ان واعظین کے پاس بیٹھتے ہیں جب تک وہ خارج از عقل باتیں یا ایسی مؤثر باتیں بیان کیا کرتے ہیں، جو ان کے دلوں میں اثر پیدا کریں اور ان کو رلائیں

آپ کی برتری اور جامعیت کا تخیل

۲۔ ان روایات کے پیدا ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک آنحضرتؐ افضل الانبیاء ہیں۔ آپؐ کامل ترین شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ آپؐ تمام محاسن کے جامع ہیں۔ یہ اعتقاد بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کو لوگوں نے غلط طور پر وسعت دے دی اور انبیائے سابقین کے تمام معجزات کو آنحضرتؐ کی ذات میں جمع کر دیا اور وہ اس اعتقاد کی بدولت تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔ بیہقی اور ابو نعیم نے دلائل میں اور سیوطی نے خصائص میں علانیہ دوسرے انبیاءؑ کے معجزاتؑ کے مقابل میں اُن ہی کے مثل آپؐ کے معجزات بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح آپؐ کی تعلیم تمام انبیاءؑ کی تعلیمات کا عطر خلاصہ اور مجموعہ ہے۔ اسی طرح آپؐ کے معجزات بھی تمام دیگر انبیاءؑ کے معجزات کا مجموعہ ہیں۔ اور جو کچھ عام انبیاءؑ سے متفرق طور پر صادر ہوا، وہ تمام مجموعاً آپؐ سے صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس مماثلت اور مقابلہ کے لئے تمام ترصحیح روایتیں

دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے لوگوں نے ان ہی ضعیف اور موضوع روایتوں کے دامن میں پناہ لی۔ کہیں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے تمام اسماء کی تعلیم کی۔ دیلمیؒ نے مسند الفردوس میں روایت کی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو بھی تمام اسماء کی تعلیم دی۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا نے ان کو بلند جگہ میں اُٹھایا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی اُس سے بھی آگے قاب قوسین تک ہوئی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طوفان کی دُعاء اگر قبول ہوئی تو آپؐ کی قحط کی دُعا قبول ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے لئے اونٹنی معجزہ تھی تو آنحضرتؐ سے اونٹ نے باتیں کیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں نہ جلے۔ آپؐ سے بھی آتشیں معجزے صادر ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر اگر چھُری رکھی گئی تو آپؐ کا بھی سینہ چاک کیا گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بھیڑیے نے گفتگو کی۔ روایت کی گئی ہے کہ آپؐ سے بھی بھیڑیا ہم کلام ہوا۔ ابو نعیم میں حکایت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حُسن کا آدھا حصّہ عطا ہوا لیکن آنحضرتؐ کو پُورا حصّہ دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے پتھر سے نہریں جاری ہوئیں تو آپؐ کی انگلیوں سے پانی بہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی معجزہ دکھاتی تھی تو آپؐ کے فراق میں چھوہارے کا درخت بھی رویا اور چھوہارے کی خشک ٹہنی تلوار بن گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے بحرِ احمر شق ہوا تو آپؐ کے لئے معراج میں آسمان و زمین کے درمیان کا دریائے فضا بیچ سے پھٹ گیا۔ یوشع علیہ السلام کے لئے آفتاب ٹھہر گیا تو آپؐ کے اشارے سے آفتاب ڈوب کر نکلا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں کلام کیا تھا۔ یہ روایت وضع کی گئی کہ آپؐ نے بھی گہوارے میں کلام کیا اور آپؐ کی زبان سے پہلے تکبیر و تسبیح کی صدا بلند ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ مُردوں کو زندہ کرنا ہے اور صرف اُن ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن آنحضرتؐ کی طرف بھی یہ معجزہ منسوب کیا گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک شخص کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا "جب تک آپؐ میری لڑکی کو زندہ نہ کردیں گے میں ایمان نہ لاؤں گا"۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی قبر پر جاکر آواز دی اور وہ زندہ نکل کر باہر آئی اور پھر چلی گئی۔ اسی طرح یہ روایت بھی گھڑی گئی ہے کہ آپؐ کی والدہ بھی آپؐ کی دُعا سے زندہ ہوئیں۔ اور آپؐ پر ایمان لائیں۔

غیبی آوازوں اور پیشین گوئیوں سے نبوّت کی تصدیق کا شوق

۳۔ قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاءؑ کے گذشتہ صحیفوں میں آنحضرتؐ کے ظہور کی پیشین گوئیاں ہیں اور ان کے مطابق یہود و نصاریٰ کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا۔ اس واقع کو دروغ گورادیوں نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا۔ چنانچہ ولادتِ نبوی سے قبل علمائے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے۔ اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا۔ بلکہ پرانے گھرانوں اور دیروں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں جن میں آپؐ کا تمام حلیہ لکھا تھا۔ اور اگلے لوگ ان کو بہت چھپا چھپا کر رکھتے تھے۔ بلکہ بعض دیروں میں تو آپؐ کی تصویر تک موجود تھی۔ توراۃ و انجیل میں آنحضرتؐ کے متعلق بعض پیشین گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں اور وہ آج بھی ہیں۔ لیکن وہ استعارات، وکنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں۔ اُن کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپؐ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلایا گیا۔

عرب میں بت خانوں کے مجاور اور کاہن تھے۔ جو فال کھولتے تھے اور پیشین گوئیاں

کرتے تھے۔ ان کا ذریعۂ علم جنّات اور شیاطین تھے۔ چنانچہ آپؐ کے قربِ ولادت کا زمانہ آیا تو عموماً بت خانوں سے اور بتوں کے پیٹ سے آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کاہن مقفّی اور مسجّع فقروں میں اور جنّات شعروں میں یہ خبر سنایا کرتے تھے۔ کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش کا زمانہ قریب آگیا۔ یمن کے ایک بادشاہ کی طرف آپؐ کی منقبت میں پورہ قصیدہ منسوب کیا گیا۔ ملوکِ یمن، شاہانِ فارس اور قریش کے اکابر نے آپؐ کو خواب میں دیکھا۔ پتھروں پر اسم مبارک لوگوں کو منقوش نظر آتا تھا۔ قریش کا مورثِ اعلیٰ کعب بن لوئی ہر جمعہ کو اپنے قبیلہ کے لوگوں کو یکجا کر کے اُن کے سامنے خطبہ دیتا تھا جس میں مسجّع فقروں اور شعروں میں آپؐ کے ظہور کی خوشخبری ہوتی تھی۔ مکّہ کے لوگ احبار اور راہبوں کی زبان سے محمدؐ آپؐ کا نام سُن کر اپنے بچّوں کا یہی نام رکھتے تھے کہ شاید یہی پیغمبر ہو جائے۔ مدینہ کے لوگوں کو ان ہی یہودیوں کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شہرِ یثرب آپؐ کا دارالہجرۃ ہوگا۔ اس لئے وہ آپؐ کے ورود کے منتظر تھے۔ سطیح کاہن کا آپؐ کی پیشین گوئی میں ایک طویل افسانہ ہے۔ لیکن اس دفتر کا بڑا حصّہ موضوع اور جعلی ہے اور باقی نہایت ضعیف اور کمزور اور ان میں جو ایک آدھ صحیح ہے۔ وہ پہلے گذر چکا ہے۔

شاعرانہ تخیّل کو واقعہ سمجھ لینا

۴۔ آنحضرتؐ کی پیدائش عالم کی رحمت کا باعث تھی۔ اس لئے کائنات کا فخر و ناز اس پر بجا ہو سکتا ہے۔ اگلے واعظوں اور میلاد خوانوں نے اس واقعہ کو شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کیا کہ آمنہ کا کاشانہ نور سے معمور ہو گیا۔ جانور خوشی سے بولنے لگے۔ پرندے تہنیت کے گیت گانے لگے۔ مغرب کے چرندوں اور پرندوں نے مشرق کے چرندوں اور پرندوں کو مبارک باد دی۔ مکّہ کے سوکھے درختوں میں بہار آگئی۔ ستارے زمین پر جھک گئے۔ آسمانوں کے دروازے کھُل گئے۔ فرشتوں نے ترانۂ مسرّت بلند کیا۔ انبیاءؑ

نے روئے روشن کی زیارت کی۔ فرشتوں نے بچہ کو آسمان وزمین کی سیر کرائی۔ شیطانوں کی فوج پا بہ زنجیر کی گئی۔ پہاڑ غرور سے اونچے ہو گئے۔ دریا کی موجیں خوشی سے اُچھلنے لگیں۔ درختوں نے سبزی کے نئے جوڑے پہنے۔ بہشت وجنّت کے ایوان نئے سروسامان سے سجائے گئے وغیرہ۔ بعد کے واعظوں اور میلاد خانوں نے اس شاعرانہ اندازِ بیان کو واقعہ سمجھ لیا۔ اور روایت تیار ہو گئی۔

آیندہ واقعات کو اشارات میں ولادت کے موقع پر بیان کرنا

۵۔ آنحضرتؐ کے عہدِ رسالت میں یا بعد کو جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ان کا وقوع آنحضرتؐ کی ولادت کے زمانہ میں تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کو بحیثیت معجزہ کے آیندہ واقعات کا پیش خیمہ بنایا گیا ہے۔ مثلاً آپؐ کے زمانہ میں بت پرستی کا استیصال ہو گیا۔ کسریٰ وقیصر کی سلطنتیں فنا ہو گئیں۔ ایران کی آتش پرستی کا خاتمہ ہو گیا۔ شام کا مُلک فتح ہُوا۔ ان واقعات کو معجزہ اس طرح بنایا گیا کہ جب آپؐ کی ولادت ہوئی تو کعبہ کے تمام بت سرنگوں ہو گئے۔ قصرِ کسریٰ کے کنگرے ہل گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ کر رہ گیا۔ نہر ساوہ خشک ہو گئی۔ ایک نور چمکا جس سے شام کے محل نظر آنے لگے۔

معجزات کی تعداد بڑھانے کا شوق

۶۔ بعض واقعات ایسے ہیں جن کو کسی حیثیت سے معجزہ نہیں کہا جا سکتا لیکن تکثیرِ معجزات کے شوق میں ذرا سا بھی کسی بات میں اعجوبہ پن اُن کو نظر آیا تو اس کو مستقل معجزہ بنا لیا۔ مثلاً حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے اور وہ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی مذکور ہے کہ آپؐ کے گھر میں کوئی پالتو جانور تھا۔ جب آپؐ اندر تشریف لاتے تو وہ نہایت سکون واطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا۔ جب آپؐ باہر چلے جاتے تو وہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو بھی آپؐ کی جلالتِ قدر

اور حفظِ مراتب کا پاس تھا اور آپؐ کی عظمت و شان سے واقف تھے۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی معجزہ نہیں۔ بلکہ عام لوگوں سے بھی بعض جانور اسی طرح ہل مل جاتے ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت جابرؓ سخت بیمار تھے۔ آنحضرتؐ ان کی عیادت کو گئے تو وہ بے ہوش تھے۔ آنحضرتؐ نے وضو کر کے ان کے مُنہ پر پانی چھڑکا تو ان کو ہوش آگیا۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر کتبِ دلائل کے مصنفین نے اس کو بھی معجزہ قرار دے دیا ہے[1]

اسی طرح یہ روایت ہے کہ آنحضرتؐ مختون پیدا ہوئے تھے۔ یہ روایت متعدد طریقوں سے مروی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی طریقہ بھی ضعف سے خالی نہیں ہے۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ آپؐ کا مختون پیدا ہونا متواتر روایتوں سے ثابت ہے۔ اس پر علامہ ذہبی نے تنقید کی ہے۔ کہ تواتر تو کُجا صحیح طریقہ سے ثابت نہیں[2] اور بقول علامہ ابنِ قیم، اگر یہ ثابت بھی ہو تو یہ آنحضرتؐ کی کوئی فضیلت نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے بچے اکثر پیدا ہوئے ہیں۔[3]

روایاتِ صحیحہ میں ہے کہ آنحضرتؐ جب دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے تھے۔ یا سجدہ میں جاتے تھے تو آپؐ کی بغل کی سپیدی نظر آتی تھی۔ یہ ایک معمولی بات ہے، مگر محبّ طبری، قرطبی اور سیوطی وغیرہ نے اس کو بھی معجزہ اور آپؐ کا خاصہ قرار دیا ہے۔

معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں کتبِ دلائل کے مصنفین نے یہ بھی کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی روایت میں اگر مختلف سلسلۂ سند کے راویوں میں باہم موقع، مقام یا کسی اور بات میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا تو اس کو چند واقعے قرار دے دیا۔ مثلاً ایک واقعہ یہ ہے

---

[1] خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم [2] مستدرک جلد دوم باب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم [3] زاد المعاد۔

کہ ایک اونٹ جو دیوانہ ہو گیا تھا، یا بگڑ گیا تھا۔ آنحضرتؐ جب اس کے پاس گئے تو اس نے مطیعانہ سر ڈال دیا۔ صحابہؓ نے کہا "یا رسول اللہؐ! جب جانور آپؐ کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو ہم کو انسان ہو کر تو ضرور آپؐ کے سامنے سر بسجود ہونا چاہیئے"۔ آپؐ نے فرمایا "اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنا روا رکھتا تو بیوی کو کہتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے"۔ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو ذرا ذرا سے اختلافِ بیان کی بنا پر چودہ پندرہ واقعے بن گیا ہے۔

الفاظ کی نقل میں بے احتیاطی

۷۔ ان کتابوں میں بعض معجزات ایسے مذکور ہیں جن کی اصل صحاح میں مذکور ہے اور اس طرح مذکور ہے کہ وہ کوئی معجزہ نہیں۔ بلکہ معمولی واقعہ ہے۔ لیکن نیچے درجہ کی روایتوں میں بے احتیاط راویوں نے الفاظ کے ذرا الٹ پھیر سے اس کو معجزہ قرار دے دیا۔ صحاح کی متعدد روایتوں میں ہے کہ شانۂ مبارک پر اُبھرا ہوا گوشت تھا جس کو "خاتم نبوّت" کہتے تھے۔ اور آپؐ کی انگشت مبارک میں جو نقرئی خاتم (چاندی کی انگوٹھی) تھی۔ اس "پر محمد رسول اللہ" منقوش تھا۔ بے احتیاط راویوں نے ان دونوں واقعوں کو ملا دیا اور اس طرح واقعہ کی صورت حاکم کی تاریخ نیشاپور، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور ابونعیم کی دلائل میں جا کر یوں ہو جاتی ہے کہ پشتِ مبارک کے گوشت کی خاتم نبوّت پر کلمہ وغیرہ کی عبارتیں لکھی تھیں۔

مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت

دلائل و معجزات کے باب میں موضوع، منکر، ضعیف، غرض ہر قسم کی قابلِ اعتراض روایات کا اتنا بڑا انبار ہے کہ اگر ایک ایک کر کے اس کی جانچ پڑتال کی جائے تو ایک مستقل ضخیم جلد تیار ہو جائے۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔ اس لئے ہم صرف اُن روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں۔ اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق و ذوق پڑھا اور

سُنا جاتا ہے :۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ روایت آتی ہے کہ "اللہ تعالےٰ نے لوح وقلم، عرش وکُرسی، جن وانس غرض سب سے پہلے نورِ محمدی کو پیدا کیا اور پھر لوح وقلم، عرش وکرسی، آسمان وزمین، ارواح وملائکہ، سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں"۔ اس کے متعلق اَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ[1] (یعنی سب سے پہلے خدا نے میرا نور پیدا کیا۔) کی روایت عام طور سے زبانوں پر جاری ہے۔ مگر اس روایت کا پتہ احادیث کے دفتر میں مجھے نہیں ملا۔ البتہ ایک روایت مصنّف عبدالرزاق میں ہے۔ یاجابر اوّل ماخلق اللہ نور نبیّک من نورہٖ (اے جابر سب سے پہلے خدا نے تیرے پیغمبر کا نور اپنے نور سے پیدا کیا) اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصّے ہوئے اور ان ہی سے لوح وقلم، عرش وکُرسی، آسمان وزمین اور جن وانس کی پیدائش ہوئی۔

زرقانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی سند نہیں لکھی۔ ہندوستان میں مصنّف عبدالرزاق کی گو دوسری جلد ملتی ہے۔ مگر پہلی نہیں ملتی۔ دوسری جلد دیکھ لی گئی۔ اس میں یہ حدیث مذکور نہیں۔ اس لئے اس روایت کی تنقید نہ ہوسکی اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں اور فضائل و مناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اصولی حیثیت سے اس

---

[1] بعض اربابِ سیر نے اس بنا پر کہ فضائل میں ہر قسم کی روایات قبول کرلی جاتی ہیں اور خصوصاً وہ جن کی تائید ان کے خیال میں دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے، اس روایت کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ (زرقانی علی المواہب جلد اوّل) مگر جو علماء ہر قسم کی روایت میں صحت کے پہلو کا خیال ضروری سمجھتے ہیں ان کو اس میں کلام ہے۔ البتہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تمام انبیاءؑ میں اوّل مخلوق ہونا ثابت ہے

روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس و پیش ہے۔ اس تردد کو قوت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں مخلوقاتِ الٰہی میں سب سے پہلے "قلم تقدیر" کی پیدائش کا تصریحی بیان ہے کہ اوّل ماخلق اللہ القلم[1]

۲۔ روایتوں میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدہ میں پڑا رہا۔ پھر حضرت آدم علیہ السّلام کے تیرہ وتار جسم کا چراغ بنا۔ پھر آدم علیہ السّلام نے مرتے وقت شیث علیہ السّلام کو اپنا وصی بنا کر یہ نور اُن کے سپرد کیا۔ اسی طرح یہ درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا ہوا حضرت عبداللہ کو سپرد ہوا۔ اور حضرت عبداللہ سے حضرت آمنہ کو منتقل ہُوا۔ نور کا سجدہ میں پڑا رہنا اور اس کا موجود ہونا بالکل موضوع ہے اور نور کا ایک دوسرے وصی کو درجہ بدرجہ منتقل ہوتا رہنا بے سروپا ہے۔ طبقات ابنِ سعد اور طبرانی، ابونعیم اور بزار میں اس آیت پاک

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۙ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝ (الشعراء: ۲۱۸-۲۱۹)

وہ خدا جو تجھ کو دیکھتا ہے۔ جب تو تہجد کی نماز میں، کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے اُلٹ پھیر کو بھی دیکھتا ہے۔

کی تفسیر میں حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کا پیغمبروں کی پشت بہ پشت منتقل ہونا خدا دیکھ رہا تھا۔ لیکن اوّل تو پوری آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں۔

---

[1] جامع ترمذی کتاب القدر۔ ان علماء نے جنہوں نے اوّل ماخلق اللہ نوری کو قبول کر لیا ہے نور محمدیؐ اور قلم کی اوّلیت بے پیدائش میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔

۳۔ روایت ہے کہ "یہ نور جب (بلوغ کے وقت) عبدالمطلب کو سپرد ہوا تو وہ (ایک دن خانۂ کعبہ میں سوئے ہوئے تھے) سو کر اُٹھے تو دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں سُرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہے اور بدن پر جمال و رونق کا خلعت ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ آخر کار ان کے باپ ان کو قریش کے ایک کاہن کے پاس لے گئے۔ اُس نے کہا کہ آسمانوں کے خدا نے اجازت دی ہے کہ اس لڑکے کا نکاح کر دیا جائے۔ اس نور کے اثر سے عبدالمطلب کے بدن سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا۔ قریش پر قحط وغیرہ کی جب کوئی مصیبت آتی تھی تو اس نُور کے وسیلہ سے وہ دُعا مانگتے تھے تو قبول ہوتی تھی۔

یہ روایت ابوسعد نیشاپوری المتوفی ۴۰۷ھ نے اپنی کتاب شرف المصطفٰے میں ابوبکر ابن ابی مریم کے واسطہ سے کعب احبار (نومسلم یہودی) تابعی سے نقل کی ہے۔ اوّل تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے۔ آگے کی سند نہیں۔ علاوہ ازیں کعب احبار گو نومسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم امام بخاری اِن کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادث کی روایات کے سرچشمہ یہی ہیں۔ بیچ کے راوی ابوبکر ابن ابی مریم باتفاقِ محدّثین ضعیف ہیں۔ ان کا دماغ ایک حادثہ کے باعث ٹھیک نہیں رہا تھا۔

۴۔ ابونعیم، حاکم، بیہقی اور طبرانی میں ایک روایت ہے کہ عبدالمطلب یمن گئے تھے۔ وہاں ایک کاہن اُن کے پاس آیا اور اِن کی اجازت سے ان کے دونوں نتھنوں کو دیکھ کر بتایا کہ ایک ہاتھ میں نبوّت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت ہے۔ تم بنو زہرہ کی کسی لڑکی سے جا کر شادی کرو۔ ان مصنّفوں کا مشترک راوی عبدالعزیز بن عمران الزہری ہے۔

اس کی نسبت میزان میں ہے کہ امام بخاری نے کہا "اس کی حدیث نہ لکھی جائے"۔ نسائی نے کہا "متروک ہے"۔ یحییٰ نے کہا "یہ شعر و شاعری کا آدمی ہے۔ ثقہ نہ تھا"۔ عبدالعزیز کے بعد کا راوی اس میں یعقوب بن زہری ہے، جس کی نسبت ابنِ معین کہتے ہیں کہ "اگر ثقات سے روایت کرے تو خیر لکھو"۔ ابوزرعہ نے کہا "وہ کچھ نہیں۔ وہ واقدی کے قریب ہے"۔ امام احمد نے کہا "وہ کچھ نہیں۔ اس کی حدیث لاشے کے برابر ہے"۔ ساجی نے کہا "وہ منکر الحدیث ہے"۔ علاوہ ازیں اس روایت میں بعض اور مجہول بھی ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے لیکن امام ذہبی نے نقدِ مستدرک میں یعقوب اور عبدالعزیز دونوں کو ضعیف کہا ہے۔

۵۔ روایت ہے کہ "حضرت عبداللہ کی پیشانی میں جب یہ نور چمکا تو ایک عورت جو کاہنہ تھی، اس نے نور کو پہچانا اور چاہا کہ وہ خود عبداللہ سے ہم بستر ہو کر اس نور کی امین بن جائے۔ مگر یہ سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی۔ اس وقت عبداللہ نے عذر کیا اور گھر چلے گئے۔ وہاں یہ دولت آمنہؓ کو نصیب ہوئی۔ عبداللہ نے واپس آکر اس کاہنہ سے اب خود درخواست کی تو اس نے رد کر دی کہ "اب وہ نور تمہاری پیشانی سے منتقل ہو چکا"۔

یہ روایت الفاظ اور جزئیات کے اختلاف کے ساتھ ابنِ سعد، خرائطی، ابنِ عساکر بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے۔ ابنِ سعد نے تین طریقوں سے اس کی روایت کی ہے۔ ایک طریقہ میں پہلا راوی واقدی ہے۔ دوسرے میں کلبی ہے۔ یہ دونوں مشہور دروغ گو ہیں۔ تیسرا طریقہ ابویزید مدنی تابعی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ ابویزید مدنی کی اگرچہ بعض ائمہ نے توثیق کی ہے مگر مدینہ کے شیخ الکل امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔ ابوزرعہ نے کہا "مجھے نہیں معلوم"۔ ابونعیم نے چار طریقوں سے اس کی روایت کی ہے۔ لیکن کوئی ان میں قابلِ وثوق نہیں۔ ایک طریقہ میں نضر بن سلمہ اور احمد بن محمد بن عبدالعزیز بن عمر والزہری ہیں۔ اور یہ

تینوں نامعتبر ہیں۔ تیسرے سلسلہ میں مسلم بن خالد الزنجی ہیں جو ضعیف سمجھے جاتے ہیں اور متعدد مجاہیل ہیں۔ چوتھا طریقہ یزید بن شہاب الزہری پر ختم ہے۔ اور وہ اپنے آگے کا سلسلہ نہیں بتاتے اور ان کا حال بھی نہیں معلوم۔ بیہقی کا سلسلہ وہی تیسرا ہے۔ خرائطی اور ابنِ عساکر کا یوں بھی اعتبار نہیں۔

۶۔ حضرت عباسؓ سے روایت کی گئی ہے کہ عبدِ مناف اور قبیلۂ مخزوم کی دو سو عورتیں گنی گئیں جنہوں نے اس غم میں کہ عبداللہ سے ان کو یہ دولت حاصل نہ ہوئی وہ مر گئیں لیکن انہوں نے شادی نہ کی (یعنی عمر بھر کنواری رہیں) اور قریش کی کوئی عورت نہ تھی جو اس غم میں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ یہی حکایت ہے۔ جس کا غلط ترجمہ اردو مولفینِ میلاد نے یہ کیا ہے کہ اس رات دو سو عورتیں رشک و حسد سے مر گئیں۔ یہ روایت سند کے بغیر زرقانی شرحِ مواہب لدنیہ میں بصیغہ رُوِیَ (یعنی بیان کیا گیا ہے) مذکور ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مصنّف کو بھی اس کی صحت میں کلام ہے۔ یہ درحقیقت بالکل بے سند اور بے اصل روایت ہے اور کسی معتبر کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

۷۔ روایت ہے کہ اس رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑ گیا اور اس کے چودہ کنگرے گر پڑے اور ساوہ کی نہر (واقع فارس) اور بعض روایتوں میں طبریہ کی نہر (واقع شام) خشک ہو گئی اور فارس کا آتش کدہ جو ہزاروں برس سے روشن تھا، بجھ گیا۔ اور کسریٰ نے ایک ہولناک خواب دیکھا، جس کی تعبیر یمن کے ایک کاہن سطیح سے دریافت کی گئی۔ یہ قصّہ بیہقی، خرائطی، ابنِ عساکر، اور ابونعیم میں سند اور سلسلۂ روایت کے ساتھ مذکور ہے۔ ان سب کا مرکزی راوی مخزوم ابن ہانی ہے جو اپنے باپ ہانی مخزومی (قریش) سے جس کی ڈیڑھ سو برس کی عمر تھی، بیان کرتا ہے۔ ہانی کے نام کا کوئی صحابی جو مخزومی قریشی ہو اور جو ڈیڑھ سو برس کی عمر رکھتا ہو

معلوم نہیں۔ اصابہ وغیرہ میں اسی روایت کے سلسلہ میں ان کا نام مشکوک طریقہ سے آیا ہے۔ ان کے صاحبزادہ مخزوم بن ہانی سے محدثین میں بھی کوئی شناسا نہیں۔ نیچے کے راویوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں تک کہ ابن عساکر جیسے ضعیف روایتوں کے سرپرست بھی اس روایت کو غریب کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور ابن حجر جیسے کمزور روایتوں کے سہارا اور پشت پناہ بھی اس کو مرسل ماننے کو تیار ہیں۔ ابونعیم کی روایت میں محمد بن جعفر بن اعین مشہور وضاع ہے۔

۸۔ روایت ہے کہ جب آنحضرتؐ پیدا ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی ماں شفاؑ بنت اوس ولادت کے وقت زچہ خانہ میں موجود تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آپؐ پیدا ہوئے تو پہلے غیب سے ایک آواز آئی۔ پھر مشرق و مغرب کی ساری زمین میرے سامنے روشن ہو گئی۔ یہاں تک کہ شام کے محل مجھ کو نظر آنے لگے۔ میں نے آپؐ کو کپڑا پہنا کر لٹایا ہی تھا۔ کہ اندھیرا چھا گیا اور میں ڈر کر کانپنے لگی۔ پھر داہنی طرف سے کچھ روشنی نکلی تو آواز سنی "کہاں لے گئے تھے" جواب ملا "مغرب کی سمت"۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ میں ڈر کر کانپی اور آواز آئی کہ کہاں لے گئے تھے۔ جواب ملا کہ مشرق کی سمت۔ یہ حکایت ابونعیم میں ہے۔ اس کے بیچ کا راوی احمد بن محمد بن عبدالعزیز زہری نامعتبر ہے اور اس کے دوسرے رُواۃ مجہول الحال ہیں۔

۹۔ روایت ہے کہ حضرت آمنہؓ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے "اے آمنہ تیرا بچہ تمام جہاں کا سردار ہوگا۔ جب پیدا ہو تو اس کا نام احمدؐ اور محمدؐ رکھنا اور یہ تعویذ اس کے گلے میں ڈالنا"۔ جب وہ بیدار ہوئیں تو سونے کے پتر پر یہ اشعار لکھے ملے (اس کے بعد اشعار ہیں) یہ قصہ ابونعیم میں ہے، جس کا راوی ابوعزیہ محمد بن موسیٰ انصاری ہے جس کی روایتوں کو امام بخاری منکر کہتے ہیں۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ دوسروں کی حدیثیں چرایا کرتا تھا

اور ثقات سے موضوع روایتیں بنا کر بیان کرتا تھا۔ متاخرین میں حافظ عراقی نے اس روایت کو بے اصل اور شامی نے بہت ہی ضعیف کہا ہے۔ ابن اسحاق نے بھی اس کو بے سند روایت کیا ہے۔ ابن سعد میں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے ہے۔ جس کی دروغ گوئی محتاج بیان نہیں۔

۱۰۔ روایت :۔ عثمان بن ابی العاص رضؓ صحابی کی ماں ولادت کے وقت موجود تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آمنہؓ کو دردِ زہ ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے زمین پر جھکے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ میں ڈری کہ کہیں زمین پر نہ گر پڑیں اور جب پیدا ہوئے تو جدھر نظر جاتی تھی تمام گھر روشنی سے معمور تھا۔ یہ قصہ ابو نعیم، طبرانی اور بیہقی میں مذکور ہے۔ اس کے رُواۃ میں یعقوب بن محمد زہری پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اور عبد العزیز بن عمر بن عبد الرحمٰن بن عوف ایک محض داستان گو اور جھوٹا تھا۔

۱۱۔ روایت :۔ حضرت آمنہؓ کہتی ہیں کہ مجھے ایامِ حمل میں حمل کی کوئی علامت معلوم نہ ہوئی اور عورتوں کو ان ایام میں جو گرانی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ بھی نہ ہوئی، بجز اس کے کہ معمول میں فرق آ گیا تھا۔ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اس قصہ کو ابن اسحٰق اور ابو نعیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن اسحٰق کا جو نسخہ ابن ہشام کے نام سے مشہور اور چھپا ہوا ہے اور نیز دلائل ابو نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔ قسطلانی کی پیروی میں دوسرے بے احتیاط متاخرین مثلاً صاحب سیرۃ حلبیہ اور مصنف خمیس نے بھی ابن اسحاق اور ابو نعیم ہی کی طرف اس روایت کی نسبت کی ہے۔ لیکن ابن سید الناس نے عیون الاثر میں بجا طور سے اس روایت کے لئے واقدی کا حوالہ دیا ہے۔ دراصل یہ قصہ ابن سعد نے نقل کیا ہے اور اس کی روایت کے دو سلسلے لکھے ہیں۔ مگر ان میں سے

ہر ایک کا سر سلسلہ واقدی ہے۔ اور اس کی نسبت محدثین کی رائے پوشیدہ نہیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے کوئی سلسلہ بھی مرفوع نہیں۔ پہلا سلسلہ عبداللہ بن وہب پر ختم ہوتا ہے جو اپنی پھوپھی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتی ہیں کہ ہم یہ سنا کرتے تھے، ..... دوسرے سلسلہ کو واقدی زہری پر جا کر ختم کر دیتا ہے۔

۱۲۔ ایک روایت اس کے بالکل برخلاف ابنِ سعد میں یہ ہے کہ "(غالباً آنحضرتؐ کی جلالت و عظمت کے باعث) حضرت آمنہؓ کو سخت گرانی اور بار محسوس ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میرے پیٹ میں کئی بچے رہے، مگر اس بچہؐ سے زیادہ بھاری اور گراں مجھے کوئی نہیں معلوم ہوا۔ اوّل تو یہ روایت معروف اور مسلّم واقعہ کے خلاف ہے۔ حضرت آمنہؓ کے ایک کے سوا نہ کوئی اور بچہ ہوا اور نہ حمل رہا۔ دوسرے یہ کہ اس روایت کا سلسلہ ناتمام ہے۔ اسی معنی کی ایک اور روایت شدّاد بن اوسؓ صحابی کی زبانی منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "میں اپنے والدین کا پہلوٹا ہوں۔ جب میں شکم میں تھا۔ تو میری ماں عام عورتوں سے بہت زیادہ گرانی محسوس کرتی تھی"[1] معانی بن زکریا القاضی نے اس روایت پر اتنی ہی جرح کی ہے کہ یہ منقطع ہے۔ یعنی شدّاد بن اوس اور ان کے بعد کے راوی مکحول میں ملاقات نہیں اس لئے بیچ میں ایک راوی کم ہے۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کا پہلا راوی عمر بن صبیح، کذّاب، وضّاع اور متروک تھا۔

۱۳۔ روایت: جب ولادت کا وقت آیا خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور بہشتوں کے دروازے کھول دو۔ فرشتے باہم بشارت دیتے پھرتے تھے۔ سورج نے نور کا نیا جوڑا پہنا۔ اس سال دنیا کی تمام عورتوں کو یہ رعایت ملی کہ سب فرزندِ نرینہ جنیں۔ درختوں

---

[1] کنز العمال: کتاب الفضائل۔

میں پھیل آگئے۔ آسمان میں زبرجد یاقوت کے ستون کھڑے کیئے گئے۔ نہرِ کوثر کے کنارے مشکِ خالص کے درخت اُگائے گئے۔ مکّہ کے بُت اوندھے ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ حکایت مواہب لدنیہ اور خصائص کبریٰ میں ابونعیم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے لیکن ابونعیم کی دلائل النبوّۃ کے مطبوعہ نسخہ میں جہاں اس کا موقع ہو سکتا تھا، وہاں یہ روایت مجھ کو نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ ابونعیم نے اپنی کسی اور کتاب میں یہ روایت لکھی ہو یا یہ مطبوعہ نسخہ نامکمل ہو۔ بہرحال اس روایت کی بنا صرف اس قدر ہے کہ ابونعیم چوتھی صدی کے ایک راوی عمرو بن قیتبہ رادی سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد قیتبہ جو بڑے فاضل تھے، یہ بیان کرتے تھے۔ قسطلانی نے مواہب میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ "مطعون ہے"۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں اس کو مُنکر کہا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تر بے سند اور موضوع ہے۔

۱۴۔ روایت:۔ آنحضرتؐ کے حمل میں ہونے کی جو نشانیاں تھیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اس رات کو قریش کے سب جانور بولنے لگے اور کہنے لگے کہ کعبہ کے خدا کی قسم آنحضرتؐ شکمِ مادر میں آ گئے۔ وہ دُنیا جہان کی امان اور اہلِ دنیا کے چراغ ہیں۔ قریش اور دیگر قبائل کی کاہنہ عورتوں میں کوئی عورت ایسی نہ تھی کہ اس کا جن اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا ہو اور ان سے کہانت کا علم چھین لیا گیا۔ اور دنیا کے تمام بادشاہوں کے تخت اوندھے ہو گئے اور سلاطین اس دن گونگے ہو گئے۔ مشرق کے وحشی جانوروں نے مغرب کے وحشی جانوروں کو جا کر بشارت دی۔ اسی طرح ایک دریا نے دوسرے دریا کو خوشخبری سُنائی اور پورے ایّامِ حمل میں ہر ماہ آسمان و زمین سے یہ ندا سُنی جانے لگی کہ بشارت ہو کہ حضرت ابوالقاسمؐ کے زمین پر ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آیا۔ آنحضرتؐ کی والدہ فرماتی

تھیں۔ کہ جب میرے حمل کے چھ مہینے گذرے تو خواب میں کسی نے مجھ کو پاؤں سے ٹھوکر دے کر کہا کہ "اے آمنہ! تمام جہان کا سردار تیرے پیٹ میں ہے۔ جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ رکھنا اور اپنی حالت کو چھپائے رکھنا" کہتی ہیں کہ جب ولادت کا زمانہ آیا تو عورتوں کو جو پیش آتا ہے۔ وہ مجھ کو بھی پیش آیا اور کسی کو میری اس حالت کی خبر نہ تھی۔ میں گھر میں تنہا تھی عبدالمطلب خانۂ کعبہ کے طواف کو گئے تھے۔ تو میں نے ایک زور کی آواز سنی۔ جس سے میں ڈر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک سپید مرغ ہے جو اپنے بازو کو میرے دل پر مل رہا ہے۔ اُس سے میری تمام دہشت دور ہو گئی۔ اور درد کی تکلیف بھی جاتی رہی۔ پھر ایک طرف دیکھا کہ سپید شربت ہے۔ پیاسی تھی۔ دودھ سمجھ کر اس کو پی گئی۔ اس کے پینے سے ایک نور مجھ سے نکل کر بلند ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں، گویا عبدالمطلب کی بیٹیاں ہیں، وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں۔ میں تعجب کر رہی ہوں کہ ان کو کیسے میرا حال معلوم ہوا (ایک اور روایت میں ہے کہ ان عورتوں نے کہا کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم اور یہ حوریں ہیں) میرا درد بڑھ گیا اور ہر گھڑی آواز اور زیادہ بلند تھی اور خوفناک ہوتی جاتی تھی اتنے میں ایک سپید دیبا کی چادر آسمان و زمین کے درمیان پھیلی نظر آئی اور آواز آئی کہ "اس کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپالو" میں نے دیکھا کہ چند مرد ہوا میں معلق ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کے آفتابے ہیں اور میرے بدن سے موتی کی طرح پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جن میں مشک خالص سے بہتر خوشبو تھی اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش عبدالمطلب اس وقت پاس ہوتے۔ پھر میں نے پرندوں کا ایک غول دیکھا جو نہیں معلوم کدھر سے آئے۔ وہ میرے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی منقاریں زمرد کی اور بازو یاقوت کے تھے۔ میری آنکھوں سے اس وقت پردے اُٹھا دیئے گئے۔ تو اس وقت مشرق و

ومغرب سب میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ تین جھنڈے نظر آئے۔ ایک مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک خانۂ کعبہ کی چھت پر۔ اب درد زیادہ بڑھ گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ عورتیں ٹیک لگائے بیٹھی ہیں اور اتنی عورتیں بھر گئیں کہ مجھے گھر کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اسی اثنا میں بچہ پیدا ہوا۔ میں نے پھر کر دیکھا تو وہ سجدہ میں پڑا تھا۔ اور دو انگلیوں کو آسمان کی طرف دُعا کی طرح اُٹھائے تھا۔ پھر ایک سیاہ بادل نظر آیا جو آسمان سے اُتر کر نیچے آیا اور بچہ پر چھا گیا۔ اور بچہ میری نگاہ سے چھپ گیا۔ اتنے میں ایک منادی سنی کہ "محمدؐ" کو زمین کے پورب اور پچھم گھما دو اور سمندروں کے اندر لے جاؤ کہ سب ان کے نام نامی اور شکل وصورت کو پہچان لیں۔ اور جان لیں کہ یہ مٹانے والے ہیں۔ یہ اپنے زمانہ میں شرک کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں بادل ہٹ گیا اور آپؐ دودھ سے زیادہ سفید کپڑے میں لپٹے نظر آئے۔ جس کے نیچے سبز ریشم تھا۔ ہاتھوں میں سفید موتیوں کی تین کنجیاں تھیں۔ اور ایک آواز آئی کہ محمدؐ کو فتح و نُصرت اور نبوت کی کنجیاں دی گئی ہیں۔

میں نے دل پر جبر کر کے یہ پوری حکایت نقل کی ہے۔ یہ اس لئے کہ میلاد کے عام جلسوں کی رونق ان ہی روایتوں سے ہے۔ یہ روایت ابو نعیم میں حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے۔ اور سند کا سلسلہ بھی ہر طرح درست ہے۔ مگر اگر کسی کو اسماء الرجال سے آگاہی نہ بھی ہو اور وہ صرف ادبِ عربی کا صحیح ذوق رکھتا ہو تو وہ فقط روایت کے الفاظ اور عبارت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دے گا کہ یہ تیسری چوتھی صدی کی بنائی ہوئی ہے۔ اس روایت میں یحییٰ بن عبداللہ البابلتی اور ابوبکر بن ابی مریم ہیں۔ پہلا شخص بالکل ضعیف ہے اور دوسرا ناقابلِ حجت ہے۔ ان کے آگے کے راوی سعید بن عمرو الانصاری اور ان کے باپ عمرو الانصاری کا کوئی پتہ نہیں۔

۱۵۔ اسی قسم کی ایک اور روایت حضرت عباسؓ سے نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی عبداللہ جب پیدا ہوئے تو ان کے چہرے پر سورج کی سی روشنی تھی اور والد نے ایک دفعہ خواب دیکھا۔ بنو مخزوم کی ایک کاہنہ نے یہ خواب سُن کر پیشین گوئی کی کہ "اس لڑکے کی پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا۔ جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا"۔ جب آمنہؓ کے شکم سے بچہ پیدا ہُوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ ولادت کے اثنا میں تم کو کیا کیا نظر آیا؟ انہوں نے کہا کہ جب مجھے درد ہونے لگا تو میں نے بڑے زور کی آواز سُنی جو انسانوں کی آواز کی طرح نہ تھی اور سبز ریشم کا پھریرا یاقوت کے جھنڈے میں لگا ہُوا آسمان و زمین کے بیچ میں گڑا نظر آیا۔ اور میں نے دیکھا کہ بچہ کے سر سے روشنی کی کرنیں نکل نکل کر آسمان تک جاتی ہیں۔ شام کے تمام محل آگ کا شعلہ معلوم ہوتے تھے اور اپنے پاس مرغابیوں کا ایک جُھنڈ دکھائی دیا۔ جس نے بچہ کو سجدہ کیا۔ پھر اپنے پروں کو کھول دیا۔ اور سعیرہ اسدیہ کو دیکھا کہ وہ کہتی ہوئی گذری کہ "تیرے اس بچہ نے بتوں اور کاہنوں کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ ہائے سعیرہ ہلاک ہو گئی"۔ پھر ایک بلند و بالا سپید رنگ جوان نظر آیا۔ جس نے بچہ کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن لگایا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کا طشت تھا۔ بچہ کے پیٹ کو پھاڑا، پھر اس کے دل کو نکالا۔ اس میں سے ایک سیاہ داغ نکال کر پھینک دیا۔ پھر سبز حریر کی ایک تھیلی کھولی، جس میں سپید کی طرح کوئی چیز تھی۔ اس کو سینہ میں بھرا پھر سپید حریر کی ایک تھیلی کھولی، اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر مونڈھے کے برابر مہر کی اور اس کو ایک کُرتہ پہنا دیا۔ اے عباسؓ یہ میں نے دیکھا۔

اس روایت کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کہ ناقلین نے اس کے ضعف کو خود تسلیم کیا ہے اور حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت اور اس سے پہلے کی دو روایتوں

(۱۳-۱۴) میں سخت نکارت ہے۔ اور میں نے اپنی کتاب (خصائص) میں ان تینوں سے زیادہ منکر کوئی روایت نہیں کی۔ اور میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے محض ابو نعیم کی تقلید میں لکھ دیا ہے۔ جن روایتوں کو حافظ سیوطی لکھنے کے قابل نہ سمجھیں۔ آپ اُن کے ضعف کے درجہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ سیوطی اس روایت کا ماخذ ابو نعیم کو بتاتے ہیں۔ مگر یہ روایت دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملی۔ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عباسؓ آنحضرتؐ سے ایک ہی دو سال بڑے تھے۔ جب آمنہؓ نے وفات پائی تو وہ سات آٹھ برس کے بچہ ہوں گے۔

۱۶۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آمنہؓ آنحضرتؐ کی ولادت کا قصہ بیان کر رہی تھیں کہ میں حیرت میں تھی کہ تین آدمی دکھائی دیئے، جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ تھا۔ جس سے مُشک کی سی خوشبو آرہی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت تھا۔ جس کے چار گوشے تھے۔ اور ہر گوشہ میں سپید موتی رکھا تھا۔ اور ایک آواز آئی۔ "اے حبیبُ اللہ! یہ پوری دُنیا، پورب، پچھم، خشکی و تری سب مجتمع ہو کر آئی ہے۔ اس کے جس گوشہ کو چاہیئے مٹھی میں لے لیجیئے۔" آمنہؓ کہتی ہیں کہ میں نے گھوم کر دیکھا کہ بچہ کہاں ہاتھ رکھتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے بیچ میں ہاتھ رکھا۔ تو کہنے والے کی آواز سُنی کہ محمدؐ نے کعبہ کے خدا کی قسم کعبہ پر قبضہ کر لیا۔ ہاں یہ کعبہ اس کا قبلہ اور اس کا مسکن بنے گا۔ تیسرے کے ہاتھ میں سپید حریر لپٹا تھا۔ اس نے اُس کو کھولا تو اس میں ایک انگوٹھی نکلی، جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت کرتی تھیں، پھر وہ میرے پاس آیا تو طشت والے نے اس انگوٹھی کو لے کر اُس آفتابہ سے سات بار اس کو دھویا اور بچہ کے مونڈھے پر مہر کر دی۔ اور حریر میں اس کو لپیٹ کر مشکِ خاص کے تاگے سے اس کو باندھ دیا۔

اور تھوڑی دیر تک اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ رضوانِ جنت تھا۔ پھر بچہؐ کے کان میں کچھ کہا جس کو آمنہؓ کہتی ہیں کہ میں سمجھ نہ سکی اور پھر اس نے کہا "اے محمدؐ! بشارت ہو کہ کسی نبی کو کوئی ایسا علم عطا نہیں کیا گیا جو تم کو نہیں بتا دیا گیا۔ تم سب پیغمبروں سے زیادہ شجاع بنائے گئے۔ تم کو فتح و نصرت کی کنجی دی گئی۔ اور رعب و داب بخشا گیا۔ جو تمہارا نام سُنے گا۔ اس نے تم کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو تو وہ کانپ جائے گا۔ اے خدا کے خلیفہ!"

اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ یحییٰ بن عائذ المتوفی ۲۷۸ھ نے اپنی کتاب میلاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن دحیہ محدّث نے بڑی جرأت کر کے اس خبر کو "غریب" کہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے۔ یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے۔

۱۷۔ روایت: آمنہؓ کہتی ہیں کہ "جب ولادت ہوئی تو ایک بہت بڑا ابر کا ٹکڑا نظر آیا۔ جس میں گھوڑے کے ہنہنانے اور پروں کے پھٹپھٹانے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ابر کا ٹکڑا بچہؐ کے اوپر آ کر چھا گیا۔ اور بچہؐ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ البتہ منادی کی آواز سنائی دی کہ "محمدؐ کو ملکوں ملکوں پھراؤ اور سمندر کی تہوں میں لے جاؤ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے اور جنّ و انس، چرند و پرند، ملائکہ، بلکہ ہر ذی روح کے سامنے ان کو لے جاؤ۔ ان کو آدمؑ کا خُلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، ابراہیمؑ کی دوستی، اسمٰعیلؑ کی زبان، اسحاقؑ کی رضا، صالحؑ کی فصاحت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی اطاعت، یوشعؑ کا جہاد، داؤدؑ کی آواز، دانیالؑ کی محبّت، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاک دامنی اور عیسیٰؑ کا زُہد عطا کرو اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔" آمنہؓ کہتی ہیں۔ پھر یہ منظر ہٹ گیا تو میں نے دیکھا کہ آپؐ سبز حریر میں لپٹے ہیں۔ اور اس کے اندر سے پانی ٹپک رہا ہے۔ آواز آئی۔ ہاں

محمدؐ نے تمام دنیا پر قبضہ کرلیا اور کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جو ان کے حلقۂ اطاعت میں نہ آگئی ہو"۔ کہتی ہیں کہ پھر میں نے دیکھا تو نظر آیا کہ آپؐ کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے اور مشکِ خالص کی سی خوشبو آپؐ سے نکل رہی ہے۔ دفعتہً تین آدمی نظر آئے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ ہے، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرّد کا طشت ہے اور تیسرے کے ہاتھ میں سپید ریشم ہے۔ اس نے سپید ریشم کھول کر اس میں سے انگوٹھی جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں، نکالی۔ پہلے اس نے انگوٹھی کو سات دفعہ اس آفتابہ کے پانی سے دھویا پھر مونڈھے پر مُہر کر کے بچہؐ کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا، اور پھر مجھے واپس کر دیا۔

اس حکایت کی بنیاد یہ ہے کہ قسطلانی نے اپنے مواہب لدنیہ میں السعادۃ والبشریٰ نامی ایک میلاد کی کتاب سے اس کو نقل کیا ہے اور السعادۃ البشریٰ کا مصنف کہتا ہے کہ اس نے خطیب سے اس کو لیا ہے۔ روایات کے لحاظ سے خطیب کی تاریخ کا جو درجہ ہے وہ کس کو معلوم نہیں۔ قسطلانی نے اس روایت کو ابو نعیم کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر دلائل ابو نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس کا پتہ نہیں۔ غنیمت ہے کہ حافظ قسطلانی نے خود تصریح کر دی ہے کہ "اس میں سخت نکارت ہے"۔

۱۸۔ روایت: آمنہؓ کہتی ہیں کہ جب آپؐ پیدا ہوئے تو ایک روشنی چمکی جس سے تمام مشرق و مغرب روشن ہو گیا۔ اور آپؐ دونوں ہاتھ ٹیک کر زمین پر گر پڑے (شاید مقصود یہ کہنا ہے کہ آپؐ سجدہ میں گئے)۔ پھر مٹھی سے مٹی اٹھائی (اہلِ میلاد اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ آپ نے روئے زمین پر قبضہ کر لیا۔) اور آسمان کی طرف سر اٹھایا۔

یہ حکایت ابنِ سعد میں متعدد طریقوں سے مذکور ہے۔ مگر ان میں سے کوئی قوی نہیں۔

اسی کے قریب قریب ابونعیم اور طبرانی میں روایتیں ہیں، اُن کا بھی یہی حال ہے۔

۱۹۔ روایت: جس شب کو آپؐ پیدا ہوئے قریش کے بڑے بڑے سردار جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ ایک یہودی نے جو مکہ میں سوداگری کرتا تھا، اُن سے آکر دریافت کیا کہ آج تمہارے یہاں کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے۔ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس نے کہا "اللہ اکبر! تم کو نہیں معلوم تو خیر میں جو کہتا ہوں اس کو سُن رکھو۔ آج شب کو اس پچھلی اُمت کا نبی پیدا ہو گیا۔ اس کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایک نشانی ہے۔ اس میں گھوڑے کی ایال کی طرح کچھ اوپر تلے بال ہیں وہ دو دن تک دودھ نہ پیے گا۔ کیونکہ ایک جن نے اس کے مُنہ میں انگلی ڈال دی ہے۔ جس سے وہ دودھ نہیں پی سکتا۔" جب جلسہ چھٹ گیا اور لوگ گھروں کو لوٹے تو معلوم ہُوا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ لوگ اس یہودی کو آمنہؓ کے گھر لے گئے۔ اُس نے بچہؐ کی پیٹھ پر تِل دیکھا تو غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا لوگوں نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا "خدا کی قسم اسرائیل کے گھرانے سے نبوّت رخصت ہو گئی۔ اے قریش! تم اس کی پیدائش سے خوش ہو۔ ہوشیار! خدا کی قسم ایک دن یہ تم پر ایسا حملہ کرے گا، جس کی خبر چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔"

یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مگر اہلِ علم جانتے ہیں کہ حاکم کا کسی روایت کو صحیح کہنا ہمیشہ تنقید کا محتاج رہتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک[1] میں حاکم کی تردید کی ہے۔ اس کا سلسلۂ روایت یہ ہے کہ یعقوب ابنِ سفیان، فسوی ابو غسان محمد یحییٰ کنانی سے اور یہ اپنے باپ (یحییٰ بن علی کنانی) سے اور وہ محمد بن اسحاق (مصنفِ سیرت) سے روایت کرتے ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابنِ اسحاق نے خود اپنی سیرت

---

[1] تلخیص مستدرک، جلد دوم

میں یہ روایت نہیں لی ہے۔ ابوعثمان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین نے اچھا کہا ہے۔ مگر محدث سلیمانی نے ان کو منکر الحدیث ایسی باتیں بیان کرنے والا جن کی تصدیق دیگر معتبر بیانات سے نہیں ہوتی، کہا ہے۔ ابنِ حزم نے ان کو مجہول کہا ہے۔ بہر حال اُن تک غنیمت ہے۔ مگر ان کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں کہ یہ کون تھے؟ اور کب تھے؟ اسی قسم کی ایک اور روایت عیص راہب کے متعلق ابوجعفر بن ابی شیبہ سے ہے اور ابونعیم نے دلائل میں اور ابن عساکر نے تاریخ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ لیکن زرقانی نے لکھ دیا ہے کہ ابوجعفر بن ابی شیبہ نامعتبر ہے۔

۲۰۔ روایت: حضرت عباسؓ آنحضرتؐ سے ذکر کرتے ہیں کہ یارسول اللہؐ! مجھ کو جس نشانی نے آپؐ کے مذہب میں داخل ہونے کا خیال دلایا۔ وہ یہ ہے کہ جب آپؐ گہوارہ میں تھے تو میں نے دیکھا کہ آپؐ چاند سے اور چاند آپؐ سے باتیں کرتا تھا اور انگلی سے آپؐ اس کو جدھر اشارہ کرتے تھے اِدھر جھک جاتا تھا فرمایا، "ہاں میں اس سے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور رونے سے بہلاتا تھا۔ اور عرش کے نیچے جاکر جب وہ تسبیح کرتا تھا، تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔" یہ حکایت دلائلِ بیہقی، کتاب المائتین صابونی، تاریخِ خطیب اور تاریخ ابنِ عساکر میں ہے۔ مگر خود بیہقی نے تصریح کر دی ہے کہ یہ صرف احمد بن ابراہیم جبلی کی روایت ہے اور وہ مجہول ہے۔ صابونی نے روایت لکھ کر کہا ہے کہ "یہ سند اور متن دونوں لحاظ سے غریب ہے"۔ علاوہ ازیں حضرت عباسؓ آنحضرتؐ سے شاید ایک ہی دو سال بڑے تھے۔ آنحضرتؐ کی شیر خوارگی کے عالم میں وہ خود شیر خوار ہوں گے۔

۲۱۔ حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں واقدی کی سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے گہوارہ میں کلام کیا۔ ابنِ سبع کی خصائص میں ہے کہ فرشتے آپؐ کا گہوارہ ہلاتے تھے، اور

(پیدائش کے بعد) سب سے پہلا فقرہ زبانِ مبارک سے یہ نکلا الحمد للہ کثیرا والحمد للہ کثیراً۔ ابنِ عائذ وغیرہ میلاد کی بعض اور کتابوں میں اور فقرے بھی منسوب ہیں۔ مثلاً کہ آپؐ نے لا الٰہ الّا اللہ یا جلال ربّی الرفیع پڑھا۔

واقدی کی سیر سے مراد اگر واقدی کی مغازی ہے تو اس کا مطبوعہ کلکتہ نسخہ جو میرے پیشِ نظر ہے، اس میں یہ واقعہ مذکور نہیں اور اگر ہوتا بھی تو واقدی کا اعتبار کیا ہے! ابنِ سبع اور ابنِ عائذ وغیرہ زمانہ متاخر کے لوگ ہیں۔ اور قدماء سے روایات کی نقل میں بے احتیاط ہیں۔ کسی قدیم ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں یہ روایتیں انہوں نے کہاں سے لیں۔

۲۲۔ آنحضرتؐ کی رضاعت اور شیر خوارگی کے زمانہ کے فضائل اور معجزات جب آپؐ کو حلیمہ سعدیہؓ اپنے گھر لے جاتی ہیں، ابنِ اسحاق، ابنِ راہویہ، ابویعلی، طبرانی، بیہقی، ابونعیم ابنِ عساکر اور ابنِ سعد میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ حلیمہ سعدیہؓ کا آنا اور آپؐ کا ان کو دیکھ کر مسکرانا، حلیمہؓ کے خشک سینوں میں دودھ بھر آنا، آپؐ کا صرف ایک طرف کے سینہ سے سیر ہو جانا اور دوسری طرف کا اپنے رضاعی بھائی کے لئے بنظرِ انصاف چھوڑ دینا، آپؐ کے سوار ہوتے ہی حلیمہؓ کی کمزور اور دُبلی پتلی گدھی کا تیز رو، طاقت ور اور فربہ ہو جانا اور حلیمہؓ کے قبیلہ کی قحط زدہ زمین کا سرسبز و شاداب اور سر بھرا ہو جانا، حلیمہؓ کی بکریوں کا موٹا ہونا اور سب سے زیادہ دودھ دینا، آپؐ کا غیر معمولی نشوونما پانا، دو برس کے سن میں آپؐ کے سینہ کا چاک ہونا، حلیمہؓ کا اس واقعہ سے ڈر کر آپؐ کو آمنہؓ کے پاس واپس لانا، آمنہؓ کا حلیمہؓ کو تسلی دینا، یہ تمام واقعات ان کتابوں میں بالتفصیل مذکور ہیں۔

یہ واقعات دو طریقوں سے مروی ہیں۔ ایک طریقہ کا مشترک راوی جہم بن ابی جہم

ایک مجہول شخص ہے اور دوسرے کا مشترک راوی واقدی ہے۔ جس کا کوئی اعتبار نہیں

پہلے طریقہ سے اس کو ابنِ اسحٰق، ابنِ راہویہ، ابویعلی، طبرانی، اور ابونعیم نے روایت کیا ہے۔ اس کا سلسلہ یہ ہے کہ "ابنِ اسحاق نے کہا کہ مجھ سے جہم بن ابی جہم مولیٰ حارث بن حاطب جمحی نے کہا اور وہ کہتا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نے خود بیان کیا یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا جس نے عبداللہ بن جعفرؓ سے سُنا اور عبداللہ بن جعفرؓ نے حلیمہؓ سعدیہؓ سے سُنا۔ اس روایت میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جہم اس روایت کا خود عبداللہ بن جعفرؓ سے سُننا یقینی نہیں بتاتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ عبداللہ بن جعفرؓ یا کسی نے اُن سے سُن کر مجھ سے کہا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا؟ اور کیسا تھا؟ ابونعیم وغیرہ متاخرین نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شک سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے۔ اگر بالفرض جہم نے عبداللہ بن جعفرؓ سے سُنا تو عبداللہ بن جعفرؓ کا جو آنحضرتؐ کے زمانہ میں آٹھ نو برس کے تھے اور ۸ھ کے بعد حبش کے ملک سے مدینہ آئے تھے، حلیمہؓ سے ملنا اور ان سے نقلِ روایت کرنا محتاجِ ثبوت ہے۔ بلکہ علمائے سیر و رجال میں خود حلیمہؓ کے اسلام یا نبوت کے بعد آپؐ سے ملاقات میں اختلاف ہے۔ صرف ایک دفعہ غزوۂ ہوازن کے موقع پر ان کا آنا کسی کسی نے بیان کیا ہے مگر اس موقع پر عبداللہ بن جعفرؓ کا جو کمسن تھے، موجود ہونا اور ان سے ملنا، مطلق ثابت نہیں۔ جہم بن ابی جہم جو اس روایت کا سر بنیاد ہے، ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسی روایت کی تقریب سے اس کا نام لکھ کر لکھا ہے۔ لا یعرف یعنی معلوم نہیں یہ کون تھا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کا مرکزی راوی واقدی ہے۔ اس سلسلہ سے ابنِ سعد، ابونعیم اور ابنِ عساکر نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ سلسلہ علاوہ ازیں کہ واقدی کے واسطہ سے

ہے، موقوف بھی ہے۔ یعنی کسی صحابی تک وہ نہیں پہنچتا۔ اس کو واقدی زکریا بن یحییٰ بن یزید سعدی سے، اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن زید سعدی سے نقل کرتا ہے۔ ابنِ سعد نے دوسری جگہ[1] ایک اور سلسلہ سے اس کو واقدی سے روایت کیا ہے اور واقدی عبداللہ بن زید بن اسلم سے اور عبداللہ اپنے باپ زید بن اسلم تابعی سے نقل کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ بھی علاوہ ازیں کہ اس کا پہلا راوی وہی واقدی ہے اور روایت بھی موقوف ہے، زید مذکور کی نسبت اہلِ مدینہ کلام کرتے تھے۔ اور ان کے بیٹے عبداللہ کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ بھی استناد کے قابل نہیں ہے۔ ابونعیم نے تیسری روایت میں واقدی کے واسطہ سے ان واقعات کو بے سند لکھا ہے۔

۲۳۔ شقِ صدر یعنی سینۂ مبارک کے چاک ہونے کا واقعہ معراج میں پیش آنا مسلّم ہے۔ مگر بعض لوگوں نے بچپن کے زمانہ میں بھی اس واقعہ کا پیش آنا بیان کیا ہے۔ بچپن کے وقت کی تعیین میں ان روایتوں میں اختلاف ہے۔ اکثر روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت حلیمہؓ کے پاس قیام کے زمانہ میں یہ پیش آیا۔ جب عمر شریف غالباً صرف چار برس کی تھی۔ ایک دو روایتوں میں ہے کہ اس وقت آپؐ دس برس کے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عہدِ طفولیت میں شقِ صدر کی جس قدر روایتیں ہیں، صحیح مسلم کی روایت کے علاوہ، وہ تمام تر ضعیف ہیں۔ صحیح مسلم کی روایت میں حمّاد بن سلمہ کی غلطی سے معراج کا واقعہ عہدِ طفولیت میں بیان ہو گیا ہے۔ اس بارے میں میں نے اپنی تحقیق شرحِ صدر کی بحث میں مفصّل بیان کی ہے۔

۲۴۔ حضرت حلیمہؓ کے پاس قیام کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی راویوں نے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ کو دیکھ کر بعض یہودیوں نے یا عرب قیافہ شناسوں نے در روایت

---

[1] طبقات ابنِ سعد، جلد اوّل۔

میں اختلاف ہے) یہ معلوم کر لیا کہ نبی آخر الزماں ہیں، اور یہی ہمارے آبائی کیش اور مذہب کو دنیا سے مٹائیں گے۔ یہ سمجھ کر انہوں نے آپؐ کو قتل کرنا چاہا یا دوسروں کو آپؐ کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ (روایت میں اختلاف ہے) ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حلیمہؓ آپؐ کو پہلے پہل مکہ معظمہ سے لے کر عکاظ کے میلہ میں آئیں وہاں قبیلۂ ہذیل کا ایک قیافہ شناس بڈھا تھا۔ عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس آتی تھیں اور فال نکلواتی تھیں۔ اس کی نظر جب آنحضرتؐ پر پڑی تو وہ چلا اٹھا کہ اس کو قتل کر ڈالو۔ مگر آپؐ لوگوں کی نظر سے غائب ہو چکے تھے۔ حلیمہؓ آپؐ کو لے کر چل دی تھیں۔ لوگوں نے بڈھے سے واقعہ پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی وہ بچہ دیکھا جو تمہارے اہل مذہب کو قتل کرے گا۔ اور تمہارے بتوں کو توڑے گا۔ اور وہ کامیاب ہوگا۔" اس کے بعد لوگوں نے آپؐ کو بہت ڈھونڈھا مگر آپؐ نہ ملے۔ حضرت حلیمہؓ نے اس کے بعد آپؐ کو پھر کسی قیافہ شناس اور فال دیکھنے والے کے سامنے پیش نہ کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد اس بڈھے کی عقل جاتی رہی اور وہ کفر ہی کی حالت میں مر گیا۔ دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت آمنہؓ نے حلیمہؓ کو کہہ دیا تھا کہ میرے بچہ کو یہودیوں سے بچائے رکھنا۔" اتفاق سے جب وہ آپؐ کو لے کر چلیں تو کچھ یہودی راستہ میں مل گئے۔ انہوں نے آپؐ کا حال سن کر ایک دوسرے سے کہا کہ "اس کو مار ڈالو۔" پھر انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ بچہ یتیم ہے؟ حلیمہؓ نے کہا "نہیں۔ میں اس کی ماں ہوں" اور اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ انہوں نے کہا کہ "اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اس کو قتل کر ڈالتے (یعنی آخری پیغمبر کی ایک علامت یتیمی بھی تھی اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ علامت بچہ میں پائی نہیں جاتی، اس سے ان کا یقین جاتا رہا۔)

یہ روایتیں[1] ابن سعد میں ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ پہلی روایتوں کا ماخذ واقدی کی داستانیں ہیں، اور اس پر بھی ان کے سلسلے ناتمام ہیں۔ آخری روایت کا سلسلہ یہ ہے۔ عمرو بن عاصم کلابی، ہمام بن یحییٰ، اسحاق بن عبداللہ، گو یہ تینوں عموماً ثقہ اصحاب ہیں۔ مگر ان کی یہ روایت موقوف ہے۔ یعنی آخری راوی اسحاق بن عبداللہ گو تابعی ہیں، مگر وہ کسی صحابی سے اس کا سُننا ظاہر نہیں کرتے۔ معلوم نہیں یہ روایت ان کو کہاں سے پہنچی؟

تقریباً اسی واقعہ کو ابونعیم نے دلائل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "حلیمہؓ جب آپؐ کو مکہ سے لے کر روانہ ہوئیں، تو ایک وادی میں پہنچ کر ان کو حبش کے کچھ لوگ ملے (جو غالباً عیسائی ہوں گے) حلیمہؓ ان کے ساتھ ہو گئیں۔ انہوں نے جب آنحضرتؐ کو دیکھا تو آپؐ کی نسبت کچھ دریافت کیا۔ اس کے بعد بہت غور سے انہوں نے آپؐ کو دیکھنا شروع کیا۔ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں جو مہر نبوت تھی، وہ دیکھی۔ آپؐ کی آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی، اس کو دیکھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ "کیا بچہ کی آنکھوں میں یہ سُرخی کسی بیماری سے ہے"؟ حلیمہؓ نے کہا "نہیں۔ یہ ہمیشہ سے اسی طرح ہے"۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم یہ پیغمبر ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے چاہا کہ بچہ کو حضرت حلیمہؓ سے چھین لیں۔ لیکن خدا نے آپؐ کی حفاظت کی"۔ ابونعیم کی اس روایت کا سلسلہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے، اور اس کے رُواۃ مجہول الحال لوگ ہیں۔

۲۵۔ کہتے ہیں کہ پیار اور محبت سے حضرت حلیمہؓ آپؐ کو دھوپ میں نکلنے نہیں

---

[1] طبقات ابن سعد جلد اوّل۔

دیتی تھیں۔ ایک دن آپؐ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں نکل پڑے۔ حلیمہؓ نے دیکھا تو لڑکی پر خفا ہوئیں۔ کہ تم دھوپ میں کیوں لے گئیں۔ لڑکی نے کہا" اماں جان میرے بھائی کو دھوپ نہیں لگتی۔ مَیں نے دیکھا کہ اس پر بادل سایہ کئے تھے۔ جدھر وہ جاتا تھا، وہ بھی چلتے تھے اور جہاں وہ رُک جاتا تھا، وہ بھی رُک جاتے تھے۔ اسی کیفیت سے وہ یہاں تک پہنچا ہے۔ ابنِ سعد نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ایک میں تو صرف واقدی کا حوالہ ہے اور اس کے آگے کوئی نام نہیں دیا ہے۔ اور دوسرے میں ہے کہ واقدی نے معاذ بن محمدؒ سے اور اس نے عطاء سے۔ اور صفائی نے حضرت ابنِ عباسؓ سے سُنا۔ ابنِ سعد کے علاوہ ابونعیم، ابنِ عساکر اور ابنِ طرماح نے بھی اسی سلسلہ سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، مگر اس سلسلہ میں واقدی کے علاوہ معاذ بن محمد مجہول اور نامعتبر ہے۔

یہاں تک تو ہم نے فضائل و معجزات کی غلط اور ضعیف روایتوں کی مسلسل تنقید کی ہے اگر اسی طرح ہم آخر تک نبھانا چاہیں تو یہ دفتر ان اوراق میں نہیں سما سکتا۔ اس لئے ہم صرف مشہور ترین روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں۔

۲۶۔ سب سے مشہور بحیرا راہب کا قصہ ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپؐ دس بارہ برس کے تھے تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ راہ میں ایک عیسائی خانقاہ ملی، جس میں بحیرا نام ایک راہب رہا کرتا تھا۔ اس نے آپؐ کو دیکھ کر اور علامتوں سے پہچان کر یہ جان لیا کہ پیغمبر آخر الزّمان اور سردارِ عالم یہی ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ ابر آپؐ پر سایہ افگن ہے۔ جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے ہیں، اس کی شاخیں آپؐ پر جھکی آتی ہیں۔ اُس نے آپؐ کی خاطر قافلہ کی دعوت کی اور ابو طالب سے با صرار کہا کہ اس بچّہ کو مکّہ واپس لے جاؤ۔ ورنہ رومی اگر اس کو پہچان گئے تو اس کو قتل کر ڈالیں گے۔ دشاید اس لئے کہ آپؐ کے

ہاتھوں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا) ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ رومیوں کا ایک گروہ پہنچ گیا۔ دریافت سے ظاہر ہوا کہ رومیوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے ظہور کا وقت آگیا ہے۔ اس لئے رومیوں نے تحقیقِ حال کے لئے ہر طرف اپنے دستے روانہ کئے ہیں۔ بُحیرا نے اُن سے کہا کہ "خدا کی تقدیر ٹل نہیں سکتی۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ"۔ وہ رُک گئے اور اُدھر ابو طالب نے آنحضرتؐ کو مکہ واپس بھیج دیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو آپؐ کے ساتھ کر دیا اور بُحیرا نے کیک اور ناشتہ آپؐ کے ساتھ کیا۔

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے۔ مگر ابنِ اسحاق اور ابنِ سعد وغیرہ کتبِ سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں اُن سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہُوئے ہیں۔ اِس قصّہ کا سب سے محفوظ طریقہ سند وہ ہے جس میں عبدالرحمان بن غزوان جو ابو نوح قراد کے نام سے مشہور ہے، یونس بن اسحٰق سے اور وہ ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابو موسیٰ اشعریؓ سے اِس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصّہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنّف ابنِ ابی شیبہ، دلائلِ بیہقی اور دلائلِ ابی نعیم میں مذکور ہے۔ ترمذی نے اس کو "حسن وغریب" اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں اس روایت پر پوری تنقید کی ہے اور عبدالرحمان بن غزوان کو اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ سند میں نہ صرف عبدالرحمٰن بن غزوان بلکہ دوسرے رُواۃ بھی جرح کے قابل ہیں۔

(۱) سب سے اوّل یہ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ مسلمان ہو کر ۷ھ ہجری میں یمن سے مدینہ آئے تھے اور یہ واقعہ اس سے پچاس برس پہلے کا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ نہ تو خود آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے اور نہ کسی اور شریکِ واقعہ کی زبان سے اپنا سُننا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔

(۲) اس واقعہ کو حضرت ابو موسیٰؓ سے ان کے صاحبزادے ابو بکر روایت کرتے ہیں۔ مگر اُن کی نسبت کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سُنی بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ناقدینِ فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے۔ امام ابنِ حنبل نے تو اس سے قطعی انکار کیا ہے۔ بنابریں یہ روایت منقطع ہے۔ اس کے سوا ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ "وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔"

(۳) ابو بکر سے یونس بن اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔ گو متعدد محدّثین نے اُن کی توثیق کی ہے تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ "ان میں سخت بے پروائی تھی"۔ شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا ہے۔ امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور "ایسی ویسی" کہتے ہیں۔ ابو حاتم کی رائے ہے۔ کہ وہ راست گو ہیں۔ لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجّت نہیں۔ ساجی کا قول ہے۔ کہ "وہ سچّے ہیں اور بعض محدّثین نے ان کو ضعیف کہا ہے"۔ ابو حاکم کا بیان ہے کہ اکثر ان کو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا۔

(۴) چوتھا راوی عبد الرحمٰن بن غزوان ہے۔ جس کا نام مستدرک اور ابو نعیم میں ابو نوح قراد ہے۔ اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔ تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے۔ ممالیک والی جھوٹی حدیث اُسی نے روایت کی ہے۔ ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ "اس نے

امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے۔" ابن حبان نے لکھا ہے کہ "وہ غلطیاں کرتا تھا۔ اور امام لیث اور مالک سے مسالیک والی حدیث نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔"

(۵) حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیرا راہب کا قصہ ہے۔ اس قصے کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے بلالؓ کو آپؐ کے ساتھ کر دیا۔ حالانکہ حضرت ابوبکرؓ اس وقت بچہ تھے اور حضرت بلالؓ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۶) حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔ حافظ ذہبی مستدرک کی تلخیص میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میں اس روایت کو بنایا ہوا خیال کرتا ہوں کیونکہ اس میں بعض واقعات غلط ہیں۔"[1]

(۷) امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ "یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں۔ اس لئے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

۲۷۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ دوسری دفعہ کے سفر شام میں جب آپؐ حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر بصریٰ تک تشریف لے گئے ہیں، بیان کیا جاتا ہے۔ آپؐ کے ساتھ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی تھا۔ اس کی زبانی روایت ہے کہ ہر جگہ ابر آپؐ پر سایہ افگن رہتا۔ کبھی فرشتے اپنے پروں کا سایہ کرتے تھے۔ ایک عیسائی خانقاہ کے

---

[1] مستدرک جلد دوم۔

قریب جہاں نسطورا راہب رہتا تھا، آپؐ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا۔ راہب نے یہ دیکھا تو میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ اس نے نام و نشان بتایا۔ راہب نے کہا کہ "اس درخت کے نیچے پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہرا ہے۔" پھر دریافت کیا کہ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ یہ سرخی رہتی ہے؟ غلام نے اثبات میں جواب دیا۔ راہب نے کہا "تو یہ یقیناً آخر زمانہ کا پیغمبر ہے۔ تم کبھی اس کی رفاقت نہ چھوڑنا" اسی درمیان میں ایک شخص سے خرید و فروخت میں کوئی جھگڑا پیش آیا۔ خریدار نے آپؐ سے کہا کہ "تم لات و عزیٰ کی قسم کھاؤ۔" آنحضرتؐ نے فرمایا "میں اُن کی قسم نہیں کھاتا۔" راہب نے میسرہ سے کہا "خدا کی قسم یہ پیغمبر ہے۔ اس کی صفتیں ہماری کتابوں میں لکھی ہیں"۔ میسرہ کا بیان ہے کہ جب دوپہر کی سخت دھوپ پڑتی تو دو فرشتے آپؐ پر سایہ کر لیتے۔ جب آپؐ تجارت سے فارغ ہو کر مکہ آ رہے تھے، اتفاق سے اُس وقت حضرت خدیجہؓ چند سہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کی نظر آپؐ پر پڑی کہ آپؐ اونٹ پر سوار ہیں اور دو فرشتے آپؐ پر سایہ افگن ہیں۔ انہوں نے یہ منظر اپنی سہیلیوں کو دکھایا اور میسرہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ میسرہ نے کہا پورے سفر میں یہی تماشا دیکھتا آیا ہوں اور اس کے بعد اس نے نسطورا راہب کی گفتگو بھی ان سے دہرائی۔

یہ واقعہ ابنِ اسحاق، ابنِ سعد، ابونعیم اور ابنِ عساکر میں ہے۔ ابنِ اسحاق میں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے۔ بقیہ کتابوں میں اس کی سند یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین واقدی سے اور واقدی موسیٰ بن شیبہ سے اور وہ عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب سے اور عمیرہ اُمّ سعد بنت کعب سے اور وہ یعلی بن منیہؓ صحابی کی بہن نفیسہ بنت منیہؓ سے جو صحابیہ تھیں، روایت کرتے ہیں۔ واقدی کی بے اعتباری تو محتاج بیان نہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ بن شیبہ کی نسبت امام ابنِ حنبل کہتے ہیں۔ احادیثہ مناکیر (اس حدیثیں منکر ہیں) عمیرہ

بنت ابن کعب اور اُمِ سعد کا حال نہیں معلوم۔

ابن اسحاق، ابن سعد، بیہقی اور ابونعیم میں ہے کہ قریش نے جب بنو ہاشم کا مقاطعہ کر کے شعبِ ابی طالب میں محصور کیا، اور باہم ایک معاہدہ مرتب کر کے خانۂ کعبہ میں رکھ دیا تو چند سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیمک کو بھیجا، جس نے کاغذ کو کھا لیا۔ ایک روایت میں ہے کہ خدا کا نام چھوڑ کر باقی عبارت کو جس میں بنو ہاشم کے مقاطعہ کا عہد تھا' اس نے کھا لیا تھا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ خدا کا نام کھا لیا تھا اور بقیہ عبارت چھوڑ دی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو اس واقعہ سے مطلع فرمایا۔ آنحضرتؐ نے ابوطالب سے اس کا ذکر کیا۔ ابوطالب نے قریش کو اس کی خبر کی اور بالآخر اِس واقعہ کے جھوٹ اور سچ ہونے پر معاہدہ باقی رہنے یا ٹوٹ جانے کا فیصلہ قرار پایا۔ کفار نے جب کاغذ کو اُتار کر دیکھا تو آنحضرتؐ کے قول کی تصدیق ہوگئی۔

ابن اسحاق کی روایت بے سند ہے۔ بقیہ تمام روایتیں یا واقدی اور ابن لہیعہ سے ہیں جن کا اعتبار نہیں اور یا ثقات سے ہیں، تو وہ تمام تر مرسل ہیں۔ ان مرسل روایتوں میں اگر کوئی بہتر روایت ہے تو وہ بیہقی میں موسیٰ بن عقبہ کی ہے جو امام زہری سے اس کو روایت کرتے ہیں، مگر وہ زہری تک پہنچ کر رہ جاتی ہے، کسی صحابی تک نہیں پہنچتی۔

۲۹۔ مشہور ہے کہ ہجرت میں جب آپؐ نے غارِ ثور میں پناہ لی تو خدا کے حکم سے فوراً غار کے مُنہ پر بنولے یا ببول کا درخت اُگ آیا، جس کی ڈالیاں پھیل کر چھا گئیں۔ کبوتر کے ایک جوڑے نے آکر وہاں انڈے دے دیئے اور مکڑی نے جالے تن دیئے، تاکہ مشرکین کو آنحضرتؐ کے اس کے اندر ہونے کا گمان نہ ہو۔ درخت کے اُگنے، کبوتر کے انڈے دینے مکڑی کے جالا تننے، ان تینوں کا ذکر صرف ابومصعب مکی کی روایت میں ہے۔ بقیہ روایتوں میں صرف کبوتروں کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے کا بیان ہے۔ بہرحال یہ واقعہ

کتبِ سیر میں ابنِ اسحاق، ابنِ سعد، دلائلِ بیہقی اور ابونعیم میں اور کتبِ حدیث میں سے ابنِ مردویہ اور بزار میں ہے۔ ابنِ مردویہ، بزار اور بیہقی میں جو روایت ہے، نیز ابنِ سعد اور ابو نعیم کی ایک روایت، ابومصعب مکی سے ہے۔ جو متعدد صحابہ سے اس واقعہ کا سُننا ظاہر کرتا ہے۔ ابومصعب سے عون بن عمرو القیسی اس کی روایت کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں صاحب پایۂ اعتبار سے گرے ہُوئے ہیں۔ ابومصعب مکی مجہول ہے اور عون بن عمرو کی نسبت ابنِ معین کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ "منکر الحدیث اور مجہول ہے"۔ ابونعیم میں عون بن عمرو کے بجائے عوین بن عمرو القیسی لکھا ہے۔ یہ عوین بن عمرو بھی بے اعتبار ہے۔ عقیلی نے اس کا ضعفاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اس کی روایتوں کی تصدیق نہیں ہوتی" اور اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ ابومصعب مجہول ہے[1]

استاذ مرحوم نے سیرت جلد اوّل واقعۂ ہجرت میں صرف ابومصعب کی روایت پر تنقید کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ابومصعب کے علاوہ اور دوسرے سلسلوں سے بھی یہ مروی ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے ایک اور طریقہ سے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔ مگر اس روایت کا سرِ سلسلہ واقدی ہے، جس نے متعدد روایتوں کو یکجا کرکے ان کی ایک مشترک روایتِ ہجرت تیار کی ہے۔ اِس واقعہ کی بہترین روایت وہ ہے جو مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

فمروا بالغار فرأوا علی بابہ نسج	کفار آپؐ کی تلاش میں غار کے مُنہ
العنکبوت فقالوا لو دخل ھٰھنا	تک پہنچ گئے۔ دیکھا کہ مُنہ پر مکڑی

---

[1] دیکھو لسان المیزان ترجمہ ابومصعب مکی و عون بن عمرو اور میزان الاعتدال ترجمہ عون بن عمرو اور عوین بن عمرو۔

لم یکن نسبہ العنکبوت علیٰ بابہ۔

کے جال ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر محمد اس کے اندر جاتے تو یہ جال نہ ہوتے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد اوّل)

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ اس روایت کی بنا پر اس کو تائیدات میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ روایت بھی قوی نہیں۔ اس کے راوی مقسم ہیں۔ جو اپنے کو مولیٰ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں۔ اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے۔ مقسم کی اگرچہ متعدد محدثین نے توثیق کی ہے۔ اور امام بخاریؒ نے صحیح میں ان سے حجامت کی روایت نقل کی ہے۔ مگر وہ خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے۔ ساجی نے لکھا ہے کہ لوگوں نے ان کی روایت میں کلام کیا ہے"۔ ابنِ حزم نے لکھا ہے کہ "وہ قوی نہیں"۔ اور عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو بن ساج الجزری ہے اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے مشہور ہے، گو ابنِ حبان نے اپنے مشہور تساہل کی بنا پر اُس کو ثقات میں داخل کیا ہے مگر محدث ابو حاتم کہتے ہیں کہ "اس کی حدیث لکھی جائے۔ حجت میں پیش نہ کی جائے"۔ علامہ ذہبی میزان میں اور حافظ ابن حجر نے لسان میں صرف ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے۔

۳۰۔ روایتوں میں ہے کہ اسی سفر میں راہ میں ایک جگہ بکریوں کے ایک چرواہے سے آپؐ نے دودھ طلب کیا۔ اس نے معذرت کی کہ کوئی دودھ والی بکری نہیں۔ لیکن آپؐ نے اس کی اجازت سے ایک دودھ والی بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا۔ فوراً دودھ نکل آیا۔ چنانچہ سب نے دودھ پیا۔ چرواہا یہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

لم یکن نسبہ العنکبوت علیٰ بابہ۔

کے جال ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر محمد اس کے اندر جاتے تو یہ جال نہ ہوتے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد اوّل)

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ اس روایت کی بنا پر اس کو تائیدات میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ روایت بھی قوی نہیں۔ اس کے راوی مقسم ہیں۔ جو اپنے کو مولیٰ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں۔ اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے۔ مقسم کی اگرچہ متعدد محدثین نے توثیق کی ہے۔ اور امام بخاریؒ نے صحیح میں ان سے حجامت کی روایت نقل کی ہے۔ مگر وہ خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے۔ ساجی نے لکھا ہے کہ لوگوں نے ان کی روایت میں کلام کیا ہے"۔ ابنِ حزم نے لکھا ہے کہ "وہ قوی نہیں"۔ اور عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو بن ساج الجزری ہے اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے مشہور ہے، گو ابنِ حبان نے اپنے مشہور تساہل کی بنا پر اُس کو ثقات میں داخل کیا ہے مگر محدث ابو حاتم کہتے ہیں کہ "اس کی حدیث لکھی جائے۔ حجت میں پیش نہ کی جائے"۔ علامہ ذہبی میزان میں اور حافظ ابن حجر نے لسان میں صرف ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے۔

۳۰۔ روایتوں میں ہے کہ اسی سفر میں راہ میں ایک جگہ بکریوں کے ایک چرواہے سے آپؐ نے دودھ طلب کیا۔ اس نے معذرت کی کہ کوئی دودھ والی بکری نہیں۔ لیکن آپؐ نے اس کی اجازت سے ایک دودھ والی بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا۔ فوراً دودھ نکل آیا۔ چنانچہ سب نے دودھ پیا۔ چرواہا یہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ چرواہا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ لیکن عام معجزات کے تحت میں ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا واقعہ زمانۂ ہجرت کا نہیں، بلکہ وہ کسی اور زمانہ کا ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا واقعہ مسند طیالسی اور مسند احمد میں خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی صحیح روایات کے ساتھ مذکور ہے۔ مسندِ ابویعلی، مستدرک حاکم، اور طبرانی میں بجائے عبداللہ بن مسعودؓ کے صرف "عبد" یعنی ایک غلام کا ذکر ہے جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ صحابہؓ میں سے اس کے راوی قیس بن نعمان سکونیؓ ہیں۔ یہ صرف ایک دفعہ ایک وفد کے ساتھ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے صرف یہی ایک روایت مروی ہے۔ بعضوں نے ان سے ایک اور روایت ہدیہ کی بھی نقل کی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ شریکِ واقعہ نہ تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ کس سے سُنا؟ معلوم نہیں اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔ اس کے ایک راوی عبیداللہ بن ایاد بن لقیط کی گو اوروں نے توثیق ہے، مگر بزار نے لکھا ہے کہ "وہ قوی نہیں"۔ تاہم ذہبی نے تلخیص مستدرک[1] میں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ (ترجمہ قیس بن نعمان سکونیؓ) میں اس کو صحیح کہا ہے، مگر یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ خود حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جو واقعۂ ہجرت کی مفصل روایت صحیحین میں ہے، اس میں ایک غلام کے بکری کے دودھ پلانے کا واقعہ مذکور ہے۔ مگر اس معجزہ کا وہاں نام و نشان بھی نہیں۔

ہجرت کے موقع پر بے دودھ والی بکری کے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جانے کا مشہور ترین معجزہ اُمِّ معبد کے خیمہ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کی راہ میں قبیلۂ خزاعہ کے ایک خاندان کا میدان میں خیمہ تھا۔ اُمِّ معبد اور ابومعبد میاں بیوی اس خیمہ میں رہتے تھے۔

---

[1] مستدرک جلد سوم۔

اور مسافروں کو آرام پہنچایا کرتے تھے۔ بکریوں کی پرورش پر ان کا گذارہ تھا۔ صبح کو ابو معبد تمام اچھی اور دودھ والی بکریاں لے کر چراگاہ کو نکل گیا تھا۔ صرف بے دودھ والی دُبلی بکریاں خیمہ میں رہ گئی تھیں۔ اتنے میں آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکرؓ کا اُدھر سے گذر ہوا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں آپؐ نے بقیمت طلب کیں، جو نہیں ملیں۔ خیمہ کے ایک گوشہ میں ایک بکری نظر آئی۔ آپؐ نے پوچھا کہ اُمِّ معبد یہ بکری کیسی ہے؟ اس نے کہا یہ لاغری سے بکریوں کے ساتھ نہ جا سکی۔ پھر فرمایا کہ اس کے کچھ دودھ ہے؟ جواب دیا، یہ دودھ سے معذور ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ امسال خشک سالی تھی اور لوگ قحط میں مبتلا تھے۔" فرمایا کہ مجھے اس کے دوہنے کی اجازت ہے۔؟ عرض کی میرے ماں باپ قربان اگر اس کے دودھ ہو تو دودھ لیجئے۔ آپؐ نے دُعا فرمائی اور پھر بسم اللہ کہہ کر تھن میں ہاتھ لگایا، فوراً اس کے تھنوں میں دودھ اُتر آیا۔ دودھ سب نے پی لیا۔ اور کچھ بچ گیا۔ اور قافلۂ نبویؐ آگے روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ابو معبد آیا۔ دیکھا کہ گھر میں دودھ رکھا ہے۔ تعجب سے پوچھا۔ یہ دودھ کہاں سے آیا؟ بکریاں تو سب میرے ساتھ تھیں۔ اُمِّ معبد نے سارا قصہ بیان کیا۔ ابو معبد نے کہا ذرا اس شخص کی صورت و شکل بیان کرو۔ اُمِّ معبد نے نہایت تفصیل سے آپؐ کے حُسن و جمال اور شکل و شمائل کی تصویر کھینچی جس کو سُن کر ابو معبد نے کہا یہ تو خدا کی قسم قریش والا آدمی معلوم ہوتا ہے، جس کا کچھ حال میں سُن چکا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ مجھے اس کی صحبت میسّر ہوتی اور جب انشاء اللہ موقع مِل گیا میں یہ کروں گا۔ اسی وقت مکّہ میں کچھ اشعار غیب سے سُنے گئے۔ یہ اشعار بھی روایت میں ہیں۔ ان اشعار میں اُمِّ معبد کے اسی واقعہ کا بیان ہے۔ حضرت حسانؓ نے جب ہاتف کی یہ آواز سُنی تو ان اشعار کے جواب میں یہ اشعار کہے۔ (یہ جوابی اشعار بھی روایت میں مذکور ہیں۔)

یہ روایت بغوی، ابنِ شاہین، ابن سکن، ابنِ مندہ، طبرانی، بیہقی، ابونعیم اور حاکم میں اُمِ معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی مذکور ہے اور حاکم نے نہ صرف یہ کہ اس کو صحیح کہا ہے۔ بلکہ اور دیگر طریقوں سے بھی اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر معلوم ہے کہ حاکم کے صحیح کہنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کردی ہے کہ اُن میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کی شرائط کے مطابق نہیں۔ حافظ ذہبی نے مجملاً اسی قدر لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے یہ روایت حاکم کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اس سلسلۂ سند سے مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ حزام اپنے باپ ہشام سے اور ہشام اپنے باپ حبیش بن خالد خزاعی سے ناقل ہیں۔ حزام مجہول ہیں۔ حبیش بن خالد سے صرف یہی ایک روایت تمام کتب حدیث میں مذکور ہے۔ حبیش اصل واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے کس سے سُنا۔ اس لئے یہ روایت اگر ثابت بھی ہو تو مرسل ہے۔ حاکم نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ایک انہی حزام اور ہشام بن حبیش کے ذریعہ سے اور دوسرے حرّ بن صباح سے اور وہ اُمِ معبد کے شوہر ابو معبد سے راوی ہیں۔ پہلے طریقہ میں حاکم نے یہ کمال کیا ہے کہ حبیش کے بجائے خود ہشام ابن حبیش بن خویلد (بجائے خالد) کو اصل راوی اور صحابی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے روایت کا ارسال اور بڑھ گیا۔ ہشام کا صحابی ہونا بھی مشکوک ہے۔ دوسرے طریقہ میں حرّ بن صباح گو ثقہ ہیں۔ مگر ابو معبد سے ان کی سماعت ثابت نہیں۔ چنانچہ ابنِ حجر نے تہذیب میں لکھا ہے کہ حرّ ابو معبد سے مرسل روایتیں کرتے ہیں۔ یہ تو ان تمام روایتوں کے اوپر کے راویوں کا حال ہے۔ نیچے کے راویوں میں اکثر مجہول لوگ ہیں۔ حرّ والی روایت میں نیچے ایک شخص محمد بن بشر سکری ہے۔ جس کو ازدی نے منکر الحدیث اور ابنِ عدی نے واہی کہا ہے[1] ابونعیم نے دلائل میں ایک

---

[1] لسان المیزان، ترجمہ محمد بن بشر بن ابان السکری۔

اور صحابی سلیط ابو سلیمان انصاریؓ بدری سے اس کی روایت کی ہے۔ سلیطؓ سے ان کے بیٹے سلیمان اور ان سے ان کے بیٹے محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری روایت کرتے ہیں۔ لیکن ان سلیط کا نام صرف اسی روایت کے راوی کی حیثیت سے بعض مؤلفینِ سیر صحابہؓ نے کیا ہے۔ ورنہ ان کا کوئی حال ہم کو معلوم نہیں۔ سلیط انصاری بدریؓ جو مشہور ہیں، وہ سلیط بن قیس انصاری خزرجی بدریؓ ہیں۔ ان کے بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ جن سے گو نسل چلی نہیں۔ لیکن ان سے روایت نسائی میں موجود ہے۔ مگر سلیط ابو سلیمان انصاری بدریؓ سے کوئی روایت اس کے سوا موجود نہیں۔ اسی لئے اسما و رجالِ صحابہؓ کے مؤلفین میں سے بعض نے ان کو اور سلیط بن قیس انصاری بدریؓ کو ایک سمجھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سلیمان ان کے بیٹے اور محمد ان کے پوتے کا نام نہ تھا۔ اور اگر دو ہیں تو اصحابِ بدر کے نام سب گنے ہوئے ہیں۔ ان میں سلیط بن قیس خزرجی کے سوا کوئی دوسرا سلیط نام نہیں۔ پھر یہ مدینہ کے باشندہ تھے اور اُمِّ معبد قبیلہ خزاعہ کی تھی، جو مکہ اور مدینہ کے بیچ میں آباد تھا۔ معلوم نہیں کہ سلیط انصاری نے کس سے سُنا؟ پھر اُن کے بیٹے سلیمان اور پوتے محمد سے ہم کو کوئی واقفیت نہیں۔ حافظ ابن حجر لسان المیزان میں محمد بن سلیط انصاری کے تحت میں لکھتے ہیں۔

"قال العقیلی مجهول بالنقل روی عن ابیه عن جده فذکر قصة ام معبد.... وهو واه و قال لیس هذا الطریق محفوظا فی حدیث ام معبد.... قال ابن منده مجهول"

علاوہ ازیں ان روایتوں کے الفاظ اُمِّ معبد اور آنحضرتؐ کے باہم طرزِ تخاطب اور اشعار کی زبان اور ابو معبد کی گفتگو میں ایک خاص غرابت ہے۔ جس کو ناقدینِ

حدیث اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہاتفِ غیب نے تو اشعارِ مکہ میں لوگوں کو سُنائے اور حسانؓ نے جو ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، مدینہ میں بیٹھے بیٹھے ان کا جواب کہا۔ ہجرت کے سال میں مکہ کے آس پاس قحط کا پڑنا اور خشک سالی ہونا بھی ثابت نہیں۔

مجھے ہجرت کے موقع پر ان دودھ والی روایتوں کے تسلیم کرنے میں اس لئے بھی پس وپیش ہے کہ ہجرت کے رفیقِ سفر حضرت ابوبکرؓ سے واقعاتِ ہجرت کی جو روایت صحیح بخاری میں مذکور ہے، اس میں ایک جگہ ایک چرواہے سے دودھ مانگ کر پینے کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس معجزہ کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرؓ کی زبانی یہ قصہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔ "دفعتہً ایک چرواہا نظر آیا۔ جو اپنی بکریوں کو ہانکے لئے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، تم کس کے غلام ہو؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو میں جانتا تھا۔ پھر میں نے کہا تمہاری بکریوں کے دودھ ہے؟ اُس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن جھاڑ کر پیالہ میں دودھ تو دوہو۔ اس نے دوہا تو میں آنحضرتؐ کے لئے ایک برتن میں رکھ کر اور تھوڑا پانی ملا کر کہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے، آپؐ کے پاس لایا۔ آپؐ نے نوش فرمایا۔[1]"

مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کی ایک اجتماعی زندگی شروع ہو گئی تھی اور خلوت وجلوت میں ہر موقع پر جان نثاروں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس لیئے آپؐ کے واقعات وسوانح کا ایک ایک حرف پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر اس زمانہ کے دلائل ومعجزات زیادہ محفوظ طریقہ سے احادیث میں مذکور ہیں اور اس عہد کے متعلق جو غلط اور

---

[1] صحیح بخاری، باب مناقب المہاجرین۔

اور مشتبہ روایات بعد کو پیدا ہوئی ہیں، محدثین نے موضوعات میں علانیہ ان کی پردہ دری کردی ہے[1] اس لئے فن موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں اِن کی تفصیل موجود ہے، مثلاً

۱۔ وہ تمام روایتیں جن میں آنحضرتؐ کے معجزہ سے حضرت آمنہؓ یا کسی اور مُردہ کے زندہ ہونے کا بیان ہے، وہ سب جھوٹی اور بنائی ہوئی ہیں۔

۲۔ وہ معجزے جن میں گدھے، اونٹ، بکری، ہرن، گوہ، بھیڑیئے شیر وغیرہ جانوروں کے انسانوں کی طرح بولنے یا کلمہ پڑھنے کا ذِکر ہے، بروایتِ صحیحہ ثابت نہیں ہیں[2]۔

۳۔ ایسی روایتیں جن میں آنحضرتؐ کے لئے آسمان سے خوان نعمت یا جنّت سے میووں کے آنے کا ذکر ہے موضوع ہیں، یا ضعیف ہیں[3]۔

۴۔ وہ روایتیں جن میں حضرت خضر یا الیاس علیہما السلام سے ملنے یا اُن کے سلام و پیام

---

[1] علامہ زرقانی نے شرحِ مواہب لدنیہ کی پانچویں جلد میں ان روایتوں کو مع تنقید کے جمع کردیا ہے۔

[2] یعنی ضعیف روایتوں میں گویہ آیا ہے، لیکن ان کو صحیح کا درجہ حاصل نہیں۔ اِن روایتوں میں سے ایک بھیڑیئے کے بولنے کا قصہ زیادہ مشہور ہے جو دلائلِ بیہقی، مسند احمد، حاکم اور ترمذی میں بطرقِ متعددہ مذکور ہے۔ جن میں سب سے قوی حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور ذہبی نے بشرطِ مسلم کہا ہے (مستدرک جلد چہارم) لیکن امام بخاری نے کہا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں (زرقانی علی المواہب جلد پنجم)

[3] اس قسم کی ایک روایت مسند احمد (جلد چہارم) دارمی، نسائی، حاکم، بزار، ابویعلی اور طبرانی میں سلمہ بن نفیل سکونی سے مروی ہے۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ لیکن ذہبی نے اس کے استدراک میں اس کو سند صحیح کہا ہے۔ لیکن غرائب صحاح میں قرار دیا ہے (مستدرک حاکم، جلد چہارم و خصائص کبریٰ سیوطی، جلد دوم)

بھیجنے کا بیان ہے صحت سے خالی ہیں۔

۵۔ عوام میں مشہور ہے کہ آنحضرتؐ کے سایہ نہ تھا۔ لیکن یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔

۶۔ روایت ہے کہ آپؐ قضائے حاجت سے واپس آتے تھے تو وہاں کوئی نجاست باقی نہیں رہتی تھی۔ یہ سرتاپا موضوع ہے۔

۷۔ واعظوں میں مشہور ہے کہ ابوجہل کی فرمائش سے اس کے ہاتھ کی کنکریاں آنحضرتؐ کے معجزہ سے کلمہ پڑھنے لگیں۔ لیکن یہ ثابت نہیں۔

۸۔ وہ تمام حکایات جن سے ہماری زبان میں کتب وفات نامہ اور ہرنی نامہ ترتیب پائی ہیں۔ تمام تر جھوٹی ہیں۔

۹۔ ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ ایک دفعہ حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے۔ آفتاب ڈوب رہا تھا اور نماز عصر کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ نے ادباً آپؐ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ جب آفتاب ڈوب گیا تو دفعتہً آپؐ بیدار ہوئے اور دریافت فرمایا کہ تم نے نماز پڑھی؟ عرض کی نہیں۔ آپ نے دعا کی، فوراً آفتاب لوٹ کر نکل آیا۔ یہ روایت بھی صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے۔[1]

---

[1] بعض علمائے اہل سنت مثلاً قاضی عیاض، ابوحفص طحاوی اور عام علمائے روافض نے اس روایت کے ضعف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر عام ائمہ رجال کا رجحان اس روایت کے موضوع یا کم از کم ضعیف ہونے کی طرف ہے۔ ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ کہ ہمارے استاذ نے اور امام ذہبی نے بھی اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے۔

(البدایہ والنہایہ، جلد ششم)

ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ کا چہرۂ مبارک اس قدر روشن تھا کہ اندھیرے میں آپؐ جاتے تھے تو اجالا ہو جاتا۔ چنانچہ ایک دفعہ رات کو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ سے سُوئی گر گئی۔ تلاش کی نہیں ملی۔ دفعتہً آپؐ تشریف لے آئے تو چہرۂ مبارک کی روشنی میں سُوئی چمک اُٹھی اور مل گئی۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔

گو ان میں سے بعض روایتوں کو اہلِ سیر اور مصنفین نے فضائلِ نبویؐ میں اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ مگر اِس سے اُن کی صحّت ثابت نہیں ہوتی اور اگر ان میں کوئی روایت سنداً صحیح ثابت ہو جائے تو اس خاکسار ہیچمدان کو اس کے قبول میں کوئی عُذر نہیں۔ وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔

ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبویؐ میں کلام نہیں ہے۔ بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کی جاوے وہ ہر طرح صحیح ہو۔[1]

---

[1] اس کتاب کی تصنیف کے برسوں بعد حافظ ابنِ کثیر کی کتاب البدایہ والنہایہ مصر سے چھپ کر آئی ہے۔ جو سیرت پر بڑی مفصّل کتاب ہے۔ اس کی چھٹی جلد میں حافظ موصوف نے معجزاتِ نبویہؐ کی ہر قسم کی روایتوں کو جمع کر دیا ہے اور ان پر کلام بھی کیا ہے۔ اور اُن کے اسناد کی جرح و تعدیل بھی کی ہے۔ اہلِ تحقیق حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں۔

بشارات

يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ (الاعراف: ۱۵۷)

(جس پیغمبر کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)

یہود و نصاریٰ میں بشارات کی اہمیت

یہود و نصاریٰ میں یہ خیال ہے کہ کسی پیغمبر کا دعوائے نبوت اس وقت تک مسلّم نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ پہلے پیغمبروں نے اس کی آمد کی پیشین گوئی کی ہے۔ اور جو اس کی نشانیاں بتائی ہیں وہ مدعیٔ نبوت میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی نبوّت کو بھی وہ اسی معیار پر پرکھتے تھے اور بہت سے یہود و نصاریٰ جن کو اس معیار سے تشفّی کی دولت حاصل ہوئی، وہ علی الاعلان ایمان لائے اور جو اپنی کمزوری سے اپنے ایمان کا اعلان نہ کر سکے، اُنہوں نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا۔ لیکن جن کے قلوب عناد و تعصّب کے گرد و غبار سے تیرہ و تار تھے۔ وہ اس ظُلمت سے باہر نہ آسکے اور آبِ حیات کا سرچشمہ ان کے ہاتھ نہ آسکا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا قرآن میں

آنحضرتؐ نے صحابہؓ کے جواب میں فرمایا ہے کہ "میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام

کی دُعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں[1]۔ اس اجمال کی تفصیل[2] یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام نے جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پائی تو مقدس باپ بیٹوں نے مل کر دُعا مانگی کہ ہماری اولاد میں ایک پیغمبر اس سرزمین پر مبعوث ہو:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	اور یاد کرو جب ابراہیمؑ کے پروردگار
فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ	نے ابراہیمؑ کا چند باتوں میں امتحان لیا۔
لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ	پس ابراہیمؑ نے ان کو پورا کیا۔ خدا نے
قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ	کہا کہ اے ابراہیمؑ میں تم کو لوگوں کا پیشوا
اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ	بناؤں گا۔ ابراہیمؑ نے کہا اور میری اولاد
وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ	میں سے؟ خدا نے کہا میرا وعدہ گناہگار
اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى	نہ پائیں گے۔ اور یاد کرو جب ہم نے خانۂ
اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا	کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور مامن بنایا اور
بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَ	حکم دیا کہ ابراہیمؑ کی قیام گاہ کو
الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ	نماز کی جگہ مقرر کرو اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو
اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا	فرمایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور
اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ	رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک
مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	صاف کرو۔ اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے
الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ	دُعا کی کہ میرے پروردگار! اس (مکہ) کو

---

[1] مستدرک حاکم جلد دوم، فضائل نبویؐ ابنِ سعد جزو اوّل [2] صفحات ذیل میں صرف ان ہی بشارات سے بحث ہے جن کے حوالے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔

قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ
النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ وَاِذْ
يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ
الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ
يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ○

(البقرۃ: ۱۲۴ - ۱۲۹)

امن کا شہر بنا اور اِس کے رہنے والوں
میں سے جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتے
تھے، اُن کو پھل روزی دے۔ خُدا نے
کہا جو ان میں سے خدا کا مُنکر ہو گا، اس کو
بھی ہم دنیا کی چند روزہ زندگی میں بہرہ مند
کریں گے۔ پھر اس کو مجبور کر کے عذاب
دوزخ میں لے جائیں گے اور وہ بہت بُرا
ٹھکانا ہے اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ
خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھ رہے تھے تو انہوں نے دُعا کی
خداوندا! ہماری یہ خدمت قبول کر، تو ہی دُعا کا
سُننے والا ہے، نیتوں کا جاننے والا ہے۔
خداوندا! ہم کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری نسل
میں بھی ایک گروہ اپنے فرمانبرداروں کا پیدا
کر اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے سکھا۔
ہم سے درگذر کر تو ہی بڑا درگذر کرنے والا مہربان
ہے۔ خداوندا! ان ہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث
کر جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سُنائے اور کتاب
اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے تو غالب
اور حکمت والا ہے۔

ان آیات میں تصریح یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے مل کر خدا کے حضور میں دُعا کی کہ اس شہر میں ہماری نسل سے ایک پیغمبر مبعوث فرما۔ چونکہ مقامِ بعثت مکہ مقرر کیا گیا اور دُعا میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بھی شرکت تھی۔ اس لئے اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس دُعا کا مقصود یہ تھا کہ یہ پیغمبر نسلِ اسمٰعیلؑ سے ہوگا اور مکہ میں اس کی بعثت ہوگی۔

حضرت ابراہیمؑ کی دُعا توراۃ میں | موجودہ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۶ کے آخر اور باب ۱۷ کے اوّل میں بھی کچھ اس کے اشارات پائے جاتے ہیں:

> اور ہاجرہ ابراہیمؑ کے لئے بیٹا جنی اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیلؑ (خدا نے دُعا سُنی) رکھّا۔ (پیدائش: ۱۶: ۱۵)

> جب ابراہیم ننانوے برس کا ہُوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اُس نے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں۔ تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا۔ تب ابرام منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہم کلام ہو کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں ہوں۔ تیرا عہد میرے ساتھ ہے۔ اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا۔ بلکہ تیرا نام ابرہامؑ ہوگا۔ کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا اور میں تجھے بہت پھل دوں گا اور قومیں تجھ سے پیدا ہوں گی اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے۔ اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خُدا ہوں گا اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، دیتا ہوں، کہ

ہمیشہ کے لئے ملک ہو اور میں ان کا خدا ہوں گا۔" (پیدائش ۱۷: ۱ تا ۸)

خدا کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ عہد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ہی اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت سے پہلے ہوتا ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بشارت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے ہے۔ اسحٰق علیہ السلام کے لئے نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہم ہوا کہ اس نئی بشارت سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام زندہ نہ رہیں گے اور وہ عہدِ اسحٰق علیہ السلام کے ساتھ پورا ہوگا۔ فوراً بارگاہِ الٰہی میں عرض کی:۔

"کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔" (پیدائش ۱۷۔ ۱۸)

خدا نے جواب دیا:

"اور اسمٰعیلؑ کے حق میں میں نے تیری سُنی۔ دیکھ میں اُسے برکت دوں گا۔ اور اُسے بارور کروں گا۔ اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے۔ اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔" (پیدائش ۱۷: ۲۰)

حضرت ہاجرہؑ جب حاملہ ہونے کے بعد حضرت سارہؑ سے خفا ہو کر بیر سبع چلی گئیں تو فرشتہ نے آواز دی: "میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی" اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ "تو بیٹا جنے گی۔ اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھنا کہ خدا نے تیرا دُکھ سُن لیا۔" (پیدائش ۱۶: ۱۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہ السلام کو فاران (مکہ) کے بیابان میں رخصت کیا اور مشکیزہ کا پانی چک گیا اور حضرت ہاجرہؑ نے گریہ و زاری شروع کی

"تب خدا نے اس لڑکے (اسمٰعیلؑ) کی آواز سُنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہؑ کو پکارا۔ اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہؑ تجھ کو کیا ہوا۔ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سُنی۔ اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ مَیں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں (بیر زمزم) دیکھا..... خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑھا اور بیابان (عرب[1]) میں رہا..... اور وہ فاران کے بیابان[2] میں رہا۔" (پیدائش ۲۱، ۱۷ تا ۲۱)

موجودہ توراۃ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش اور اِن کی نسل کی برومندی، کثرت اور برکت اور ان کی نسل کے بارہ سرداروں کے پیدا ہونے کی بشارتیں مذکور ہیں اور ان سے قرآن مجید کے بیان کردہ دُعائے ابراہیمی اور عہدِ الٰہی کی تائید ہوتی ہے۔ الغرض اسی لئے روایات میں ہے کہ آنحضرتؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "میں تمہیں بتاؤں کیا ہوں۔ اَنَا دَعْوَۃُ اَبِیْ اِبْرَاھِیْمَ (مَیں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دُعا ہوں[3])

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل میں جس رسول کے پیدا ہونے کی دُعا مانگی تھی اس کے اوصاف یہ گنائے تھے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا	اے ہمارے خداوند! ان میں (یعنی
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ	اسمٰعیلؑ کی اولاد میں) ایک پیغمبر کو مبعوث
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ	کرنا جو ان کو تیرے احکام پڑھ کر سُنائے
يُزَكِّيهِمْ ط	اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور

[1] عرب کے لفظی معنی بیابان کے ہیں۔ [2] قرآن مجید نے اس کو وادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (بن کھیتی کے میدان) سے تعبیر کیا ہے۔ [3] طبقات ابنِ سعد و مستدرک حاکم۔

(البقرۃ : ۱۲۹) ان کو پاک و صاف کردے۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر آنحضرتؐ کے یہی اوصاف ظاہر کئے ہیں:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ

(الجمعۃ : ۲)

اُسی خدا نے اَن پڑھوں میں انہی کی قوم سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کو خدا کے احکام پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ

(اٰل عمران : ۱۶۴)

خدا نے مومنوں پر یقیناً یہ احسان کیا کہ ان میں ایک پیغمبر خود انہی کی قوم سے مبعوث کیا جو ان کو خدا کے احکام سُناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس سے یہ اشارہ صاف واضح ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کا وجودِ مبارک دُعائے ابراہیمی کی قبولیت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آنحضرتؐ کی جو بشارت دی ہے وہ اس سے بھی زیادہ صاف صاف ہے:

وَاِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ

اور جب عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا قاصد

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ	بن کر اور مجھ سے پہلے جو توراۃ آئی میں اس
التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ	کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد احمد نام
مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ	ایک پیغمبر کی خوشخبری لے کر آیا ہوں۔

(الصف : ۶)

انجیل یوحنا باب ۱۴ میں ایک آنے والے کی بشارت ان الفاظ میں ہے :۔

" اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا "فارقلیط" بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔" (۱۴-۱۶)

آگے بڑھ کر پھر ہے :

" لیکن وہ " فارقلیط " جو روح القدس ہے، جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا۔ اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے کہی ہیں۔ تمہیں یاد دلائے گا۔ (۱۴-۲۰)

اسی انجیل کے باب ۱۵-۲۶ میں ہے :۔

" پر جب وہ " فارقلیط " جسے میں تمہارے لئے باپ کی طرف سے بھیجوں گا۔ یعنی سچائی کی روح جو باپ سے نکلتی ہے تو وہ میرے لئے گواہی دے گا۔"

اسی انجیل کے باب ۱۶-۷ میں ہے :۔

" لیکن میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں " تو فارقلیط " تمہارے پاس نہ آئے گا۔ پر اگر میں جاؤں تو میں اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آن کر دنیا کو گناہ سے، راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھیرائے گا۔ گناہ سے اس لئے اس کو جہاں کے سردار پر حکم کیا گیا ہے میری

اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم اُن کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی بات بتائے گی۔ اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی۔ لیکن جو کچھ وہ سُنے گی سو کہے گی۔ اور تمہیں آئندہ کی خبر دے گی۔ وہ میری بزرگی کرے گی، اس لئے کہ وہ میری چیزوں سے پائے گی اور تمہیں دکھائے گی۔"

انجیل کی ان آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے جس آنے والے پیغمبر کی بشارت بار باردی ہے۔ اس کو لفظ "فارقلیط" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لفظ عبرانی یا سُریانی ہے۔ جس کے لفظی معنی ٹھیک محمدؐ اور احمد کے ہیں۔ یونانی کے قدیم تراجم میں اس کا ترجمہ "پیریکلیو طاس" کیا گیا تھا جو بعینہٖ فارقلیط اور احمدؐ کا ہم معنی ہے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اس سے اسلام کی تصدیق ہوتی ہے، ذرا سے تغیر سے "پیریکلیو طاس" کے بجائے پیریکلیطاس" کر دیا گیا ہے جس کا ترجمہ اب عام طور سے "تسلی دہندہ" کیا جاتا ہے۔ عیسائی اور مسلمان علماء کے درمیان اس لفظ کی تحقیق پر سینکڑوں برس سے مناظرہ قائم ہے اور مسلمان علمأ نے خود قدیم عیسائی علماء کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح لفظ "پیرکلیو طاس" ہے۔ سب سے زیادہ سیدھی بات یہ ہے کہ یہ فقرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلے تھے۔ اُن کی زبان سُریانی آمیز عبرانی تھی۔ یونانی نہ تھی۔ اس لئے جو لفظ ان کی زبان سے نکلا ہوگا۔ وہ عبرانی یا سُریانی ہوگا۔ اس لئے یہ بالکل صاف ہے کہ انہوں نے فارقلیط کا لفظ کہا ہوگا۔ جو احمدؐ یا محمدؐ کا مرادف ہے۔ جیسا کہ اوپر کی آیت میں قرآن کا دعویٰ ہے۔[1]

---

[1] خطباتِ احمدیہ، خطبۂ بشارات محمدی، منقول از گاڈفری ہیگنس صاحب۔

گذشتہ صفحات میں یہ کہیں ثابت کیا جا چکا ہے کہ آنحضرتؐ توراۃ و انجیل کی انسانی تعلیم سے قطعاً ناآشنا تھے۔ بایں ہمہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس آنے والے پیغمبر کی جو صفتیں گنائی ہیں۔ وہ حرف بحرف آنحضرتؐ پر صادق آتی ہیں:۔

لیکن وہ فارقلیط (احمدؐ) جو روح القدس (پاکیزگی کی روح) ہے۔ جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا۔ اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴-۲۶)

" وہ فارقلیط (احمدؐ)..... جو باپ (خدا) سے نکلتی ہے، آئے تو میرے لئے گواہی دے گا۔" (یوحنا ۱۵-۲۶)

" اور وہ (فارقلیط) آن کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا گناہ سے اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے ..... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح جب آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔ اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سُنے گی سو کہے گی۔ میری بزرگی کرے گی۔" (یوحنا ۱۶-۸)

انجیل کے ان فقروں میں آنے والے پیغمبر کی یہ صفات گنائی گئی ہیں:۔

۱۔ مسیح کی اصلی تعلیم لوگ بھول جائیں گے۔ اس لئے وہ پیغمبر آکر اس کو یاد دلائے گا۔

۲۔ وہ مسیح کی ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا، اور وہ ساری سچائی کی باتیں بتائے گا۔ اور سب باتوں کی خبر دے گا۔

۳۔ مسیح کی عظمت کو دنیا میں قائم کرے گا اور اُن کی گواہی دے گا اور اُن پر ایمان نہ لانے پر دنیا کو گناہ گار ٹھہرائے گا۔

۴۔ اس کی باتیں خود اس کی نہ ہوں گی۔ بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے اس کو سُنایا جائے گا وہی کہے گا۔

اس صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم عیسائی بُھلا چکے تھے۔ توحید کی جگہ تثلیث تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی تعلیماتِ صادقہ میں اُلوہیتِ مسیحؑ، مجسمہ پرستی اور بیسیوں عقائدِ فاسدہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ مبارک ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بُھلائی باتوں کو پھر یاد دلایا۔ اور بتایا کہ اُن کی اصلی تعلیم کیا تھی؟ قرآن مجید نے پُورے واشگاف طریق سے نصاریٰ کے عقایدِ فاسدہ اور غلط تعلیمات کی تشریح کی اور دنیا میں تثلیث کے بجائے توحید کا علَم نصب کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور حضرت مریم علیہا السّلام کی اُلوہیّت کی تردید کی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انبیّت اور ان کی حیات و موت کے مسئلہ کو صاف کیا۔

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السّلام نے کہا کہ وہ میری ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا۔ یہ خصوصیت بھی خاتم النبیینؐ کے سوا اور کسی پر صادق نہیں آسکتی۔ مسیح علیہ السّلام کے اس فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسیح علیہ السّلام تک دینِ الٰہی ناتمام ہے۔ اور دوسری یہ کہ آئندہ آنے والے پیغمبر کے ہاتھ سے اس کی تکمیل ہوگی۔ اور وہ سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا اور ساری باتوں کی خبر دے گا۔ یہ پیشین گوئی آنحضرتؐ کی ذات سے پوری ہوئی۔ آپؐ کی ذات سے دینِ الٰہی تکمیل کو پہنچا اور آپؐ نے عقائد، عبادات، اخلاق، احکام، آثارِ قیامت، جنّت، دوزخ، سزا، جزا وغیرہ تمام باتوں کو اس تفصیل، تشریح اور تکمیل کے ساتھ بتایا جس کی مثال دنیا کے کسی پیغمبر کی تعلیم میں نہیں ملتی۔ اسی لئے آپؐ کو خاتم النبیینؐ کا لقب دیا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس پیغمبر کی تیسری نشانی یہ بتائی کہ "وہ دنیا میں میری عظمت کو قائم کرے گا اور میرے لئے گواہی دے گا" یہ نشانی بھی آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس کے سوا کسی اور پر صادق نہیں ہو سکی۔ وہ آنحضرتؐ ہی ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصلی شخصیت اور عظمت کو دنیا میں آشکارا کیا اور دوستوں اور دشمنوں کی طرف سے اُن پر جو غلط اتہامات قائم کئے گئے تھے، اُن کی پردہ دری کی اور اُن کی نبوت اور رسالت کی گواہی دی اور اُن کی صداقت کو تسلیم کرنا اسلام کا ضروری رُکن قرار دیا۔ اُن کے حقیقی اوصاف و محامد کی تصویر کو جسے یہود نے دشمنی سے اور نصاریٰ نے محبت سے دھندلی کر دیا تھا، اپنی روشنی سے اُجاگر کر دیا۔ یہودیوں نے اُن پر اور اُن کی ماں حضرت مریم علیہا السلام پر جو بہتان باندھے تھے۔ ان کی علی رؤس الاشہاد تردید کر دی اور نصاریٰ نے اُن کی ولادت، وفات، انبیت، اُلوہیت اور تعلیمات پر رومی مشرکانہ اعمال و عقائد کا جو پردہ ڈال رکھا تھا، اُس کو چاک کر دیا اور قرآن کی بیسیوں آیتوں میں نہایت صفائی کے ساتھ اُن اُمور کی تشریح کی گئی اور اب کروڑوں دلوں میں ان کی اصلی عظمت اور حقیقی بزرگی کا نقش کندہ ہے۔

چوتھی نشانی حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ بتائی کہ وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہے گا بلکہ وہی کہے گا جو اس کو اوپر سنایا جائے گا۔ یہ آنحضرتؐ کا خاص وصف ہے۔ قرآن نے کہا:۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ	اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ
إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝	وہ جو کچھ بولتا ہے وہی بولتا ہے جو
(النجم ۳ - ۴)	اس پر وحی کی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ آنحضرتؐ جو کچھ ارشاد فرماتے تھے، اس کو لکھ

لیا کرتے تھے۔ لوگوں نے کہا آپؐ کبھی غصّہ میں کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اُن کو نہ لکھا کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جا کر آنحضرتؐ سے عرض کیا۔ آپؐ نے اپنے دہنِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے رضامندی اور نارضامندی دونوں حالتوں میں حق اور سچائی کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ قرآن مجید نے اپنی نسبت بارہا کہا کہ وہ سچائی کی روح ہے، وہ حق ہے، وہ تذکرہ ہے، وہ ہدایت ہے اور اس کا پیغمبر چراغِ ہدایت ہے، رہنمائے عالم ہے۔ مذکّر (یاد دلانے والا) ہے۔ اس تفصیل کے بعد کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیشین گوئی آنحضرتؐ کے ظہور سے حرف بحرف پوری نہیں ہوئی اور آنحضرتؐ کے سوا کوئی اور ہستی نہیں جس پر یہ اوصاف صادق آسکیں۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ کہ آنحضرتؐ کے ظہور کی پیشین گوئی توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس پیشین گوئی کو جانتے ہیں:۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ	جو لوگ اس اَن پڑھ پیغام رساں قاصد
الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے
عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ	پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے
(الاعراف، ۱۵۷)	ہیں۔

انجیل میں گذشتہ بشارتِ فارقلیط کے علاوہ آنحضرتؐ کی دو اور بھی پیشین گوئیاں مذکور ہیں۔ انجیلِ لوقا میں ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے فرمایا:۔

"دیکھو میں اپنے باپ خدا کے اس موعود کو تم پر بھیجتا ہوں۔ لیکن جب تک عالمِ بالا سے تم کو قوت عطا نہ کی جائے یروشلم میں ٹھہرو۔ (لوقا ۴۲-۴۹)

اس کی چند سطروں کے بعد لوقا کی انجیل ختم ہوگئی ہے۔ اور اس موعود کے ظہور کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ رسولِ موعود کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بعد آنحضرتؐ کے سوا کوئی پیغمبر نہیں ہُوا۔ انجیل کے اس فقرہ میں یہ الفاظ غور کے قابل ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ اس قوّت آسمانی کے ظاہر ہونے کے وقت تک شہر یروشلم میں ٹھہرو۔ اس سے مقصود اس قوت آسمانی کے ظہور تک شہر یروشلم محض اقامت نہیں ہے، بلکہ یہ مقصود ہے کہ اس رسولِ موعود کے ظہور تک تمہارا کعبہ اور قبلہ بیت المقدس رہے گا۔ لیکن جب وہ آئے گا تو رُخ شہرِ مکہ کی طرف بدل جائے گا اسی لئے قرآن مجید نے تحویلِ قبلہ کے موقع پر یہ کہا ہے:۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ	تو تو اپنا مُنہ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف
الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا	پھیر۔ اور تم جہاں بھی ہو اُسی
وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ	کی طرف اپنے منہ پھیرو۔ اور جو
أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ	اہلِ کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ
الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ	یہ حق ہے۔ اُن کے پروردگار کی
(البقرۃ: ۱۴۴)	جانب سے ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپؐ کی آمد کی بشارت کس قدر کُھلے لفظوں میں دی تھی۔ اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "میں اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السّلام کی بشارت ہوں۔" انجیل کی دوسری بشارت حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے ظہور کے موقع پر مذکور ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السّلام جب ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ اُن سے پوچھتے ہیں کہ تین آنے والے پیغمبروں میں سے تم کون ہو؟

"یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اُس سے پوچھیں کہ

تو کون ہے؟ اور اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اُس سے پوچھا تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں ..... اور انہوں نے اس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ الیاس اور نہ وہ نبی" تو کیوں بپتسمہ دیتا ہے۔" (یوحنا-۱-۱۹)

اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ توراۃ کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاس علیہ السلام اور مسیح علیہ السلام تھے۔ لیکن تیسرے کا نام صرف "وہ نبی" لیا گیا ہے۔ یہ تیسرا نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کون ہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں یقین رکھتے ہیں کہ اب مسیح علیہ السلام کے سوا کوئی اور آنے والا نہیں۔ صرف آنحضرتؐ ہی کی ذات ہے جو نبی اور پیغمبر کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ مسلمان آپؐ کو "آنحضرت" "وہ حضرت" یعنی پیغمبر کہتے ہیں اور مسیحیوں میں آپؐ کا نام "دی پرافٹ" (وہ پیغمبر) مشہور ہو گیا ہے۔

صحابۂ کرامؓ اور تابعین میں جن لوگوں کو توراۃ سے واقفیت تھی یا علمائے یہود میں سے جو لوگ اسلام لائے تھے ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آنحضرتؐ کی بشارت صحف انبیاءؑ میں مذکور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ گو آنحضرتؐ کے زمانہ میں کم سن تھے۔ مگر وہ مطالعۂ کتب کے شائق تھے اور وہ توراۃ پڑھا کرتے تھے۔ سورۂ فتح میں آنحضرتؐ کی شان میں ہے:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا	ہم نے تجھ کو گواہ، خوش خبری سنانے
وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ	والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے

رَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ط وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ○

(الفتح ۸، ۹)

تاکہ خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی عظمت کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

سورۂ احزاب میں کچھ اوصاف اور زیادہ مذکور ہیں:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○

(الاحزاب: ۴۵-۴۶)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، اور اللہ کی طرف اُس کے حکم سے بُلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرتؐ کے جو اوصاف گنائے گئے ہیں وہ بعینہٖ توراۃ میں۔

عن عبد الله بن عمرو ان هٰذه الآية التى فى القرآن يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ○ قال فى التوراة يا ايها النبى انا ارسلناك شاهدا و مبشرا وحرزا للاميين انت عبدى ورسولى وسميتك المتوكل ليس

عبداللہ بن عمروؓ نے کہا کہ قرآن کی یہ آیت کہ اے پیغمبر! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ توراۃ میں یونہی ہے کہ اے نبی! میں نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے اور اُمیوں کا ماویٰ و ملجا بنا کر بھیجا۔ تو میرا

بفظ ولاغليظ ولاسخاب
بالاسواق ولايدفع السيئة
بالسيئة ولكن يعفو ويصفح
لن يقبضه الله حتى يقيم به
الملة العوجاء بأن يقولوا لا
اله الا الله فيفتح بها اعينا
عميا واذانا صما وقلوبا
قلوبا۔

(صحیح بخاری تفسیر سورۃ فتح)

بندہ ہے اور میرا رسول ہے۔ اور میں
نے تیرا نام خدا پر بھروسہ رکھنے والا
رکھا۔ وہ سخت اور سنگدل نہ ہوگا۔
اور بازاروں میں شور نہ کرے گا۔ وہ برائی
کا بدلہ برائی نہ کرے گا۔ بلکہ عفو اور
درگذر کرے گا اور اُس وقت تک خُدا
اُس کی روح قبض نہ کرے گا جب تک
اُس کے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ
کرے گا کہ لوگ کہنے لگیں کہ اللہ تعالےٰ
کے سوا کوئی خدا نہیں۔ پس وہ اس دین
سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور
نافہم دلوں کو کھول دے گا۔

صحابہؓ کے زمانہ میں کعبؓ ایک یہودی عالم تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے۔ تفسیر طبری میں ہے کہ حضرت عطا تابعی نے ان سے پوچھا کہ آنحضرتؐ کی کوئی بشارت توراۃ میں مذکور ہے؟ انہوں نے کہا "ہاں ہے"۔ اور اس کے بعد انہوں نے توراۃ کی اسی عبارت کا ترجمہ پڑھا۔ چنانچہ اس وقت توراۃ کے جو نسخے موجود ہیں، ان میں اشعیا نبی کی کتاب میں کسی قدر الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ پیشین گوئی اب تک موجود ہے اور جس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت کعبؓ نے اپنی پیشین گوئی کو اختصار اور اجمال کے ساتھ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اشعیا نبی علیہ السلام

کی پیشین گوئی یہ ہے:۔

" دیکھو میرا "بندہ" جسے میں سنبھالتا۔ "میرا برگزیدہ" جس سے میرا جی راضی ہے میں نے اپنی روح اس پر رکھی۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔ وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا نہ بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا۔ وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دہکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا۔ وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے۔ اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں۔ خداوند خدا جو آسمانوں کو خلق کرتا اور انہیں تانتا جو زمین کو اور انہیں جو اس سے نکلتے ہیں پھیلاتا اور ان لوگوں کو جو اس پر ہیں سانس دیتا اور ان کو جو اس پر چلتے ہیں روح بخشتا ہے یوں فرماتا ہے۔ میں خداوند نے تجھے صداقت کے لئے بلایا۔ میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور میں تجھ کو لوگوں کے لئے عہد اور قوموں کے لئے نور[1] بناؤں گا کہ اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بند ہوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں، قید خانہ سے چھڑائے۔ یہوداہ میں ہوں۔ یہ میرا نام ہے، اور اپنی شوکت دوسروں کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی کھودی ہوئی مورتوں کے لئے ہونے نہ دوں گا۔ دیکھو تو سابق پیشین گوئیاں برآئیں اور میں نئی باتیں بتاتا ہوں اس سے پیشتر کہ واقع ہوں۔ میں تم سے بیان کرتا ہوں

---

[1] اس فقرہ کا اردو ترجمہ میرے پیش نظر اردو نسخہ میں صحیح نہ تھا۔ میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۰ء سے درست کیا ہے۔

خداوند کے لئے ایک نیا گیت گاؤ۔ اے تم جو سمندر پر گزرتے ہو۔ اور تم جو اس میں سے ہو۔ اے بحری ممالک اور ان کے باشندو تم زمین پر سرتاسر اس کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کرینگے سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے۔ اور بحری ممالک میں اس کی ثنا خوانی کریں گے۔ خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا۔ وہ جنگی مرد کے مانند اپنی غیرت کو اسکائے گا۔ وہ چلّائے گا۔ ہاں۔ وہ جنگ کے لئے للکارے گا۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا۔ میں بہت مدت سے چپ رہا۔ میں خاموش ہو رہا اور آپ کو روکتا گیا۔ پر اب میں اُس عورت کی طرح جسے دردِ زہ ہو، چلّاؤں گا۔ اور ہانپوں گا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لوں گا۔ میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کر ڈالوں گا اور اُن کے سبزہ زاروں کو خشک کروں گا اور ان کی ندیاں بسنے کے لائق زمین بناؤں گا اور تالابوں کو سُکھا دوں گا اور اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا۔ میں انہیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔ میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور اونچی نیچی جگہوں کو میدان کر دوں گا۔ میں اُن سے یہ سلوک کروں گا۔ اور انہیں ترک نہ کروں گا۔ وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیماں ہوں جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے اِلٰہ ہو۔ سُنو! اے بہرو! اور تاکو اے اندھو! تاکہ تم دیکھو اندھا کون ہے؟ مگر میرا بندہ؟ اور کون ایسا بہرہ ہے، جیسا میرا رسول جسے میں بھیجوں گا؟ اندھا کون ہے جیسا کہ وہ کامل ہے، اور خداوند کے خادم کی مانند اندھا کون ہے؟ تو نے بہت

چیزیں دیکھی ہیں، پر اُن پر لحاظ نہیں رکھا۔ اور کان تو کھلے ہیں۔ پر کچھ نہیں سُنتا۔ خداوند اپنی صداقت کے سبب راضی ہوا اور وہ شریعت کو بزرگی دے گا۔ اور اُسے عزت بخشے گا۔" (باب ۴۲)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت کعبؓ کی پیش کردہ بشارت میں جو الفاظ ہیں۔ وہ حرف حرف اس میں موجود ہیں، پہلا لفظ اس بشارت میں "شاھد" ہے، یعنی خدا کی طرف سے وہ قوموں کے درمیان گواہ اور شاہد ہوگا۔ اشعیاء میں ہے: "وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔ اور اس عدالت کا وہ گواہ ہوگا۔" اس کے بعد مبشرًا کی صفت ہے۔ یعنی وہ نیکوکاروں کو خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سُنائے گا۔ اشعیاء کے اس پُورے باب میں اس آنے والے پیغمبر کے یہی اوصاف بیان ہُوئے ہیں۔ بعدازیں حرزالامیین۔ آدمیوں کا ماوٰی اور پناہ ہے۔ اُمّی وہ ہیں جن کو اب تک کوئی شریعت نہیں ملی تھی۔ چنانچہ اشعیا میں ہے کہ "اس رسول کے ذریعہ سے اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا۔ میں اُن ہی رستوں (شریعت) پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔" انت عبدی و رسولی (یعنی تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے) اشعیاء کے شروع میں ہے "دیکھو میرا بندہ" اور آخر میں ہے "میرا بندہ میرا رسول جسے میں بھیجوں گا" یسمیتک بالمتوکل (میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ کرنے والا رکھا۔) اشعیاء میں ہے "میرا بندہ جس کو میں سنبھالتا ہوں... میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔" لیس بفظ ولا غلیظ ولا یدفع السیئۃ بالسیئۃ ولکن یعفوا ویصفح۔ (وہ سنگ دل اور سخت نہ ہوگا۔ یعنی کمزوروں اور ضعیفوں کو نہ ستائے گا۔ اور برائی کا بدلہ برائی نہ دے گا، بلکہ معاف کریگا اشعیاء علیہ السلام تمثیل واستعارہ میں کہتے ہیں۔ "وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا۔ اور دھیمی بتی کو نہ بجھائے گا۔

وہ عدالت کو جاری کرائے گا۔ ولا سخاب بالاسواق (وہ بازاروں میں نہ چلّا جائے گا۔ یعنی وہ متین اور سنجیدہ ہوگا) اشعیا علیہ السّلام نے کہا" وہ نہ چلّائے گا۔ اپنی صدا نہ بلند کرے گا، اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سُنائے گا۔ ولن یقبضہ اللہ حتّٰی یقیم بہ اللہ العرجاء۔! (خدا اس وقت تک اس کی روح قبض نہ کرے گا، جب تک اس کے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ کرالے گا) اشعیاء میں ہے۔ اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا، اور نہ مسلا جائے گا، جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرلے گا۔ فیقولوا لا الٰہ الّا اللہ (تو لوگ کہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں) اشعیا علیہ السّلام کہتے ہیں" مَیں خُدا (یہوداہ) اپنی شوکت دوسرے معبودانِ باطل کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی ہے کھودی ہوئی مورتوں کے لئے ہوئے نہ دوں گا .... وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھائے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو فیفتح بہ اعینا عمیا و آذانا صمّا و قلوبًا غلفًا (وہ اِس کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور زیر پردہ دلوں کو کھول دے گا) اشعیا علیہ السّلام کہتے ہیں:" لوگوں کے عہد اور قوموں کی روشنی کے لئے تجھے دوں گا کہ اندھوں کی آنکھیں کھولے۔ جو بند ہیں اُن کو قید سے نکالے، ..... سُنو اے بہرو، تاکو اے اندھو۔"

حضرت اشعیا علیہ السّلام کی یہ بشارت حرف بحرف آنحضرتؐ پر صادق آتی ہے۔ حضرت اشعیاء علیہ السّلام نے ان فقروں میں جس نبی کی پیشین گوئی کی ہے۔ وہ یقیناً حضرت عیسٰی علیہ السّلام نہیں ہیں، کہ نہ تو وہ عیسائیوں میں خدا کے "بندہ اور رسول" کی حیثیت سے تسلیم ہوتے ہیں اور نہ وہ ایک جنگی مرد کی طرح دنیا میں آئے، نہ انہوں نے توحید کو دنیا میں قائم کیا اور نہ بت پرستی کا استیصال کیا۔ علاوہ ازیں اس پیشین گوئی میں اس کی طرف بھی

خاص اشارہ ہے کہ وہ آنے والا نبی قیدار بن اسمٰعیل کی نسل سے اور قیدار کے دیہاتوں میں پیدا ہوگا۔ قیدار بن اسمٰعیل کا مشہور خاندان قریش تھا اور قیدار کا دیہات مکہ معظمہ ہے۔ اس باب ۴۲ سے پہلے جس میں یہ بشارت ہے، باب ۴۱ میں بھی اس بشارت کا ایک حصہ مذکور ہے۔

کس نے اس راست باز کو پورب کی طرف سے برپا کیا اور اپنے پاؤں کے پاس بُلایا اور امتوں کو اس کے آگے دھر دیا اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا۔ کس نے انہیں (کافروں) خاک کی مانند اس کی تلوار کے اور اڑتی بھوسی کے مانند اس کی تلوار کے حوالہ کیا۔"

اس درس میں یہ تصریح ہے کہ وہ راست باز پورب کی طرف سے مبعوث ہوگا۔ توراۃ کے محاورہ میں پورب کی سرزمین سے عموماً عرب مراد ہوتا ہے[1] اس سے ثابت ہُوا کہ وہ راست باز بندہ اور رسول ملکِ عرب میں مبعوث ہوگا۔

اس بشارت میں آنے والے پیغمبر کے سب سے پہلے وصف کا ترجمہ "برگزیدہ" کیا گیا ہے۔ جو آنحضرتؐ کے لقب "مصطفٰے" کا ترجمہ ہے۔ دوسرا وصف "راست باز" ہے یہ امین کا وہ لقب ہے جو نبوّت سے پہلے اہلِ مکہ کی زبان سے آپؐ کو ملا تھا۔

اب حضرت اشعیا علیہ السّلام کی بشارت کے ایک ایک لفظ پر غور کرو تو آنحضرتؐ کے اوصاف و حالات سے اس کی عجیب مطابقت ہوتی ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ اس پیغمبر کو بندہ اور رسول کے وصف سے یاد کیا ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ مخصوص ہے آنحضرتؐ کے سوا

---

[1] میں نے اپنی تصنیف ارض القرآن جلد اوّل میں جغرافیۂ عرب میں توراۃ کے حوالوں سے اس کو بتفصیل دکھایا ہے۔

کوئی پیغمبر اس وصفِ خاص کے ساتھ شہرت نہیں رکھتا۔ یہ اسلام ہی کا پیغمبر ہے۔ جس کا طغرائے فخر صرف عبدیت اور رسالت ہے۔ اُس نے دنیا میں اپنے نام کا اعلان ہی اِن الفاظ کے ساتھ کیا کہ عبدہ و رسولہ کسی مسلمان کی کوئی نماز اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی زبان سے تشہد میں یہ نہیں ادا کر لیتا۔ واشھدانّ محمد عبدہ و رسولہ" (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور اس کے رسول ہیں)۔ اس موقع پر ایک خاص نکتہ بیان کے لائق ہے کہ دیگر انبیاءؑ، جس طرح خلیل اللہ، کلیم اللہ، روح اللہ وغیرہ کے خطابات سے مشرف ہیں۔ آنحضرتؐ کا سب سے بڑا خطاب عبداللہ (خدا کا بندہ) ہے۔ معراج میں جو تقربِ الٰہی کی آخری منزل اور انسانی رُتبہ کی آخری شرف یابی تھی۔ آنحضرتؐ اسی لقبِ خاص سے پکارے گئے:۔

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ — پاک ہے وہ خدا جو معراج میں اپنے "بندہ" کو لے گیا۔

(بنی اسرائیل: ۱)

اس کے علاوہ اور متعدد آیتوں میں آپؐ کو اس خطاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا — اگر تم کو اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے "بندہ" پر اتارا۔

(البقرۃ: ۲۳)

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ — بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے "بندہ" پر قرآن اُتارا۔

(الفرقان: ۱)

وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ — اور جب خدا کا "بندہ" اس کو پکارتے

(الجن : ۱۹) ہوئے کھڑا ہوا۔

آنحضرتؐ دونوں زانو کھڑے کرکے کھانا تناول فرماتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ "میں خدا کا بندہ ہوں۔ اُسی طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھاتا ہے۔"

دوسرا وصف رسُول ہے۔ گو دُنیا میں پیغمبر ہزاروں آئے۔ مگر لفظ رسول سے ان کے نام کو شہرت نہیں۔ یہ صرف آنحضرتؐ ہی کا وصف ہے۔ جو تمام مسلمانوں کی زبانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ملقّب ہیں۔ یہاں تک کہ عیسائیوں میں بھی "دی پرافٹ" (یعنی پیغمبر مخصوص) آپؐ کا نام ہے۔ قرآن نے بتصریح کہا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ محمد خدا کا رسول۔

(الفتح : ۲۹)

يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ؕ خدا کا رسول تمہاری مغفرت

(المنافقون : ۵) چاہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ تمہارے پاس خود تمہاری قوم کا

(التوبۃ : ۱۲۸) رسول آیا۔

اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ تم میں خدا کا رسول ہے۔

(الحجرات : ۷)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ تمہارے لئے خدا کے رسول کے

اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اندر اچھی پیروی ہے۔

(الاحزاب : ۲۱)

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اے رسول تجھ پر جو کچھ اتارا گیا

اِلَيْكَ	ہے۔ اس کو لوگوں تک پہنچا
(المائدۃ: ۶۷)	دے۔

ان مقامات کے علاوہ اور بیسیوں جگہ آنحضرتؐ کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی ہے وہ بھی اسی رسولؐ کے لفظ کے ساتھ دی ہے۔ مبشِّرًا برسولٍ یاتی من بعدی اسمہٗ اَحْمَدُ[1] (میرے بعد "احمد" نام کا ایک رسول آنے والا ہے۔")

حضرت اشعیا علیہ السلام نے آنے والے پیغمبر کا تیسرا وصف "برگزیدہ" بتایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آنحضرتؐ مصطفٰے (برگزیدہ) کے لقب سے عام طور پر مشہور ہیں۔

حدیث صحیح میں ہے:

ان اللہ اصطفی کنانۃ من ولد اسمٰعیل واصطفٰی قریشا من کنانۃ واصطفی بنی ھاشم من قریش واصطفانی من بنی ھاشم[2]	بے شک خدا نے اولادِ اسمٰعیل میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور کنانہ میں سے قریش کو برگزیدہ کیا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو برگزیدہ کیا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو برگزیدہ کیا۔

چوتھی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ "جس سے میرا جی راضی ہوا" یہ وصف صرف آنحضرتؐ کے لئے بلکہ آپؐ کے وسیلہ سے تمام پیروانِ محمدیؐ میں عام ہے۔

---

[1] الصف: ۶ - [2] جامع ترمذی فضل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ..... يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا	محمد خدا کا رسول ہے اور جو اس کے ساتھ ہیں .... وہ خدا کی مہربانی اور رضا کو ڈھونڈتے ہیں۔
(الفتح : ۲۹)	
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ	خدا اُن سے راضی ہوا اور وہ خدا سے
(المائدۃ : ۱۱۹ ، التوبۃ : ۱۰۰)	راضی ہوئے۔
(المجادلۃ : ۲۲ ، البینۃ : ۸)	
لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	بے شک خدا مومنوں سے
(الفتح ، ۱۸)	راضی ہوا۔

تمام انبیاءؑ کی اُمتوں سے یہ مخصوص وصف اُمتِ محمدی ہی کا ہے۔ اس کے پیرو رضی اللہ عنہ کی دُعا سے ہمیشہ مخاطب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت اشعیاء علیہ السلام اس پیغمبر کا وصف بتاتے ہیں کہ خدا اُس سے کہتا ہے "میں نے اپنی رُوح اس پر رکھی" قرآن نے اس وصف سے بھی آنحضرتؐ کو متصف کیا ہے

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط	ہم نے تیری طرف اپنی شان کی ایک رُوح وحی کی۔
(الشوریٰ : ۵۲)	
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ	امانت دار رُوح اس کو لے کر
(الشعراء : ۱۹۳)	اتری۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ۔ کہہ دے کہ روح القدس نے
(النحل : ۱۰۲) اس کو اتارا ہے۔

پانچواں وصف یہ بتایا گیا کہ وہ نہ چلّائے گا اور نہ اپنی صدا بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا۔" صحابہؓ نے آپؐ کی سیرت کے خط و خال کی بھی تصویر کھینچی ہے۔ متعدد صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ کبھی زور سے نہیں ہنستے تھے۔ بلکہ صرف مسکراتے تھے۔[1] شمائل ترمذی میں حضرت ہندؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ اکثر چپ رہتے، بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے، ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے۔"

حضرت عائشہؓ سے ایک شخص نے آپؐ کے اخلاق پوچھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرتؐ بدگو نہ تھے اور نہ بازاروں میں شور کرتے تھے۔" حضرت علیؓ سے حضرت حسینؓ نے دریافت کیا کہ آپؐ کے اوصاف کیا تھے؟ فرمایا "آپؐ شور وغل نہیں کرتے تھے۔"[2]

سفر اشعیا میں اس کے بعد ہے:" وہ مُسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دہکتی ہوئی بتّی کو نہ بجھائے گا۔ مسکینوں، غریبوں اور کمزوروں کو نہ ستائے گا۔ وہ نرم دل اور نیک خو ہوگا۔" قرآن مجید نے آپؐ کے اس وصف کو نمایاں طریق سے بتایا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۝ اور بے شک تو بڑے خُلق پر ہے۔
(القلم ۴)

---

[1] جامع ترمذی باب ما جاء فی صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] یہ دونوں روایتیں شمائل ترمذی باب خُلق النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں۔ حضرت عائشہؓ والی روایت مسند ابوداؤد طیالسی اور مستدرک حاکم میں بھی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (اٰل عمران : ۱۵۹)

خدا کی رحمت کے سبب سے تو اُن کے ساتھ نرم ہے۔ اگر تو کڑا اور دل کا سخت ہوتا تو یہ تیرے اردگرد سے ہٹ جاتے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (التوبۃ : ۱۲۸)

تمہاری قوم سے تمہارے پاس ایک پیغمبر آیا۔ جس کو تمہاری تکلیف شاق ہوتی ہے۔ تمہاری بہی خواہی کا حریص ہے اور مسلمانوں پر مہربان اور رحمت والا ہے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ آپؐ برائی کے بدلہ برائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ معاف کرتے تھے۔ اور درگذر فرماتے تھے۔ آپؐ نے کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ "آپؐ خندہ جبیں، نرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے"۔ ہند بن ابی ہالہؓ جو گویا آپؐ کے آغوش پروردہ تھے، بیان کرتے ہیں کہ "آپؐ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے۔ خود اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی غصہ نہ فرماتے اور نہ کسی سے انتقام لیتے۔[1]"

حضرت انسؓ خادمِ خاص کہتے ہیں کہ "میں نے دس برس آپؐ کی خدمت کی۔ مگر آپؐ نے کبھی کسی معاملہ کی مجھ سے باز پرس نہ فرمائی۔[2]" مالک بن جویرثؓ جو بیس دن تک

---

[1] یہ تمام روایات شمائل ترمذی میں مذکور ہیں [2] صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الادب۔

آپؐ کی صحبت میں رہے تھے، کہتے ہیں کہ آپؐ رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔[1]

حضرت اشعیا علیہ السلام اس کے بعد کہتے ہیں کہ "وہ عدالت کو قائم کرے گا کہ دائم رہے"۔ چنانچہ آنحضرتؐ نبی آخرالزماں ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور نہ آپؐ کی شریعت منسوخ ہوگی۔ آپؐ آخر دین لے کر آئے جو قیامت تک دائم رہے گا۔ پھر کہتے ہیں کہ "اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ ملا جائے گا۔ جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے"۔ یعنی جب تک اس کی شریعت اور تعلیم قائم نہ ہو جائے گی، اس کو موت نہ آئے گی۔

ظاہر ہے کہ یہ وصف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صادق نہیں آتا کہ وہ اپنی تعلیم و شریعت کے استحکام سے پہلے اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ یہ مخصوص وصف آنحضرتؐ کا ہے جو اس وقت تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے جب تک آپؐ کی تعلیم و شریعت نے ظہورِ تام اور استحکامِ کامل نہیں حاصل کر لیا۔ چنانچہ جب یہ بات حاصل ہو گئی تو آپؐ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی اجازت ملی۔ حضرت اشعیاء علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی قرآن مجید کے اس سورہ کے مطابق ہے:۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝	جب خدا کی نصرت اور فتح آچکی اور
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ	تو نے لوگوں کو گروہ دینِ الٰہی میں آتے
دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ	دیکھ لیا (تو تیرا فرض انجام پا چکا اور
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ	اس دنیا سے تیرے رخصت کے
كَانَ تَوَّابًا ۝	دن قریب آگئے) اب خدا کی حمد و
(النصر : ۱-۳)	استغفار میں مصروف ہو کہ وہ رحم کرنے والا ہے

---

[1] صحیح البخاری باب رحمۃ الناس۔

جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے فرمایا کہ "خدا کے ایک بندہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے وہ اس دنیا کو قبول کرے یا دوسری دنیا کا سہ اختیار کرے۔ مگر اس بندہ نے آخرت کو پسند کیا۔" حضرت ابو بکرؓ یہ سُن کر رو پڑے۔ وہ سمجھ گئے کہ "یہ بندہ کون ہے"۔ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے امتحاناً اس سورہ کا مطلب پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں آنحضرتؐ کی وفات کا اشارہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس کی تصدیق کی[1]۔

اس کے بعد اشعیاء علیہ السلام کہتے ہیں کہ "تمام بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں"۔ یہ اسلام ہی تھا جس کی شریعت نہر سیحون اور جیحون سے دجلہ و فرات ہو کر بحر روم تک اور بحر ہند سے بحر ظلمات تک پھیل گئی۔ اور بڑے بڑے جزیرے اُس کے نور سے منور ہو گئے۔ بعد ازیں حضرت اشعیا علیہ السلام خدا کا وعدہ سُناتے ہیں کہ "میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا"۔ یہ وعدہ بھی آنحضرتؐ کے ساتھ پُورا ہوا۔ آپؐ نے یکہ و تنہا دعوتِ توحید کی اُس وقت اشاعت کی جب ملکِ عرب کا ذرہ ذرہ آپؐ کے خون کا پیاسا تھا اور خدا کے سوا کوئی آپؐ کا دوسرا دستگیر نہ تھا۔ اس نے دشمنوں کے نرغہ میں نازک سے نازک اور خطرناک سے خطرناک حملوں سے آپؐ کی ذاتِ گرامی کو محفوظ رکھا اور سفرِ اشعیا کے وعدہ کو قرآن کے ذریعہ سے دوبارہ دُہرایا اور مکہ میں عین اس وقت جب دشمنوں کی عداوت کا آفتاب پوری تمازت پر تھا، یہ آیت اُتری:۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ — اور یاد کرو اے محمدؐ! جب ہم نے

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سُورہ مذکور۔

بِالنَّاسِ ط

(بنی اسرائیل : ۶۰)

تم سے فرمایا کہ تمہارے پروردگار نے لوگوں کو ہر طرف سے روک رکھا ہے۔ کہ تم پر ہاتھ ڈالیں۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا

(الطور : ۴۸)

اپنے رب کے حکم کا صبر کے ساتھ انتظار کر کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

مدینہ میں آکر یہ وعدہ مکرر دہرایا گیا۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط

(المائدہ : ۶۷)

اور خدا لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

صحابہؓ اپنی جان نثاری سے آنحضرتؐ کے خیمہ کے گرد پہرا دیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اُتری تو آپؐ نے خیمہ سے سرِ مبارک باہر نکال فرمایا: "لوگو! واپس جاؤ۔ کہ خدا نے میری حفاظت کا خود وعدہ کیا ہے۔" اس وصف کے مستحق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے جو عیسائیوں کے اقرار کے مطابق رومیوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر سولی پر لٹکائے گئے۔

بشاراتِ اشعیاء میں اس کے بعد ہے: "میں تجھ کو لوگوں کے لئے عہد اور قوموں کے لئے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھوں کو کھولے اور بندھے ہوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں، قید سے نکالے۔" تاریخ گواہ ہے کہ بشارت کا یہ حصہ بھی پیغمبر اسلامؐ کے وجود سے کس خوبی سے پورا ہوا ہے۔ قرآن مجید نے بھی بشارت کے اس حصہ کو ان الفاظ میں مکمل کیا:

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ
عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ
وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ○ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ
اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

(الاعراف: ۱۵۷-۱۵۸)

وہ لوگ جو اس ان پڑھ فرستادہ
پیغمبرؐ کی پیروی کرتے ہیں، جس کو وہ
اپنے ہاں توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے
ہیں وہ اُن کو نیکی کا حکم کرتا ہے۔ اور
بُرائی سے روکتا ہے اور اچھی چیزیں ان
کے لئے حلال کرتا ہے اور بُری چیزیں
اُن پر حرام کرتا ہے اور اُن سے اُن
کی اُن پابندیوں اور زنجیروں کو جو
اُن پر تھیں، ہلکا کرتا ہے۔ تو جن لوگوں
نے اُس کو مانا اور اُس کی مدد اور
نُصرت کی اور اُس روشنی کے پیچھے چلے
جو اُس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی
کامیاب ہوں گے۔ کہہ دے (اے پیغمبر!)
اے لوگو! میں تم سب کے پاس خدا کا بھیجا
ہُوا ہُوں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَّدَاعِيًا اِلَى
اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○

(الاحزاب: ۴۵-۴۶)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری
دینے والا، ہوشیار کرنے والا اور خدا کی
طرف اس کے حکم سے بُلانے والا اور
روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ○

(النساء : ۱۷۴)

اے لوگو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے دلیل آچکی۔ ہم نے تمہاری طرف وہ نور اُتارا جو ہر چیز کو روشن کرتا ہے۔

وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا ۚ

(التغابن : ۸)

اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے اُتارا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ○

(الانبیآء : ۱۰۷)

اے محمدؐ! ہم نے تجھ کو تمام دُنیا کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۙ

(ابراھیم : ۱)

یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف اُتارا ہے تاکہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔

وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○

(الشوریٰ : ۵۲)

لیکن ہم نے اُس کو نور بنایا ہے تاکہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ دکھائیں۔ اور تو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

اس کے بعد اس بشارت میں ہے کہ آنے والا پیغمبر توحید کامل کا مبلغ، بت شکن اور باطل پرستی کا دشمن ہوگا۔ اور بت پرست کفار و مشرکین کو وہ شکستِ عظیم دے گا:

"یہوا (اللہ) میرا نام ہے، اور اپنی شوکت دوسرے (معبودانِ باطل) کو نہ دوں گا

اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی ہے۔ کھودی ہوئی مورتوں کے لئے نہ دوں گا۔
وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں۔
اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو۔"

حضرت اشعیا علیہ السلام کے بعد دنیا میں وہ کون پیغمبر آیا جس نے توحید کامل کی تعلیم پیغمبر اسلام سے واضح تر اور کامل تر دی ہو۔ جس نے بت پرستی کی بیخ کنی کی ہو، جس نے بُت خانوں کو منہدم کیا ہو، جس نے مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کیا ہو۔ اور باطل پرستی کے علم کو ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیا ہو۔ قرآن اور آپؐ کی تعلیمات کا بڑا حصّہ شرک و بُت پرستی کے خلاف جہادِ عظیم ہے اور تمام دنیا کو اعتراف ہے کہ اس فرض کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوبی اور تکمیل کے ساتھ ادا کیا، وہ کسی اور سے نہ ہو سکا۔

بعد ازیں حضرت اشعیا علیہ السلام بتاتے ہیں کہ وہ آنے والا پیغمبر مجاہد اور تیغ زن ہوگا۔ اور وہ باطل پرستیوں کے خلاف اپنی تلوار اٹھائے گا:۔

" خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا۔ وہ جنگی مرد کی طرح اپنی غیرت کو اُکسائے گا۔
وہ چلّائے گا۔ ہاں وہ جنگ کے لئے بُلائے گا۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا۔"

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف بدر و اُحد اور حنین و خندق کے سپہ سالار "پیغمبرؐ" کی شان ہے۔

" بیابان (عرب) اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے"

اس فقرہ میں آنے والے پیغمبر کا وطن (بیابانِ عرب) اور خاندان (قیدار بن اسمٰعیل) بھی بتا دیا گیا ہے۔ آخر میں ہے:

" اور اندھوں کو اس راہ سے جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا۔ میں انہیں اُن رستوں

پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔"

اس فقرہ میں یہ ارشاد ہے کہ وہ اُمّیوں کا پیغمبر اور اُس قوم کا داعی ہوگا جس کو کبھی راہِ راست کی ہدایت نہیں ملی۔ یہ صفت اہلِ عرب کی ہے جن کو آپؐ سے پہلے کوئی صاحب شریعت پیغمبر نہیں ملا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے جن کو شریعت مل چکی تھی۔ اس لئے یہ ان کی صفت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ صرف پیغمبرِ عربؐ کا وصفِ خاص ہے چنانچہ قرآن مجید نے صاف کہا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ (القصص: ۴۶)	تاکہ ان کو ہوشیار کرے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا۔
اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۭ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (یٰسٓ: ۳-۶)	تو یقیناً پیغمبروں میں سے ہے اور سیدھی راہ پر ہے اور یہ غالب مہربان خدا کی طرف سے اُترا ہے تاکہ تو اُن کو ہوشیار کرے جن کے باپ دادا ہوشیار نہیں کئے گئے وہ غفلت میں ہیں۔
هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (الجمعۃ: ۲)	وہی خدا جس نے اَن پڑھوں میں پیغمبر بنا کر اُن ہی میں سے کھڑا کیا جو اُن کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سُناتا اور کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ

(الانعام. ۱۵۵ - ۱۵۷)

یہ کتاب ہے جس کو ہم نے اُتارا ہے جو برکت والی ہے تو اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (یہ کتاب تم کو اس لئے دی گئی) تاکہ یہ نہ کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے یہود اور نصاریٰ دو قوموں کو عطا ہوئی اور ہم اس کے پڑھنے سے غافل تھے۔ یہ کہو کہ اگر خاص ہم پر کوئی کتاب اُترتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست پر ہوتے۔ تو لو تمہارے پاس خدا کی طرف سے کھلی دلیل، ہدایت اور رحمت آچکی۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ۝

(سبا: ۴۴)

اور ہم نے ان کو نہ تو کتابیں دیں جن کو وہ پڑھیں اور نہ تجھ سے پہلے اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا بھیجا۔

اس بشارت کے تمام فقروں پر جو شخص اس تفصیل سے نظر ڈالے گا اور اس کے ایک ایک فقرہ کی قرآنِ پاک، احادیثِ شریف اور سوانح نبویؐ کے ساتھ حرف حرف تطبیق پر غور کرے گا، وہ اس یقین کے پیدا کرنے پر مجبور ہوگا۔ کہ اس بشارت کا مصداق

محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا:

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ	وہی جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا
اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ	ہے تاکہ وہ تم کو اندھیرے سے نکال کر
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ	روشنی میں لے جائے۔

(الحدید: ۹)

سورۂ فتح میں جس میں آنحضرتؐ کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے، توراۃ اور انجیل کی ایک اور پیشین گوئی کا حوالہ دیا گیا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ	محمد خدا کا بھیجا ہوا اور جو لوگ اس کے
مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ	ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بھاری، آپس
بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا	میں مہربان ہیں۔ دیکھتے ہو تم ان کو
یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا	کہ (خدا کے سامنے) رکوع اور
سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ	سجدہ میں گرے رہتے ہیں اور خدا
السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۖ	کی رحمت اور خوشنودی کے جویاں
	رہتے ہیں۔ ان کے چہروں میں سجدہ
(الفتح: ۲۹)	کے اثر سے نور ہے۔ ان کی حالت کا
	بیان توراۃ میں ہے۔

آنحضرتؐ اور صحابۂ اکرامؓ کا یہ مجموعی وصف فتح مکہ کے موقع پر بیان کیا گیا ہے جو اسلام کی دعوت کی تکمیل، توحید الٰہی کے انجام، خانۂ خلیل کی کامل آزادی اور معبودانِ باطل کی دائمی شکست کا دن ہے اور اس کے بعد کوئی نیا پیغام سنانے والا دنیا میں آنے والا

نہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر اُن کی توراۃ اور اُن کے صحیفۂ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بنی اسرائیل کو یہ فرمائی:۔

"یہ وہ برکت ہے جو موسیٰؑ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سیناسے آیا اور سعیر سے اُن پر طلوع ہُوا۔ اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہُوا۔ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت اُن کے لئے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس (ہمراہی) تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔" (استثناء ۳۳۔ ۱و۲و۳)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آخری کلام ہے جس میں آخری پیغمبر کی بعثت کی خبر دی ہے۔ اس بشارت میں کوہِ فاران سے نورِ الٰہی کے طلوع ہونے کی خوشخبری ہے۔ اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید کے بیان کے عین مطابق ہیں۔

(۱) وہ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (الفتح: ۲۹)

محمدؐ خدا کے فرستادہ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔

(۲) اُس کے ہاتھ میں ان کے لیے آتشیں شریعت ہوگی:

اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ (الفتح: ۲۹)

وہ خدا کے منکروں پر سخت ہوں گے۔

(۳) وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا:

رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ

آپس میں ایک دوسرے پر مہربان

(الفتح ، ۲۹) ہوں گے۔

(۴) (اے خدا) اس (آنے والے پیغمبر) کے سارے مقدس لوگ (یعنی صحابہؓ) تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ	دیکھتے ہو تم اُن کو خدا کے آگے رکوع
فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَا	اور سجود میں جھکے ہوئے خدا کی مہربانی
هُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ	اور خوشنودی کے طلبگار رہیں۔ اطاعت و
(الفتح : ۲۹)	عبادت کے اثر سے اُن کے چہروں
	میں نورانیت ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اِس آنے والے پیغمبر کے مقدس ساتھیوں کی تعداد دس ہزار فرماتے ہیں۔ فتحِ مکہ کے دن بعینہٖ یہی دس ہزار مقدسین تھے جو اس فاران سے آنے والے نورانی پیکر کے ساتھ شہرِ خلیل (مکہ) کے دروازے میں داخل ہوئے اور اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہوا۔

سورۂ فتح میں اس کے بعد ہے:

وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ	اور ان کی مثال انجیل میں مثل کھیت کے
اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ	ہے۔ جس نے ٹہنی نکالی، پھر اس کو
فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ	مضبوط کیا، پھر موٹا ہوا، پھر اپنی ٹہنیوں پر
الزُّرَّاعَ	کھڑا ہوا۔ کھیت والوں کو خوش اور
(الفتح ، ۲۹)	مسرور کر رہا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ تمثیل آسمانی بادشاہی کی دی ہے۔ چنانچہ انجیل کے

مختلف نسخوں میں یہ تمثیل ان الفاظ میں مذکور ہے۔

" آسمان کی بادشاہت رائی کے دانہ کے مانند ہے جسے ایک شخص نے لے کے اپنے کھیت میں بویا۔ وہ سب بیجوں میں چھوٹا ہے۔ پر جب اُگتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے۔ اور ایسا پیڑ ہوتا ہے کہ ہوا کی چڑیاں آکے اس کی ڈالیوں میں بسیرا کریں۔" (متی ۱۳ ۳۱، و مرقس ۴، ۳۰)

" خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسا ایک شخص جو زمین میں بیج بوئے اور رات دن وہ سوئے اُٹھے۔ اور بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ اس لئے کہ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے سبزی، پھر بال، بعد میں اس کے بال میں تیّار دانے، اور جب دانا پک چکا تو وہ فی الفور ہنسوا بھجواتا ہے۔ کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا ہے۔"

(مرقس ۴، ۲۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے آسمانی بادشاہت کی جو تمثیل دی ہے۔ قرآن مجید نے اس کو سورۂ فتح میں دہرایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام کی جسمانی اور روحانی، ظاہری و باطنی دونوں بادشاہیوں کے جلوس و موکب کا دن فتح مکہ کا دن ہے، اور آسمانی بادشاہی کی یہ تمثیل پوری ہوئی کہ محمدؐ نام ایک کاشتکار نے ایک بیج زمین میں ڈالا اور اُس سے سیکڑوں ہزاروں خوشے پیدا ہو گئے۔ اور اس نے آسمانی بادشاہی کی منادی کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام بنی اسرائیل کو نصیحت کرتے ہیں:

" خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھرو۔" (استثناء ۱۸-۱۵)

" میں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور

اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُس سے کہوں گا۔ وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اُس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گُستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے۔ جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔ اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پُورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی، بلکہ اس نبی نے گُستاخی سے کہی ہے۔ تو اس سے مت ڈرو۔"

(استثنا ۱۸-۱۹)

عیسائیوں نے اس بشارت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں کرنا چاہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس کے مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتے۔ اس بشارت میں ہے کہ یہ نبی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے مبعوث ہوگا۔ بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسمٰعیل تھے۔ اس سے یہ مفہوم ہُوا کہ وہ پیغمبر نسل اسمٰعیل علیہ السلام سے ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسمٰعیلی نہ تھے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہیں مان سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ آئندہ نبی میرے مانند ہوگا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں کوئی وجہ مماثلت نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنگ جو اور مجاہد تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو غلام سے نکال کر بادشاہی تک پہنچایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف واعظ نہ

تھے، عمل فرما اور کار پرداز بھی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف واعظ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوموں اور ملکوں کے فاتح تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک چپہ زمین پر بھی قابض نہ تھے۔ برخلاف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ علیہما السلام میں یہ تمام اوصاف مشترک ہیں۔ اس لیے وہ موعود نبی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مانند پیدا ہونے والا تھا۔ وہ آنحضرتؐ ہی تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بشارت میں جو کچھ فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی حرف حرف تصدیق کی ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے روزِ ازل تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد لیا تھا کہ ہر نبی دوسرے نبی کی تائید کرتا جائے اور اپنی اُمت کو یہ نصیحت کر جائے کہ جب کوئی پیغمبر ان کے پاس آئے تو وہ اُس کی تصدیق کرے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

(اٰل عمران : ۸۱)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ ہم جو تم کو کتاب اور دانائی دیں اور پھر کوئی پیغمبر تمہارے پاس آئے جو کتاب اور شریعت تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہو تو ضرور اس کو ماننا اور اس کی مدد کرنا۔ اور فرمایا کہ کیا تم نے اِس کا اقرار کر لیا اور اِن باتوں پر جو ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا ہے اُس کو تسلیم کیا؟ پیغمبروں نے عرض کیا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا

تو تم گواہ رہو اور تمہارے ساتھ ہم بھی
ایک گواہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آنے والے پیغمبر کی اطاعت کی جو نصیحت فرمائی وہ اُسی ازلی عہد و پیمان کا ایفا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنے والے پیغمبر کی نسبت ارشاد فرمایا کہ "وہ میرے مانند ہوگا"۔ قرآن مجید نے بھی اس کی تصدیق کی:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○	ہم نے تمہارے پاس ایک پیغمبر کو بھیجا ہے۔ جو تم پر گواہ ہے۔ جس طرح کہ ہم نے فرعون کے پاس ایک پیغمبر بھیجا تھا۔
(المزمل: ۱۵)	

اس پیغمبر کا وصف یہ ہوگا کہ "خدا اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالے گا"۔ قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی نسبت کہا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○	اور وہ اپنی خواہشِ نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو اُس سے خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔
(النجم: ۳-۴)	

توراۃ میں ہے:

"اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب لوں گا۔

قرآن مجید نے بھی یہی اعلان کیا کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے

منکر ہوگا۔ اس کو اپنے حساب کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ	اور اے پیغمبر عذاب وغیرہ کے جو وعدے
نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا	(ان کفار سے) ہم کرتے ہیں۔ ان میں سے
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○	بعض تو تمہاری زندگی ہی میں تم کو پورا
	کر کے دکھائیں گے یا ان کے پورا ہونے
(الرعد : ۴۰)	سے پہلے تم کو دنیا سے اٹھا لیں گے
	تمہارا کام ہمارے احکام کو ان تک پہنچا دینا
	تھا اور ان کا حساب لینا میرا کام ہے۔

توراۃ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اس بشارت میں یہ کہا:۔

"لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے، جسے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا"

قرآن مجید نے بھی اس فرمان کی صداقت پر اپنی مہر ثبت کر دی:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ○	اگر پیغمبر (محمدؐ) کچھ جھوٹ اپنی طرف
لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ	سے ملا کر کہتا تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے
لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○ فَمَا	اور اس کی گردن کی شہ رگ کاٹ
مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ○	ڈالتے پھر تم میں سے کوئی اس کو
(الحاقة : ۴۴ - ۴۷)	مجھ سے نہ بچا سکتا۔

توراۃ نے اُس آنے والے پیغمبر کی نشانی یہ بتائی کہ اس کی تمام پیشین گوئیاں سچی ہوں گی۔ سیرۃ نبویؐ کے تمام ابواب تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھو کہ اس نشانی کی صداقت میں ایک

ذرّہ بھی کبھی کمی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رویا میں جو کچھ آپؐ دیکھتے تھے وہ سپیدۂ صبح کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔[1] مسلمان تو مسلمان خود کفار تک کو اس پر یقین تھا کہ آنحضرتؐ کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں ہوتی۔ یاد ہوگا کہ غزوہ بدر سے پہلے ایک صحابی عمرہ ادا کرنے مکہ گئے تھے۔ انہوں نے قریش کے رئیس اُمیّہ سے کہا کہ "آنحضرتؐ نے فرمادیا ہے کہ تو قتل ہوگا"۔ اس پیشین گوئی کا یہ اثر ہوا کہ کانپ گیا اور معرکۂ بدر میں وہ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ جاتے ہوئے اس کی بیوی نے دامن پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو تم کو اس مدینہ والے کی پیشین گوئی یاد نہیں۔[2] آنحضرتؐ نے سینکڑوں پیشین گوئیاں کیں اور ان میں سے ایک ایک سچائی کے معیار پر اُتری۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ابنِ ناطور جو قیصرِ روم کا محرمِ راز اور شام کا اسقف (بشپ) تھا، اس نے بیان کیا کہ ہرقل قیصرِ روم منجّم تھا۔ ایک دن وہ دربار میں آیا تو چہرہ متغیّر تھا۔ کسی درباری نے سبب دریافت کیا تو اس نے کہا رات ستاروں کو دیکھ کر یہ نظر آیا کہ "ملك الختان" (ختنہ کا بادشاہ یا فرشتہ) ظاہر ہوگیا۔ تو تحقیق کرو کہ ختنہ کس قوم میں رائج ہے۔ درباریوں نے کہا کہ ختنہ تو صرف یہود کرتے ہیں۔ اس لئے آپ مضطرب نہ ہوں۔ صوبوں میں حکم جاری کر دیجئے کہ امسال یہودیوں کے یہاں جس قدر بچے پیدا ہوں، سب قتل کر دیئے جائیں۔ اسی اثناء میں حدودِ شام کے عرب رئیس غسّان نے یہ خبر پہنچائی کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے۔ قیصر نے کہا دریافت کرو کہ عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس کا جواب جب اس کو اثبات میں ملا تو اس نے کہا "ہاں یہ اس امت کا مَلِك (بادشاہ یا فرشتہ) ہے"۔ اور اِس کے بعد اہلِ دربار سے

---

[1] صحیح بخاری بدءالوحی [2] صحیح بخاری مغازی۔

مخاطب ہوکر کہا کہ "اگر تم کو اپنی سلطنت بچانی منظور ہے تو اس پر ایمان لاؤ" درباریوں نے قیصر کی اس گفتگو کو سخت ناپسند کیا۔ مگر رومیہ میں قیصر کا ایک اور صاحبِ علم دوست تھا۔ قیصر نے اس کو لکھا تو اس نے بھی قیصر کی رائے کی تائید کی۔

ہمارے محدثین اس خبر کی صحیح حقیقت نہیں سمجھ سکے ہیں اور اسی لئے ملك الختان کا تلفظ نہ مَلِك (بادشاہ) ہے اور نہ مَلَك (فرشتہ) ہے۔ بلکہ ملاك ہے۔ جس کے معنی "فرستادہ اور پیغامبر" کے ہیں۔ جس کی اصل عربی میں الوکہ بمعنی پیغام ہے۔ اگر یہ لفظ عربی تلفظ میں مَلَك پڑھا جائے تو یہ لفظ اس موقع پر "فرشتہ" کے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ فرستادہ کے لغوی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ قیصر کا یہ لفظ ملاك الختان (ختنہ کا پیغامبر) استعمال کرنا درحقیقت توراۃ کی ایک پیشین گوئی کی طرف اشارہ ہے۔ ملاخیا نبی علیہ السلام کی کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ میں مذکور ہے۔

"دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کرے گا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو، ہاں "ختنہ کا رسول" جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آئے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے۔ پر اس کے آنے کے دن کو کون ٹھہر سکے گا۔ اور جب وہ ظاہر ہوگا، کون ہے جو کھڑا رہے گا۔ کیونکہ وہ سُنار کی آگ اور دھوبی کے صابن کی مانند ہے اور وہ روپیہ کا میل کاٹتا ہوا اور اسے خالص کرتا ہوا بیٹھے گا۔" (باب ۳)

آج کل کے ترجموں میں "ختنہ کے رسول" کے بجائے "عہد کا رسول" لکھا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے جواب میں جس رسول کی بعثت کا وعدہ فرمایا تھا، اس کے متعلق یہ بشارت ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ

کہ توراۃ کی زبان میں "ختنہ" نسلِ ابراہیمی کے جسم پر خدا اور ابراہیم علیہ السلام کے باہمی "عہد و میثاق" کی مُہر کا نام ہے۔ توراۃ میں جہاں ختنہ کا حکم ہے، مذکور ہے:

"اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، جسے تم یاد رکھو یہ ہے کہ تم میں ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہے جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" (پیدائش ۱۷۔ ۱۰)

اس بنا پر "ختنہ" کی بجائے مترجمین نے "عہد" کا لفظ رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے قربِ مولد کے زمانہ میں اس پیشین گوئی کے مطابق اس "رسول الختان" کا یہود و نصاریٰ دونوں کو انتظار تھا۔ اور قیصرِ روم اس پیشین گوئی کے پُورا ہونے کا منتظر تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں نہ تھی۔ کیونکہ اگر ان کے حق میں ہوتی تو عیسائی قیصر اُس کی آمد کا منتظر نہ ہوتا۔ "رسول الختان" کے لفظ سے اس بات کا اشارہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مختون قوم میں ظاہر ہوگا۔ اور عیسائی مذہب نے اس رسم کو باطل قرار دیا ہے۔ یہودیت کے بعد اسلام ہی ہے جس نے نسلِ ابراہیم کے اس عہد کو دُنیا میں ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔

توراۃ میں ایک اور بشارت ہے:

"خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہُوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہُوا۔" (استثناء ۳۳۔ ۲)

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حبقوق نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں پھر دہرایا گیا ہے:

"خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہِ فاران سے آیا۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہوگئی۔" (۳۔ ۳)

صحیفۂ استثناء کی بشارت میں خداوند کا مظہر تین پہاڑوں کو قرار دیا گیا ہے۔ کوہِ سینا، کوہ سعیر اور کوہِ فاران۔ یہ درحقیقت خورشیدِ نبوت کے تین مطلع ہیں۔ ان میں بہ ترتیب کوہِ سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، کوہ سعیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور کوہِ فاران سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں کہ وہ مکّہ کی پہاڑیوں کا نام ہے۔ حضرت حبقوق علیہ السلام اس بشارت میں کہتے ہیں کہ وہ تیمان سے آیا۔ تیمان کے لغوی معنی جنوب کے ہیں۔ اور استعمال میں ملکِ یمن کو کہتے ہیں۔ اور یہاں یہ دونوں معنی ٹھیک ہیں۔ پھر کہتے ہیں "اس کی شوکت سے آسمان چھُپ گیا" یہ معراج آسمانی کی تشریح ہے۔ پھر کہتے ہیں "اس کی حمد سے زمین معمور ہوگئی" زمین کا کون گوشہ ہے جو محمد کی حمد سے معمور نہیں۔ لفظ حمد کہ محمد کا مادّہ اور عبادتِ اسلامی کا آغاز (الحمد الخ) ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلمیح سے لبریز ہے۔

توراۃ کی اس بشارت کو قرآن مجید نے سورۂ والتین کے ان الفاظ میں ادا کیا:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ	قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طورِ سینا کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔

(التین: ۱-۳)

سب کو معلوم ہے کہ انجیر اور زیتون والا ملک شام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مولد اور کوہ سعیر کا مبدء ہے۔ طورِ سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عبارت ہے اور بلدِ امین یعنی مکّہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے۔

علمائے اسلام نے توراۃ اور انجیل کی اور بھی بشارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ہم نے صرف ان ہی بشارتوں کا ذکر کیا ہے جن کی طرف قرآن مجید اور احادیث میں اشارے پائے

جاتے ہیں۔ کتب سیر و دلائل میں بہت سی پیشین گوئیاں عرب کے کاہنوں و ربت خانوں کے پجاریوں سے منقول ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا بڑا حصہ اصول روایت کے رُو سے کمزور ہے اس لئے ہم ان کی تفصیل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ تاہم ان روایات کا قدرِ مشترک اس قدر ضرور نکلتا ہے کہ عرب بھی ایک پیغمبر کے وجود کا تشنہ تھا۔ روم و فارس کی دہ سالہ جنگ نے مشرق و مغرب کی سرزمین کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ اور خیالات میں تلاش امن کی شورش برپا کر دی تھی۔ اور عرب میں اصحابِ الفیل کا واقعہ دلوں میں لرزش پیدا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اور عین یہی موسم دنیا میں روحِ اعظم کے ظہور کا ہوتا ہے۔ اس لئے مولدِ نبیؐ کے قریب زمانہ میں عرب روم اور یہود و نصاریٰ سب کو توراۃ اور انجیل کی بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسفیانؓ کی زبانی مروی ہے کہ جب قاصدِ نبوی دعوت نامۂ اسلام لے کر قیصر کے دربار میں پہنچا ہے اور قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر، جو اُس وقت تک کافر تھے، آنحضرتؐ کے متعلق چند استفسارات کئے ہیں اور ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیئے ہیں اُن کو سُن کر اس نے بھرے دربار میں کہا "تم نے جو کچھ بیان کیا، اگر وہ سچ ہے تو ایک دن یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اُس کے قبضہ میں ہو گی۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہو گا۔ اگر ممکن ہوتا میں خود جا کر اس کی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا"[1]

قیصر کے محرم راز اور شام کے بشپ ابنِ ناطور کا بیان اوپر پڑھ چکے ہو کہ قیصر کا خیال تھا کہ ختنہ والے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے

---

[1] صحیح بخاری (کیف کان بدء الوحی)

نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی۔ مقوقس شاہِ مصر کے دربار میں جو قاصدِ نبویؐ خط لے کر گیا تھا۔ وہ بھی یہ جواب لایا کہ "ہاں ہم کو بھی یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔ لیکن یہ خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا"۔ حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ سچے پیغمبر ہیں"[1]۔ یاد ہوگا کہ یمن کے شہر نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد حاضرِ خدمت ہوا تھا اور فیصلۂ حق کے لئے یہ قرار پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں۔ لیکن وفد کے سمجھ دار عیسائیوں نے وفد کو آنحضرتؐ کے مقابلہ میں مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ "خدا کی قسم اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں گے"[2]۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی پیغمبر کی آمد کا گمان تھا۔ اسلام سے پہلے زیدؓ ایک عرب موحد تلاشِ حق میں مدتوں سے سرگرداں رہے۔ وہ پہلے یثرب (مدینہ کا پہلا نام) گئے۔ دیکھا تو وہاں کے یہودیوں بھی توحیدِ کامل پر قائم نہ تھے۔ یہاں سے نکل کر خیبر کے یہودی کے پاس گئے اور ان کا بھی یہی حال پایا۔ وہاں سے شام کے عیسائیوں میں گئے۔ دیکھا کہ وہ بھی مشرک ہیں۔ آخر شام کے ایک راہب نے کہا کہ اگر تمہیں دینِ حق کی تلاش ہے تو عراق جاؤ۔ وہاں ایک بزرگ ہیں۔ زیدؓ جب ان کے پاس پہنچے اور لبِ سوال وا کیا تو دریافت کیا کہ تم کہاں سے آتے ہو؟ زید نے کہا حرمِ مکہ سے۔ ان بزرگ نے کہا۔ جاؤ تم اپنے وطن کو لوٹ جاؤ۔ دینِ حق کا وہیں ظہور ہونے والا ہے۔ وہ لوٹ کر مکہ آئے لیکن اسلام سے پہلے ان کی وفات ہو گئی[3]۔ ورقہ بن نوفل کا واقعہ تم سیرۃ جلد اوّل میں پڑھ چکے ہو کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہؓ آپؐ کو لے کر ورقہ کے پاس گئی ہیں تو ورقہ نے آپؐ کی نبوّت کی تصدیق کی اور آرزو ظاہر کی کہ

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل [2] سیرۃ النبیؐ جلد دوم۔ [3] مسند ابو زرعۃ۔

کاش میں آپؐ کی ہجرت تک رہتا تو آپؐ کی مدد کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا اُس وقت انتظار تھا۔

ابنِ سعد، ابنِ اسحٰق، مسند احمد، تاریخِ بخاری، مستدرک حاکم، دلائلِ بیہقی، معجم طبرانی، دلائلِ ابونعیم وغیرہ میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں بھی ایک آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے تھے اور ان ہی سے سُن سُن کر اوس و خزرج کے کانوں میں پیغمبر کی بعثت کی خبر پڑی ہوئی تھی اور اکثروں کے لئے یہ خبر ہدایت کا باعث بنی۔ چنانچہ ابنِ سعد کے علاوہ دیگر کتب مذکورہ میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسندِ صحیح مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں چھوٹا تھا، تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ تھا۔ اثنائے وعظ میں اس نے ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا؟ اُس نے ان انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے۔ اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا۔" انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا آپؐ کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑا۔ آنحضرتؐ اس کی عیادت کو گئے اور اُس کے باپ سے پوچھا کہ "کیا میرا ذکر تم توراۃ میں پاتے ہو؟" اُس نے کہا "نہیں" لڑکے نے فوراً جواب دیا "ہاں یا رسول اللہؐ! آپؐ کا ذکر ہم نے توراۃ میں پڑھا ہے"، اور یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا[1]۔ عربوں اور یہودیوں میں جب لڑائی ہوتی تو یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں۔ اُن کے عہد میں ہم کو کامل فتح ہوگی۔ قرآن مجید نے اُن کے اسی عقیدہ کو دُہرا کر ان کے عدمِ

---

[1] بیہقی باسنادِ صحیح۔ مگر یہ روایت صحیح بخاری (کتاب الجنائز) سے کسی قدر مختلف ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ وہ لڑکا اپنے باپ کے مشورہ سے مسلمان ہو گیا۔

اسلام پر ملامت کی ہے:

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○

(البقرۃ : ۸۹)

اور اس سے پہلے کافروں پر اسی آنے والے پیغمبر کا نام لے کر فتح چاہا کرتے تھے۔ بس جب وہ بات سامنے آگئی جس کو انہوں نے پہچان لیا تو انکار کر دیا۔ کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

قرآن مجید نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد مقامات پر یہودیوں کو اُن کے اس سابق یقین کے خلاف ان کے موجودہ اظہارِ کفر پر اُن کی سرزنش کی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ

(البقرۃ : ۱۴۴)

جن کو کتاب پہلے دی جا چکی ہے۔ وہ یقیناً اُن نشانیوں کی بنا پر جو اس کتاب میں مذکور ہیں، جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

(البقرۃ : ۱۴۶)

جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں وہ اسلام کی صداقت کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک فریق جان کر حق کو چھپاتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ	جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں
کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ	وہ اس کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس
(الانعام : ۲۰)	طرح وہ اپنے بیٹوں کو۔

یہ ان ہی بشارتوں اور پیشین گوئیوں کا اثر تھا کہ عُلمائے یہود آنے والے نبی کے متعلق توراۃ کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضرِ خدمت ہوتے تھے اور سوالات کرتے تھے اور آپؐ کا امتحان لیتے تھے اور جب ان کی تشفّی ہو جاتی تھی تو وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفر طیارؓ نے اسلام پر تقریر کی اور سورۂ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو نجاشی پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"۔ اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اسلام کا جو عقیدہ سنا تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اُٹھا کر کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسیٰ علیہ السلام اِس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں"[1]۔

کفارِ عرب کو مخاطب کر کے قرآن مجید نے کہا کہ اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ	اے پیغمبر! ان سے کہو کہ غور کرو۔
اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَھِدَ شَاھِدٌ	اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم

---

[1] مسند ابنِ حنبل (جلد اوّل)۔

مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ط

(الاحقاف : ۱۰)

اس سے مُنکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اس طرح کی ایک کتاب نازل ہونے کی گواہی بھی دی اور ایمان بھی لایا۔ اور تم مغرور بنے رہے تو ایسی صورت میں تمہارا کیا انجام ہوگا۔

اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ○

(الشعراء ، ۱۹۷)

کیا ان کفار کو یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

خصائصِ محمدیؐ

خصائصِ محمدیؐ کی دو قسمیں | خصائص وہ امور ہیں جو کسی کی ذات کے ساتھ خاص ہوں۔ آنحضرتؐ کو بہت سی چیزیں ایسی دی گئی تھیں جو اوروں کو نہیں ملی تھیں۔ یہ خصائصِ محمدیؐ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو صرف آپؐ کے لئے تھے اور آپؐ کی اُمت میں سے کسی اور کے لئے نہ تھے۔ دوسرے وہ جو صرف آپؐ کو عطا ہوئے اور دوسرے انبیاءؑ کو مرحمت نہیں ہوئے۔ غرض پہلی خصوصیتیں اُمت کے مقابلہ میں اور دوسری انبیاء کے مقابلہ میں تھیں۔ ہم نے پہلے کا نام "خصائصِ ذاتی" اور دوسرے کا "خصائصِ نبویؐ" رکھا ہے۔

خصائصِ ذاتی اور خصائصِ نبویؐ | اربابِ سیر نے ان خصائص کی توسیع اور کثرت کو آنحضرتؐ کی فضیلت کا بڑا معیار قرار دیا ہے کہ اس سے بارگاہِ الٰہی میں آپؐ کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے معمولی معمولی سی باتوں کو خصوصیات میں شمار کر کے خصائصِ نبوی کا ایک بڑا انبار لگا دیا ہے۔ مثلاً حافظ ابو سعید نیشاپوری نے شرف المصطفٰے میں آپؐ کے خصائص کی تعداد ساٹھ لکھی ہے۔ حافظ سیوطی نے

خصائص الکبریٰ میں اس پر سیکڑوں کا اور اضافہ کیا ہے، حالانکہ ان میں اکثر کا ماخذ، تاویلِ بعید، نکتہ آفرینی اور ضعیف روایتیں ہیں۔ بعض ایسی باتیں بھی خصائص میں شمار کرلی گئی ہیں، جو گو عام افرادِ اُمت کے لئے نہیں۔ لیکن اُمراء اور خلفائے اسلام کا اُن سے اتصاف یا تعلق جائز ہے۔

محدثین نے خصائص ذاتی کو یہ وسعت دی ہے کہ انہوں نے یہ اصول بنالیا ہے کہ حدیث قولی اور عملی میں اگر تصادم ہو تو حدیثِ قولی کو حدیثِ عملی پر ترجیح ہوگی۔ یعنی اگر ایک امر آنحضرتؐ کے قول سے ثابت ہے اور اس کے مخالف دوسرا آپؐ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے تو عام اُمت کو آپؐ کے ذاتی عمل کی تقلید کے مقابلہ میں آپؐ کے قول کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ عمل محض آپؐ کے لئے مخصوص، اور آپؐ کے خصائصِ ذاتی میں ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ انبیاءؑ دنیا میں اپنی اُمت کے لئے نمونہ اور عملی مثال ہی بن کر آتے ہیں۔ خصوصاً حضرت مقتدائے اعظم کہ ان کے متعلق فرمانِ الٰہی نے اعلان کردیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

اور تمہارے لئے (اے مسلمانو!) رسول اللہ میں بہترین اقتداء ہے

(الاحزاب : ۲۱)

تو جب آپؐ مقتدائے عالم اور امامِ اعظم بن کر آئے اور تمام لوگوں کو آپؐ کی تقلید اور پیروی کا حکم دیا گیا تو ایسی حالت میں آپؐ کا ہر فعل ہمارے لئے قابلِ تقلید اور لائقِ پیروی ہے۔ بے شبہ بعض امور ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو بحیثیت پیغمبر آپؐ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں۔ لیکن ضرورت ہے کہ دفعِ التباس اور رفعِ شک کے لئے ان تمام مخصوص امور کے متعلق ساتھ ساتھ یہ اعلانِ عام بھی کردیا جائے کہ یہ مخصوصاتِ نبویؐ ہیں اور

یہ عام امّت کے لئے نہیں ہیں۔ اس بنا پر اس کے تسلیم کر لینے سے چارہ نہیں کہ آنحضرتؐ کے جس قدر خصائص ذاتی تھے، شریعت نے اُن کو برملا واضح کر دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ یہ صرف آپؐ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لئے جن امور کے متعلق یہ تصریح موجود نہیں کہ یہ مخصوصاتِ نبویؐ میں ہیں۔ اُن کو ہرگز خصائص کے باب میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اور اس طرح یہ معلوم ہوگا کہ آنحضرتؐ کے جو خصائصِ ذاتی ہیں، وہ چند محدود امور ہیں اور کتاب و سنّت نے ان کا مخصوص ہونا عالم آشکارا کر دیا ہے۔



خصائص ذاتی

نبوّت اور لوازمِ نبوّت | سب سے پہلی چیز جو آپؐ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ مخصوص تھی اور جس کا کوئی حصّہ افرادِ اُمّت کو نہیں ملا وہ نبوّت اور اُس کے لوازم وحی، تشریع، اخبارِ الٰہی، نزولِ جبریلؑ، نسخِ احکام وغیرہ ہیں۔ یعنی آپؐ کے سوا نہ تو کسی فردِ اُمّت پر کوئی وحی آئی اور نہ آسکتی ہے، نہ کسی کو کوئی شریعت لانے اور نئے مذہبی قانون وضع کرنے کا اختیار ہے، نہ وہ بے گناہ اور معصوم ہے، نہ اللہ تعالےٰ سے سُن کر وہ خبر دے سکتا ہے، نہ اُس کے پاس قاصدِ الٰہی آسکتا ہے، وہ نہ احکامِ شرعی کو منسوخ کرسکتا ہے وغیرہ۔ صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو افرادِ اُمت کے لئے باقی ہیں، اور وہ رویائے صادقہ اور کشف و الہام ہیں۔

امورِ متعلقۂ نکاح | مسئلۂ نکاح میں آنحضرتؐ کے لئے چند امور مخصوص کردیئے گئے ہیں۔ جن کی رخصت عام اُمّت کے لئے نہیں۔

۱۔ عام مسلمان بشرطِ عدل صرف چار بیویاں ایک وقت میں رکھ سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ چار سے زیادہ رکھ سکتے تھے۔

۲۔ آنحضرتؐ کے لئے اس کی رخصت تھی کہ اگر کوئی عورت اپنی خوشی سے مہر کے بغیر آپؐ کی زوجیّت میں آنا چاہتی اور آپؐ اُس کو قبول کرنا چاہتے تو کرسکتے تھے۔ گو ایسا

واقع نہیں ہوا، لیکن افرادِ اُمّت کے لئے مہر کے بغیر نکاح ممکن ہی نہیں۔

یہ دو رخصتیں تھیں۔ لیکن اُن کے مقابلہ میں اس باب میں آپؐ پر کچھ قیدیں بھی تھیں۔ جو عام افرادِ اُمّت پر نہیں۔

۳۔ آپؐ پر وہی عورتیں حلال تھیں جن کو ادائے مہر یا بغیر مہر کے آپؐ اپنی زوجیّت میں اب تک لے چکے تھے۔ اور رشتہ کی بہنوں میں سے صرف وہی عورتیں آپؐ کی زوجیّت میں رہ سکتی تھیں جنہوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ عام مسلمانوں پر یہ قید نہ تھی۔

۴۔ عام مسلمان اہلِ کتاب کی عورتوں سے جنہوں نے گو اسلام نہ قبول کیا ہو، نکاح کر سکتے تھے اور کر سکتے ہیں۔ مگر آپؐ کو اس کی اجازت نہ تھی۔

۵۔ جو بیویاں آپؐ کے پاس تھیں، اُن میں سے اب کسی کو نہ آپؐ طلاق دے سکتے تھے اور نہ اُن کے بعد آپؐ اور کسی سے اب نکاح کر سکتے تھے۔

۶۔ آپؐ کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ ان بیویوں میں سے چند کو اپنے قریب کر لیں۔ اور باقی کو پیچھے کر دیں۔ چنانچہ آپؐ نے چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، زینبؓ اور اُمِّ سلمہؓ کو پاس رکھ لیا تھا، اور بقیّہ کو شرفِ زوجیت بخشنے کے ساتھ اپنے سے علیحدہ رکھا تھا، اور ان میں آپؐ ردّ و بدل بھی کر سکتے تھے۔

۷۔ آنحضرتؐ کی بیویوں کو آپؐ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے نکاح میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ	اور نہ یہ مناسب ہے کہ اپنے پیغمبر کی بیویوں سے اُس کے بعد کبھی

(الاحزاب : ۵۳)　　نکاح کرو۔

یہ تمام احکام سورۂ احزاب میں بتصریح تمام مذکور ہیں اور ان کی خاص وجوہ ومصالح ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عرب میں نکاح کی تعداد متعیّن نہ تھی۔ بلکہ بنی اسرائیل میں بھی اس کی تحدید نہ تھی۔ توراۃ میں ایسے انبیاءؑ اور بزرگوں کے نام بھی ہیں، جن کی متعدّد بلکہ سینکڑوں بیویاں تھیں۔ آنحضرتؐ نے پورے عہدِ شباب میں یعنی پچیس سال سے پچاس سال کی عمر تک صرف ایک بی بی (حضرت خدیجہؓ) پر کفایت کی۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک ساتھ دو نکاح کئے، حضرت سودہؓ سے جو کبیر السن تھیں اور حضرت عائشہؓ سے جو صرف چھ برس کی تھیں۔ اتنی چھوٹی لڑکی سے نکاح ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف دو خاندانوں میں محبت اور یک جہتی کی ترقی ہی کے لئے ہو سکتا تھا۔ مدینہ آکر آپؐ نے چند نکاح کئے۔ ان نکاحوں پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُن میں دو قسم کی عورتیں تھیں۔ ایک جو رؤسائے قبائل کی لڑکیاں تھیں اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لئے تعلّقات کی توسیع اور اضافہ تھا۔ حضرت عائشہؓ، صدیق اکبرؓ کی اور حضرت حفصہؓ فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت اُمّ حبیبہؓ، ابوسفیان رئیس بنی اُمیّہ کی بیٹی تھیں۔ حضرت جویریہؓ بنی مصطلق کی رئیسہ تھیں۔ حضرت صفیہؓ رئیسِ خیبر کی دختر تھیں۔

ازواج مطہراتؓ میں دوسری وہ بیوہ عورتیں تھیں جن کا سن زیادہ تھا اور گویا اس طرح اُن کی کفالت کا بار آپؐ نے اُٹھایا تھا۔ چنانچہ حضرت سودہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ اُمّ المساکین یہ سب بیوائیں تھیں۔ ایک اور بیوی حضرت زینب بنت جحشؓ تھیں، جو گو بیوہ نہ تھیں، لیکن مطلّقہ تھیں۔ اُن کے شوہر نے ان کو طلاق دے دی تھی۔ اس تفصیل سے آپؐ کی کثرتِ ازواج کے اسباب منکشف ہوئے ہوں گے

اس کی تصریح نہیں ملتی کہ سورۂ احزاب میں یہ مخصوص احکام کب نازل ہوئے۔ لیکن اس بنا پر کہ آپؐ نے آخری سے آخری نکاح حضرت میمونہؓ سے ۷ھ میں ادائے عمرہ کے زمانہ میں کیا ہے اور اس کے بعد[1] آپؐ کا کوئی نکاح ثابت نہیں، اس لئے ان احکام کے نزول کی تاریخ اسی ۷ھ کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ ۷ھ میں اسلام کی طاقت اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی اور خیبر، طائف اور مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا اور آنحضرتؐ کو ان تعلقات کے ذریعہ سے کسی نئے قبیلہ کو مطیع کرنے کی ضرورت نہ تھی اور نہ غریب سن رسیدہ مسلمان بیواؤں کی کفالت کی حاجت تھی۔

اس تمہید کے بعد یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام نے ازواجِ مطہراتؓ کو وقارِ نبوت کے برقرار رکھنے اور ان کو تمام تر احکامِ اسلامی کے نشر و اشاعت میں مصروف رہنے کا حکم دے کر ان کا آئندہ نکاح ناجائز قرار دیا اور اُن کو تمام مسلمانوں کی مائیں کا رُتبہ دیا (وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ[2]) اب ایسی حالت میں چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کا حکم نازل ہوتا ہے۔ اب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے سوا چارہ کا کیا ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ بیویوں پر محدود رہیں کہ اگر ان میں سے کچھ کو طلاق دے دی جائے تو چونکہ وہ دوسرے مسلمانوں کے نکاح میں نہیں آسکتیں اس لئے یہ ان پر صریح ظلم ہوتا۔ بنا بریں آنحضرتؐ کو موجودہ بیویوں کو آپؐ کی زوجیت میں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے، اور طلاق کی رخصت آپؐ سے سلب کر لی جاتی ہے۔ اور اُن محدود ازواج میں سے بھی چند کو قریب رکھنے اور بقیہ کو شرفِ زوجیت کے ساتھ علیحدگی (ارجاء) کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور آنحضرتؐ

---

[1] طبقات ابنِ سعد، جز نساء۔ [2] الاحزاب: ۶۔

چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حصہ حفصہؓ، حضرت امِ سلمہؓ، حضرت زینبؓ کو اختیار کرتے ہیں۔ اور حضرت سودہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت اُمِ حبیبہؓ سے ارجاء کرتے ہیں[1]

کتابیہ سے آنحضرتؐ کو اس لئے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی کہ نبوتِ محمدیؐ پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے امورِ دین میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ اس کو محرمِ راز ہونے کا شرف بخشا جاسکتا تھا۔

نمازِ شبانہ شروع میں جب نماز پنجگانہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، مسلمانوں پر رات کی نماز (تہجد) فرض تھی۔ اس کے بعد معراج میں جب پانچ وقت کی نماز فرض ہوگئی تو تہجد کی نماز عام اُمت پر فرض نہیں رہی، بلکہ صرف مستحب رہ گئی۔ لیکن خود آنحضرتؐ کے لئے یہ نماز شبانہ فرض مزید کے طور پر باقی رہی۔ چنانچہ آنحضرتؐ پوری پابندی کے ساتھ اس کو ادا کرتے تھے۔ یہی وہ نماز تھی، جس میں دیر تک کھڑے رہنے سے پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل جو معراج کا سورہ ہے۔ اس میں نماز پنجگانہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○	اور رات کے حصہ میں بیدار ہوکر نماز پڑھ یہ تیرے لیے مزید ہے۔ قریب ہے کہ تیرا پروردگار تجھ کو مقامِ محمود (مرتبۂ شفاعت) میں اُٹھالے۔
بنی اسرائیل ۷۹)	

نمازِ چاشت اور قربانی اسی طرح چاشت کے وقت نماز عام مسلمانوں کے لئے نفل

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر سورۂ احزاب جلد بست و دوم۔

ہے، مگر احادیث میں ہے کہ یہ نماز آپؐ پر بمنزلۂ فرض کے تھی اور اسی کے ساتھ قربانی کا حکم بھی۔ غالباً یہ حدیثیں سورۂ کوثر کی تفسیر میں ہیں:

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ	اے پیغمبر! میں نے تجھے کوثر عطا کیا۔
لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝	تو تو (اس کے شکرانے میں) اپنے رب
(الکوثر: ۱-۲)	کی نماز (چاشت) پڑھ اور قربانی کر۔

مگر یہ بطریقِ صحاح مذکور نہیں، اسی لئے ہمیں ان کو خصائص نبویؐ میں شمار کرنے میں اب بھی تامل ہے۔

عصر کے بعد نماز دوگانہ | عام اُمّت کے لئے نمازِ عصر کے بعد سے غروب تک نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ مگر آنحضرتؐ کو آخر میں بعض ازواجِ مطہراتؓ نے عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا۔ دریافت کیا تو فرمایا کہ "ایک وفد کی ملاقات میں ظہر کے بعد کی دو رکعتیں مجھ سے رہ گئی تھیں، یہ میں ان کی قضا پڑھتا ہوں[1]۔" عام اُمّت کے لئے تو اُس کی قضا واجب بھی نہ تھی۔ اگر ہوتی تھی تو ایک دفعہ قضا پڑھ لینا کافی تھا۔ مگر آپؐ نے اپنے لئے ایک نمازِ سنّت کے ترکِ عمد کی تلافی کی شاید آخر عمر تک کوشش کرتے رہے۔

صومِ وصال | یعنی کئی کئی دن کا متّصل افطار کئے بغیر روزہ رکھنا عام اُمّت کے لئے ممنوع ہے۔ لیکن آنحضرتؐ کئی کئی دن کا روزہ رکھتے تھے اور بیچ میں افطار کے وقت کچھ کھاتے پیتے نہ تھے۔ بعض صحابہؓ نے آپؐ کی پیروی میں اس طرح کا روزہ رکھنا چاہا تو آپؐ نے روک دیا۔ اور فرمایا "تم میں کون میری طرح ہے، مجھ کو میرا پروردگار کھلاتا اور

---

[1] بحوالہ خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم۔ [2] ابوداؤد، ترمذی باب الصلوٰۃ بعد العصر۔

سیراب کرتا ہے۔[1]"

صدقہ وزکوٰۃ کھانے کی حرمت آنحضرتؐ اور اہلِ بیت پر کئی کئی دن کے فاقے گذر جاتے تھے۔ عام مسلمان غربت اور تنگ دستی کی حالت میں اس سرمایہ سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ مگر آپؐ نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس مد کی ہر شئے حرام کر دی۔ اور کبھی صدقہ کا مال ذاتی صرف میں لانا گوارا نہ فرمایا۔ یہاں تک کہ اگر حسنین علیہما السلام لڑکپن کے اقتضا سے صدقہ وزکوٰۃ کی کوئی کھجور بھی اپنے مُنہ میں ڈال لیتے تھے تو آپؐ اُگلوا دیتے تھے۔[2] اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ "یہ لوگوں کے مال و دولت کا میل ہے۔ اس کا لینا اہلِ بیتِ نبوّت کو روا نہیں۔[3]" چنانچہ سادات کے لئے قیامت تک اس قسم کے صدقات کا لینا جائز نہیں۔ آپؐ کے پاس جب کوئی ناواقف شخص کوئی چیز لے کر جاتا تھا کہ اس کو آپؐ کی خدمت میں پیش کرے تو آپؐ دریافت فرما لیا کرتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا تحفہ؟ اگر تحفہ کہتا قبول فرماتے اور اگر معلوم ہوتا کہ صدقہ ہے تو اجتناب فرماتے۔[4] اس طرح آنحضرتؐ نے مخالفین کی اِس بدگمانی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا کہ پیغمبر اسلامؐ کی صدقہ وخیرات کی اس تاکید کا مقصود (نعوذ باللہ) اپنی اور اپنے خاندان کی دائمی پرورش کا سامان تھا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتصام۔ [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الزکوٰۃ [3] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ [4] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ و صحیح بخاری کتاب الہدایا۔

خصائص نبویؐ

خصائص نبوی کا شمار دیگر انبیاءؑ کے مقابلہ میں جس قدر خصائص آپؐ کو عطا ہوئے ہیں وہ متعدد معتبر حدیثوں میں مختلف تعدادوں میں نام بنام خود زبانِ اقدس سے ادا ہوئے ہیں۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ مجھے رُعب اور دھاک کے ذریعہ سے فتح و نُصرت دی گئی۔ میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لئے حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا۔ مجھ سے پہلے انبیاءؑ خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام دُنیا کے لئے مبعوث[1] ہُوا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرتؐ کی زبانی چھ باتیں گنائی ہیں۔ مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے۔ رعب و داب سے نُصرت دی گئی۔ مالِ غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا۔ تمام روئے زمین میرے لئے مسجد بنی۔ میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی۔ انبیاءؑ کا سلسلہ میری ذات پر ختم ہُوا۔[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب جعلت لی الارض کلہا مسجدًا و کتاب التیمم و صحیح مسلم باب المساجد و نسائی باب التیمم [2] صحیح مسلم باب المساجد، ترمذی کتاب السیر و نسائی۔

احادیث کی دیگر روایتوں میں بعض اور خصائص بھی زبانِ اقدس سے بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ میرا معجزۂ وحی قیامت تک کے لیے ہے، میرے پیرو تمام انبیاءؑ سے زیادہ ہیں، میری نبوّت اوّلین ہے، مجھ کو فلاں فلاں سورتیں دی گئیں جو کسی اور کو نہیں ملیں، فلاں فلاں وقت کی نمازیں خاص میری اُمّت کے لیئے فرض ہوئیں، مگر حقیقت میں ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو انہی چھ عنوانوں کے تحت میں کسی نہ کسی حیثیت سے مندرج ہیں۔ سورتوں کی خصوصیّت جوامع الکلم میں داخل ہے۔ بعض نمازوں کے اوقات کا اضافہ ختمِ نبوّت کے مدارج کے اندر ہے۔ قرآن مجید میں آپؐ کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئی ہیں۔ وہ ان سب کو جامع ہیں۔ یعنی تکمیلِ دین اور ختمِ نبوّت۔ بہر حال اجمال کو چھوڑ کر ذیل میں ہم کو نمایاں خصوصیات پر قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک تفصیلی نظر ڈالنا ہے۔

رعب و نُصرت | آنحضرتؐ سے پہلے جو انبیاءؑ دنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے۔ یا وہ بظاہر کمزور اور بے یار و مددگار تھے اور ان کو دنیاوی طاقت کا کوئی حصّہ عطا نہیں ہُوا تھا اور پیغمبروں کی بڑی تعداد ایسی ہی تھی۔ دوسرے وہ انبیاءؑ ہیں، جن کو دنیا کی ظاہری طاقت بھی ملی تھی اور وہ صرف چند ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام، حضرت داؤد علیہ السّلام اور حضرت سلیمان علیہ السّلام۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی نام نامی کے رُعب اور ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا۔ اور تاریخ اس بیان پر شاہد ہے۔ آنحضرتؐ کا آغاز گو ایّوبی بے چارگی اور مسیحی غربت سے ہُوا۔ مگر انجامِ موسوی طاقت، داؤدی سلطنت اور سلیمانی شان و شکوہ پر ہُوا۔ اور ان سب سے مافوق یہ تھا کہ آپؐ کی تمام تر قوّت، طاقت، رعب و ہیبت سب خدا کی راہ میں صرف ہوئی۔ اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا، بھولوں نے یاد کیا، سُننے والوں نے آواز دی۔ یہ اثر پیدا ہوا کہ آپؐ جس راستہ سے نکل جاتے گنہگار اور مُجرم سرِ اطاعت خم کر دیتے اور اپنی

سیہ کاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے تھے۔

متعدّد حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے فتح و نصرت رعب و ہیبت کے ذریعہ بخشی گئی۔ یہاں تک کہ میری دھاک ایک مہینہ کی مسافت تک پر کام کرتی ہے[1]۔" علامہ ابنِ خلدون نے مقدّمہ میں فنونِ جنگ پر بحث کرتے ہوئے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی ایک فریق کو جو فتح ہوتی ہے وہ اُسی وقت ہوتی ہے۔ جب دوسرے فریق پر پہلے کی خداداد مرعوبیّت چھا جاتی ہے۔

آنحضرتؐ کے اسمِ گرامی کو یہ شرف اس لئے عطا ہوا تاکہ مزید خونریزی کے بغیر ملک میں امن و امان اور سکون و اطمینان پیدا ہو جائے اور صدائے حق کے لئے راستہ صاف ہو۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس وصف کو عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا:

سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ	عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔

(الانفال: ۱۲)

چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے شہادت دی:

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ	اور خدا نے اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

(الاحزاب: ۲۶، الحشر: ۲)

چنانچہ بڑے بڑے دل گردہ کے بہادر زہر میں تلواریں بجھا بجھا کر آئے۔ مگر جب روئے روشن پر نظر پڑی کانپ کر رہ گئے۔ بڑے بڑے سرکش قبائل آپؐ کا نام سُن کر دم بخود ہو جاتے تھے۔ مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرماں روائی

---

[1] صحیح بخاری و مسلم عن ابی ہریرہ و احمد و ابن ابی شیبہ و بیہقی و بزار عن علیؓ۔

کرتے تھے اور جن کو اپنی فوجی قوت اور جنگی سامانوں پر بڑا ناز تھا جب انہوں نے سرتابی کی، بے لڑے بھڑے آپؐ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی۔ خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے، جب ایک صبح کو ان کے قلعوں کے سامنے دفعتہً کوکبۂ اسلام طلوع ہوا تو اُن کے منہ سے چیخ نکل گئی کہ "محمدؐ کا لشکر"!! ابوسفیان جو بارہا ایک فریقِ مقابل کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا، فتح مکہ کے دِن جب حضرت عباسؓ اس کو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الٰہی کا نظارہ دکھا رہے تھے اور رنگ برنگ کے علَم نگاہوں کے سامنے سے گذر رہے تھے تو ہر نئے دستہ اور نئے علَم کو دیکھ کر کانپ کانپ جاتا تھا۔

باایں ہمہ اس مجسمہ ہیبت کا حال کیا تھا۔ ناآشنا ڈرتے تھے اور وہ اُن کو تسکین دیتا تھا۔ بے خبر اُس سے رعب کھاتے تھے اور آگاہ پروانہ کرتے تھے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ	محمد رسول اللہؐ اور ان کے ساتھی
مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ	کافروں پر بھاری اور آپس میں
بَيْنَهُمْ	رحم دل ہیں۔

(الفتح : ۲۹)

ایک بدوی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی کانپ گیا۔ فرمایا ڈرو نہیں میں بادشاہ نہیں۔ میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔[1] حضرت مخرمہؓ صحابی نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ آنحضرتؐ زنان خانہ میں ہیں۔ آپؐ کو آواز دو۔ وہ ہچکچانے لگے۔ باپ نے کہا: "جانِ پدر! محمدؐ

---

[1] شمائل ترمذی۔

جبّار نہیں[1] یہ ہیبت، یہ وقار، یہ دبدبہ، یہ رعب تیغ و سنان کی چمک، فوج و عسکر کے تلاطم جلّادوں کی صف بندی اور تیغ بکف سپاہیوں کی نمائش سے نہیں پیدا ہوا بلکہ ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت ایں مردِ صاحب دلق نیست

(روم)

سجدہ گاہِ عام | اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں، وہ اپنے مراسم عبادت کے ادا کرنے کے لئے چند گھری ہوئی چہار دیواریوں کے محتاج ہیں، گویا ان کا خُدا انہی کے اندر بستا ہے۔ یہود اپنے صومعوں اور قربان گاہوں سے باہر نہ خدا کو پکار سکتے ہیں اور نہ قربانی کے نذرانے پیش کر سکتے ہیں۔ عیسائی اپنے کنیسوں کے بغیر خدا کے آگے نہیں جھک سکتے۔ یہاں تک کہ بُت پرست قومیں بھی اپنے بت خانوں ہی کی چہار دیواریوں کے اندر اپنے دیوتاؤں کو خوش کر سکتی ہیں۔ لیکن اسلام کے عالمگیر مذہب کا خدا اس آب و گل اور سنگ و خشت کی چہار دیواریوں میں محدود نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور ہر جگہ سے پکارا جا سکتا ہے۔ کوہ و صحرا، خشکی و تری، مسجد و کنشت[2] ہر جگہ اس کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ جس طرح مسجدوں کے اندر ہے، مسجدوں کے باہر بھی ہے۔ اس کی قربانی مشرق و مغرب ہر جگہ گزاری جا سکتی ہے۔

اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط — جدھر مُنہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا مُنہ ہے۔

(البقرۃ: ۱۱۵)

ع - ہر جا کنم سجدہ بآں آستاں رسد

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم [2] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ فی البیعۃ میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اُن گرجاؤں میں جن میں تصویریں نہ ہوتیں نماز پڑھ لیتے۔

آپؐ نے فرمایا کہ "میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی"[1]۔ یہ مسئلہ ہر چند ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کے اندر وہ صداقت پنہاں ہے جو اسلام کی عالمگیری اور اس کے آخری مذہب ہونے کا اعلانِ عام کرتا ہے۔

پیرووں کی کثرت دنیا میں لاکھوں پیغمبر آئے، مگر آج دنیا میں ان کی تعلیم و ہدایت کی ایک یادگار باقی نہیں۔ یہاں تک کہ تاریخ کے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں۔ وہ انبیاءؑ جن کے صرف حالات معلوم ہیں، ان کی نسبت وہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنے والے چند سے آگے نہ بڑھ سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک ایک پیغمبر کا کارنامہ دیکھ جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا ایک بھی ایسا نہ ملے گا جس کے ماننے والے سو بھی ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوششوں کی جولان گاہ صرف بنی اسرائیل کے چند ہزار نفوس تھے۔ جو قدم قدم پر راہِ حق سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں۔ کہیں گوسالے کو پوجتے ہیں۔ کہیں خدا کو ان آنکھوں دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ کہیں سرفروشی اور جانبازی سے گھبرا کر میدانِ جنگ میں جانے سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزانہ کارنامے صرف اسی قدر اثر دکھاتے ہیں کہ چند دہائی انسان اُن کی شیریں گفتاری کا دم بھرتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ مرغ بانگ دے ابنِ آدم کو دشمنوں کے پنجہ میں اسیر کراتے ہیں اور تین دفعہ اُس کے پہچاننے سے منکر ہوتے ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ کا یہ حال ہے کہ مکہ کی گلیوں میں آپؐ نے تن تنہا، بے یار و مددگار متلاشیانِ حق کو صدائے توحید دی۔ جواب میں ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی۔ لیکن تینتیس سال نہ گزرنے پائے تھے کہ ریگستانِ عرب کا ذرّہ ذرّہ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے پُرشور ہو گیا۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و نسائی و ترمذی باب المساجد۔

اور جب آپؐ نے اسی مکہ کی سرزمین کے لئے حجۃ الوداع کا اعلان کیا تو کم و بیش ایک لاکھ جان نثار و فداکار دائیں بائیں کھڑے تھے۔

صحیح مُسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جس قدر میری نبوّت کی سچّائی کا اعتراف کیا گیا کسی اور پیغمبر کی سچائی کا نہیں کیا گیا کہ بعض انبیاءؑ ایسے بھی ہیں جن کو سچّا کہنے والا ان کی اُمّت میں صرف ایک ہی نکلا۔[1] صحیحین میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ایک دفعہ مجھ پر (عالم مثال میں) قومیں پیش کی گئیں۔ بعض پیغمبر ایسے تھے کہ ان کے پیچھے صرف ایک ہی دو آدمی تھے۔ بعض تنہا ہی تھے۔ اُن کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ اتنے میں ایک بڑی بھیڑ نظر آئی خیال ہُوا کہ یہ میری اُمّت ہوگی تو بتایا گیا کہ یہ موسیٰ علیہ السّلام اور اُن کی قوم ہے۔ پھر کہا گیا کہ دوسرے کنارہ کی طرف دیکھو! تو اتنا سوادِ عظیم نظر آیا کہ اس سے افق چھپ گیا۔ پھر کہا گیا کہ اسی طرح اِدھر دیکھو۔ بڑی تعدادِ کثیر دکھائی دی۔ کہا گیا کہ یہ سب تیری اُمّت ہے"[2]۔

دعوتِ عام | محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں اور حلقہ بگوشوں کی کثرتِ تعداد کا ایک اور سبب یہ ہے کہ آپؐ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے، وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے۔ ان کی دعوت عام نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی گلّہ بانی تک محدود رکھا۔ لیکن آنحضرتؐ کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور ہر جنس کی طرف ہوئی۔ کالے، گورے، رومی، حبشی، عرب، عجم، ترک، تاتار، چینی، ہندی، سب آپؐ میں برابر کے حق دار ہیں۔ قرآن نے کہا:

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان [2] صحیح مسلم کتاب الایمان و بخاری کتاب الطب و باب وفاۃ موسیٰؑ و کتاب الرقاق۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا: ۲۸)

اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ (الفرقان ۱)

بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن اُتارا تاکہ وہ تمام دنیا کو ہوشیار کرے۔

صحیحین میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مجھ سے پہلے نبی خاص اپنی قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں"[1]۔ اس معنی کی بکثرت روایتیں حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں۔ اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ۔ سب کے پیروؤں کو اس کی زندگی میں خود اُسی کے قوم وملک کے اندر محدود پاؤ گے۔ لیکن آپؐ کے حلقہ بگوشوں میں خود آپؐ کی زندگی میں عرب کے علاوہ سلمان عجمیؓ، صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ سب کو پاؤ گے۔ سلاطینِ عالم کے نام آپؐ کا دعوت نامہ بھی اسی تعمیم دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔

جوامع الکلم | دنیا میں کئی آسمانی صحیفے اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ مگر ان میں ایک کے سوا وصفِ جامعیت سے سب محروم ہیں۔ توراۃ اقوام کی تاریخ اور احکام وقوانین کا مجموعہ ہے۔ عقیدۂ توحید ورسالت کے سوا تمام دیگر ضروری عقاید سے اور رسم قربانی کے علاوہ تمام دیگر مسائلِ عبادات سے اور چند معمولی باتوں کو چھوڑ کر تمام دقائق اخلاق سے یکسر خالی ہے۔ زبور صرف دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے۔ سفر ایوبؑ

---

[1] بخاری ومسلم، کتاب المساجد۔

میں صرف عقیدۂ تقدیر و رضا کی تعلیم ہے۔ مثالِ سلیمان صرف مواعظ و حِکم ہیں۔ دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے صرف توبہ و ندامت، پیشین گوئی اور ماتم ہیں۔ انجیل کا صحیفہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت اور تعلیماتِ اخلاقی کا مجموعہ ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صحیفہ ملا وہ جوامع الکلم ہے۔ یعنی وہ تمام باتوں کا جامع ہے۔ وہ توراۃ بھی ہے۔ زبور بھی اور انجیل بھی اور کچھ ان سے زیادہ بھی۔ اس لئے آپؐ نے اپنے خصائص میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے"[1] بیہقی میں[2] حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مجھے توراۃ کی جگہ سبع طوال (سات بڑی سورتیں) اور زبور کی جگہ مئین (تقریباً سو آیتوں والی سورتیں)، انجیل کے قائم مقام مثانی دی گئیں۔ اور سُوَرِ مفصلات[3] زیادہ ملیں۔ ابونعیم میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے۔ کہ "مجھے مثانی توراۃ کی جگہ، مئین انجیل کی جگہ، حوامیم زبور کی جگہ اور مفصلات علاوہ بریں ملیں"[4]

اس لئے قرآن مجید توراۃ، زبور اور انجیل کو جامع ہے اور اُن کے سوا کچھ اور بھی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاعتصام و باب التعبیر و مسلم کتاب المساجد [2] بحوالہ خصائص کبریٰ جلد دوم [3] سبع طوال، مئین اور مفصلات، قرآن مجید کی کئی کئی سورتوں کے مختلف مجموعوں کے نام ہیں [4] ابونعیم عن ابی عباس (بحوالہ خصائص سیوطی جلد دوم) دوسری روایت کے الفاظ پہلے سے زیادہ قرین قیاس ہیں۔ کیونکہ مثانی اور سبع طوال ہماری تحقیق میں ایک ہی ہیں۔ اور پہلی روایت میں اُن کو دو بتایا گیا ہے۔ حالانکہ خود قرآن نے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (مثانی کی سات سورتیں) کہا ہے۔ حوامیم وہ سورتیں ہیں جن کے شروع میں حٰمٓ ہے۔ سبعا من المثانی کی تفصیل میں روایات اور علماء کی تشریحات میں بہت سے اختلافات ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سبعا من المثانی سورہ فاتحہ کو کہا گیا ہے جس میں سات آیتیں ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وہ تاریخ اقوام بھی ہے، اخلاق و مواعظ بھی ہے، دُعا و مناجات بھی ہے۔ اس میں دینِ کامل کے تمام عقائد ہیں، تمام مراسمِ عبادات ہیں، تمام معاملات کے احکام و قوانین ہیں۔ اس میں ایک مسلمان کی زندگی کے ہر دور اور ہر شعبہ کے لئے کامل ہدایات اور صحیح تعلیمات موجود ہیں۔ صرف توراۃ کے اسفارِ خمسہ یہود کی مذہبی زندگی کا کامل مجموعہ نہیں۔ صرف انجیل عیسائیوں کی مذہبی حیات کا مکمل سرمایہ نہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے عقاید و عبادات بھی ان کے صحیفوں کے رہینِ منّت نہیں اور وہ اُن کی صحیح تعلیم سے یکسر خاموش ہیں۔ لیکن اسلام قرآن سے باہر کچھ نہیں، باہر جو کچھ ہے (احادیث) اُس کی عملی توضیح و تفسیر ہے۔ وہی تنہا مسلمانوں کی ہر ضرورت کا کفیل اور ہر سوال کا مجیب ہے اور اسی لئے اُس کے پیروِ کامل حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ (ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے) کا نعرۂ فخر بلند کرتے ہیں۔

قرآن جوامع الکلم ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کے اندر سیکڑوں لطائف ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ سے متکلّمین اور فقہاؔ نے چند در چند مسائل نکالے ہیں اور صوفیہ اور اربابِ حال نے متعدد نکتے پیدا کیے ہیں۔ تاہم اُس کی لطافتوں اور نزاکتوں کا خاتمہ نہیں ہُوا اور اس کی جوامع الکلمی کا حصر نہ ہو سکا۔

تکمیلِ دین | اسلام کا صحیفہ جب ایسا جامع ہے تو یقیناً وہ دین بھی جس کو لے کر وہ آیا، کامل ہوگا۔ قرآن مجید نے آنحضرتؐ کی وفات کے قریب عین مسلمانوں کے اجتماعِ عظیم کے دن (حجۃ الوداع) یہ اعلان عام کیا:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج کے دن میں نے تمہارے لئے
وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ	تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت

لہ صحیح بخاری ذکر مرضہ و وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسلم، کتاب الوصیۃ۔

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ (المائدۃ: ۳) — پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمہارے لئے پسند کیا۔

اسلام قرآن کے عقیدہ کے مطابق اُس صحیح مذہب کا نام ہے جو اپنے اپنے وقت میں ہر پیغمبر کو عطا ہوا اور عہد بعہد دنیا کی عُمر کے ساتھ مختلف پیغمبروں کے ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچتا رہا۔ یہاں تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کی تکمیل پر وہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ کر تمام ہو گیا۔ اور یہ منصبِ خاص صرف آپؐ کی ذاتِ پاک کے لئے روزِ ازل سے مقدّر ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ انا خاتم النبیین و آدم منجدل فی طینتہ[1] (میں پیغمبرِ آخر تھا اور آدمؑ ابھی آب و گِل میں پڑے تھے) آنحضرتؐ نے ایک بلیغ تمثیل میں اسلام کی تکمیل دین کی تشریح فرمائی ہے۔ فرمایا "میری اور دوسرے انبیاءؑ کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی۔ لوگ اس کے اندر جاتے ہیں اور اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن دیکھتے ہیں کہ اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے۔ تو میں وہ آخری اینٹ ہوں[2] عمارت دین و نبوّت ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک پیغمبر کا وجود اور اس کا دین و شریعت ہے اور اس کی تکمیل کا آخری پتھر نبی اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجودِ اقدس ہے۔

دائمی معجزہ | وہ دین جو مختلف انبیاءؑ کی وساطتوں سے دنیا میں آتا رہا چونکہ وہ محدود زمانوں کے لئے آیا، کیا اس لئے اُن کے معجزے بھی محدود الوقت تھے یعنی ایک خاص وقت میں پیدا ہوئے اور مٹ گئے۔ اب عصائے مُوسیٰؑ۔ یدِ بیضا، لحنِ داؤدؑ، تعبیرِ یوسفؑ، ناقۂ

---

[1] مستدرک حاکم تفسیر سورۂ احزاب۔ [2] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی باب خاتم النبیین۔

ہودؑ۔ نفسِ عیسیٰؑ کا کہاں پتہ ہے۔ لیکن جو دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا، کامل تھا۔ اور قیامت تک کے لئے آیا تھا۔ بنا بریں اس کے لئے ایک دائمی اور مستقل معجزہ کی ضرورت تھی اور وہ خود صحیفۂ اسلام ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کہ "ہر نبی کو وہ معجزہ ملا جس پر اس کی اُمّت ایمان لائی۔ لیکن جو مجھے ملا وہ وحی ہے، جو خدا نے بھیجی۔ تو مجھے امید ہے کہ میرے پیرو تمام انبیاءؑ سے زیادہ ہوں گے۔" یہ خیالِ مُبارک اسی لئے تھا کہ آپؐ کا معجزۂ وحی قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے اِس کو دیکھنے والے اور اِس پر ایمان لانے والے سب سے زیادہ ہوں گے۔ دوسرے انبیاءؑ کے صحیفے بجائے خود معجزہ نہ تھے۔ اسی لئے وہ تحریف و تغیّر سے پاک نہیں رہے اور قرآن دین کا کامل صحیفہ، خاتم الانبیاء کی وحی اور دائمی معجزہ بن کر آیا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ کے لئے اپنی حفاظت کا سامان اپنے ساتھ لایا۔ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ[2] (اور ہم ہیں اس کے محافظ)

ختمِ نبوّت | یہ رعب و نُصرت، یہ پیروؤں کی کثرت، یہ سجدہ گاہِ عام، یہ اعجازِ دوام، یہ جوامع الکلمی، یہ دعوتِ عمومی، یہ تکمیلِ دین، یہ آیاتِ مبین خود اِس بات کے دلائل ہیں کہ آپؐ کے وجودِ اقدسؐ پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں کا خاتمہ ہو گیا اور نبوّت اور رسالت کا سلسلہ منتہی ہو گیا اور اب دنیا کسی نئے آنے والے وجود سے مستغنی ہو گئی۔ اسی لئے قرآن پاک نے عہدِ نبوّت کے سب سے بڑے مجمع میں یہ اعلانِ عام کیا کہ۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاعتصام و صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ [2] الحجر: ۹۔

لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ط (المائدۃ: ۳)

لئے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا

یہ آیت جو نوذی حجہ ۱۰ھ کو نازل ہوئی، اس بات کی بشارت تھی کہ نبوت جس کا مقصد دین کی عمارت میں کسی نہ کسی اینٹ کا اضافہ تھا، وہ آج تکمیل کو پہنچ گئی۔ لیکن اس سے پہلے ۵ھ میں بھی یہ بشارت ان الفاظ میں گوش گذار ہو چکی تھی:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ط (الاحزاب: ۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن خدا کے پیغمبر اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔

ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے[1] اسی سے اس کے دوسرے معنی "کسی شئے کو بند کر کے اس پر مہر کرنے کے ہیں" جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر آگئی ہے۔ چونکہ یہ عمل مُہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے، اس کے معنی انتہا اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ معنی مستعمل ہوئے ہیں۔ مثلاً

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ (یٰسٓ: ۶۵)

آج (قیامت کے دن) اُن کے مُنہ پر مہر لگا دیں گے (یعنی بند کر دیں گے کہ بول نہ سکیں)۔

---

[1] دیکھو لسان العرب و صحاح جوہری و اساس البلاغۃ زمخشری۔

یہاں ختم کے معنی "بند کر دینے" کے بالکل ظاہر ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	خدا نے ان (کافروں) کے دلوں پر مُہر
(البقرۃ: ۷)	لگا دی ہے (یعنی اُن کے دلوں کے
	دروازے بند کر دیئے)۔

کہ باہر سے جو نصیحت اور ہدایت کی باتیں وہ سنتے ہیں، وہ اُن کے دلوں کے اندر نہیں گھستیں اور بے اثر رہتی ہیں۔

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ	اور خدا نے اس کے کان پر اور دل پر
(الجاثیۃ: ۲۳)	مُہر لگا دی (یعنی اس کے کان اور دل بند
	کر دیئے)

کہ اُس کے کان کے اندر دعوتِ رسول کی آواز، اور اس کے دِل کے اندر اُس آواز کا اثر نہیں جاتا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝	اہلِ جنّت پلائے جائیں گے وہ شراب
(المطففین: ۲۵)	جس پر مُہر لگی ہوگی۔

وہ سربمہر یعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ خالص شراب ہے۔ یہ کھُلی نہیں کہ اُس کے اندر کی خوشبو باہر نکل گئی ہو اور نہ اس کے اندر باہر سے کوئی چیز کسی نے ملا دی ہے، جس سے اس کی تیزی کم ہو گئی ہو۔ اسی کے بعد یہ آیت ہے:۔

خِتَامُهٗ مِسْكٌ ؕ	اس کی مُہر مشک ہوگی (یا) اس شراب
(المطففین: ۲۶)	کا آخر مشک ہوگا۔

یعنی اس کے ہر گھونٹ کے پینے کے بعد مشک کی بو اُس میں سے نکلے گی۔ یا یہ معنی

کہ بوتل یا صراحی کا منہ غایتِ صفائی اور نزاہت کی غرض سے دنیا کی طرح مٹی، لاکھ یا موم کے بجائے مشکِ خالص سے بند ہوگا۔

بہر حال ان تمام استعمالات سے یہ بالیقین معلوم ہوگا کہ اس لفظ کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں۔ لفظ خاتم کی دو قرأتیں ہیں۔ مشہور قرأت[1] تو خاتِم (بکسر تاء) کی ہے۔ جس کے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہوئے اور دوسری قرأت خاتَم کی ہے۔ جس کے معنی ہیں "وہ شئے جس کے ذریعہ سے کوئی شئے بند کی جائے اور اس پر مُہر لگائی جائے تاکہ وہ کھولی نہ جاسکے اور نہ اس کے اندر کوئی چیز باہر سے جاسکے"۔ الغرض دونوں حالتوں میں آیتِ پاک کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا کہ آپؐ کا وجود پیغمبروں کے سلسلہ کو بند کرنے والا اور اُن پر مہر لگا دینے والا ہے کہ پھر آیندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہوسکے۔

آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ تمہارے وہ ظاہری باپ نہیں ہیں جس کے رشتہ کی بنا پر وراثت اور حرمتِ نکاح وغیرہ کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ روحانی باپ (رسول اللہؐ) اور سب سے آخری روحانی باپ (خاتم النبیینؐ) ہیں۔ اس لئے باپ ہونے کے ظاہری احکام کے بغیر آپؐ سے وہی پدرانہ محبت رکھنی چاہیئے۔ اور اسی طرح آپؐ کی پدرانہ اطاعت کرنی چاہیئے۔

احادیث صحیحہ میں لفظ خاتم النبیین کی تشریح بالکل صاف اور واضح ہے۔ مسند احمد میں حضرت ثوبانؓ اور حضرت حذیفہؓ اور ترمذی[2] میں صرف حضرت ثوبانؓ

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری و تفسیر ابن حیان اندلسی، تفسیر آیت مذکور۔ [2] مسند احمد جلد پنجم [3] مسند احمد جلد پنجم، اس روایت میں ۳۰ تعداد لکھی ہے جن میں چار عورتیں ہوں گی۔ [4] کتاب الفتن حدیث حسن صحیح۔

سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تیس کے قریب جھوٹے نبی پیدا ہوں گے :

و انی خاتم النبیین لا نبی بعدی	بہ تحقیق میں نبیوں کا خاتم ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

لا نبی بعدی خاتم النبیین کی تفسیر و تشریح ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاتم النبیین کے یہی معنی ہیں کہ آپؐ کے بعد پھر کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپؐ نے تکمیل دین اور ختم نبوت کی جو مشہور تمثیل بیان کی ہے اور جس کو ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں، اس سے بھی لفظ خاتم النبیین کی پوری تفسیر ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "میری اور دیگر انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی عمدہ محل بنوایا ہو۔ لوگ اس کو آکر دیکھتے ہیں اور اس کی عمدگی اور خوبصورتی پر عش عش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے تو کہتے ہیں۔ کہ اگر یہ اتنا ناتمام نہ رہ جاتا تو خوب ہوتا۔" اس کے بعد مختلف روایتوں میں حسب ذیل الفاظ ہیں:

فانا تلك اللبنة[1]	تو میں وہی آخری اینٹ ہوں
فانا تلك اللبنة و انا خاتم النبیین[2]	تو میں وہی آخری اینٹ ہوں اور سب پیغمبروں کا خاتم ہوں۔
فانا موضع اللبنة فجئت فختمت الانبیاء[3]	تو اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں۔ میں آیا تو پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا۔
و انا فی النبیین موضع تلك	میں پیغمبروں میں اسی آخری اینٹ

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب خاتم النبیین [2] صحیح بخاری باب خاتم النبیین و صحیح مسلم عن ابی ہریرۃؓ و عن ابی سعید الخدریؓ باب خاتم النبیین [3] صحیح مسلم، باب مذکور عن جابرؓ

اللبنۃ[1] کی جگہ ہوں۔

آنحضرتؐ نے دیگر انبیاءؑ کے مقابلہ میں اپنے جو مخصوص فضائل گنائے ہیں۔ اُن میں ایک ختمِ نبوّت بھی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم (کتاب المساجد)، ترمذی (کتاب السیر باب الغنیمہ) اور نسائی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

وختم بی النبیون۔ اور انبیاءؑ مجھ سے ختم کئے گئے

سنن دارمی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

وانا خاتم النبیین ولا فخر اور پیغمبروں کا خاتم ہوں اور اس پر

(باب ما اکرم اللہ نبیہ) فخر نہیں۔

آپؐ کا خاتمِ نبوّت ہونا کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ یہ آپؐ کی وہ خصوصیت تھی جو آپؐ کے لئے روزِ اوّل سے مقرر ہو چکی تھی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:[2]

انا عبد اللہ وخاتم النبیین۔ مَیں خدا کا بندہ اور خاتم انبیاء تھا اور

وآدم منجدل فی طینتہ۔ آدمؑ ہنوز اپنے عنصر خاکی میں پڑے تھے۔

حضرت علیؓ کو جب آپؐ نے اہلِ بیت کی نگرانی کے لئے مدینہ چھوڑ کر تبوک جانا چاہا اور حضرت علیؓ نے ہم رکاب نہ ہونے پر ملال خاطر ظاہر کیا تو آپؐ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا:

الا ترضی ان تکون منی بمنزلۃ کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تم میں اور

---

[1] باب فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترمذی عن ابی بن کعبؓ [2] یہ حدیث حسب ذیل کتابوں میں ہے مستدرک حاکم تفسیر سورۂ احزاب۔ حاکم اور ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے و تاریخ امام بخاری (بحوالہ فتح الباری جلد ششم) حلیۃ الاولیاء ابی نعیم و شعب الایمان بیہقی (بحوالہ کنز العمال جلد ششم) و مسند احمد۔

ھارون من موسٰی الا انه لیس	مجھ میں وہ نسبت ہو جو ہارونؑ اور موسیٰؑ
نبی بعدی	میں تھی۔ لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی
(صحیح بخاری غزوہ تبوک)	نہیں۔

صحیح مسلم (مناقب علیؓ) میں یہ الفاظ ہیں:۔

غیر انه لا نبی بعدی۔	لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔
الا انه لا نبوة بعدی۔	لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبوت نہیں۔

صحیح بخاری (کتاب الانبیاءؑ) اور صحیح مسلم (کتاب الامارۃ) میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ بنواسرائیل کی نگرانی اور سیاست انبیاء کرتے تھے۔ ایک نبی جب مرتا تھا تو دوسرا نبی پیدا ہوتا تھا

و انه لا نبی بعدی۔	اور بہ تحقیق میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

جامع ترمذی[1] اور مستدرک[2] حاکم میں ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت عمرؓ کی مدح میں فرمایا:

لوکان نبی بعدی لکان عمر	اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو وہ
بن الخطاب۔	خطاب کے بیٹے عمرؓ ہوتے۔

عربی زبان جاننے والے کو معلوم ہے کہ "لو" امر محال کے لیے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے بعد کسی دوسرے نبی کا آنا محال ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمدؐ ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ خدا میرے ذریعہ سے کفر کو محو کرے گا، میں حاشر ہوں کہ خدا میرے پیچھے سب کو جمع کرے گا اور میں عاقب (آخری) ہوں الذی لیس بعدہ نبی (جس کے بعد کوئی

---

[1] مناقب عمرؓ، حدیث غریب حسن۔ [2] مناقب عمرؓ جلد سوم حدیث صحیح، صححہ الذہبی۔

نبی نہ ہوگا[1] جامع ترمذی اور بعض دوسری کتابوں میں آخری فقرہ ان الفاظ میں ہے۔ الذی لیس بعدی نبی۔ یعنی میں وہ عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔[2]

صحیح بخاری میں آپؐ کا ارشاد ہے۔ کہ "خوشخبریوں کے سوا نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا" صحابہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہؐ! خوشخبریاں کیا ہیں؟ فرمایا "رؤیائے صالحہ"[3] یعنی سچے خواب۔ پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اپنے امورِ غیب سے مطلع کرنے کے متعدد ذرائع مقرر کئے ہیں، منجملہ اُن کے ایک رؤیائے صالحہ بھی ہے۔ اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ "نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو مومن کی رؤیائے صالحہ ہے"[4] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "تم سے پہلے قوموں میں محدثین (بات کئے گئے) ہوا کرتے تھے۔ اگر میری اُمت میں کوئی محدث ہوگا تو وہ عمرؓ ہیں"[5] ائمہ حدیث نے محدث کے معنی مُلْهَمْ کے لکھے ہیں۔

غرض ختمِ نبوت کے بعد اب جو نعمت اہلِ ایمان کے لئے باقی رہ گئی ہے وہ صرف دو ہیں۔ رؤیائے صالحہ اور الہام۔ لیکن چونکہ نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں اور نہ اس کی سچائی کی کوئی قطعی شہادت موجود ہے۔ اس لئے کسی مومن کی رؤیائے صالحہ اور الہامات کسی دوسرے شخص پر بلکہ خود اُس پر بھی حجت نہیں۔ اور اُن کے منجانب اللہ ہونے کا یقین

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم، باب: اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم صحیح بخاری میں عاقب کی تفسیر مذکور نہیں۔ مسند ابن حنبل جلد چہارم میں یہ حدیث اور عاقب کی یہ تفسیر امام زہری سے مذکور ہے [2] فتح الباری شرح بخاری جلد ششم [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر [4] صحیح بخاری کتاب التعبیر و صحیح مسلم کتاب الرؤیا و مسند ابن حنبل جلد سوم۔ عن انسؓ۔

[5] بخاری و مسلم و ترمذی، مناقب عمرؓ۔

کامل کرنا، اور اُن کی اطاعت و پیروی کرنا اور اُن کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور اُن کی صداقت پر تحدّی کرنا ضلالت و گمراہی ہے۔ ان رؤیائے صالحہ اور الہامات کے ذریعہ سے جو چیز مومن کو دی جاتی ہے وہ احکام نہیں ہوتے، بلکہ صرف خوشخبریاں ہوتی ہیں۔ یعنی امرِ غیب اور مستقبل کی کچھ اطلاعات اور مناظر!

مسند ابنِ حنبل میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے مرض الموت میں حجرۂ مبارک کا پردہ اُٹھایا۔ حضرت ابوبکرؓ امام تھے اور صحابۂ کرامؓ صف بستہ پیچھے۔ اُس وقت یہ آخری اعلان فرمایا:

یاایھا الناس لم یبق من مبشرات النبوۃ الا الرویا الصالحۃ یراھا المسلم او تری لہ۔	اے لوگو! نبوّت کی خوشخبریوں (غیبی ودائع علم وخبر) میں سے اب کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ لیکن اب رؤیائے صالحہ جو مسلمان اپنے متعلق آپ دیکھے یا کوئی دوسرا اُس کے متعلق دیکھے۔
(مسند احمد بن حنبل جلد اول)	

اِس سے صاف ہو گیا کہ رؤیائے صالحہ شخصی احوال و مناظر سے متعلق ہے۔ اسی کتاب میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہمارے مقصد کے اثبات کے لئے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلسِ نبویؐ میں خدّام حاضر تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔

ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔	رسالت اور نبوّت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

صحابہؓ پر یہ بات سخت گذری تو آپؐ نے فرمایا۔ ولکن مبشرات (لیکن خوشخبریاں) باقی ہیں۔ لوگوں نے عرض کی۔ یارسول اللہؐ! خوش خبریاں کیا ہیں؟ فرمایا، مردِ مومن کی رؤیائے صالحہ وہ نبوّت کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے[1]۔

تمام حدیثیں حقیقت میں جیساکہ ترمذیؒ[2] و حاکم میں ہے۔ اس آیت کی تفسیر ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ	ہاں! اولیائے الٰہی کو کوئی خوف اور
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝	غم نہیں۔ جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝	تھے۔ اُن کو دنیا اور آخرت میں بشارت
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	ہے۔
وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ	

(یونس: ۶۲-۶۴)

صحابہؓ نے پوچھا کہ دنیا میں اُن کے لئے بشارت کیا ہے؟ "رؤیائے صالحہ"! اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اِن مبشّرات کے حصول کا ذریعہ ایمان اور تقویٰ کی تکمیل ہے اور دوسری یہ کہ ایسے لوگوں کا نام جن کو یہ مرتبہ حاصل ہُوا، اولیاء اللہ ہے اور اِس لئے اُن کے اِس رُتبہ کا نام ولایت ہوگا۔ اس کو جزئی نبوّت، لغوی نبوّت مجازی نبوّت، نبوّتِ ناقصہ وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرنا ایسی لفظی گمراہی ہے جو معنوی گمراہی کی طرف مقتضی ہے اور اس سے خرک فی النبوّۃ کی اُسی طرح برائیاں پیدا ہوں گی، بلکہ ہوئیں اور ہو رہی ہیں، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مجازی معنوں میں ابن اللہ کہہ کر حقیقی معنوں

---

[1] مسند ابن حنبل عن انسؓ جلد سوم و ترمذی کتاب الرویاء [2] ترمذی تفسیر سورۂ یونس و کتاب الرویاء و مستدرک حاکم تفسیر یونس (صحیح)

میں عیسائی شرک فی التوحید میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ ہر قسم کی نبوّتوں کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کی تکمیل ہو چکی۔ دنیا میں خدا کا آخری پیغام دعوتِ محمدیؐ کے ذریعہ سامعہ نواز ہو چکا۔ معمارِ قدرت اپنی عمارت میں اس آخری پتھر کو اپنی جگہ پر رکھ کر اپنی تعمیر پوری کر چکا۔ درجہ بدرجہ ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشیدِ انور طالع ہوا جس کے لئے غروب نہیں۔ طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد باغِ کائنات میں وہ سدا بہار موسم آگیا جس کے بعد پھر خزاں نہیں۔

شفاعت اوّلین | عرصۂ دار و گیر محشر میں جب جلالِ الٰہی کا آفتاب پوری تمازت پر ہوگا اور گناہگار انسانوں کو امن کا کوئی سایہ نہیں ملے گا، اس وقت سب سے پہلے فخرِ موجودات، باعثِ خلق کائنات، سیّدِ اولادِ آدمؑ، خاتم الانبیاء و رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں میں لوائے حمد لے کر اور فرقِ مبارک پر تاجِ شفاعت رکھ کر گناہگاروں کی دستگیری فرمائینگے۔

لفظ شفاعت" اصل لغت میں شفع سے نکلا ہے۔ جس کے معنی جوڑا بننے، ایک کے ساتھ دوسرے کے ہونے کے ہیں۔ چونکہ شفاعت اصل میں یہی ہے کہ "کسی درخواست کنندہ اور عریضہ گذار کے ہم آہنگ ہو کر کسی بڑے کے سامنے اُس کی عرض و درخواست قبول کر لینے کی خواہش کا اظہار کرنا۔ آپؐ کی شفاعت بھی یہی ہوگی کہ آپ گناہگاروں کی زبان بن کر اُن کی طرف سے خداوندِ ذوالجلال کے اذن سے اُس کے سامنے اُن کی بخشائش و مغفرت کی درخواست پیش کریں گے۔ سورۂ اسرا (بنی اسرائیل) میں ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝

قریب ہے کہ خدا تجھے مقامِ محمود میں اُٹھائے۔

(بنی اسرائیل: ۷۹)

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں تمام صحیح روایتوں میں متعدد صحابۂ کبارؓ سے منقول ہے

کہ مقامِ محمود سے مراد رتبۂ شفاعت ہے[1]۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ نے شفاعت کے تمام واقعات بیان کرکے یہ آیتِ بالا تلاوت کی۔ پھر حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا "یہی وہ مقامِ محمود ہے جس کا تمہارے پیغمبر سے وعدہ کیا گیا ہے"[2]۔ صحیح مسلم میں ہے کہ بصرہ کے کچھ خوارج جو گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو دائمی جہنمی سمجھتے ہیں، یعنی اُن کے حق میں شفاعت کے اثر کے قائل نہیں، مدینہ منوّرہ آئے۔ یہاں مسجد نبویؐ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ صحابی قیامت کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے بڑھ کر کہا "اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابیؓ! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ خدا تو قرآن میں یہ کہہ رہا ہے"۔ یہ کہہ کر قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی، جس کا یہ مطلب ہے کہ دوزخی جب دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اُسی میں ڈال دیئے جائیں گے۔ (کُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِیْدُوْا مِنْهَا)[3]۔ حضرت جابرؓ نے پوچھا تم نے قرآن پڑھا ہے۔ اُس نے جواب دیا "ہاں"۔ فرمایا تم نے اس "مقامِ محمود" کا حال سُنا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ تمہارے پیغمبر کو مبعوث کرے گا۔ اس نے کہا "ہاں سُنا ہے"۔ فرمایا تو یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ محمود ہے جس کے ذریعہ سے خدا دوزخ سے جس کو نکالنا چاہے گا، نکالے گا۔ یہ سُن کر ایک کے سوا باقی سب اپنے اپنے عقیدۂ باطل سے تائب ہو گئے اور بولے کہ "کیا یہ بوڑھا صحابیؓ رسولؐ پر جھوٹ بولے گا؟"[4]

بخاری میں حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ہر اُمّت اپنے اپنے پیغمبر کے پیچھے چلے گی اور کہے گی کہ "اے وہ! خدا کی درگاہ میں ہماری شفاعت کیجیئے"۔

---

[1] صحیح بخاری و جامع ترمذی و مستدرک، تفسیر آیت مذکورہ و صحیح مسلم کتاب الایمان، باب الشفاعۃ [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ [3] الحج: ۲۲۔ [4] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعہ [5] صحیح بخاری، تفسیر آیت مذکور۔

یہاں تک کہ شفاعت کا معاملہ آنحضرتؐ تک پہنچے گا یہی وہ دن ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ آپؐ کو مقام محمود میں اُٹھائے گا۔ جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اذان سُن کر یہ دُعا مانگے گا۔ کہ اے خدا جو پوری دُعا اور کھڑی ہونے والی نماز کا مالک ہے۔ محمدؐ کو وسیلہ اور فضیلت اور وہ مقام محمود عطا فرما جس کا تو نے وعدہ فرمایا تو قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت اُترے گی[1]۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہر نبی کو کوئی نہ کوئی مستجاب دُعا دی گئی۔ میں نے اپنی اس دُعا کو اپنی اُمت کے لئے چھپا رکھا ہے[2]۔ پھر فرمایا ہے کہ مجھ کو دیگر انبیاءؑ پر چند فضیلتیں عطا ہوئیں۔ اُن میں سے ایک یہ کہ مجھے شفاعت عطا کی گئی[3]۔ (یعنی شفاعت اوّلین)

موطا امام مالک اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے متعدد تابعیوں نے یہ متفقہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "ہر نبی کو ایک مقبول دُعا مانگنے کا موقع عطا کیا گیا تو انہوں نے وہ دُعا مانگ لی اور وہ قبول کر لی گئی۔ لیکن میں نے اپنی دُعا کا یہ موقع قیامت کے دن کے لئے چھپا رکھا ہے اور وہ اپنی اُمت کی شفاعت ہے[4]۔ فرمایا کہ "میں سب سے پہلا شفیع ہوں گا اور سب سے پہلا وہ شخص جس کی شفاعت قبول کی جائے گی[5]۔ اور فرمایا کہ "میں پہلا ہوں گا جو جنت کی شفاعت کرے گا[6]۔

اُس دن جب دنیا کی گناہگاریاں اپنی عریاں صورت میں نظر آئیں گی اور آدم کی اولاد ترساں و لرزاں کسی شفیع کی تلاش میں ہو گی۔ کبھی آدم علیہ السلام کا سہارا ڈھونڈھے گی۔ کبھی نوح و ابراہیم علیہما السلام کو یاد کرے گی۔ کبھی موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی طرف بیتابانہ

---

[1] صحیح بخاری، تفسیر آیت مذکور و باب الدعاء عند النداء [2] صحیح بخاری کتاب التوحید و کتاب الدعوات و صحیح مسلم باب الشفاعۃ [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب المساجد [4] صحیح بخاری، کتاب التوحید و کتاب الدعوات و صحیح مسلم باب الشفاعۃ۔
[5] صحیح مسلم کتاب فضائل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وغیرہ۔ [6] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ۔

حضورؐ جائیں گے اور پھر واپس آکر عرض گذار ہوں گے۔ حمد و ثنا کریں گے اور سربسجود ہوں گے۔ آواز آئے گی "جاؤ جس کے دل میں چھوٹی سی چھوٹی رائی کے برابر ایمان ہو، اس کو بھی دوزخ سے نکالوں گا"۔ آپؐ پھر جا کر واپس آئیں گے اور گذارش کریں گے اور حمد و ثنا کر کے سجدہ میں گر پڑیں گے۔ پھر ندا آئے گی "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا۔ مانگو دیا جائے گا۔ شفاعت کرو قبول ہوگی"۔ عرض کریں گے، جس نے بھی تیری یکتائی کی گواہی دی اس کی شفاعت کا اذن عطا ہو"۔ صدا آئے گی اس کا اختیار تم کو نہیں۔ لیکن مجھے اپنی عزت و کبریائی اور اپنی عظمت و جبروت کی قسم ہے، میں دوزخ سے ہر اُس شخص کو نکالوں گا جس نے مجھے ایک کہا اور اپنے لئے دوسرا معبود نہیں بنایا۔ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ [1]

کمزور انسانوں کو تسکین کا یہ پیام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کس نے سنایا۔

فضائلِ اخروی آنحضرتؐ کے یہ وہ خصائص تھے، جو آپؐ کو پیغمبر، مبلغ دین، صاحبِ مذہب اور پیشوائے امت ہونے کی حیثیت سے عطا ہوئے تھے۔ علاوہ بریں آپؐ کو آخرت کی دنیا میں بھی مزید فضائل عنایت ہوئے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا "قیامت میں میں پیغمبروں کا نمائندہ اور امام اور ان کی شفاعت کا پیروکار ہوں گا اور اس پر فخر نہیں [2]"۔ پھر فرمایا ہے "میں قیامت کے دن تمام بنی آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں اور میرے ہی ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا اور اس پر فخر نہیں اور قیامت کے دن آدمؑ وغیرہ تمام پیغمبر میرے

---

[1] یہ پوری حدیث صحیح بخاری باب تفسیر بنی اسرائیل، کتاب الانبیاء ذکر نوحؑ و صحیح مسلم باب الشفاعہ میں مختلف صحابیوںؓ سے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے تغیر سے مروی ہے۔ ہم نے سب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ [2] ترمذی، مناقب نبویؐ۔ حدیث حسن صحیح غریب۔

علم کے نیچے ہوں گے اور اس پر فخر نہیں اور سب سے پہلے میں ہی قبر سے باہر آؤں گا۔[1] نیز ارشاد ہے۔ لوگ قبروں سے جب اُٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلا اٹھنے والا میں ہی ہوں گا۔ جب وہ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو ان کی طرف سے بولنے والا میں ہوں گا۔ جب وہ ناامید ہوں گے تو ان کو خوشخبری سُنانے والا میں ہوں گا۔ اس دن خدا کی حمد کا علم میرے ہاتھ میں ہوگا۔[2]

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وسلم

وتم الجزء الثالث من السیرۃ النبویۃ

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ

سید سلیمان ندوی

---

[1] ترمذی، مناقب نبویؐ حدیث حسن [2] ترمذی مناقب نبویؐ حدیث حسن غریب۔